

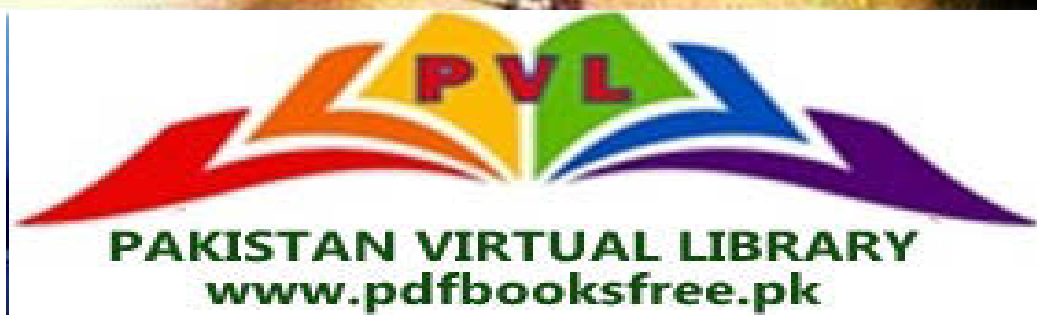
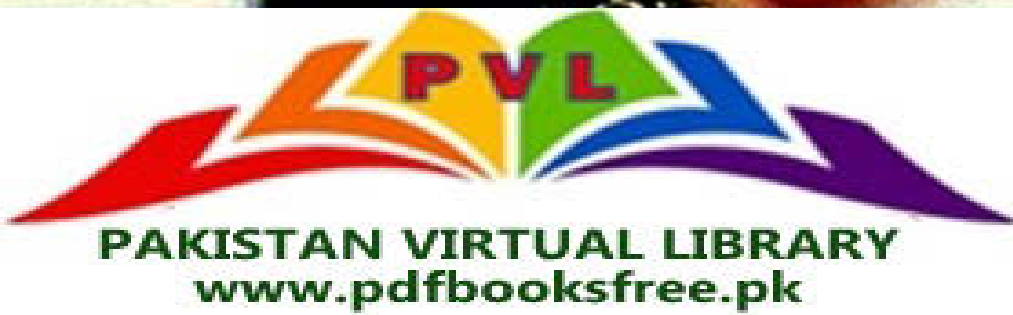
اپریل 2016

بہنوں کا اپنا مآب نامہ

شرع

PDFBOOKSFREE.PK

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk



سمیرا حمید کا مکمل ناول
رَبِّ الْبَشَرِ



پہلی شعاع، رضیہ جمیل 10
حمزہ، زاہد قاسمی 11
نعت، زاہد قاسمی 11
نئی کی باتیں، ادارہ 12

226 سیاہ کاشیہ، صائمہ اکرم
74 کوئی تعویذ، سیرالونس



بذرِ حسن، دلش تیمور 24
شادی مبارک ہو، آسیہ رزاقی 32
دستک، شاہین رشید 28
جب تجھ سے نانا، گل م 17

59 میں ہوں تانا، نبت سحر
156 جگنو، حاجرہ خان
67 رشتہ تلے زبانی، مصباح علی
102 کھلے گلاب، میہنا شاد
259 کس سفر میں ہے، سدرۃ المنہجی



36 خوب شیشے کا، عفت سحر ظاہر
216 رقصِ سبیل، نبیلہ عزیز

267 غزل، صحن احسان
266 نظم، ڈاکٹر طاہر مسعود
266 غزل، لطیف ساحل



108 رب البشر، سیراجہد
162 محبت مارچ کا موسم، سائرہ رضا

زیرِ سالانہ بیگہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) --- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ --- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔



PAKISTAN DIGITAL LIBRARY

www.pdfbooksfree.pk



282	امت الصبور	تاریخ کے جھڑکے	274	رضیہ جمیل	خط آپ کے
288	خالہ جیلانی	موسم کے پیکوان	268	ادارہ	مُسکراہٹیں
290	ادارہ	خوبصورت بنئے	285	واصفہ سہیل	ایتنے خالے میں
			270	شگفتہ جاہ	بالوں سے خوشبو لے
			273	خالہ جیلانی	کھلتا کسی پہ

اپریل 2016

صفحہ 30 نمبر 8

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی

رضیہ جمیل نے لندن حسن پر نشنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقابلاً اپنی پوری سی اپنی اپنی سوکائی ہوئی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رگزیجیگن سہ ماہی شعلہ

شعاع اپریل کا شمار لیے حاضر ہیں۔
 انسان اپنے جذبات و احساسات کا اظہار مختلف پیرائے میں کرتا ہے۔ اور اظہار کا انداز ہی اس کی شخصیت کو بے نقاب کرتا ہے۔ انسان اپنی گفتگو کے پردے میں چھپا ہوا ہے۔ الفاظ جب ترتیب پا کر گفتگو میں ڈھلتے ہیں تو تب یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ہمارا مخاطب کس شخصیت کا مالک ہے۔ اگرچہ الفاظ بھلے خود اپنے اندر معنی کا ایک جہاں رکھتے ہیں۔
 نشر کی صورت بھی رکھتے ہیں اور مرہم کی خاصیت بھی۔
 دل داری کے راز سے بھی آشنا ہوتے ہیں اور بے رخی کے کا دی چر کے لگانے سے بھی نہیں چوکتے۔
 یہ الفاظ ہی ہیں جو زندگی میں رنگ بھرتے ہیں اور ستریں بھی لیکن۔ دل کو غم کدے میں بندنے کا ہنر بھی ان ہی کے پاس ہے۔
 مگر یہ تمام الفاظ اس وقت زندگی پاتے ہیں جب برتنے والا ان پر قادر بھی ہو اور غالب بھی۔
 اس لیے الفاظ کا سوچ سمجھ کر استعمال ہی دانائی ہے کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی پشیمانی کے گہرے سمندر میں غرق کر سکتی ہے۔
 بسا اوقات زندگی میں ایسے مقامات بھی آجاتے ہیں جہاں الفاظ گونگے ہو جاتے ہیں۔ اپنی حیثیت کھو بیٹھتے ہیں۔ خاموشی کلام کرنے لگتی ہے۔
 اور خاموشی وہیں کلام کرتی ہے جہاں دوستی اور محبت کے انمول اور حقیقی رشتے موجود ہوں۔

اس شمارے میں،

- ۱۔ سمیرا حمید کا مکمل ناول۔ رب البشر،
 - ۲۔ سائرہ رضا کا مکمل ناول۔ محبت مارچ کا موسم،
 - ۳۔ صائمہ اکرم اور سمیرا یونس ہارون کے ناولٹ،
 - ۴۔ مصباح علی، بنت سحر، مریم بنت ارشاد، ہاجرہ سبحان اور سمدۃ المفتی کے افسانے،
 - ۵۔ جب تجھ سے نانا جوڑا ہے۔ قارئین کا سلسلہ،
 - ۶۔ معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
 - ۷۔ دانش تیمور اور عائزہ خان کا بندھن،
 - ۸۔ شعاع کے ساتھ ساتھ۔ قارئین سے سروے،
 - ۹۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث کا سلسلہ،
 - ۱۰۔ خط آپ کے اور دیگر سلسلے شامل ہیں۔
- اپریل کا شمارہ آپ کو کیسا لگا، خط لکھ کر ہمیں اپنی رائے سے ضرور توازیے گا۔

جو نبیؐ کے قریب ہوتے ہیں
اُن کے روشن نصیب ہوتے ہیں

اُمّتی جو درود پڑھتے ہیں
مُصطفیٰؐ کے قریب ہوتے ہیں

پیروی جو سدا نبیؐ کی کریں
وہ ہی ربؐ کے قریب ہوتے ہیں

درد رکھیں جو اُن کا سینے میں
اُقا اُن کے طبیب ہوتے ہیں

رُتبہ اُقا کا جو نہ سمجھ پائیں
وہ بڑے بد نصیب ہوتے ہیں

دل میں غم، آنکھ میں آنسو
وقتِ رخصت نصیب ہوتے ہیں

اُن کے قدموں میں آگیا زاہد
کس کے ایسے نصیب ہوتے ہیں

زاہد قاسمی

کروں حمد تیری میں اے خدا، تیری شانِ بَہلِ جَلالہ،
تو ہی سب جہانوں کا بادشاہ، تیری شانِ بَہلِ جَلالہ،

بسا ہر جہاں میں نیا جہاں، یہ زمین ہو کہ آسمان
تیرا ذکر جاری ہے جا بہ جا، تیری شانِ بَہلِ جَلالہ،

تیرے در پہ جھکتا ہے کل جہاں، یہ ملائکہ سب ہی انس و جان
تیری حمد کرتے ہیں سب سدا، تیری شانِ بَہلِ جَلالہ،

تیری ملک ساری ہے کائنات، تیرے فضل سے ہیں یہ دن و رات
شمس و قمر میں تیری ضیاء، تیری شانِ بَہلِ جَلالہ،

ہیں رسولِ آخری مُصطفیٰؐ، جو ہیں باعثِ رحمتِ کل جہاں
سبھی انبیاءؑ کے ہیں پیشوا، تیری شانِ بَہلِ جَلالہ،

میرے حال پر ہے تیری نظر، میری سب خطائیں تو معاف کہ
تیرے بن نہیں کوئی آسرا، تیری شانِ بَہلِ جَلالہ،

تیرا نام ہو وردِ زبان، دمِ واپسی میرے مہرباں
کرے تجھ سے زاہد یہ التجا، تیری شانِ بَہلِ جَلالہ،

زاہد قاسمی



اللہ کے منع کردہ کاموں کا بیان

غیبت کے حرام ہونے اور زبان کی حفاظت کرنے کا حکم

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
”تم میں سے کوئی شخص کسی کی غیبت نہ کرے۔
کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ
وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ تم اسے ناپسند
سمجھو گے۔ اور اللہ سے ڈرو۔ یقیناً“ اللہ تعالیٰ بہت
رجوع کرنے والا نہایت مہربان ہے۔“ (الحجرات-12)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”اس چیز کے پیچھے مت پڑو
جس کا تمہیں علم نہیں، بے شک کان، آنکھ اور دل
ان سب ہی سے باز پرس ہوگی۔“ (الاسرا-36)
اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”انسان جو لفظ بھی بولتا ہے
تو اس کے پاس ہی ایک نگران تیار ہے۔“ (ق-18)
امام نووی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں : ”معلوم ہونا
چاہیے کہ ہر مکلف انسان کے لیے مناسب ہے کہ وہ
اپنی زبان کی ہر قسم کی گفتگو سے حفاظت کرے
صرف وہ گفتگو کرے جس میں مصلحت واضح ہو اور
جہاں مصلحت کے اعتبار سے بولنا اور خاموش رہنا
دونوں برابر ہوں تو پھر خاموش رہنا سنت ہے اس لیے
کہ بعض دفعہ جائز گفتگو بھی حرام یا مکروہ تک پہنچا دیتی
ہے اور ایسا عام طور پر ہوتا ہے۔ اور سلامتی کے برابر
کوئی چیز نہیں۔“

خاموشی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی
کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جو شخص اللہ اور

یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ یا تو بھلائی کی بات کہے
ورنہ خاموش رہے۔“ (بخاری و مسلم)
اس حدیث سے واضح ہے کہ گفتگو اسی وقت
مناسب ہے جب اس میں کوئی بھلائی ہو۔ اور یہ وہی
بات ہے جس کی مصلحت ظاہر ہو۔ اور جب مصلحت
کے ظہور میں (یقین کی بجائے) شک ہو تو پھر گفتگو ہی
نہ کرے۔

فوائد : اس سے فضول گوئی کی شاعت اور بے
فائدہ گفتگو نہ کرنے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

سب سے افضل

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ
میں نے عرض کیا۔
”اے اللہ کے رسول! مسلمانوں میں سے کون
افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جس
کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔“
(بخاری و مسلم)

زبان کی حفاظت

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت
ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”جو شخص مجھے اپنے دو جبروں کے درمیان والی چیز
(زبان) اور اپنی دونوں ٹانگوں کے درمیان والی چیز (شرم
گاہ) کی حفاظت کی ضمانت دے دے تو میں اسے جنت
کی ضمانت دیتا ہوں۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ : دو جبروں کے درمیان زبان ہوتی ہے اور دو
ٹانگوں کے درمیان شرم گاہ۔ ان دونوں کی حفاظت پر
جنت کی بشارت ہے۔ حفاظت کا مطلب ہے کہ ان کا
استعمال صرف جائز جگہوں پر کیا جائے اور ناجائز

استعمال سے ان کی حفاظت کی جائے۔

بے سوچے سمجھے بات کرنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔ ”بندہ ایک بات کرتا ہے اس میں غور و فکر نہیں کرتا وہ اس بات کی وجہ سے مشرق و مغرب کی درمیانی مسافت سے بھی زیادہ جہنم کی آگ کی طرف گر جاتا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ : اس میں زبان کی بے اعتدالی کے نقصانات کو واضح کیا گیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان ہر بات کرنے سے پہلے اسے تولے اور پھر بولے۔

توجہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بندہ اللہ کی رضامندی کی بات کرتا ہے اس کی طرف اس کی توجہ بھی نہیں ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کے کئی درجے بلند فرماتا ہے۔ اور بندہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی والی بات کرتا ہے جس کی طرف اس کا دھیان بھی نہیں ہوتا لیکن اس کی وجہ سے وہ جہنم میں جا گرتا ہے۔“ (بخاری)

کلمہ خیر

حضرت ابو عبد الرحمن بلال بن حارث منی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”آدمی اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی بات کرتا ہے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ کہاں تک پہنچے گی۔ اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کے لیے قیامت کے دن تک اپنی رضامندی لکھ دیتا ہے۔ اور آدمی (بعض دفعہ) اللہ کی ناراضی کا کوئی بول بولتا ہے اسے گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ کہاں تک پہنچے گا اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کے لیے اپنی ملاقات کے دن تک اپنی ناراضی لکھ

دیتا ہے۔“

(اسے امام مالک نے مؤطا میں روایت کیا ہے نیز اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فائدہ : اس حدیث میں بھی ایک ایسی حقیقت کا بیان ہے جس کا عام مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ بعض دفعہ آدمی زبان سے ایسا کلمہ خیر ادا کرتا ہے جس سے کسی کا دل خوش ہو جاتا ہے یا اس کی اصلاح ہو جاتی ہے یا وہ ظلم و معصیت کے ارادے سے باز آ جاتا ہے تو یقیناً ”یہ کلمہ خیر عند اللہ بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے۔ اور اسی طرح بعض دفعہ انسان کی زبان سے ایسا کلمہ شر ادا

ہو جاتا ہے کہ اس کو اس کی تباہ کاری و حشر سامانی کا اندازہ نہیں ہوتا لیکن اس کا کلمہ کسی کی دل آزاری یا گمراہی یا ظلم و معصیت کا باعث بنتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ زبان کی حفاظت اور اس کا صحیح استعمال نہایت ضروری ہے ورنہ یہ انسان کو تباہی کے گڑھے میں ڈال دے گی۔

سب سے بڑا خطرہ

حضرت صفیان بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا۔ ”اے اللہ کے رسول! مجھے ایسی بات بتائیے جس کو میں مضبوطی سے پکڑ لوں؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”تم کہو: میرا رب اللہ ہے پھر اس پر جم جاؤ۔“

میں نے عرض کیا:

”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! سب سے زیادہ خطرے والی چیز جس کا آپ کو مجھ سے اندیشہ ہو کیا ہے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان پکڑی پھر فرمایا:

”یہ زبان۔“

(اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور حسن صحیح کہا ہے۔)

فوائد و مسائل :

1- اللہ تعالیٰ اور اس کی ربوبیت پر ایمان یہ تمام اعمال صالحہ کی بنیاد ہے۔ اس کے بغیر کسی عمل کی عند اللہ کوئی اہمیت نہیں۔

2- اس پر استقامت کا مطلب ہے کہ اس کی رضا اور عدم رضا کو ہر وقت سامنے رکھا جائے۔ اس کے اوامر کو بجالایا جائے تاکہ وہ راضی ہو جائے اور نواہی سے بچا جائے تاکہ وہ ناراض نہ ہو۔ زبان کی حفاظت کی تاکید بھی اسی لیے ہے کہ زبان کی بے احتیاطی سے انسان غضب الہی کا مورد نہ بن جائے۔

دل کی سختی

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ‘ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”اللہ کے ذکر کے علاوہ باتیں زیادہ نہ کرو“ اس لیے کہ اللہ کے ذکر کے علاوہ دیگر زیادہ باتیں ‘دل کی سختی ہے۔ اور لوگوں میں اللہ سے سب سے زیادہ دور سخت دل (والا آدمی) ہے۔“ (ترمذی)

فوائد و مسائل :

1- دل کے سخت ہونے کا مطلب ہے کہ حالات و واقعات سے وہ عبرت و موعظت نہ پکڑے اور وعظ و نصیحت سے کوئی اثر قبول نہ کرے۔

2- اللہ کے ذکر کے بجائے فضول باتوں سے قلوب انسانی سخت ہو جاتے ہیں جو نہایت بد بختی کی علامت ہے۔ اس لیے انسان کو اللہ کا ذکر ہی کثرت سے کرنا چاہیے۔

زبان پر قابو

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا۔

”اے اللہ کے رسول! نجات کس طرح ممکن ہے؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اپنی زبان کو قابو میں رکھو تمہارا گھر تمہیں اپنے اندر سمالے (تمہارا فارغ وقت گھر کے اندر ہی

گزرے) اور اپنی غلطیوں پر خوب روؤ۔“

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ

حدیث حسن ہے۔)

فوائد و مسائل :

1- لوگوں سے زیادہ میل جول اور ان سے گپ شپ میں انسان کے دین کو بہت خطرات لاحق رہتے ہیں اس لیے زیادہ احتیاط کے بجائے گھر میں اللہ کی اطاعت اور ذکر و فکر اور تلاوت وغیرہ میں اپنے فارغ اوقات کو صرف کرنا بہتر ہے۔

2- اسی طرح تنہائیوں میں اپنی خطاؤں اور لغزشوں پر رونا بھی اللہ کا بہت پسندیدہ ہے ‘ اس حدیث میں زبان کی حفاظت کے علاوہ ان دو باتوں کی بھی تاکید

ہے۔

اللہ کا ڈر

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ‘نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جب انسان صبح کرتا ہے تو اس کے جسم کے تمام اعضاء زبان سے نہایت عاجزی سے عرض کرتے ہیں ‘

کہتے ہیں تو ہمارے بارے میں اللہ سے ڈرنا ‘ اس لیے کہ ہمارا معاملہ تیرے ساتھ وابستہ ہے ‘ اگر تو سیدھی

رہے گی تو ہم بھی سیدھے رہیں گے ‘ اگر تو نے کجی اختیار کی تو ہم بھی ٹیڑھے ہو جائیں گے۔“ (ترمذی)

فوائد و مسائل :

1- اس سے واضح ہے کہ زبان کو سوچ سمجھ کر استعمال کرنا کتنا ضروری ہے کہ زبان کی ذرا سی بے

اعتدالی کی سزا پورے جسم انسانی کو بھگتنی پڑتی ہے۔ لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں تو مار جسم ہی کو برداشت کرنی

پڑتی ہے۔ بعض دفعہ جسم کو ہمیشہ کی نیند تک سلا دیا جاتا ہے۔

2- ”ٹیڑھے ہونے کا مطلب یہی ہے کہ زبان کے ٹیڑھے پن کی زد پورے جسم پر پڑتی ہے اور سیدھے رہنے کا مطلب ابتلا و آزمائش سے محفوظ رہنا ہے۔

3- ایک دوسری حدیث میں دل کو تمام جسم انسانی کی

اصلاح یا فساد کا باعث بتلایا گیا ہے، جب کہ اس حدیث سے زبان کا یہ مقام واضح ہوتا ہے۔ تو ان میں باہم کوئی تعارض نہیں۔ اس لیے کہ زبان دل کی جانشین اور اس کی ترجمان ہے اور انسان، زبان اور دل دونوں کے مجموعے سے عبارت ہے اور آدمیت انہی دونوں چھوٹی چیزوں کا نام ہے۔ ایک عربی مفکر نے کیا خوب کہا ہے۔ ”آدمی کی زبان نصف ہے اور اس کا دل دوسرا نصف ہے۔“

غیبت کرنا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب مجھے معراج کرائی گئی تو میرا گزر کچھ ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جن کے ناخن تانے کے تھے، وہ (ان سے) اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے تو میں نے پوچھا:

”جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟“

انہوں نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں (غیبت کرتے ہیں) اور ان کی عزتوں کو پامال کرتے ہیں۔“ (ابوداؤد)

فوائد و مسائل :

1- لوگوں کا گوشت کھانا کنایہ ہے غیبت کرنے

2- عزتیں پامال کرنے سے مراد لوگوں کے سامنے برائی بیان کر کے ان کی ساکھ اور وقار کو مجروح کرنا ہے، یہ سب باتیں حرام اور سخت ممنوع ہیں۔

3- مذکورہ سزا سے اس جرم کی قباحت واضح ہے۔

حرام

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہر مسلمان کا خون، اس کی آبرو اور اس کا مال دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔“ (مسلم)

فوائد و مسائل :

1- اس سے بھی واضح ہے کہ اسلام میں خون، عزت اور مال، ان سب کی حفاظت پر زور دیا گیا ہے اور کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی بھی مسلمان کی عزت و آبرو پر حملہ کرے یا اس کا مال ہتھیائے یا اسے ناحق قتل کرے۔

2- اسے باب الغیبتہ میں لانے کا مطلب یہ ہے کہ غیبت سے بھی انسان کی عزت مجروح ہوتی ہے، اس لیے یہ بھی حرام ہے۔

غیبت سننے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”اور جب وہ کوئی بے ہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے اعراض کر لیتے ہیں۔“ (القصص-55)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”مومن بے ہودہ (سب و شتم، لایعنی، جھوٹ اور بے حیائی پر مبنی) باتوں سے اعراض کرنے والے ہوتے ہیں۔“ (المومنون-3)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”بے شک کان، آنکھ اور دل، ان سب سے باز پرس ہوگی۔“ (الاسراء-36)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”جب تو ایسے لوگوں کو دیکھے جو ہمارے حکموں میں طعن و تشنیع کر رہے ہوں تو ان سے اعراض کر لے (ان کی مجلس سے علیحدگی اختیار کر لے) یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مصروف ہو جائیں۔ اور اگر تجھے شیطان بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھ۔“ (الانعام-68)

فائدہ آیات :

1- مذکورہ آیات سے واضح ہے کہ جھوٹ، مکرو، فریب، بے حیائی، بے ہودہ اور لایعنی باتوں سے کنارہ کش رہنا اہل ایمان کا شیوہ ہے اور ان کو اس سے اعراض کرنے کا حکم ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غیبت کا سنتا بھی حرام ہے کیونکہ وہ بھی لغو میں شامل

ایک آدمی نے کہا: ”وہ تو منافق ہے“ اللہ اور اس

کے رسول سے محبت نہیں کرتا۔“

تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”یہ بات مت کہو، کیا تم نہیں دیکھتے کہ اس نے لا

الہ اللہ کہا ہے۔ اس سے اس کا ارادہ اللہ کی رضا ہی

حاصل کرنا ہے۔ اور یقیناً اللہ نے اس شخص پر جہنم

کی آگ حرام کر دی ہے جس نے اللہ کے چہرے کی

تلاش میں (اللہ کی رضا کی خاطر) لا الہ الا اللہ کہا۔“

(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ مومن پر جہنم کی آگ حرام ہونے کا مطلب ہے:

علی سبیل الخلود، یعنی مومن کا ہمیشہ کے لیے جہنم

میں رہنا حرام ہے، ورنہ کبیرہ گناہ کا مرتکب مومن اگر

اللہ نے اسے معاف نہ کیا، تو بطور سزا جہنم میں جائے گا

اور جب تک اللہ چاہے گا، جہنم کی سزا بھگتے گا، تاہم بعد

میں اسے جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

2۔ اس حدیث سے بھی واضح ہے کہ مسلمان کی

غیبت کرنا حرام اور ممنوع ہے۔

منافقت ظاہر کرنا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”میرا گمان ہے کہ فلاں فلاں آدمی ہمارے دین کی

کسی بات کو نہیں جانتے۔“ (بخاری)

اس حدیث کے ایک راوی لیث بن سعد فرماتے

ہیں کہ یہ دونوں آدمی منافقین میں سے تھے۔

فائدہ : منافقین بھی اہل فساد اور مشتبہ کروار ہی

کے حامل ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی حقیقت سے بھی

لوگوں کو آگاہ کرنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے تاکہ

لوگ ان سے بچ کر رہیں اور ان کا دین یا دنیا خراب نہ

ہو۔



2۔ اسی طرح ان مجلسوں کا بایکٹ ضروری ہے

جہاں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم

کے احکام کا استہزا اڑایا جا رہا ہو۔ یہ استہزا چاہے زبانی

ہو یا عملی، یعنی احکام الہیہ کی صریح مخالفت کی جا رہی

ہو، یہ بھی آیت الہیہ کا استہزا اور مذاق ہی ہے، جیسے

آج کل منگنی، مندی اور شادی بیاہ اور ختنہ و سالگرہ

وغیرہ کی تقریبات ہیں جن میں بے حیائی، بے پردگی،

تصویر سازی، ناچ گانا، مرد و عورت کا بے باکانہ اختلاط

اور جوان بچیوں کا براتیوں کا استقبال اور ان پر گل پاشی

کرنا، وغیرہ جیسی قباحتیں عام ہیں۔ اس قسم کی

تقریبات میں اگر انسان ان قباحتوں کو روکنے پر قادر

نہیں ہے تو ان میں شرکت سخت گناہ ہے، اس لیے ان

کا بایکٹ ضروری ہے۔

مسلمان بھائی کا دفاع

حضرت ابو درار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جس شخص نے اپنے مسلمان بھائی کی عزت کا

دفاع کیا، اللہ تعالیٰ قیامت والے دن اس کے چہرے

سے جہنم کی آگ دور کر دے گا۔“ (اسے ترمذی نے

روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)

فائدہ : عزت کے دفاع کا مطلب یہ ہے کہ کوئی

شخص کسی مجلس میں کسی کی عیب جوئی کرے، اس کی

توہین و تنقیص کر رہا ہو تو اس کا دفاع کیا جائے اور اہل

مجلس کو بتلایا جائے کہ اس کی بابت یہ باتیں صحیح نہیں

ہیں، اس کا دامن ان چیزوں سے پاک ہے۔

کلمہ گو کا احترام

حضرت عتبہ بن مالک رضی اللہ عنہ اپنی اس

مشہور اور طویل حدیث میں، جو باب الرجاء میں گزر

چکی ہے، بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ

وسلم نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہوئے تو فرمایا:

”مالک بن وحشم کہاں ہے؟“

مڑتی ہوئی کلیاں چھوڑی ہیں
 کھلتی ہوئی کلیاں چھوڑی ہیں
 جھولے کی وہ سکھیاں چھوڑی ہیں
 ہر طاق میں گزریاں چھوڑی ہیں
 جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے
 مت پوچھ کہ کیا کیا چھوڑا ہے

ایک لڑکی کا باہل کا گھر چھوڑ کر بیادیس جانا ایسا ہی ہے جیسے پودا ایک زمین سے اکھاڑ کر دوسری زمین میں لگا دیا جائے۔ اگر موافق زمین اور ماحول ملے تو یہ پودا پھلتا پھولتا ہے ورنہ مرجھا جاتا ہے۔
 غیر اور اجنبی لوگوں کی بات تو جانے دیں، کبھی کبھی سگی خالہ اور سگے چچا کے گھر میں بھی شادی ہو تو مختلف رویوں اور ماحول کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ تصور کریں ایک بڑھی لکھی، نازک خیال نفیس طبع لڑکی کو رخصت ہو کر ایسے ماحول میں جانا پڑے جہاں ان پر بڑھ لوگ، کالم گلوچ، لڑائی جھگڑا، طعنے تشنہ ہوں، اس طرح کے ماحول کو تبدیل کرنے اور یہاں خود کو منوانے کے لیے ایک عمر کی ریاضت درکار ہوتی ہے اور کبھی پوری عمر ہی رائیگاں ہی ٹھرتی ہے۔ خود کو مٹا کر بھی کچھ نہیں ملتا۔ اس ماہ نام اسی حوالے سے نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

گل، م، ڈیروغازی خان

ج۔ میری شادی 25 جون 2004ء کو ہوئی۔

س۔ شادی سے پہلے مشاغل اور دلچسپیاں؟
 ج۔ شادی سے پہلے بہت سے مشاغل تھے۔ بہت بے فکری کی زندگی تھی۔ اپنی مرضی سے سونا، اپنی مرضی سے اٹھنا۔ پورا دن ڈائجسٹ پڑھنا۔ اپنی بڑھالی کرنا۔ شادی، خوشیوں میں خوب انجوائے کرنا۔ دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرنا۔

س۔ اس رشتے میں آپ کی مرضی شامل تھی یا گھر والوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا؟

ج۔ اس رشتے میں سراسر گھر والوں کی مرضی تھی۔ لیکن میں بھی دل میں مطمئن تھی کہ چلو شادی شدہ ہیں۔ بڑی عمر کے میچور مرد ہیں۔ ان کی پہلی بیوی سے اولاد نہیں تھی۔ ماں باپ نے ترس کھا کر چلو اولاد ہو جائے گی۔ ہماری بیٹی کو بھی خوش رکھے گا اور بڑی بیوی کا بھی خیال رکھے گا۔ میں نے بھی سوچا کہ کم عمر

شعاع و خواتین سے رشتہ بہت پرانا ہے۔ آنکھ کھولتے ہی اپنے ارد گرد رسالوں کا ڈھیر دیکھا اور اسی وقت سے پڑھنے کی خواہش تھی جب ابھی اردو کا جوڑ سیکھ رہے تھے۔ تیسری چوکھی کلاس سے پڑھنا شروع کیا اور اب چار بیچوں کی مہما ہیں۔ اس وقت کہانیوں کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ بس پڑھنا شروع کر دیا تھا۔
 اب میرے بچوں کو میری طرح پڑھنے کا شوق ہے۔ میری پانچ سال کی بیٹی کہتی ہے۔ ”مما مجھے بھی پڑھ کر سناؤ۔“ میں نے کہا۔

”جب بڑی ہو جاؤ خود پڑھنا۔“

میں نے رسالے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کے لیے سنبھال کے رکھے ہوئے ہیں۔

جب سے ”جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔“ شروع ہوا ہے۔ ہر مہینے سوچتی تھی کہ اس میں ضرور شرکت کروں گی اور آخر کار آج ہمت کر رہی ہوں۔

س۔ شادی کب ہوئی؟

بیوی دیکھ کر مجھے خوش رکھے گا۔ بہ نسبت لابی کم عمر
نوجوان لڑکوں کے۔ لیکن سب کچھ اس کے الٹ نکلا۔
س۔ ذہن میں جیون ساٹھی کے حوالے سے کوئی
تصور تھا؟ وہ کیا خوبیاں تھیں جو آپ اپنے جیون ساٹھی
میں دیکھنا چاہتی تھیں؟

ج۔ کچھ خاص تصور نہیں تھا۔ بس یہ تھا کہ محبت
کرنے والا ہو۔ خیال کرنے والا، دکھ سکھ کا ساٹھی ہو۔
جو میری تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے۔ میری خوشی کو
اپنی خوشی۔

س۔ منگنی کتنا عرصہ رہی شادی سے پہلے فون پر بات
ہوئی یا ملاقات وغیرہ؟

ج۔ منگنی نہیں ہوئی۔ ڈائریکٹ نکاح۔ میں نے تو خیر
آتے جاتے انہیں دیکھ لیا تھا لیکن انہوں نے مجھے
نہیں دیکھا تھا۔ بات چیت کا تو کوئی تصور ہی نہیں تھا۔
کیونکہ یہ بالکل غیر تھے۔ ملاقات کا تو سوچنا ہی محال
تھا۔

س۔ شادی سے پہلے آپ کے سرال والوں کے
بارے میں کیا خیالات تھے؟ وہ ان خیالات پر پورا
اترے سب؟

ج۔ سرال کے نام پر ان کے گھر میں ان کی پہلی
بیوی تھی۔ ماں باپ وفات پا چکے تھے۔ بہن بھائی
سارے شادی شدہ تھے۔ اور ان سے بہت بڑے یہ
سب سے چھوٹے ہیں۔ ان کی پہلی بیوی ان سے عمر
میں 25 سال بڑی اور میں ان سے 20 سال چھوٹی۔
میں نے سوچا اتنی بڑی عمر کی عورت ہے۔ خدمت کر
کے اس کا دل جیت لوں گی۔ اور اتنی کم عمر بیوی پا کر یہ
بھی میرا خیال پر تھیں گے۔ لیکن قسمت کو شاید کچھ
آزمائش منظور تھی۔ اور حالات کچھ سے کچھ ہو گئے۔
س۔ شادی کے لیے آپ کو تعلیم کی قربانی دینا پڑی؟ یا
کوئی اور؟

ج۔ شادی کے لیے خیر تعلیم تو نہیں چھوڑنا پڑی بلکہ
ان کو پڑھائی کا شوق ہے۔ انہوں نے شادی کے بعد
مجھے بی۔ ایڈ اور ایم۔ اے کروایا علامہ اقبال اوپن
یونیورسٹی سے اور خود بھی دوبارہ پڑھائی شروع کر دی۔

البتہ تمام شوق، مشاغل کی قربانی دینی پڑی۔
س۔ شادی کی رسموں کے دوران لین دین کے
معاملے پر کوئی بد مزگی ہوئی؟
ج۔ نہیں شادی بخیر و خوبی انجام پا گئی۔ کوئی بد مزگی
نہیں ہوئی۔

س۔ شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کر کیا کہا؟
ج۔ خاص کچھ نہیں کہا۔ بس پہلی بیوی کی تعریفیں
کرتے رہے۔

س۔ شادی کے بعد آپ کی زندگی میں کیا تبدیلیاں
آئیں؟

ج۔ شادی کے بعد پوری کی پوری زندگی تبدیل
ہو گئی۔ میری عمر 22 سال ان کی 42 ان کی
پہلی بیوی کی عمر 65 سال۔ بڑی عمر کے دو لوگوں
میں میری زندگی پس کے رہ گئی۔ یہ نہ کرو وہ نہ کرو۔
ایسے نہ بیٹھو۔ میک اپ نہ کرو۔ فیشن ایبل کپڑے نہ
پہنو، غرض یہ کہ ہر چیز پر تنقید۔ وہ عورت ان کو سکھاتی
اور یہ اس کی باتوں پر من و عن عمل کرتے۔ بہت لمبی
داستان ہے۔ پوری لکھنے میں صفحے کے صفحے بھر جائیں،
شاید باتیں ختم نہ ہوں۔ اس عورت کو خطرہ اس کا بچہ
ہو جائے گا اس کی پوزیشن مضبوط ہو جائے گی اس نے
ان کو میرے خلاف بھرنا شروع کر دیا۔ اور یہ کان کے
کچے اس کی ہر بات مانتے۔ اس کے کہنے پر بڑھے لکھے
ہونے کے باوجود میری پٹائی کرتے۔ گالم گلوچ کرتے ہر
قسم کا طنز طعنہ دیتے۔ گھر میں بالکل ایسی حیثیت دے
دی جیسی نوکرانی کی ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ بیٹھتے
کھاتے پیتے اور ہر قسم کی ڈسکشن اسی کے ساتھ کرتے
تھے۔ مجھے بس کام کرنے والی مشین سمجھا جاتا تھا اور
کوئی حیثیت نہیں تھی۔ بہت مشکل وقت دیکھا ہے۔
جس کو بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ بس اتنا کہوں گی بہت
صبر کیا۔ اتنی کم عمری میں اپنی ہر خواہش۔ ہر پسند ناپسند
کو ختم کر دیا۔ ان کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیا۔
اور واقعی سچ کہتے ہیں ”صبر کا پھل میٹھا ہے“ واقعی اللہ
نے مجھے میرے صبر کا پھل دیا۔ اور آج میں سب کے
سامنے سرخرو ہوں۔

س۔ سسرال اور میکے کے ماحول میں کوئی فرق محسوس ہوا؟

ج۔ زمین آسمان کا فرق۔ ماں باپ کے گھر میں اپنی مرضی، آزادی نہ کوئی روک ٹوک۔ لیکن یہاں پر سسرال نہ ہونے کے باوجود صرف دو لوگوں نے جتنا حرام کر دیا۔ یہ اپنا کمپلیکس چھپانے کے لیے مجھ پر ظلم کرتے اور اس عورت کو خوش کرتے۔ میرے شوہر کا تعلق بالکل دیہات سے ہے۔ جہاں پر بڑھائی کا نام و نشان نہیں۔ جہالت شکوک و شبہات کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں، مرد عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں۔ ان کی تربیت، بچپن جوانی ایسے ماحول میں گزرا۔ یہ اپنی پہلی شادی کے وقت شہر تو آگئے تھے۔ لیکن عادتیں وہی کی وہی۔ ہریات پر شک کرتے تھے۔ ماں باپ کے گھر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کسی شادی غمی میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ لپ اسٹک لگانے کی اجازت نہیں تھی۔ کہ تمہارے میک اپ کرنے سے اس عورت کے دل پر کیا گزرے گی جس کی اولاد نہیں ہے۔ لہذا بنا سنورا نہ کرو۔ شادی کے دوسرے دن سے جو لپ اسٹک اتاری۔ آج لگاؤں گی۔ اب آزادی ہے لیکن لگانے کو دل نہیں کرتا۔ ہر خواہش ہی ختم ہو گئی ہے۔ بس اپنے بچوں کی اچھی قسمت کی دعا کرتی ہوں۔ اپنا جیسا بھی وقت تھا اچھا برا بس گزر گیا۔ پھر بھی اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔ خیر سے گزر گیا۔

س۔ سسرال میں کن باتوں پر تنقید ہوئی؟

ج۔ وہ عورت اور یہ خود ہریات پر تنقید کھانے سے لے کر سونے تک ہر کام میں۔ بس کبھی کبھار اپنے بشری تقاضوں سے مجبور ہو کر کبھی دو بول محبت کے چوری چھپے بول لیتے تھے۔ لیکن اس عورت سے پھسپ کے کیونکہ ہماری رہائش ایک ہی کمرے میں تھی۔ یہ کہتے تھے علیحدہ کمرے میں سو کر میں اس کی بددعا میں نہیں لینا چاہتا۔

شادی کے ساڑھے آٹھ سال ایک ہی کمرے میں گزارے اور وہیں پہ میرے چار بچے پیدا ہوئے۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ اب جا کے علیحدہ گھر لیا ہے۔

ساڑھے تین سال ہو گئے ہیں۔ علیحدہ گھر لیے ہوئے ہیں۔ اب اللہ کا شکر ہے میں علیحدہ گھر میں ہوں۔

س۔ شادی کے کتنے عرصہ بعد کام کاج سنبھالا؟

ج۔ شادی کے دوسرے دن سے۔ کوئی نئی دلہن کا ناز خور نہیں اٹھایا گیا۔ دونوں میاں بیوی نے کہا۔ بچے کے لیے تمہیں اس گھر میں لائے ہیں۔ ورنہ ہم نے تمہیں کیا کرنا تھا۔ یہ خود بھی کہتے تھے ہم نے تمہارا کیا کرنا ہے۔ ہمیں بچے کی ضرورت ہے۔

س۔ کیا میکے اور سسرال کے کھانے پکانے کے ذائقے اور انداز مختلف محسوس ہوئے؟

ج۔ ذائقے میں زمین آسمان کا فرق۔ ان کے گھر میں صرف روٹی، سالن اور کچھ بھی نہیں پکایا جاتا تھا۔ چولہے کا سارا کام اس عورت نے خود سنبھالا ہوا تھا۔ باقی ماسیوں والے سارے کام میرے ذمے تھے۔ اپنے لیے انداز تک بنانے کی اجازت نہیں تھی۔

س۔ سسرال والوں نے آپ کو وہ مقام دیا جو آپ کا حق تھا؟

ج۔ بالکل نہیں کوئی مقام نہیں ملا۔ جب شوہر نے ہی عزت نہیں کی۔ تو اور کیا عزت کرتے۔ وہ تو سو کن تھی۔ میرے شوہر کے بہن بھائی بھی اس کا ساتھ دیتے۔ کہتے تھے وہ تو پہلے سے ہے۔ تمہارے ساتھ ہمارا کیا واسطہ۔ میری سو کن بہت ہی چالاک عورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسی عورتوں کو ہدایت دے۔ کوئی ایسی بددعا نہیں ہے جو اس نے نہ دی ہو۔ بس صبر کرتی رہی کہ بچہ ہو جائے گا تو شاید کچھ حالات بہتر ہو جائیں۔

س۔ سسرال والوں سے وابستہ توقعات پوری ہوئیں؟

ج۔ جب میاں سے توقعات پوری نہیں ہوئیں تو اوروں نے کیا خیال کرنا تھا۔ ان کے شادی شدہ بہن بھائی جب بھی آتے ہمارا تماشا دیکھتے، میری باتیں اس کو کہتے اس کی باتیں مجھے۔ میرے منہ پر میرے اور میری سو کن کے منہ پر اس کے سارے تماشا دیکھنے والے تھے۔ کسی نے نہ ان کو سمجھایا اور نہ میری سو کن کو۔ میرے اوپر ہوئے ظلم کے قصے بڑے مزے

سے ایک دوسرے کو سناتے۔

س۔ بچوں کی پیدائش عورت کی زندگی میں ایک بڑا مقام بن کر آتی ہے خصوصاً ”یہلا بچہ“۔

ج۔ میری تو شادی ہی بچے کے لیے ہوئی تھی۔ لہذا بچے کی خواہش تو تھی۔ ان کی پہلی شادی کو سترہ سال ہو گئے تھے۔ اور میں شادی کے ایک سال دو ماہ کے بعد امید سے ہوئی۔ اصل آزمائش اب شروع ہوئی۔ اس عورت کو زیادہ حسد پیدا ہو گیا کہ اب اس کی جگہ میرا رتبہ برہ جائے گا مختلف طریقوں سے مجھے ازیت پہنچانے کی کوشش کرتی جو ناقابل بیان ہے۔ اگر بیان کروں تو بڑھنے والوں کے روٹنے کھڑے ہو جائیں۔ خیر خدا خدا کر کے نو مہینے گزرے اور اللہ نے بیٹا دیا۔ میرے شوہر دل میں تو خوش ہوئے لیکن ظاہر نہیں کیا۔ پورے مہینے ڈھول والے آتے رہے۔

اصل آزمائش اب تھی میرے شوہر نے چالیس دن مجھ سے بات نہ کی کہ پہلی بیوی کا دل دکھے گا نہ بچے کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ اب اس عورت نے نئی چال چلی۔ اسے ڈر تھا کہیں بیٹے کے بعد یہ شوہر کونہ لے جائے۔ اس نے شوہر سے کہنا شروع کر دیا یا اس سے بچہ چھین لو یا اس کو طلاق دے دو یا تیسری شادی کرلو۔ بس ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی اور شادی کروں گا تو حالات ٹھیک ہوں گے۔ بس بچے کی پیدائش کے بعد سے یہ تیسری شادی کی تیاریوں میں لگ گئے۔

میرے شوہر کی کوئی رشتہ دار تھی پہلے سے طلاق یافتہ اس کے گھر آنا جانا شروع کر دیا۔ ڈیڑھ سال اس کے گھر جاتے رہے۔ ان کا تعلق بالکل دیہات سے تھا۔ وہ تو خوش ہو گئے کہ طلاق یافتہ کو نوکری والا مل رہا ہے۔ پڑھا لکھا بھی ہے۔ یہ نہ دیکھا کہ پہلے سے دو بیویاں ہیں ایک بچہ ہے۔ جو اتنے عرصہ کے بعد پیدا ہوا ہے۔

بس جی وہ عورت ان کے پیچھے لگ گئی شادی کرو۔ اور یہ جناب روز گھر سے غائب ڈیڑھ سال انہوں نے اس لڑکی والوں کے گھر دن رات گزارا اور اپنے ایک

بڑے بھائی کو بھی ساتھ شامل کر لیا اس مہم میں۔ میری سوکن ان لوگوں کو یقین دلائی تمہاری بیٹی کو اور کون لے گا رشتہ دار ہے۔ زمین دار ہے پکی نوکری ہے۔ تمہاری بیٹی عیش کرے گی۔ میرا کہا کہ اس کو تو چھوڑ دے گا اور یہ خود بھی نہیں رہے گی جب شادی کا سنہ گی۔

ہر روز میرے سامنے گھر میں شادی کی باتیں ہوتیں۔ دونوں میاں بیوی آپس میں ڈمکمس کرتے۔ میں خاموشی سے سنتی رہتی۔ اپنے امی ابو کو بتاتی وہ کہتے۔

”بیٹا صبر کرو۔ عورت کا صرف ایک ہی گھر اچھا ہوتا ہے۔ شریف عورت گزارہ کرتی ہے۔ اللہ غیب سے تمہاری مدد کرے گا۔“

بس اللہ سے دعائیں مانگتی۔ بس بہت مشکل وقت تھا۔ چھبیس سال کی عمر میں ایسے لگتی جیسے چھیالیس سال کی ہوں۔

آخر کار میری سوکن کی کوششیں کامیاب ہوئیں۔ میری شادی کے ساڑھے تین سال کے بعد جب میرا بیٹا ایک سال دس ماہ کا تھا میرے شوہر نے وہیں لڑکی والوں کے گھر تیسری شادی کر لی۔ اور لڑکی کو اس کے ماں باپ کے گھر رکھا۔

مجھے جب پتا چلا بس کچھ نہ پوچھیں کہ قیامت آنا کسے کہتے ہیں اس وقت ہوش و حواس ساتھ چھوڑ گئے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ ماں بہنوں نے ساتھ دیا اور اللہ کا ساتھ تھا۔ بس اللہ نے ہمت دی۔ ابو نے کہا۔ ”بیٹا! گھر نہیں چھوڑنا تمہارا بیٹا ہے۔ کہاں جاؤ گی۔“

بس اللہ آزمائش میں ڈالتا ہے تو ہمت بھی دے دیتا ہے۔

خیر تیسری شادی کے بعد میرے شوہر کے رویے میں بہت فرق آگیا۔ بہت تبدیل ہو گئے اور میری اچھائیاں ان کو نظر آنے لگیں اور خیال کرنے لگے۔ پہلے تو کہتے تھے ”میری پہلی بیوی کا دل دکھے گا کیسے تمہارے ساتھ بیٹھوں باتیں کروں۔“

پھر جب انہوں نے دیکھا کہ تیسری والی کے ساتھ تو بولنے باتیں کرنے سے پہلی بیوی کا دل نہیں دکھتا، بددعا میں بھی نہیں دیتی۔ خوش ہوتی ہے بلکہ تیسری والی کو تو کہتی تھی۔ شوہر کو خوش رکھا کرو، میک اپ کیا کرو۔ پھر ان کی سمجھ میں آیا یہ تو سراسر اس کا حسد ہے، جلاپا ہے، بغض ہے جو اس کو بچے کی وجہ سے میرے ساتھ تھا۔ پھر ان کو کچھ سمجھ میں آیا۔ اب سب کے سامنے بیٹھ کر باتیں بھی کرتے تھے۔ اور کچھ خیال بھی کرتے تھے اور خرچہ وغیرہ بھی دیتے تھے۔

پہلے تو سب کچھ اس عورت کے ہاتھ میں تھا۔ کپڑے بھی وہی لے کر دیتی تھی۔ جب اس کا دل چاہتا۔ بچے کی چیزیں بھی وہی۔ یا پھر میری امی بہنیں ہی کرتی تھیں۔

اب پہلی والی کی یہ خواہش تھی کہ تیسری کو بچہ ہو اور شوہر مجھے چھوڑ دے لیکن شاید خدا کو کچھ اور منظور تھا۔ اللہ کو مجھ پر ترس آگیا اور مجھے آزمائش میں ثابت قدم رکھا اور میرے قدم نہیں ڈگمگائے۔ کچھ حوصلہ ملا شوہر کے اچھے سلوک کی وجہ سے۔

ان کی تیسری شادی کے بعد میں پھر امید سے ہو گئی۔ اور خیر سے دوسرا بیٹا ہو گیا۔ اور شوہر کا رویہ بہت اچھا تھا۔ ان کو پہلی بیوی کی سازش کا پتا چل گیا کہ یہ بچے والی کو نکالنا چاہتی ہے۔ اب یہ اس کا کہنا نہ مانتے اور میرا اور بچوں کا خیال رکھتے۔

اب ہم دو ایک ساتھ اور تیسری اپنے ماں باپ کے گھر۔ اس کو بھی خرچہ پانی دیتے اور باقاعدگی سے آتے جاتے۔ اور کبھی میری غیر موجودگی میں اس کو پہلی بیوی کے پاس لے آتے۔

پہلی والی اس کے ساتھ بڑی خوش تھیں۔ یہ حیران پریشان۔ یہ کیا ماجرا؟ جس کو اپنے ہاتھوں سے لے کر آئی اس کے ساتھ اتنی جلن اور اس کے ساتھ خوش۔ پھر ان کی سمجھ میں ساری بات آگئی۔ کہ اس کو بچے اور بچے کی ماں سے جلن ہے کہ یہ تو بچے کی وجہ سے ہر چیز کی مالک بن گئی ہے۔ اب میری بڑی سوکن نے تیسری والی کا بچے کے لیے علاج کرانا شروع کر دیا کہ اس کو بھی

بچہ ہو۔ شوہر سمجھ گئے کہ یہ بچوں کے ساتھ شراکت چاہتی ہے۔ ان کا رویہ میرے ساتھ کافی اچھا ہو گیا۔ اس دوران میری دو بیٹیاں بھی ہو گئیں۔ واقعی بیٹیاں خدا کی رحمت ہوتی ہیں۔ جب اپنی بیٹی ہوتی تو پرانی بیٹی کا بھی احساس ہوا۔ اور حالات کافی اچھے ہو گئے۔

میری بڑی سوکن اپنی چال میں خود پھنس گئی۔ مجھے تکلیف دینے کے لیے تیسری شادی کروائی تھی۔ خود مصیبت میں پھنس گئی۔ اب میرے شوہر اس کا کہنا نہ مانتے ایک کمرے کے گھر میں رہنا مشکل ہو گیا۔ پھر بچوں کے لیے میرے شوہر نے اکتوبر 2012 میں علیحدہ گھر لیا، گھر لینے کے بعد بڑی بیوی کی بھی منتیں کرتے رہتے کہ تم بھی چلو۔ لیکن اسے اپنے اعمال ڈراتے تھے۔ کہ جس کے ساتھ اتنا برا رویہ رکھا اب اس کے ساتھ کیسے چلوں۔

اب وہ ادھر پرانے گھر میں ہے۔ ہم ادھر علیحدہ گھر میں ہیں۔ اور جب تیسری والوں نے علیحدہ گھر کا سنا تو انہوں نے کہا ہم تو اسی انتظار میں تھے۔ اس کو چھوڑ دو گے اور ہماری بیٹی کو رکھو گے۔ اس کو تو علیحدہ گھر لے دیا ہے۔ چار بچے چھپی ہو گئے ہیں۔ اب ہماری بیٹی کو چھوڑ دو کیونکہ اس وقت تک میرے شوہر نے وہاں آنا جانا ذرا کم کر دیا تھا۔ ان کو شاید ضمیر کچھ کے لگتا ہو گا۔ اب ہم علیحدہ گھر میں ہیں۔

جنوری 2015 میں میرے شوہر نے تیسری والی کو طلاق دے دی کیونکہ اس کا بچہ نہیں ہوا تھا۔ اور اس کے ماں باپ اس کی کسی اور جگہ شادی کروانا چاہتے تھے۔ اور بڑی بیوی پہلے والے گھر میں ہے۔ میرے شوہر تو آتے جاتے رہتے ہیں پہلی والی کے پاس لیکن مستقل میرے اور بچوں کے پاس رہتے ہیں۔ میں اس عورت کے پاس ان ساڑھے تین سالوں میں کبھی نہیں گئی۔ جب وہ حالات سوچتی ہوں رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اب اپنی سوکن کے بارے میں سوچتی ہوں تو جی چاہتا ہے اس کو کبھی معاف نہ کر دلاں آپ مجھے بتائیں

ایسی عورت معاف کرنے کے قابل ہے؟
 واقعی سچ کہتے ہیں ”جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودے خود اس میں جاگرتا ہے“ میرے لیے مصیبتیں اکٹھی کرتی رہی خود اس میں پھنس گئی۔
 اب اس کی عمر پچھتر سال ہے۔ چل پھر نہیں سکتی
 واش روم تک بڑی مشکل سے جاتی ہے۔ لیکن طنطنہ ویسے ہی قائم ہے۔

سچ کہتے ہیں۔ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔ ماشاء اللہ سے گھر ہے۔ بچے ہیں۔ شوہر بھی کافی اچھے ہیں۔ شکر ہے اللہ نے مجھے اس آزمائش میں ثابت قدم رکھا۔ اگر کم عمری کی وجہ سے کوئی غلط فیصلہ ہو جاتا تو پتا نہیں میرے بچوں کا کیا بنتا۔

آپ سب سے گزارش ہے کہ میرے لیے اور میرے بچوں کے لیے خصوصی دعا فرمادیں اور ایک اور بات یہ کہنا چاہوں گی۔ کہ شادی کے بارہ سالہ عرصے میں جو حالات مجھ پر بیٹے اس کی وجہ سے میں ذہنی طور پر بالکل فارغ ہو گئی۔ نہ بچوں کے کام ہوتے تھے نہ گھر کے کام سارا دن بستر پر پڑی رہتی تھی۔ حالانکہ پڑھائی میں سارے بہن بھائیوں سے لائق فائق۔ باادب حاضر جواب بچی تھی۔

اب یہ حالت کہ ایک کام کرنے کے بعد دوسرا نہیں ہوتا تھا۔ ان حالات کی وجہ سے ذہن پر اثر پڑا۔ ذہنی و جسمانی صحت دونوں ختم چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ۔

ایک دن بھائی آیا۔ جب میری حالت دیکھی گھر جا کر کہا۔ ”بہن کے پاس جائیں۔ وہ تو پاگل ہوئی بیٹھی ہے۔“

کیونکہ میری شکل دیکھ کے اس کو اندازہ ہوا۔ پھر میں نے ملتان کے ایک اچھے سائیکائرسٹ سے اپنا علاج کروایا۔ اب طبیعت بہت بہتر ہے۔ ابھی علاج جاری ہے۔ ابھی بچوں کے امتحانات کے بعد دوبارہ ڈاکٹر کو دکھانا ہے۔ دعا کریں اللہ ہم سب پر رحم فرمائے۔

س۔ جوائنٹ فیملی سسٹم کو ترجیح دیتی ہیں یا؟

ج۔ جوائنٹ فیملی سسٹم سے اس حد تک اتفاق ہے کہ اگر آپس میں پیار، محبت، خلوص ہو پھر تو رشتوں کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ نہیں تو پھر علیحدہ رہنا ہی بہتر ہے۔
 اپنے حالات دیکھتے ہوئے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ قارئین بھی میرے نتائج سے یقیناً اتفاق کریں گے۔ (1) کبھی بھی بیوی کے ہوتے ہوئے شادی شدہ مرد کو اپنی کم عمر بیٹی کا رشتہ نہیں دینا چاہیے، میری تمام والدین سے التماس ہے۔ بہت مشکلات ہوتی ہیں۔ جس پر بیٹی ہے پتا اسی کو ہوتا ہے۔

(2) کبھی بھی اتنے ایج ڈیفرنس میں رشتہ نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیشہ عمر کا جوڑ دیکھنا چاہیے۔

(3) کبھی بھی دیہاتی بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھنے والے آدمی سے شری لڑکی کا رشتہ نہیں کرنا چاہیے۔ یہ صرف میرے تجربات ہیں۔ ضروری نہیں سب کے ساتھ ایسا ہو۔

اور تمام قاری بہنوں سے یہی کہوں گی کہ جیسے بھی حالات ہوں صرف اپنے اللہ پر چھوڑ دیں۔ اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ مشکلات سے نہ ڈریں اللہ تعالیٰ خود کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتا ہے۔ اگر آپ کی کوئی بہن یا رشتے دار ایسے حالات کا شکار ہو تو براہ مہربانی اس کا ساتھ دیں۔ ان تمام کرائسٹس میں میرے ماں باپ بہن بھائیوں نے ساتھ دیا تب میں نے یہ امتحان پاس کیا ہے ورنہ ہو سکتا ہے شاید میری ہمت جواب دی جاتی۔ رشتوں کا خیال کریں، بہن بھائی بہت قیمتی چیز ہیں۔

آخر میں آپ سے یہ کہنا ہے کہ میرے شوہر کا رویہ اب میرے ساتھ بہت اچھا ہے۔ کبھی دل چاہتا ہے پچھلے رویے پر ان کو کبھی معاف نہ کروں اور کبھی دل کرتا ہے اللہ معاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ آپ مجھے مشورہ دیں کیا کروں۔ میری ان تمام بہنوں سے گزارش ہے جن کی اولاد نہیں ہے اگر ان کے شوہر دوسری شادی کریں بچوں کے لیے تو پلیر صبر کریں۔ یہ سب اللہ کے فیصلے ہیں جس کو چاہے اولاد دے جس کو چاہے نہ دے۔

Downloaded From
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

بندھن
عائزہ خان ہمارے دلکش تیمور

شامین رشید

”کیوں نہیں آیا! آپ کو ہی دوں گا۔“
مگر نہیں جی۔۔۔ یہ بڑے اشار ہیں۔ پوری دنیا میں
پہچانے جاتے ہیں۔ قلم نی وی کے جگمگاتے ستارے
ہیں۔۔۔ ان کے پاس اتنا ٹائم کہاں ہوتا ہے۔ ملنا تو دور کی
بات رہی، فون پر بات کرنے کا بھی ٹائم نہیں ہوتا۔ خیر
دعا ہے کہ خوش رہیں۔ (آمین)
انٹرویو تو ہو گیا، مگر طویل نہیں، جیسے خواہش تھی
ویسا نہیں ہوا۔ تھوڑے کو بھی بہت جانیمے گا اور یہ
انٹرویو بھی قارئین بہنوں کی بے حد فرمائش پر کیا ہے۔
”کیسی ہیں عائزہ آپ اور حورین؟“
”جی۔ اللہ کا شکر ہے۔“
”بی بی اللہ کی رحمت اور بیٹے اللہ کی نعمت ہوتے

عائزہ خان اور دانش تیمور کی شادی کیا ہوئی۔
فرمائشوں کا تانتا بندھ گیا۔۔۔ ہمارے قارئین بھی کتنے
معصوم ہوتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ ہم فرمائش کریں گے
اور وہ جھٹ پٹ پوری ہو جائے گی اور فرمائش پوری نہ
ہو تو ناراضی الگ۔۔۔ پیارے قارئین، بے شک اس
کام میں ہم نے ایک عمر گنوا دی ہے، مگر آج بھی ہمیں
مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں
جتنا آپ سمجھتے ہیں۔

8 اگست 2014ء کو عائزہ اور دانش کی
شادی ہوئی، ہم نے مبارک باد کے لیے فون کیا اور کہا
کہ ”بندھن“ کے لیے سب سے پہلا انٹرویو مجھے
دینا۔ ”بڑے اخلاق سے دانش نے کہا۔

ہیں۔ آپ کی کیا خواہش تھی؟“
 ”میری خواہش تھی کہ چاہے بیٹا ہو یا بیٹی، صحت و
 تندرستی والا بچہ ہو اور سب سے بڑھ کر تو یہ کہ اللہ نے
 ہمیں صاحب اولاد کر دیا تھا۔ اس سے بڑھ کر اور خوشی
 کی بات کیا ہو سکتی ہے۔ اولاد میں یہ دونوں ”میوے“
 مجھے پسند ہیں۔“

”کہتے ہیں کہ چونکہ ”بیٹی رحمت“ ہے تو اپنے
 ساتھ بہت سی رحمتیں لے کر آتی ہے۔ ”حورین“

کے آنے سے زندگی میں کیا رنگینی آئی؟“

”دانش جیسا اچھا شوہر مل جانا ہی بہت بڑی خوش
 قسمتی تھی تو زندگی تو پہلے ہی حسین تھی۔ ”حورین“
 کے آنے سے ”حسین تر“ ہو گئی اور آپ کو بتاؤں کہ
 ”حورین“ ہمارے لیے بہت لکی ثابت ہوئی کہ جب یہ
 پیدا ہوئی تو دانش کی فلم ”رائنگ نمبر“ ریلیز ہوئی جس
 نے بہت کامیابی بھی حاصل کی۔“

”بیٹی کے حوالے سے لوگ آپ سے کیا سوال
 کرتے ہیں؟ مطلب اس کے فیوچر کے حوالے
 سے؟ کوئی رائے؟ کوئی مشورہ؟“

”رائے“ مشورے تو لوگ بہت دیتے ہیں، مگر ہو گا تو
 وہ ہی جو اس کے نصیب میں ہو گا۔ ہم اور آپ کون
 ہوتے ہیں نصیبوں کے آگے بولنے والے بس جو بھی
 ہو، اچھا ہو اور ہماری بیٹی بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور
 نصیبوں والی ہو۔“

”مجھے یاد ہے کہ آپ نے کہا تھا کہ میں نے تو سوچا
 بھی نہیں تھا کہ اس فیلڈ میں آؤں گی۔“

”بالکل جی۔۔۔ نہ میں نے نہ میرے گھر والوں نے
 اور دیکھ لیں نہ صرف اس فیلڈ میں آئی بلکہ اس فیلڈ
 کے بندے سے شادی بھی ہوئی تو یہ سب قسمت اور
 نصیب کی بات ہے۔“

”آپ خوش ہیں اپنی لائف میں؟“

”الحمد للہ۔ بہت خوش ہوں اور اللہ میری بیٹی کا
 نصیب بھی ایسا کرے کہ وہ ہمیشہ خوش رہے۔
 (آمین)۔“

”عموماً“ خواتین فنکارائیں اپنے کیریئر کے عروج
 میں شادی نہیں کرتیں، مگر آپ نے اپنے عروج میں
 شادی کی جلدی کی؟ یا اچھا کیا کہ کر لی؟“

”میں نے اچھا کیا۔۔۔ کیونکہ لڑکی کا اصل گھر تو اس
 کے شوہر کا گھر ہوتا ہے۔ وقت پر شادی ہو جائے تو اس
 سے اچھی بات ہی کیا ہے اور میں کون سا اپنے گھر کی
 کفالت کر رہی تھی۔ شوقیہ کام کر رہی تھی اور شادی
 کر کے مجھے بالکل بھی پچھتاوا نہیں ہے بلکہ میں تو اپنی
 زندگی میں اپنے شوہر اور اپنی بیٹی کے ساتھ بہت خوش

ہوں بلکہ میں تو کہوں گی کہ میں تو شادی کے بعد اس
 فیلڈ میں زیادہ باعزت ہو گئی ہوں۔“

”ہوں۔۔۔ گنٹے دو سال کے بعد آپ اس فیلڈ میں
 واپس آئی ہیں۔۔۔ کیسا لگ رہا ہے؟“

”بہت اچھا۔ اور جو گیپ رہا، وہ بھی سب کو معلوم
 ہے، یہ تو ایک خوب صورت گیپ تھا۔ 8 اگست

2014ء کو ماشاء اللہ ہماری شادی ہوئی اور
 13 جولائی 2015ء کو ہماری بیٹی ”حورین“

پیدا ہوئی اور اب 2016ء ہے۔ بیٹی تو ابھی بہت
 چھوٹی ہے، لیکن لوگوں کی محبتیں دوبارہ اس فیلڈ میں

کھینچ لاتی ہیں۔ ہماری بیٹی تو ہمارے لیے پہلے سے بھی
 زیادہ محبتیں، خوشیاں اور کامیابیاں لے کر آئی ہے۔“

”لوگوں کی محبتیں اس فیلڈ میں کھینچ لائیں،
 رسپانس کیسے ملا؟“

”رسپانس تو ایسا ملا کہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔۔۔
 مجھے اندازہ نہیں تھا کہ لوگ مجھ سے اور دانش سے اتنی

محبت کرتے ہیں جو عزت و احترام، ہمیں شادی کے بعد
 ملا، اس کا تو ہم نے بھی اتنا نہیں سوچا تھا۔ میں نے کہنا

کہ شادی نے ہماری عزت و احترام میں اضافہ ہی کیا
 ہے اور جتنا پیار لوگ ہم سے کرتے ہیں اس سے

کہیں زیادہ پیار ہماری بیٹی سے کرتے ہیں۔“
 ”شادی دھوم دھام سے ہوئی؟“

”جی بالکل۔ بہت دھوم دھام سے ہوئی اور یہ بات
 تو آپ سب کو پتا ہے۔ کتنی دھوم دھام سے ہوئی تھی

”ماشاء اللہ۔“

”شادی پسند سے ہونی چاہیے اور کیا کیفیت تھی رخصتی کے وقت؟“

”میرے خیال میں اگر آپ کسی کو پسند کرتے ہیں تو اپنے والدین کو بتادیں۔ پھر ان کا کام ہے کہ وہ دیکھیں کہ بیٹی یا بیٹے کی پسند کیسی ہے چونکہ والدین نے دنیا دیکھی ہوئی ہے اس لیے وہ جو فیصلہ کریں گے وہ آپ کے حق میں بہتر ہوگا اور رخصتی کے وقت وہی کیفیت تھی جو ایک بیٹی کی ہوتی ہے اپنا میکہ چھوڑتے وقت۔“

”شادی سے پہلے منگیتر کے ساتھ گھومنے پھرنے کا مزہ ہے یا شادی کے بعد؟“

”میرے خیال میں گھومنے پھرنے کا مزہ شادی کے بعد ہی ہے۔ پتا نہیں کیوں لوگ کہتے ہیں کہ پہلے مزہ آتا ہے مگر مجھے تو شادی کے بعد ہی دانش کے ساتھ گھومنا اچھا لگا۔“

”اب جبکہ آپ اس فیلڈ میں دوبارہ آگئی ہیں تو چھوٹی بچی کی وجہ سے آپ کو مشکل تو پیش آئے گی؟“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ ہماری جوائنٹ فیملی ہے اور امی ابو سنبھال لیتے ہیں۔ مجھے ویسے بھی کبھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔“

”دانش سنبھالتے ہیں۔؟“

”جی جی۔۔۔ بہت۔۔۔ رات کو اکثر اٹھ جاتی ہے تو میری گود سے زیادہ دانش کی گود میں چپ ہو جاتی ہے۔۔۔ میں دودھ بنا رہی ہوں تو دانش ہی سنبھالتے ہیں اور حورین کے کاموں میں میری بہت مدد کرتے ہیں۔ کہیں جانا ہو اور میں تیار ہو رہی ہوں تب بھی دانش بیٹی کو سنبھال لیتے ہیں۔“

”حورین کی کبھی خدا نخواستہ طبیعت خراب ہو تو زیادہ پریشان کون ہوتا ہے۔“

”ہم دونوں۔۔۔ بلکہ پورا گھر ہی پریشان ہو جاتا ہے اور ایسے موقع پر بھی دانش بہت خیال رکھتے ہیں حورین کا۔ کیونکہ طبیعت خراب میں حورین بہت تنگ کرتی ہے۔“

”شاپنگ کے لیے ساتھ جاتے ہیں؟“

”جی بالکل۔۔۔ شاپنگ کا تو بہت شوق ہے جبکہ دانش تھوڑا گھبراتے ہیں۔۔۔ شروع شروع میں تو میں کچھ عرصہ شاپنگ کے لیے نہیں گئی کہ ابھی اتنا کچھ بنایا ہے لیکن خیر۔۔۔ شاپنگ سے کب دل بھرتا ہے میرا۔۔۔“

”دانش کا کون سا کام کرنا سب سے زیادہ مشکل لگتا ہے آپ کو۔۔۔؟“

”میں دانش کے سب کام خوشی خوشی کر لیتی ہوں، مگر مجھے استری کرنا سب سے زیادہ مشکل کام لگتا ہے۔“

”مگر پھر بھی کر لیتی ہوں۔“

”آپ دونوں ماشاء اللہ کماتے ہیں۔۔۔ تو آپ بھی خرچ کرتی ہیں۔۔۔ یا سب کچھ دانش کے ذمے ہے۔“

”دانش کا تو سب کچھ میرا ہے، مطلب سب ہی خرچ کرتے ہیں اور میری کمائی۔۔۔ چلیں۔ کوئی اور بات کریں۔“ منستے ہوئے۔

”بڑے بزرگ کہتے تھے کہ بیوی شوہر کی جیب میں بے جھجک ہاتھ ڈال کر پیسے نکال لیتی ہے کیونکہ اس کا حق ہوتا ہے۔ تو آپ بھی جیب یا والٹ خالی کرتی ہیں۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ کبھی ایسا نہیں کرتی اور نہ ہی کر سکتی ہوں۔ مجھے جب ضرورت ہوتی ہے تو ان سے پوچھ کر ان کے والٹ سے پیسے نکالتی ہوں۔ کبھی ان کی اجازت کے بغیر پیسے نہیں نکالتی۔“

”شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلی آئی۔۔۔ گھر کو سجانے سنوارنے اور گھرواری کا کتنا شوق ہے؟“

”شادی کے بعد مجھ میں بہت زیادہ خود اعتمادی آگئی ہے، بے شک میں خود اعتماد تو پہلے بھی تھی مگر اب اور بھی زیادہ ہو گئی ہوں۔ اور گھر کو سجانے سنوارنے کا مجھے بہت شوق ہے اور کھانا پکانے کا بھی شوق ہے۔ اگرچہ گھر میں شیف ہے لیکن کبھی کبھار پھر بھی پکین میں چلی جاتی ہوں۔“

”پکانے کا شوق ہے اور کھانے کا؟“

”جی۔۔۔ جی کھانے کا بھی بہت شوق ہے۔۔۔ لذیذ اور حیدر آبادی کھانے تو میری کمزوری ہیں۔۔۔ ضرور کھاتی ہوں۔“

دانش تیمور

”کیا حال ہیں دانش۔۔۔ آپ بتائیں کہ شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلی آئی؟“

”اللہ کا شکر ہے۔۔۔ اور شادی کے بعد زندگی میں یہ تبدیلی آئی کہ زندگی گزارنے کا نہیں بلکہ جینے کا مزہ آنے لگا ہے اور پھر بیٹی کے آجانے سے تو زندگی اور بھی زیادہ حسین ہو گئی ہے۔“

”منہ دکھائی میں کیا دیا تھا اور ہنی مون کے لیے کہاں گئے تھے؟“

”منہ دکھائی میں کیا دیا؟“ تو جس کو دیا یہ اس کے اور میرے بیچ کی باتیں ہیں۔ پبلک میں نہیں لانا چاہتا اور جہاں تک ہنی مون کا تعلق ہے تو وہ ”تھائی لینڈ“ گئے تھے ہم۔“

”عائزہ آپ کے لیے کھانا پکاتی ہے؟“ یا باہر کے کھانے پسند ہیں؟“

”کھانا میرا کک بناتا ہے۔ عائزہ کچن میں کم جاتی ہے۔ لیکن جب بھی اور جو کچھ بھی بناتی ہے لاجواب بناتی ہے۔ باہر کے کھانے تو جب بھی موڈ ہو آؤٹنگ کا تب کھاتے ہیں۔“

”آپ چاہیں گے کہ عائزہ آپ کے ساتھ فلم میں کام کرے؟“

”ہاں۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔ کوئی اچھا اسکرپٹ آیا تو ہم دونوں ایک ساتھ ضرور کام کریں گے۔“

”جوائنٹ فیملی سسٹم ہے آپ کا۔۔۔ اور آپ کو پسند ہے یہ سسٹم؟“

”جی بالکل جوائنٹ فیملی سسٹم ہے اور مجھے پسند بھی ہے۔ ہماری فیملی میں میرے والدین، میرا چھوٹا بھائی اور ہم دونوں ہوتے ہیں۔“

”بیٹی کو اور عائزہ کو اپنی مصروفیات میں سے کتنا ٹائم دیتے ہیں۔“

”کو شش کرتا ہوں کہ جتنا فری ٹائم ہو۔ بیٹی اور بیگم کے ساتھ ہی گزاروں۔“

”آپ چاہیں گے کہ عائزہ دوبارہ ڈراموں میں کام کرے؟ ماڈلنگ میں تو ہم دیکھ ہی رہے ہیں۔“

”بالکل۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔ اللہ نے اسے بہت ٹیلنٹ دیا ہے۔۔۔ اور پھر اداکاری کا اسے شوق بھی ہے۔ اور وہ آج کل ”یاسر نواز“ کے سیریل میں کام کر رہی ہیں۔ اور ہاں ماڈلنگ کے لیے بھی اچھی آفر آگئی تو کر لی اور آئندہ بھی اچھی آفر آئی تو ضرور کریں گے۔“

”عائزہ کی کس بات سے متاثر ہو کر شادی کا فیصلہ کیا تھا؟“

”عائزہ میں کوئی ایک خوبی نہیں ہے کہ جس سے میں متاثر ہوا۔ اس میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ سب سے زیادہ اچھی بات تو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سچ بولتی ہے اور بہت حقیقت پسند ہے۔“

”عائزہ آپ کو گیٹ تک خدا حافظ کہنے آتی ہے یا کمرے سے باہر بائے کر دیتی ہے؟“

”میں کہیں بھی جاؤں۔ خواہ کام کے سلسلے میں یا جم، عائزہ مجھے گیٹ تک چھوڑنے آتی ہے۔ پہلے وہ اکیلی آتی تھی۔ اب ہماری بیٹی بھی ساتھ ہوتی ہے۔“

”گیٹ پہ سوال جواب ہوتے ہیں کہ کب آئیں گے؟“

”جی بالکل۔۔۔ ضرور پوچھتی ہے کہ کب آئیں گے اور جلدی فاسرغ ہو جائیں تو جلدی آجائے گا۔“

”عائزہ آپ کو بچی بنی اچھی لگتی ہیں یا سادگی میں؟“

”مجھے عائزہ بغیر میک اپ کے سادگی میں بہت اچھی لگتی ہے۔ مجھے زیادہ میک اپ پسند نہیں۔“

”غصے میں عائزہ کارڈ عمل؟“ توڑ پھوڑ یا کچھ اور؟“

”نہ توڑ پھوڑ۔۔۔ نہ چیخنا چلانا۔۔۔ بس روہا سی ہو جاتی ہے۔ عائزہ ایک بہت اچھی بیوی ہے۔“

”اور اس کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو ختم کیا۔“

ہوں۔ اور ”اے اینڈی“ کے پروجیکٹس کے علاوہ
جیو کے کچھ پروجیکٹس بھی کر رہی ہوں۔“
”واہ۔ بس تو آپ کا کوئی ڈراما آن ایئر ہو گا تو مزید
ایک انٹرویو دیو ہے آپ پر۔“
”بالکل ڈن ہے۔ اور نہ صرف میں اداکاری کی
طرف لوٹ آئی ہوں بلکہ اب عنقریب مجھے ایک شو
میں بہ حیثیت ہوسٹ کے بھی دیکھیں گی۔“
”اچھا!۔۔۔ گڈ۔۔۔ ویسے حسبِ حال کو مس تو کرتی
ہوں گی۔۔۔“

”کیوں نہیں۔۔۔ آخر سات سال یہ پروگرام کیا ہے
اور بڑی کامیابی کے ساتھ کیا ہے؟“
”بالکل۔ کراچی میں مزا آرہا ہے؟ اور کراچی شفٹ
ہونے کا خیال کیوں آیا؟“ ”اس لیے کہ ڈراموں کا
اور شوز وغیرہ کا زیادہ کام ہو ہی کراچی میں رہا ہے اور
پھر آپ کو پتا ہے کہ مجھے آفرز بھی آتی رہتی تھیں۔ تو
سوچا کہ جب ”حسبِ حال“ نہیں تو پھر اداکاری ہی
سہی۔“

”ہاں۔۔۔ کیونکہ شروعات تو آپ نے ڈراموں سے
ہی کی تھی؟ ایسا ہی ہے نا۔“
”جی بالکل ایسا ہی ہے۔ مگر ”حسبِ حال“ کی وجہ

سے تھوڑا سا وقفہ آگیا تھا۔“
”تھوڑا نہیں کافی لمبا وقفہ آگیا تھا۔“
”ہنستے ہوئے۔۔۔ جی۔۔۔ اب انتظار ختم ہو گیا
ہے۔“

”چلیں جی۔۔۔ ان شاء اللہ پھر بات ہوگی۔“

نیلیم منیر

”کیا حال ہیں؟“



ناجیہ بیگ

”کیا حال ہیں جی؟“
”اللہ کا شکر ہے۔“
”کہاں غائب ہیں؟“ ”حسبِ حال“ میں نظر
نہیں آرہیں خیریت ہے نا۔۔۔“
”جی بالکل خیریت ہے۔ اور میں کراچی شفٹ
ہو گئی ہوں اور حسبِ حال چھوڑ دیا ہے۔“
”کیوں چھوڑا۔۔۔؟ کوئی لڑائی شڑائی؟“
”ارے نہیں۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ چونکہ حسبِ
حال کا فارمیٹ تبدیل ہو گیا تھا اور میرا اب کوئی کام
نہیں تھا۔ تو میں کراچی شفٹ ہو گئی۔“
”اچھا۔۔۔ گڈ۔۔۔ کراچی میں کیا مصروفیات ہیں؟“
”آپ کو اور آپ کی طرح دیگر چاہنے والوں کو سن
کر بہت خوشی ہوگی کہ میں اداکاری کی طرف لوٹ آئی



”اللہ کا شکر ہے۔“
 ”کبھی عام ریافت کے ساتھ، کبھی پروگرام میں
 مہمان۔ اور پھر ڈرامے، بہت مصروف رہتی ہیں
 آپ؟“
 ”جی اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے مصروف رکھا ہوا
 ہے۔ بے کار بیٹھنا تو مجھے ویسے بھی پسند نہیں ہے۔“
 ”جدوجہد میں زندگی گزری؟“
 ”جی۔۔۔ بہت زیادہ۔ ہماری کم عمری میں والد
 صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔ والدہ نے ہی جدوجہد کر
 کے ہماری تربیت کی، ہمیں لکھایا پڑھایا تو بچپن سے ہی
 سوچ لیا تھا کہ کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔“
 ”کیا آپ دیگر بہن بھائیوں میں بڑی ہیں؟۔۔۔ اور
 پھر کس طرح جدوجہد کا آغاز کیا؟“

”جی، ہم چار بہنیں ہیں اور میرا نمبر تیسرا ہے۔ اور
 مجھے یاد ہے کہ جب میں نویں کلاس میں تھی تو مجھے
 ایک کمرشل کی آفر آگئی جسے میں نے فوری طور پر قبول
 کر لیا۔ بس تب سے اب تک کام کر رہی ہوں۔“
 ”آپ پٹھان فیملی سے ہیں تو کیا کسی نے اعتراض
 نہیں کیا، جبکہ آپ کے سرپر والد کا سایہ بھی نہیں
 تھا؟“
 ”جی۔۔۔ جب اللہ ساتھ ہو تو پھر سب کے دل بھی
 نرم ہو جاتے ہیں۔ اور بجائے اعتراض کرنے کے
 سب نے خوشی کا اظہار کیا۔ جو میرے لیے باعث
 اطمینان تھا۔ ہاں۔۔۔ مجھے یہ ضرور کہا گیا تھا کہ ایسا کوئی
 کام نہ کرنا جس کی وجہ سے ہمیں شرمندگی ہو۔“
 ”پھر تو فلم کے لیے آپ کام نہیں کریں گی۔ جبکہ
 آپ کے چاہنے والے آپ کو فلم میں بھی دیکھنا چاہیں
 گے۔“

”جی۔۔۔ میں فلم میں کام کر رہی ہوں اور اپنی حدود
 میں رہ کر۔ مجھے بہت پہلے سے فلمز کی آفرز آرہی
 تھیں۔ لیکن میں ایک اچھی فلم کی تلاش میں تھی جو
 کہ الحمد للہ مجھے مل گئی ہے۔ مجھے پاکستانی ڈائریکٹرز
 نے اور بالی ووڈ کے ڈائریکٹرز نے بھی آفرز دیں مگر میں
 ”جی۔۔۔ میں فلم میں کام کر رہی ہوں اور اپنی حدود
 میں رہ کر۔ مجھے بہت پہلے سے فلمز کی آفرز آرہی
 تھیں۔ لیکن میں ایک اچھی فلم کی تلاش میں تھی جو
 کہ الحمد للہ مجھے مل گئی ہے۔ مجھے پاکستانی ڈائریکٹرز
 نے اور بالی ووڈ کے ڈائریکٹرز نے بھی آفرز دیں مگر میں

”اور اب یہی آپ کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اور آمد
 بہ آسانی ہوئی یا پھر کچھ مشکلات بھی ہوئیں؟“
 ”جی اداکاری ہی اوڑھنا بچھونا ہے اور بے شک آمد
 آسانی ہوئی مگر راتوں رات شہرت والا کام نہیں ہوا۔
 جگہ بنانے کے لیے محنت کرنا پڑی اور اللہ کا شکر ہے کہ
 اس نے محنت کا صلہ دیا مجھے۔“
 ”فلم کے بارے میں تھوڑا بتائیں؟“
 ”جی۔۔۔ محسن علی کی ڈائریکشن میں کام کر رہی
 ہوں۔ بہت اچھی کہانی ہے۔ اور ان شاء اللہ بقرعید پر
 ریلیز ہوگی۔ فلم کا نام ”چھپن چھپائی“ ہے۔ اور میرے
 ساتھ احسن خان لیڈر رول کر رہے ہیں۔ دیگر

والدہ ہی کرتی ہیں اور لباس میں وہ مشرقی لباس کی ہی شاپنگ کرتی ہیں کیونکہ مجھے مشرقی لباس ہی پسند ہے۔

”گھر جلدی آجاتی ہیں؟“

”جی میری کوشش ہوتی ہے کہ گھر جلدی آجاؤں۔۔۔ کیونکہ مجھے خود بھی دیر تک گھر سے باہر رہنا پسند نہیں ہے۔۔۔ اور میرے ڈائریکٹرز اور پروڈیوسرز کو معلوم ہے کہ ٹیلیم کو جلدی گھر جانا ہوتا ہے۔“

”انتا کام کر کے مزاج خوش باش ہو یا غصہ پہلے سے زیادہ تیز ہوا؟“

”نہیں نہیں۔۔۔ کام کے لیے مزاج کو خوشگوار ہی رکھنا پڑتا ہے ورنہ کام میں انصاف نہیں ہو سکتا۔۔۔ غصہ تیز ہی ہے مگر اچھی بات ہے کہ جلدی اتر بھی جاتا ہے۔“

عینی جعفری

”کیا حال ہیں جی۔۔۔ کہاں غائب ہیں؟“

”اللہ کا شکر ہے۔۔۔ اور کیا مطلب غائب سے؟“

”مطلب یہ کہ آج کل اسکرین پر نظر نہیں آ رہیں۔“

”اوہ۔۔۔ (تمہمہ)۔۔۔ آپ کو پتا تو ہے کہ شادی کے بعد لندن سیٹل ہو گئی ہوں۔“

”تو کیا اداکاری کو خیر یاد کہہ دیا؟“

”ارے نہیں۔۔۔ میں ان شاء اللہ بہت جلد بڑی اور

چھوٹی اسکرین پہ آپ کو نظر آؤں گی۔۔۔ بڑی اسکرین پہ تو ”خالد عثمان بٹ“ کے ساتھ لیڈرول کر رہی ہوں۔ فلم کا نام ”بالوماہی“ ہے۔“

”اس سے پہلے آپ نے ”میں ہوں شاہد آفریدی“ فلم میں بھی تو کام کیا تھا؟“

”اس فلم میں میرا لیڈرول نہیں تھا۔۔۔ کیونکہ اس کی اسٹوری کرکٹ پر مبنی تھی۔۔۔ اس میں میرا کردار

فنکاروں میں ”ریحان شیخ“ ”فیضان خواجہ“ اور طلعت حسین صاحب شامل ہیں۔“

”اپنے پسندیدہ ڈرامے بتائیں؟“

”مجھے اپنے سارے ہی ڈرامے اچھے لگتے ہیں، کیونکہ میں بہت سوچ سمجھ کر کردار لیتی ہوں۔ مگر پھر بھی اپنا پہلا ڈراما ”تھوڑا سا آسمان“ ”جل پری قید تنہائی“ اشک“ زیادہ پسند ہیں۔۔۔ اور آئندہ کے لیے

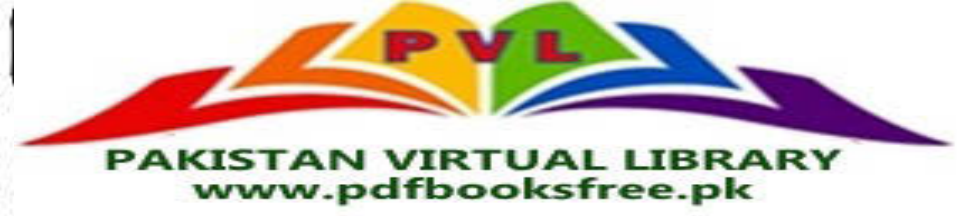
میری خواہش ہے کہ میں بہتر سے بہترین رولز کی طرف جاؤں۔“

”اداکاری میں کس کی تقلید کرتی ہیں؟“

”فالو میں کسی کو نہیں کرتی، مگر پسند بہت سے لوگوں کو کرتی ہوں۔ اپنے سینئرز سے بہت کچھ سیکھتی ہوں۔ جیسے ہمایوں سعید، فیصل قریشی، عدنان صدیقی ہیں اور ثانیہ سعید ہیں۔“

”ماشاء اللہ اتنی شہرت ہے آپ کی۔۔۔ تو پاکستان میں تو شاپنگ مشکل سے ہی ہوتی ہوگی؟“

”جی بالکل۔۔۔ اسی لیے میری ساری شاپنگ میری



ماہنامہ رکن

اپریل 2016 کا شمارہ شائع ہو گیا

- ✽ "کھولے پنکھ یادوں نے" مصطفیٰ سے سروے،
- ✽ اداکار "آفاق وحید قریشی" سے شاہین رشیدی ملاقات،
- ✽ "آواز کی دنیا سے" اس ماہ مہمان ہیں "عاصمہ حسین"
- ✽ اداکارہ "زرش خان" کہتے ہیں "میری بھی سنیے"
- ✽ اس ماہ "حورالعین اقبال" کے "مقابل ہے آئینہ"
- ✽ "من مورکھ کی بات نہ مانو" آسیہ مرزا کا
- نیا سلسلہ دارناول،

- ✽ "راہنزل" تنزیلہ ریاض کا سلسلہ دارناول،
- ✽ "دل ٹوٹ کے ہارا تھا" نایاب جیلانی کا مکمل ناول
- اختتام کی طرف،
- ✽ "جو لکھا تھا میرے نصیب میں" ایلا کرن علی
- کا مکمل ناول،

- ✽ "دل آباد کریں" نازیہ جمال کا مکمل ناول،
- ✽ "شاید" فائزہ انصاری کا دلکش ناول،
- ✽ "میرے بدگمان" ام ایمان قاضی کا ناول،
- ✽ نظیر فاطمہ، عابدہ احمد، بنت سحر اور سحرش فاطمہ
- کے افسانے اور مستقل سلسلے

ان شمارے کے ساتھ کون کتاب

"بہار، رنگ اور خوشبو"

کرن کے شمارے کے ساتھ جامعہ سے منسلک خدمت ہے

زیادہ نہیں تھا۔ لیکن اب جو قلم کر رہی ہوں۔ اس میں میں نے بتایا آپ کو کہ لیڈ رول کر رہی ہوں۔" "لیڈ رول تو ہے۔ مگر کیا لو اسٹوری ٹائپ ہے؟" "قلم تو ہوتی ہی لو اسٹوری ٹائپ ہے۔ اور اس میں میرا کردار آج کی مضبوط عورت کا کردار ہے۔ اور بہت اچھا ہے۔"

"اس فیلڈ میں وہی "ان" ہوتا ہے جو نظروں کے سامنے ہوتا ہے۔ لندن جانے سے کیریئر متاثر تو ہوا ہو گا؟"

"جی بالکل ہوا۔ مگر ازدواجی زندگی بھی بہت اہم ہے لڑکی کے لیے۔ خیر۔ اب میں دوبارہ فیلڈ میں آگئی ہوں۔"

"اداکاری اور ماڈلنگ کو ساتھ ساتھ رکھیں گی کیا؟"

"پتا نہیں کیا بات ہے کہ میں ایک وقت میں کئی کئی کام نہیں کر سکتی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ایک وقت میں ایک کام کروں مگر جم کر کروں۔ میں خود کو اداکاری تک ہی محدود رکھنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ اداکاری میرا جنون ہے۔ اور مجھے مزہ بھی اداکاری میں ہی آتا ہے۔"

"اپنے آپ کو فٹ کس طرح رکھتی ہیں کہ ایور گرین رہیں؟"

"ہنستے ہوئے۔۔۔" اچھی خوراک اور بہت سارا پانی میری فٹنس کا راز ہے۔ ورزش بھی کرتی ہوں۔ بس یہی ہے میری صحت فٹنس اور خوب صورتی کا راز۔

"فیشن سے لگاؤ؟"

"ہے۔ مگر بہت زیادہ نہیں۔ سادگی پسند ہوں۔ سادگی میں زیادہ حسن ہے۔"

"چلیں جی۔ آپ کا نیا ڈراما آئے گا تو پھر بات کریں گے۔"



Downloaded From

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

www.pdfbooksfree.pk

شادی مبارک ہو

عمر خلیل ہمارے حرا عمر
آسیہ رزاقی

لاڈلا۔ سب سے چھوٹا۔ بھائی بہنوں کا محتاج۔ من من
چن چن۔ مارے لاڈ کے بہن بھائی ان کو بابے پکارتے
تھے۔ اب بھی، لیکن اب بھانجیاں بھی ہیں۔ جن کے
وہ انوبایا ہیں۔ خیر۔
ہمیں تو اس بینک کی فکر لاحق ہو گئی۔ جہاں وہ کام
کر رہے ہیں۔

اکتوبر ختم ہو رہا تھا۔ ایبٹ آباد میں سردی برپا رہی
تھی۔ ہم نے لپ جھپ تیاری شروع کی۔ اور 2 نومبر
کو لاہور پہنچے۔ آتے ہی مارکیٹ کی سیر کی۔ اون
خریدا۔ اور اپنا شوق پورا کیا۔ ایبٹ آباد میں تو ”بچے
کھجے اون“ کے کئی کئی رنگوں کے ڈیزائن بنا کر تیار
کر لیے تھے۔ یورے نو یاد اس تھے۔ سب لاہور آئے

”عمر خلیل۔ عرف انعم کی شادی؟ ہائیں۔ کل کا
پچیس۔ آج شادی۔ کمال ہے بھئی۔“
”ارے کیا کہہ رہی ہو طاہرہ۔“ ہم نے ریسپور کو
گھورا۔ ”ابھی کچھ دن پہلے ہی تو وہ پیدا ہوا تھا۔ جب تم
ہمارے ابا کے گھر مقیم تھیں۔ 29 بی میں۔“ یقین
دلایا۔ وہ ہنسنے لگیں۔

”کچھ دن پہلے نہیں۔ بہت دن پہلے۔ پھر وہ انگلینڈ
چلا گیا پڑھنے۔ اب آیا ہے تو اس کی جاب بھی شروع
ہو گئی ہے۔ لڑکی ہمیں اچھی لگی۔“

وہ سنار ہی تھیں۔ ہم حیرانی کے سمندر میں غوطے
لگا رہے تھے۔ جاب شروع ہو گئی ہے؟ ارے۔ کیا کرتا
ہو گا وہاں۔ گھر میں تو اس سے کچھ ہوتا نہ تھا۔ انوکھا

کیونکہ وہیں از قیاس ہوتے تھے۔ خیر۔ کئی یہاں بھی سو سڑ بنائے۔ پھر آئے والی دلہن کے لیے بھی لباس سٹریٹ بن لیا۔

خیر صاحب اب عمر خلیل کی مہندی جو گھر میں ہی تھی۔ قریبی عزیز ہی تھے۔ ہماری گانے والی مخصوص ٹولی تو اب تتر بتر ہو گئی تھی۔ تارو اور فلاح امریکہ، عاشری تھانی لینڈ، دیے کر سلمیٰ اور صنہدہ ہی تھیں۔ پارو بھی کراچی میں تھی۔ خیر۔ لاؤنج میں مایوں مہندی کا

سمان۔ تخت پر پکلی مسند۔ پیلے یعنی کہ گیندے کے پھولوں کی لڑیاں، لڑکیاں فلمی گانوں میں مگن۔ میں نے حسب عادت پاکستانی گانوں کی فرمائش کی۔ سلمیٰ، صنہدہ اور باقی لڑکیاں بھی شامل ہو گئیں۔ اچھی خاصی محفل رہی۔ دولہا بلائے گئے۔ بہنوں کے جھرمٹ میں شرباتے ہوئے آئے۔ رسم کی گئی۔ ابٹن خوب ہی تھوپا گیا۔ دولہا کا منہ غائب۔ اسامہ نے کسی کو معاف نہ کیا۔ اماں ایا کو بھی تھوپا۔

عامر نے گھر میں یارلی کیو کا انتظام کیا تھا۔ اور نہ جانے کھانے میں کتنی اقسام تھیں۔ اور سنا کہ سب ہی بے حد لذیذ۔ تیج کباب۔ پھورے۔ دم کا قیمہ، گرم گرم نان۔ سادہ اور روغنی، دو میٹھے۔ نازک اندام، ریلی جلیبیاں جو گرم گرم پیش کی گئیں۔ لان میں حلوائی موجود۔

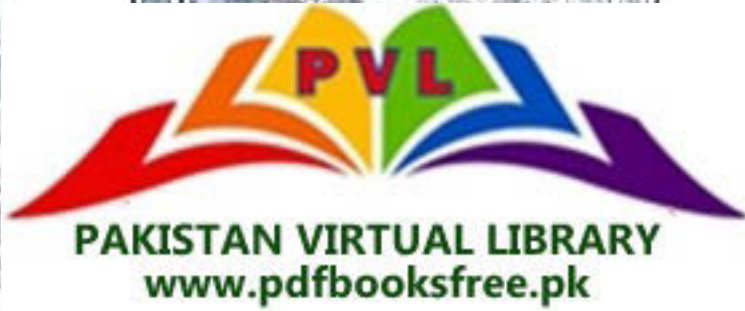
سردی یک لخت برہ گئی۔ ہم لوگ اند آگئے۔ بارات شادی ہال میں گئی۔ دولہا نظر لگنے کے حد تک پیارا۔ گلابی رنگ، براؤن بال، آف وائٹ شیروانی میں بہت ہی وجہ لگ رہے تھے۔

سرخ روپے میں چہرہ چھپائے، دلہن آئیں۔ ہم نے شکل نہیں دیکھی۔ بھی۔ دولہا ہی تھا دیکھنے کے لائق۔ گو کہ دولہا تو عمر تھے۔ مگر تقریب کے دولہا اسامہ لگ رہے تھے۔ بے حد مصروف، آخر بڑے بھائی تھے۔ اور ہر جگہ ہر دفعہ اسامہ ہی مصروف نظر آئے۔ جینز کو ٹھکانے لگانے تک۔ بھارا اکتارہا۔

”بابے! کچھ تو تجھی ہاتھ ہلائے۔ کمرہ سیٹ کروالے۔“

خواتین ڈائجسٹ

اپریل 2016ء کے شمارے سالگرہ نمبر کی ایک جگہ



● سالگرہ نمبر کی خاص پیش کش، قارئین سے سروے،

● ”حرف سادہ کو عنایت ہوا اعجاز کارنگ“

مصنفین سے سوال جواب،

● عزیزہ سیدہ کامل ناول ”گیت، پری اور تم“،

● عمیرہ احمد کا ناول ”آب حیات“،

● نمرہ احمد کا مکمل ناول ”نمل“،

● ”دشت جنوں“ آمنہ ریاض کا مکمل ناول،

● ”محبت، خوشبو کی مانند“ نفیسہ سعید کا مکمل ناول،

● قرۃ العین خرم ہاشمی، بنت سحر اور ماورا خان کے افسانے،

● راک اشار ”عمر جیسوال“ سے ملاقات،

● باتیں ”ماہا وارثی“ سے،

● ”کرن کرن روشنی“ احادیث کا سلسلہ،

● نفسیاتی ازدواجی الجھنیں عدنان کے مشورے

اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

اپریل 2016ء کا شمارہ سالگرہ نمبر آج ہی خرید لیں۔

تو جواب ملا۔ ”میں تو دولہا ہوں۔“
طاہرہ رخصتی کروا کے گھر آئیں۔ سیدھی کچن میں پہنچیں۔ کھیر چٹائی، اوہو، کچن تو پانی سے بھرا سمندر نہ کوئی تالی۔ نہ بظاہر پانی کا کوئی اور راستہ کیسی کھیر کیسی رسم، تو لے لاکر کس طرح ماں بیٹیوں نے پانی خشک کیا۔ تھک گئیں۔

ولیمہ گراؤنڈ میں تھا۔ سبزہ زار، منتظم اعلیٰ عامر ماموں اور اسامہ بھائی نے شادی کی رات ہی وہاں اسٹیج بنا کر اس پر صوفے رکھوا دیے تھے۔ قالین رول کیے کناروں پر رکھے تھے۔ تاکہ اگلے دن ذرا سہولت رہے۔ سب شادی میں مصروف تھے۔ رات میں کسی وقت سوسائٹی کا ٹینکر آیا۔ گراؤنڈ میں پانی ڈال گیا۔

صبح ناشتے سے فارغ ہو کر منتظم صاحبان جائزہ لینے آئے۔ سر پکڑ کر رہ گئے۔ صوفے پانی میں دھلے دھلائے قالین پانی میں ڈوبے ہوئے۔ آفراتفری، گھر سے باہر تک۔ دولہا بہنوں اور دلہن کے گرد بیٹھے دانت دکھاتے رہے۔ ہاں بھی۔ دولہا، دولہا ہے۔ اس کی جو ذمہ داری تھی وہ اس نے بخوبی نبھائی۔ سب کے سامنے قبول ہے۔ قبول ہے۔ قبول ہے۔ کہہ کر۔

کس قدر مشکلوں سے وہ بھگے قالین از سر نو ٹرک پر لادے گئے۔ صوفے چڑھائے گئے۔ دس گنا وزن ہو چکا تھا۔ اب گراؤنڈ کا پانی خشک کرنے کا مسئلہ۔ کہیں سے بڑے قالین نہیں مل رہے۔ دونوں منتظم اعلیٰ ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ فون کانوں سے لگائے چیخ رہے ہیں۔ سردی۔ دھوپ بھی ہلکی۔

نہ جانے کون کون سے بھاری بھر کم آلات منگا کر پانی خشک کیا گیا قالین بھی مہیا کیے گئے۔ یہ الگ داستان ہے۔ درد سری، کوفت، دولہا میاں بے فکر، سوٹ میں ملبوس مسکراتے ہوئے تشریف لائے مع دلہن۔

دلہن نے آف وائٹ عزارہ سوٹ پہنا ہوا تھا۔ جس پر خوب کام بنا ہوا تھا آلتی گلابی پٹی پر کارچوب بہار دے رہا تھا۔ کم عمری اور بھولنے پن کی عملی تفسیر۔ دونوں ہی کم عمر بھولے بھالے بچے لگ رہے تھے۔ اسامہ کی مصروفیت۔ کسی تصویر۔ کسی گروپ فوٹو

میں نظر نہ آئے۔ ذمہ دار۔ مختلی بچہ۔ اللہ عمر دراز کرے۔ مختلی اور حساس فرماں بردار ہے۔ نیک ماں باپ کی اولاد۔ اللہ دونوں بھائیوں کو بہت سی خوشیاں عطا کرے۔ آمین۔

پھر جناب یوں ہوا۔ جیسا کہ اکثر ہو جاتا ہے۔ سرد موسم کی شادیوں کی شرکت میں۔ ٹھنڈ لگی۔ اور ہم نے بستر سنبھال لیا۔ سخت بیماری جھیلی۔ بس زندگی بھی ان دواؤں اور دعاؤں کے باعث قائم رہی۔ جو دوا میں ہمارے بھانجے علی ارسلان نے تجویز کیں۔ اتفاق سے وہ ان دنوں لاہور آئے ہوئے تھے۔ اور دعائیں جو منزہ نے کینیڈا میں بیٹھے بیٹھے فیس بک میں ہماری مشہوری کر دی۔ سخت علالت کی اور دعاؤں کی اپیل۔ پھر تو نہ جانے کس کس نے فیس بک میں دعاؤں کے ذخیرے جمع کر دیے۔ جو عزیز رشتے دار لاہور، کراچی میں تھے بلکہ اسلام آباد میں بھی۔ سب نے دعائیں کیں۔ اللہ سب کو ان کا اجر دے۔ اور سب کو صحت عطا کرے۔ آمین۔

دوماہ کی بیماری۔ اور جو خدمت سلمیٰ نے کی۔ بیٹے صاحب ایبٹ آباد سے آگئے۔ دوائیں۔ ان ہیلر، اسٹیم، جو زندگی بھر نہ کیا تھا۔ وہ کرنا پڑا، ہائے مجبوری۔ ایلوپیتھک دواؤں سے واسطہ پڑا نہ تھا۔ ہمیشہ ہومیو پیتھک علاج کیا۔ لیکن۔ پبلک کے پرزور اصرار پر۔ سب کچھ کرنا اور سہنا پڑا۔ چھوٹی مولیٰ بیماری میں تو ٹوٹکوں اور خمیروں سے ہی صحت حاصل کر کے اطمینان ہو جاتا تھا۔

امریکہ بیماری کی خبر پہنچی تو بھانہ جیہاں، جی ہاں، زندگی بیٹیاں، تینوں لاہور آگئیں سوچیے، اتنی محبت بھلا کے نصیب ہوتی ہے۔ آتے ہی مجھے اپنی آغوش محبت میں لے لیا۔ ہاں جی۔ اماں جاں، دادی جان، ثانی جان کا کردار ادا کرنے لگیں۔ جیسا میں نے ان کے بچپن میں ان کے ساتھ کیا تھا۔

وہ بھی اسی طرح نصیحتوں شفقتوں کے انبار لگا رہی ہیں۔ افوہ۔ خد متیں الگ۔ اللہ خوش رکھے۔ آمین۔

عفت سحر طاہر

خون کا شعلہ

آسمان سے بارش برسنے کا آج عجیب ہی منظر تھا۔ تند و تیز پر شور ہواؤں کے ساتھ، مگر مسلسل۔ کسی بیوہ اور کسی یتیم کے آنسوؤں کی سی روانی کے ساتھ۔

”کون ہے یہ۔ تمہاری ناجائز اولاد؟“ تیز۔۔۔ سماعتوں میں چبھتی آواز۔

اس کا ساکت جسم ہلکا سا تھر تھرایا۔

”خدا کی قسم! آپ کا خون۔۔۔ آپ کے بیٹے کا جانشین۔ آپ کا وارث۔۔۔“ کوئی تڑپ کر گر گڑایا۔

”جاؤ لی بی! جاؤ۔۔۔ جا کے ثبوت لاؤ۔“

تشریف، حقارت اور رعونت۔۔۔ سب کچھ تھا فرعون وقت کے لہجے میں اور پھر ایک عورت کی چلچلاتی آواز۔

”پتا نہیں کس گندی بالی کا کیرا ہے۔۔۔ معاف کرو لی بی ہمارے سر مت منڈھو اپنے گناہوں کی پونٹلی۔“ وہاں سب ہی ایسے تھے اس کا سنسن تیز تر ہوا۔

کسی نے دھکے دے کر انہیں زبردستی بارش اور تیز ہواؤں کے سپرد کر دیا تھا۔

اس کی ماں برستے پانی میں سڑک پر ٹھوکر کھا کر اوندھے منہ گری تو وہ بے قرار سا تڑپ اٹھا۔ ان کی پیشانی لہو میں تر تھی۔



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

www.pdfbooksfree.pk



”امی!۔۔۔“ زور سے انہیں پکارا اور بے اختیار ہی اٹھ بیٹھا۔
 اپنے نرم بستر میں۔۔۔ کمرے کے پرسکون ماحول میں۔۔۔ اسے آگ لگتی محسوس ہوئی۔
 یہ خواب۔۔۔ یہ خواب اس کی زندگی کا سب سے ڈراؤنا خواب تھا اور جب تک وہ زندہ تھا شاید تب تک اسے
 یونہی اس کا خود سے کیا وعدہ یاد دلاتا رہنے والا تھا۔
 ”کسی کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔۔۔ ماں۔۔۔ جہاں لا کے ہمیں پھینکا گیا تھا ایک دن ان کو بھی وہیں اوندھے منہ
 گراؤں گا۔“ اس کی آنکھیں لہو رنگ تھیں اور دل میں وہ ہمیشہ کی طرح وہی عہد دہرا رہا تھا جو وہ ہر بار یہ خواب
 دکھائی دینے پر خود سے کیا کرتا تھا۔



عالیشان سے ”آفندی ہاؤس“ میں اس وقت خوب صورت سی ہلچل مچی ہوئی تھی اور مزے کی بات یہ کہ ساری
 ہی نسوانی چیخ و پکار۔

”اللہ۔۔۔“ چچی جان نے سرہاتھوں میں تھام لیا تو ذرا ہی دیر میں ناشتے کی میز پر مچی ہلچل تھمی۔
 ”کیا ہوا امی۔۔۔؟“ فرزین نے تشویش سے پوچھا۔
 ”اُف! صبح سے اکیلی پکن میں لگی ہوئی ہیں۔ طبیعت خراب ہو گئی ہوگی۔“ تزئین کو خیال آیا۔
 ”بی پی لو ہو گیا ہوگا۔۔۔ اندھا کھلاؤ۔“ ملاح نے اپنی ڈاکٹری جھاڑی اور پھر اس پہ الگ بحث۔
 ”ارے نہیں بی پی میں یہ تھوڑی۔۔۔ فلاں فلاں چیز اور فلاں۔۔۔ ارے نہیں۔۔۔ وہ لاف۔۔۔“ اگلے ہی لمحے ناشتے کی
 میز پھر سے مچھلی بازار۔

”تکمیوں۔۔۔ نالا نقوں بس کرو اب۔“ چچی جان نے گرج کر کہا تو سب کی سب آنکھیں پھاڑے تشویش زدہ
 ہو گئیں۔

”ہائیں۔۔۔ ہم تو ہمدردی کر رہے ہیں امی۔“ فرزین نے منہ بسورا۔
 چچی جان نے۔۔۔ سے ان کے آگے ہاتھ جوڑے۔ ”میں باز آئی ایسی ہمدردی سے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سر
 میں درد کے ساتھ ڈپریشن میں بھی مبتلا کر دیا تم لوگوں کی ہڑونگ نے۔“

”لو جی۔۔۔ نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں۔“ ملاح ہلکا سا منہ بنا کر اپنے ناشتے پر جھک گئی۔
 ”اُبھی اگر آغا جی یہاں ہوتے تو پھر دیکھتیں ان سب کی بو لگتی کیسے بند ہوتی ہے۔“ تائی جان کا انداز مخصوص
 سختی اور تنبیہ لیے ہوئے تھا۔
 ”افوائی پلیز۔۔۔ ہر وقت آغا جان سے نہ دھمکاتی رہا کریں ہمیں۔“ ملاح ہمیشہ کی طرح چڑی۔ ایک آغا جان کیا
 کم تھے جو اوپر سے امی بھی۔

”شکر کرو“ اتنی ڈھیر ساری پوتیوں میں سے ایک آدھ پھینک وینک نہیں دی انہوں نے۔ ایسا عظیم غم ہے
 انہیں پوتا نہ ہونے کا۔۔۔ ”وہ لٹھ مار انداز میں کہتی ہوئی آکر اپنی کرسی گھسیٹ کر بیٹھی تو تائی جان نے اپنی دوسری نمبر
 کی اس باغی اولاد کو ہلکا سا گھور کے دیکھا۔ پھر اسے گھر کا۔
 ”ہر وقت فضول باتیں مت کیا کرو مہو۔۔۔“

”دادا ہیں تمہارے۔۔۔ محبت اور آسائشوں بھری زندگی دی ہے انہوں نے تمہیں۔“ چچی جان کو بھی مہراہ کا انداز
 پسند نہیں آیا تھا۔

”مان لیں امی۔۔۔ کبھی کبھار بھی آغا جان کو ”پوتاڈپریشن“ کا جو دورہ پڑتا ہے تو وہ شدید ہی ہوتا ہے۔“ ملاحہ نے ڈھٹائی سے کہتے بہن کا ساتھ دیا تھا۔

”یہ ساری بکو اس ان کے سامنے کرنا پھر رہا چلے گا کتنے بیس کا سو ہوتا ہے۔“ تائی جان ان کی بے موقع بحث اور فضول گفتگو سے بھنا کٹیں۔ ایک تو ویسے ہی انہیں اور چچی جان دونوں کو ہی بیٹا نہ ہونے کا غم تھا۔

”بکس ہا۔ اتنی وسیع و عریض جائیداد۔۔۔ اور حق دار کون؟ یہ سینے پر دھری پانچ سلیں۔“ آغا جان تو برملا کہا کرتے اور پوتیوں کے جذبات کا خیال کیے بنا ان کے سامنے بہ آواز بلند کہتے۔

”بہت شکریہ۔۔۔ اللہ کا کرم ہے۔ ہمیں خود ہی پتا ہے کہ سو میں کتنے بیس کے نوٹ ہوتے ہیں۔“ وہ ناشتا کر کے فارغ ہو گئی تھیں۔ مہماہ اور ترمین کو یونیورسٹی اور فرزین اور ملاحہ کو کالج جانا تھا۔

”آلی کب آرہی ہیں امی۔۔۔؟“ ملاحہ کو خیال آیا۔ سب سے بڑی ملائکہ شادی شدہ تھی اور اپنے شوہر اور دو سالہ بیٹے کے ساتھ مسقط ہوتی تھی۔

”ابھی تو کوئی پکا ارادہ نہیں کیا اس نے۔ کچھ دن بعد بتائے گی۔“ انہوں نے بتایا تو وہ سر ہلا کے باقیوں کے پیچھے چل دی۔

فرزین اور ملاحہ کو کالج ڈراپ کرنے کے بعد ڈرائیور نے مہماہ اور ترمین کو یونیورسٹی اتارا۔ ترمین تو اندر داخل ہوتے ہی اپنی دوستوں کے گروپ کی طرف بڑھ گئی مگر مہماہ کی آنکھوں نے بے چینی سے ادھر ادھر کسی کو کھوجا۔ اور پھر ذرا آگے بڑھنے پر مخصوص کونے میں سفیدے کے درخت پاس وہ خوش رو دکھائی دے گیا تو وہ کھل کے مسکرا دی۔ اور تیزی سے اس کی طرف بڑھ گئی۔



”دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا۔۔۔ شغل میلے کی بات تھی اور تو اسے دل پہ ہی لے بیٹھا ہے۔“ نصیر قاضی اس کی بات سن کر جس طرح بدکا کوئی اور موقع ہوتا تو وقار آفندی ہستا مگر اس وقت تو وہ کسی اور ہی الجھن کے گھیرے میں تھا۔

”شغل میلہ ہی ہے۔ میں اور کیا کہہ رہا ہوں۔“ اس نے قاضی سے نظر چرائی۔ اور نصیر قاضی بچہ نہیں۔ گھاگ شکاری تھا۔ پرانا پاپی۔ اس معاملے میں چوک نہیں سکتا تھا۔

شائع ہو گئے ہیں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوبصورت سرورق

خوبصورت چمپائی

مضبوط جلد

آفسٹ ہیپر

☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو راحت جہیں قیمت: 250 روپے

☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 600 روپے

☆ محبت بیاں نہیں لہنی جدون قیمت: 250 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

”شغل میلے والوں کی حالت مجنوں جیسی نہیں بن جایا کرتی وقار! اپنے بابا جان کو جانتا ہے نا۔ تمہاری ہی نہیں میری بھی کھال اتر وادیں گے۔“ قاضی نے ہاتھ اٹھا دیے تھے۔

”تو میں کب تجھے بیچ میں ڈال رہا ہوں۔ تو بس مجھے زر گل بانی کا نمبر دے دے یا نیا ایڈریس۔ پرانے والے پہ تو وہ ملی ہی نہیں۔“ وہ بے چینی سے بولا۔

”نکل گئی ہوں گی ماں بیٹی کسی کے ساتھ۔ طوائف اور بنجارے کا کوئی ایک ٹھکانہ نہیں ہوتا میری جان۔“ قاضی نے لب و لہجے میں مقدور بھر لا پرواہی سموی۔

”قاضی پلیزیار۔۔۔“ وہ اس کے بچپن کا دوست تھا۔ آنکھوں سے سب رنگ پہچانتا تھا۔ لہجے میں ناراضی بھر کے بولا تو وہ بے بس ہونے لگا۔

”کیوں آگ میں ہاتھ ڈال رہا ہے۔ جہنم ہے یہ جہنم۔۔۔“

”بس ایسے ہی یار۔ دل پشوری ہے اور کچھ نہیں۔“ وقار نے اس کے وہم کو کم کرنا چاہا۔

”جھوٹ اس سے بولو جو تمہارے لہجے کے اتار چڑھاؤ سے ناواقف ہو وقار۔“ قاضی کے انداز میں ہلکی سی سرزنش تھی۔

”اور شادی طے ہونے والی ہے تیری۔ دل پشوری کا سامان تو آل ریڈی ہو جائے گا۔ پھر کیوں گند میں گرتا ہے یار میرے۔“

”اوف۔۔۔ میں یہاں لیکچر لینے نہیں آیا تجھ سے۔ بتانا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ کاشف سے پوچھ لوں گا اور وہ بتا بھی دے گا۔“ اب کی بار وہ ٹھیک ٹھاک ناراض ہوا اور آخر میں جتا بھی دیا۔

”یہ طوائفیں وقت گزاری کے لیے ہوتی ہیں وقار۔ اور ہم تو بس ایویں شغل میلے میں وہاں چلے گئے۔“ قاضی اسے مقدور بھر سمجھانا چاہتا تھا۔

”اے طوائف مت کہو۔ دھندا نہیں کرتی وہ۔ اس کے نصیب برے کہ ایک طوائف کے گھر پیدا ہو گئی۔ صرف گانا گاتی ہے وہ۔“ وہ خفیف سا بگڑتے ہوئے بولا۔

”مفت میں نہیں سناتی گانا۔ اس کی آواز اور ادائیں ہر روپے والے کے لیے بکاؤ مال ہیں۔ لوگ اسے گندی نظروں سے دیکھنے کے پیسے ادا کرتے ہیں۔“

قاضی نے صاف صاف کہنے کی ٹھانی تو وہ بھڑک اٹھا۔

”تم حد سے بڑھ رہے ہو نصیر قاضی۔“

”حد تک تو تم آن پہنچے ہو وقار! مذاق میں شروع ہوئی بات کو زندگی کا مسئلہ بنا لیا تم نے۔۔۔ کتنی بار مل چکے ہو اس سے؟“ قاضی کو اس کے لہجے سے زیادہ اس کی زندگی اور عزت کی فکر تھی۔

”تین ماہ سے مل رہا تھا اور ایک بار بھی کوئی اخلاق سے گری حرکت نہیں دیکھی میں نے اس کی۔“ ڈھٹائی دکھاتے ہوئے وہ تفاخر سے بولا تو قاضی نے طنز کیا۔

”تو پھر اب۔۔۔ کہاں اڑ گئی چڑیا۔“

”یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا۔ آخری ملاقات دو ہفتے پہلے ہوئی تھی۔ تب تک تو ٹھیک چل رہا تھا سب کچھ۔ اب وہاں گیا تو پتا چلا کہیں کوٹھی میں شفٹ ہو گئی زر گل بانی۔“ اس کے لب و لہجے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

”مجھ سے بڑی آسامی ہاتھ لگ گئی ہوگی شنہرا دے۔“

اب کی بار قاضی کے لہجے میں اطمینان تھا۔ ”خس کم جہاں پاک“ مگر وہ یوں بھڑکے گا قاضی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

”بکواس مت کرو اور خبردار جو ایک بھی فضول لفظ کہا اس کے بارے میں۔۔۔“
غصے سے اس کی رنگت لال پڑ گئی تھی اور ماتھے کی رگ پھڑکنے لگی۔ قاضی ایک دم چپ سا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

”میں پہلے ہی پریشان ہوں اس کے بارے میں اور روپے پیسے کا لالچ ہوتا اسے تو میرے پاس بھی کم جائیداد نہیں تھی۔ فوراً ہی شادی کی آفر قبول کر لیتی، مگر وہ تو مانی ہی نہیں اور اب ایک دم سے یوں غائب ہو جاتا۔۔۔“
وہ غصے بھری بے بسی سے کہہ رہا تھا۔ قاضی کو جھٹکا لگا۔ شدید جھٹکا۔
”تو نے شادی کی آفر کی اسے۔۔۔؟“

اس کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ وقار آندہ نے صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے اطمینان سے اسے دیکھا اور بے حد سکون سے پر لہجے میں بولا۔

”ہاں۔۔۔ اور آفر ہی نہیں کی بلکہ میں یہ شادی کروں گا۔“ نصیر قاضی اپنے بال نوچ کے رہ گیا۔
غلطی۔۔۔ بلکہ زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی جو اس ”خردماغ“ کو زر گل بانی کے کوٹھے لے گیا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وقار آندہ نوٹوں کے ساتھ دل بھی زر گل بانی کی حسین اور طرح نگار بیٹی زر نگار پر لٹا آئے گا۔



”نام نہ دیکھ رہی ہو۔۔۔ میں تو بس کیمسٹری کی سلیمنہ ممتاز کے ساتھ نکلنے والا تھا۔“
اس نے اپنی کلائی پہ بندھی گھڑی مہواہ کی آنکھوں کے آگے لہرا کر حتمایا تو وہ بھی تنگی۔
”نکل ہی گئے ہوتے۔ تاکہ میں بھی فزکس کے جنید ہمدانی کے پروپونل کو قبول کرتے ہوئے شرمندگی محسوس نہ کرتی۔“ ضبط کرتے ہوئے بھی طلال کو ہنسی آگئی تھی۔

”مجال ہے جو جواب دے بغیر تم لڑکیوں کی زبان رہ جائے۔“
”تو تم لڑکے ایسے سوال کرتے ہی کیوں ہو؟“ مہواہ نے فائل اوپر کرتے ہوئے دھوپ سے بچنے کی سعی کی اور طلال نوید کو گھور کے دیکھا۔ تو وہ صفائی پیش کرنے لگا۔

”روز دیر سے آتی ہو۔ اب کیا سوکھا رعب بھی نہیں ڈال سکتا بندہ۔“
”ہاں۔۔۔ ویسے رعب ”سوکھا سڑا“ ہی تھا بلکہ ”سڑا بسا“ زیادہ مناسب رہے گا یہاں۔“

اس نے طنز سے کہتے ہوئے سلیمنہ ممتاز کے دلے پتلے وجود اور گہری سیانولی رنگت کا حوالہ دیا تو وہ تنبیہی
اونہوں کر کے رہ گیا البتہ ہونٹوں کے کناروں سے مسکراہٹ پھوٹی پڑتی تھی۔ وہ دونوں درختوں کی چھاؤں میں
یونیورسٹی گراؤنڈ کے فٹ پاتھ پہ چلنے لگے۔

”اتنی لیٹ تو نہیں ہوئی کہ تم سلیمنہ سے شادی کر کے خود کشی کرنے کا سوچنے لگو۔ پانچ دس منٹ ہی تو اوپر
ہوتے ہیں۔“ مہواہ کا اس سے بات کرنے کا اپنا ہی انداز تھا۔ حق جتا تا۔ پیار بھر اور بے پناہ مان کہ وہ اس کا ہر جملہ
برداشت کرے گا ہر رعب جھیلے گا۔

”یوں روزانہ پانچ پانچ منٹ کر کے ہی تو جان نکالتی ہو۔ یہی لگتا ہے نہیں آو گی۔۔۔“
وہ بے بسی سے بولا تو مہواہ کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہوئی۔

”تو کیا ہوا اگر ایک دن نہ بھی آئی تو۔ کیا ہو گا؟“ لا پرواہی کا لہا وہ اوڑھ کر بے نیاز بنے ہوئے پوچھا تو وہ عین اس
کے سامنے آگیا۔ مہواہ کی۔ وہ سنجیدہ تھا۔

”تو سانس نہیں آئے گی یا۔۔۔“ مہواہ کے دل کو کچھ ہوا تو اس کی نگاہ میں ابھی نظروں کو تیزی سے پھیرتی وہ اس

کا مذاق اڑانے لگی۔

”ہاں۔ لگتا ہے ”دل والے“ دیکھ ہی بی تم نے بھی۔“

”یعنی۔ تم سمجھ رہی ہو کہ میں ڈانہلاگ جھاڑ رہا ہوں؟“ طلال کو صدمہ ہوا۔ تو مہراہ کو ضبط کے باوجود بھی ہنسی آگئی۔

”نہ کیا کرو طلال۔ قسم سے ایسے مرجانے اور سانس نہ آنے والے جملے مجھے فلمی ڈانہلاگ ہی لگتے ہیں اور ہاں ”چیپ“ میں نے دل میں کہہ لیا ہے۔ اونچی آواز میں کہتی تو تم مائنڈ کر جاتے۔“ بڑی معصومیت سے اپنا احسان جتایا تو وہ دانت پیس کر پاؤں پٹخ کر پلٹ گیا۔ مہراہ کی ہنسی اور قدموں کی چاپ اس کے پیچھے پیچھے تھی۔



مبین آفندی جوان بیٹیوں کے باپ۔ عمر کے اس دور میں تھے کہ ہر فیصلہ ہریات بلا جھجک اگلے بندے تک پہنچا دیتے، مگر آغاز الفقار آفندی کے اسٹڈی روم میں داخل ہوئے تو ان کے دل میں خفیف سے خوف کی لہر بھی تھی۔

اور ان کی بیوی۔ صاعقہ۔ اگر اسے پتا چلتا کہ مبین آفندی کون سے گڑے مردے اکھاڑنے باپ کے پاس جا رہے ہیں تو وہ زنجیروں کے شوہر کے قدموں میں پڑ جاتیں۔ سلام دعا ہو گئی۔ ادھر ادھر کی ہلکی پھلکی باتیں۔ پھر آغا جان اپنی کتاب میں مگن ہو گئے۔ ہمیشہ کی طرح اصولاً ”اب مبین آفندی کو اٹھ کے چلے جانا چاہیے تھا۔ پانچ منٹ گزرے، اٹھ دس۔ پندرہویں منٹ اور ننانوے صفحے پر پہنچ کر انہوں نے کتاب پر سے نظر ہٹائی اور چشمے کے اوپر سے گھور کے اپنے تخت جگر کو دیکھا۔

وہ گڑبڑائے۔ ”جی۔ جی۔ آغا جان۔؟“

”کیا میں نے کچھ کہا۔؟“ انہوں نے کمال تحمل سے پوچھا۔

”نہیں، لیکن میں نے سمجھا شاید۔“

آغا جان نے کتاب۔ صفحے کا کونا موڑ کر بند کی اور ایک طرف رکھتے ہوئے سیدھے سبھاؤ بولے۔ ”اب تم وہ بولو جو کہنے آئے ہو۔ بہت گفتگو ہو گئی بزبان خاموشی۔“ ان کا لب و لہجہ پر رعب تھا۔

وہ ہچکچائے۔ ”میں ڈر رہا تھا آغا جان۔ شاید آپ میری بات پسند نہ کریں۔“

”تم کہو مبین آفندی۔ مجھ میں ابھی بھی حوصلہ ہے ہریات سننے اور برداشت کرنے کا۔“

وہ اپنے مخصوص پر تنفر انداز میں بولے ذرا سار کے اور پھر گویا اپنی برداشت کی مثال دیتے ہوئے دوبارہ اضافہ کیا۔

”اپنے دو بیٹوں کو کھونے کے بعد بھی۔ آغاز الفقار آفندی وہیں کھڑا ہے۔ نہ گرا ہے اور نہ جھکا ہے۔“

مبین آفندی کئی ثانیوں تک ان کے دھیمے، مگر مضبوط اور گھن گرج والے لہجے کے زیر اثر رہے۔ پھر بے اختیار بولے۔

”اللہ آپ پہ کبھی وہ وقت نہ لائے آغا جان۔“

مگر اللہ لایا کرتا ہے۔

وہ ہمارے بیچ ہی دنوں کو پھیر پھیر کے لاتا ہے۔ زبردست کو ایک نہ ایک دن زیر دست ہونا پڑتا ہے، مگر وہ نہیں جانتے جن کے دلوں پہ مہر لگ چکی ہوں۔

”سیدھی اور صاف بات کرو مبین! ہمیں یہ گھماؤ پھیر پسند نہیں۔“ انہوں نے سپاٹ انداز میں کہا تو اپنی پوری

زندگی کی ہمت مجتمع کرتے ہوئے مبین آفندی نے کہہ ہی دیا۔

”اور اگر آپ کا ایک بیٹا۔۔۔ آپ کے پاس لوٹنا چاہے تو؟“

لجھ بھر کو مبین آفندی کو لگا جیسے آغا جان کا وجود کپکپایا ہوا ان کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی چمکی۔

”فاران۔۔۔؟“ چودہ سال بعد یہ نام ان کے ہونٹوں سے نکلا تو دونوں ہی کے کانوں کو عجیب سا لگا۔

”جی آغا جان۔۔۔!“ مبین آفندی نے ان کے چہرے کے تاثرات کو پڑھنے کی سعی کی، مگر اول لمحے کی بے

اختیاری کے بعد سے وہاں پھر سے وہی ہمیشہ والا پتھر پلاپن نمایاں تھا۔

”اچھا! اکڑ ٹوٹ گئی اس کی۔۔۔؟“ بے حد تمسخر سے انہوں نے پوچھا۔ مبین چند ثانیوں تک خاموش جیسے کوئی

بے حد پر اثر الفاظ ڈھونڈتے رہے۔ اور آخر کار فتح یاب بھی رہے۔

”اس کے پاس آپ کا پوتا ہے آغا جان! آپ کا وارث۔ آپ کی آئندہ نسل کا امین۔“

آغا جان سن سی کیفیت میں انہیں دیکھے گئے پھر بات سننے بنا اٹھ کر باہر نکل گئے۔ مبین آفندی بے بس بیٹھے رہ گئے تھے۔



کیا ہی جنگل میں آگ اس تیزی سے پھیلتی ہوگی جتنی تیزی سے یہ خبر اس کے دوستوں میں پھیلی۔

نصیر قاضی تو تھا ہی۔۔۔ کاشف اور مبشر بھی اسے سمجھانے آئے اور اگلے کئی گھنٹوں تک سر کھپاتے ہی رہے۔ آخر میں اسی کی بات رہی۔

”میں مرجاؤں گا یا ر! میرے دل پہ میرا اختیار نہیں ہے۔“ وہ چلا اٹھا۔ اسے پروا نہیں تھی ان میں سے کوئی اس کے متعلق کیا سوچتا ہے۔

وہ تینوں ہکا بکا تھے بلکہ نصیر قاضی نے تو سر ہی تھام لیا۔ اسے کیا خبر تھی کچھ گھنٹوں کی تفریح میں وہ اپنا یا ر کھو بیٹھے گا۔ اور اس کے بابا جان۔۔۔ ان کا جاہ و جلال۔۔۔؟ اگر انہیں پتا چلا کہ نصیر قاضی ان کے بیٹے کو گھنگھرو چھنکاتی ان راہوں پر لے گیا تھا تو وہ اس کی کھال میں بھس بھروانے سے بھی نہ ہچکچاتے۔

”اپنے دل پہ تھوڑا کنٹرول کرو وقار! بے اختیاری انسان کو بڑا ذلیل کرواتی ہے۔ اور دل کی مانو گے تو وہ ہر چمکتی چیز کو سوتا ہی بتائے گا۔ یہ تو دماغ ہے جو صحیح غلط کا فیصلہ بھی صحیح کرتا ہے۔ سواپنے دماغ سے کام لو۔“ مبشر برلاس بڑا عملی بندہ تھا۔ بڑی جمع تفریق کر کے فیصلے کرنے والا۔ سنجیدگی سے بولا۔

”مجھے اس کا پتا چلانا ہے اور ہر حال میں۔“ وہ باری باری تینوں کا چہرہ دیکھتے ہوئے قطعیت سے بولا۔

”ایک طرفہ محبت کا شکار ہو تم وقار۔! اس کی کوئی دلچسپی ہوتی تو وہ دنیا کی بھیڑ میں گم نہ ہو جاتی۔“ نصیر نے اسے ابھی بھی باز رکھنا چاہا۔

”اسے بھی تم لوگوں کی طرح میرے خاندان، میری عزت اور مرتبے کی فکر تھی۔ میں نے کہا بھی تھا میں سب سنبھال لوں گا۔“ وہ اپنے بال نوچنے کو تھا۔

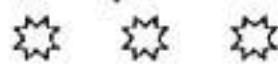
”وہ عقل مند ہے وقار! جانتی ہے، مستقبل میں کیسا طوفان آئے گا تمہارے فیصلے سے۔ یہ ”سب اچھا“ صرف اسی وقت تک ہے جب تک بابا جان کو پتا نہیں چل جاتا۔“ کاشف نے دھیمے انداز میں کہا تھا۔

”تم مجھے صرف اس کا پتا کرو دو کاشف۔ میں ہر بات سنبھال لوں گا۔ وہ مرد ہی کیا جو طوفان کا مقابلہ نہ کر سکے۔“ وہ اپنی بات میں اٹل تھا۔

”کاشف کچھ نہیں کرے گا۔“ نصیر قاضی نے کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے قطعی انداز میں کہا تو وہ چونک کر اس کا

چہرہ دیکھنے لگا۔
 ”میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی جو میں تجھے وہاں لے گیا، مگر بس۔۔۔ میں مزید کسی گناہ کا بوجھ اپنے سر لینا نہیں چاہتا۔ ہم میں سے کوئی بھی اس معاملے میں تیرا ساتھ نہیں دے گا۔“
 اس کے تاثرات پتھر پلے تھے۔ وقار آفندی کی کنپٹیاں تپیں۔
 ”گناہ نہیں ہے یہ۔ نیکی ہوگی میری زندگی کی سب سے بڑی۔ گانا گاتی ہے وہ۔ آواز نیچتی ہے، جسم نہیں۔ عزت کی زندگی دینا چاہتا ہوں میں اسے۔“

پر تپش لہجے میں کہا، مگر ان تینوں کو تو آغاز و الفقار آفندی نام کی تلوار اپنے سر پہ لٹکتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ کیا خاک متاثر ہوتے۔
 وقار آفندی ان سے ناراض ہو کر گیا۔ کاشف اچھی طرح زر گل پائی کے نئے ٹھکانے سے واقف تھا، مگر ان تینوں نے تہہ کر رکھا تھا وقار کو اس دلدل میں گرنے سے بچانے کا۔ سو کسی کا بھی وقار کو زر نگار کے متعلق کوئی خبر دینے کا ارادہ نہیں تھا۔



”بھائی صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں آغا جان۔۔۔ آپ ٹھنڈے ذہن سے سوچیں۔۔۔“
 سہیل آفندی کم ہی آغا جان کے سامنے بولنے کی ہمت کرتے تھے، مگر مبین آفندی نے انہیں ہمت دلا کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔

”کیا سوچوں سہیل۔۔۔ وہ مجھے سوچنے کے قابل چھوڑ کے کب گیا تھا۔“ ان کا لہجہ جلتا ہوا سا تھا۔
 ”بچوں سے غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں آغا جان! بڑے ہمیشہ انہیں معاف کرتے آئے ہیں۔“ مبین آفندی نے سنجیدگی سے کہا۔

”غلطی اور گناہ میں فرق ہوتا ہے مبین۔“ انہوں نے تنبیہی نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ پھر جتانے والے انداز میں اضافہ کیا۔ ”والدین کی ناقربانی گناہ کبیرہ میں شامل ہوتی ہے۔“
 ”وہ معافی مانگ رہا ہے آغا جان۔“

”ہر غلطی کی تلافی ”معافی“ نہیں ہوتی۔“
 ”گستاخی معاف آغا جان۔۔۔ اب بیٹے سے تاوان بھروائیں گے؟“ مبین آفندی نے دبے لفظوں انہیں احساس دلانا چاہا تو وہ گرج کر بولے۔

”تاوان۔۔۔؟ تاوان کی بات کرتے ہو تم لوگ؟ تاوان تو میں نے بھرا ہے۔ ایک زندگی کا تاوان۔۔۔ وہ کیا تاوان ادا کریں گے۔“ ان کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی تھی۔ سہیل آفندی تو چپ ہو رہے، مگر مبین صاحب نے تھوڑی ہمت کی۔

”وہ شدید بیمار ہے آغا جان۔۔۔! اور شرمندہ بھی۔“

آغا جان خاموش رہے۔

”پھر آپ یہ بھی تو سوچیں“ اس کے پاس اس گھر کا وارث ہے۔ آپ کی نسل کا نام لیوا۔ یہ بیٹیاں تو پرانے گھروں کو چلے جانے والی ہیں۔“ مبین آفندی نے نرمی سے ان کے مزاج کو دوسری طرف لگانے کی کوشش کی۔
 ”اس سے پہلے کہ اس تمام جائیداد میں کوئی ”اور“ حصہ داری کا دعوا لے کر آجائے۔“ سہیل آفندی کو دور کی کوڑی سو جھمی تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔

”اور کون؟“

”آپ جانتے ہیں آغا جان میں کس کی بات کر رہا ہوں۔“ وہ ”بھی تو آئی تھی اپنے بیٹے کو لے کر“ جانشینی کا دعویٰ کرتے ہوئے۔ ”انہوں نے ذمہ داری انداز میں کہا تو اب کی بار آغا جان نے پرسوج انداز میں ہنکارا بھرا۔

”ہوں۔ بات تو ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔“

”اور ویسے بھی آغا جان۔ فاران نے تو یوں سمجھیں کسی کا ساتھ دینے کی سزا پائی ہے اور بس۔ ورنہ اس گندے کھیل سے اس کا تعلق کوئی نہیں تھا۔“

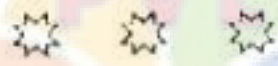
مبین آفندی نے ان کی برین واشنگ کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اور ویسے بھی ان طویل چودہ سالوں میں آغا خان کو خود بھی احساس ہو ہی گیا تھا۔ ایک کے قصور پر دوسرے بیٹے کو محض اس کی حمایت کرنے پر انہوں نے خود سے دور کر دیا تھا۔

”بہر حال۔ غلطی تو اس کی بھی بڑی تھی۔ مجھ سے مخالفت میں دلائل دیے اس نے۔ اگر اس نے تاوان میں چودہ سیال بھرے ہیں تو میں نے اپنی شریک حیات کی زندگی۔“

وہ تنگی سے بولے۔ چند لمحے توقف کیا پھر گہری سانس بھرتے ہوئے بولے۔

”وقت نکال کے رابطہ کریں گے اس سے۔ فی الحال تو میرا ذہن تیار نہیں ہے۔“

اور مبین آفندی کے لیے اتنا بھی کافی تھا وہ اور سہیل آفندی کھل کے مسکرا دیے۔
صلح کا نقارہ بج چکا۔ اب محض چند ریشمی پردے سرکنے باقی تھے۔ تمام نظارے بالکل صاف دکھائی دینے والے تھے۔



تائی جان کو علم ہوا تو پہلے تو وہ سکتے میں آگئیں۔ پھر گویا حواس میں لوٹتے ہوئے شوہر سے الجھنے لگیں۔ ”دماغ تو ٹھیک ہے آپ کا مبین؟ خود اپنے پیروں پہ کھڑی مار رہے ہیں آپ۔“
انہوں نے ہلکا سا کھور کر اپنی شریک حیات کو دیکھا۔ ”اس میں دماغ کی خرابی والی بات کہاں سے نظر آگئی تمہیں؟“

”ارے۔“ بے اختیار تیز لہجے میں کہتے ہوئے جیسے انہوں نے اپنے لب و لہجے پر قابو رکھا۔ ”اتنی بڑی جائیداد۔ بزنس ہے۔ اور آپ زمین کھود کھود کر حصہ دار نکال رہے ہیں۔“

”دماغ تو تمہارا خراب ہے صاعقہ۔“ انہوں نے تنگی سے کہا۔ ”اب کیا بیٹیوں کو جہیز میں دو گی یہ جائیداد اور بزنس؟“

لمحہ بھر کو وہ لا جواب ہوئیں۔

”ہمارا ری جگمیس داماد سنبھالیں گے کیا؟ اور ویسے بھی اسے جائیداد یا بزنس کا لالچ ہوتا تو چودہ سال لا تعلقی میں نہ گزارتا۔ خالی ہاتھ کیا تھا اس گھر سے۔ بیوی اور بیٹے کے ساتھ۔ اس کی خاموشی کی قدر کرو۔ عیاشی تو ہم نے کی ہے چودہ سال اس کے حصے پر بھی۔“

مبین آفندی جذباتی ہونے لگے۔ تو صاعقہ بیگم بھی قائل سی ہو گئیں۔

”یہ تو ہے ویسے۔“

”اس کا بیٹا جوان ہے اب۔ نیا خون ہے سہارا بنے گا باپ دادا کا اور ویسے بھی ہم کون سا سب اس کے حوالے کر کے خود فارغ بیٹھنے والے ہیں۔ بس دل کو تقویت ہو جائے گی کہ کوئی ہے جو آگے بھی یہ تمام سلسلے چلا سکتا

ہے۔

وہ بے حد رنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔
اللہ کی مصلحت اللہ ہی جانتا تھا کہ دونوں بھائی بیٹے کے لیے ترستے تھے مگر دونوں ہی بیٹیوں کے باپ بنے۔ ان کی قسمت میں اولاد نہ تھی، لکھی ہی نہ تھی۔
”اور جو ماں باپ کا دل دکھا کر گئے ان کو کیسے رنگ لگائے اللہ تعالیٰ نے۔“
تالی جان نے آہ سی بھری تو انہوں نے تنبیہ بھی نہ کی، یوں ہی کوہیکھا۔
”کفر مت بولو۔ والدین کا دل دکھانے والوں کو اللہ رنگ لگایا نہیں مگر ”دکھایا“ ضرور کرتا ہے۔ وہ بھی دنیا کے چودہ سال تمہیں کیا معلوم کتنی ٹھوکریں کھائی ہوں اس نے۔“
”ہاں تو ماں باپ کا دل دکھانے کی سزا تو بھگتی ہی ہوگی نا۔“ وہ جھٹ سے بولیں۔
مبین آفندی نے دائیں بائیں سر ہلایا اور ہنس دیے۔ ”تم عورتیں بھی نا۔ ابھی تو تمہیں ان کی رنگ برنگی زندگی نظر آرہی تھی۔ ساتھ ہی لڑھک کے سزا یہ آگئیں۔“
تالی جان جھینپ سی گئیں۔ ”ہاں تو غلط کیا کہا۔ بیٹے بھی تو اللہ نے ان ہی کو دیے۔“
”چلو اب ایک بیٹا آرہا ہے نا۔ تم لوگوں کا شوق بھی پورا ہو جائے گا۔“
وہ مسکرا کر بولے تو تالی جان نے گہری سانس بھری۔ اب یہ تو اللہ ہی جانتا تھا کہ آنے والا وقت کسی کے لیے کیا لانے والا تھا۔



بھٹے کھاتے۔ دونوں کیپس کی لہر کے ساتھ ساتھ چلتے ایک دوسرے کی سنگت میں مطمئن اور خوش و خرم تھے۔
”آئی آئی نہیں سیالکوٹ سے۔؟“ مہراہ نے پوچھا۔
”کل کارو گرام طے ہوا ہے۔ اب دیکھو۔ بڑے عرصے کے بعد گئی ہیں ماموں کی طرف تو کچھ زیادہ ہی دل لگ گیا ان کا۔“ طلال مسکراتے ہوئے بتا رہا تھا۔
وہ دونوں نہر کنارے گھاس پر بیٹھ گئے۔
”پتا ہے میں نے امی سے بات کر لی تمہارے پروپوزل کی۔“
مہراہ کے چہرے پر رنگین سی لہر دوڑی تھی۔ ہلکے سے شرمیلے پن کے ساتھ بتایا تو وہ خوش ہو گیا۔
”دیش گریٹ۔“ پھر بے تالی سے پوچھنے لگا۔ ”کیا کہا انہوں نے؟“
”بھئی۔ یہ تو اب تمام رشتوں پر غور کر کے ہی فائنل ہو گا۔ تم چکر لگالینا اپنی ماما کے ساتھ۔“ مہراہ نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا تو وہ قہقہہ لگا بیٹھا۔
”کتنی خوش قسم ہوتی ہو تم لڑکیاں بھی نا۔ ایسے کون سے رشتے لائن لگا کے کھڑے ہیں۔“
”اوہو۔ مسٹر۔ کسی وہم میں مت رہنا۔“ وہ چمک کر بولی۔ پھر تقاضا نہ بتایا۔ ”میرا بھی ایک کزن آرہا ہے۔“
”چیچوں کی ملیاں سے؟“ طلال نے بھولہن سے طنز کیا تو وہ اسے گھور کر جلانے والے انداز میں بولی۔
”جی نہیں۔ شارجہ سے۔“
”ابھی پیدا ہوا ہے کیا؟“
”ہاں۔ اٹھائیس سال کا ہے۔“ مہراہ ڈھٹائی سے ہنسی۔

”اچھا۔“ طلال نے سر کھجاتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔

”عمر تھوڑی سی زیادہ نہیں بتادی تم نے؟“

”در اصل ریڈی میڈ ہے۔“ وہ اب بھی سنجیدہ نہیں تھی۔

”ٹھٹ اپ۔“ طلال ہنستے ہوئے بولا۔

”واقعی۔ ہمارے لیے تو ریڈی میڈ ہی ہوگا۔ چودہ سال ہوئے اسے یہاں سے گئے۔ اب ایک دم سے دیکھیں گے تو اٹھا میس والا ہوگا۔“ وہ اپنی بات پہ زور دیتے ہوئے بولی۔

”مگر سوچنے والی بات تو یہ ہے کہ اچانک سے اتنا بڑا کزن آکھاں سے گیا؟“ طلال نے کھایا ہوا ہنستا شاپر میں ڈال کر ایک طرف رکھتے ہوئے عالمانہ سوال کیا۔

”بتایا تو ہے ریڈی میڈ ہے اور شارجہ سے امپورٹ ہو کے آرہا ہے۔“

”پہلے تو تم نے ذکر نہیں کیا۔“

”پہلے بتانے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ کیونکہ ان سے کوئی رابطہ ہی نہ تھا اور نہ ہی دوبارہ سے صلح صفائی کا ارادہ۔ یہ تو ابھی چچا جان نے خود رابطہ کیا۔ آغا جان سے معافی مانگی اور واپسی کی اجازت بھی۔“

مہراہ نے مختصراً بتایا۔ پھر اسے دیکھتے ہوئے شرارت سے بولی۔ ”لہذا تم جلدی سے اپنا پروپوزل بھیج دو۔ کیونکہ مابدولت اب ایک ہینڈ سم اور ڈشنگ قسم کے کزن کی کزن بن چکی ہیں۔“

”ہاں ہاں۔“

طلال کا قہقہہ کئی گردنوں کو ان کی طرف موڑ گیا۔ مہراہ نے جھل ہو کر کھایا ہوا ہنستا اسے دے مارا۔ جو اس نے دونوں ہاتھوں سے کامیابی سے کیچ کر لیا۔

”یہ دو خصوصیات تم نے اپنے پاس سے ہی لگالیں؟“ وہ مذاق اڑا رہا تھا۔

”میرے چچا بھی بہت ڈشنگ اسمشنگ ہیں۔ ان کی جوانی کی تصویریں دیکھ رکھی ہیں میں نے۔ بیٹا بھی ویسا ہی ہو گا نا۔“ مہراہ اتر کر بولی۔ پھر اضافہ بھی کیا۔ وہ بھی من چاہا۔

”بھئی۔ خوب صورتی تو ہمیں وراثت میں ملی ہے۔“

سورج کی کرنیں پانی کی لہروں سے منعکس ہو کر اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ یوں معصوم سے نقاخر کے ساتھ مسکراتی وہ واقعی کوئی ”شے“ لگ رہی تھی۔

طلال کا جی چاہا اسے اٹھا کے دل میں رکھ لے۔

”او۔ ہیلو۔“ مہراہ نے اس کی نظروں کے سامنے چٹکی بجائی۔

”کدھر کھو گئے ہو۔؟“

اس کی نظروں کی بے خودی کو محسوس کرتے ہوئے وہ مسکرا ہٹو با کر پوچھ رہی تھی۔

طلال نے گہری سانس بھرتے ہوئے سفیدے کے بلند درختوں پر نگاہ ڈالی اور سادگی سے بولا۔

”ایسے ہی۔ سوچ رہا تھا۔ اتنے سفید جھوٹ بولتے ہوئے لڑکیوں کا دل نہیں گھبراتا؟“

وہ جو کچھ ”اور“ سننے کے لیے سراپا اشتیاق بنی ہوئی تھی۔ فائل اٹھا کر اسے مارنے لگی۔ تو وہ پھرتی سے اٹھ کے بھاگا تھا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنا بیگ شانے پہ ڈالتی کپڑے جھاڑنے لگی۔



گلے شکوے، معافی تلافی۔ سب ہو چکا۔

”آپ کے لیے ایک بہت بڑا سرپرائز ہے میرے پاس آغا جان۔“ فاران آفندی کی آواز خوشی و جوش سے کپکپا رہی تھی۔

”آؤ گے تو سب سرپرائز دیکھ لیں گے ہم۔“

آغا جان اسکا پیر دکھائی دیتے فاران آفندی پر پیاسی نظریں جمائے ہوئے بظاہر بڑے رعب داب سے بولے۔ مگر حقیقت تو یہ تھی کہ چودہ سال بعد لخت جگر کو دیکھا تو تمام گلے شکوے دم توڑ گئے تھے۔

”میرا پوتا کہاں ہے۔ اسے بھی بتا رکھا ہے ہمارے بارے میں یا نہیں؟“

”جی آغا جان۔ سب پتا ہے اسے۔ ابھی جاب پہ گیا ہوا ہے۔ آئے گا تو بات کرواؤں گا آپ سے۔“

”اب چھوڑو جاب واپس۔ ہمارے تو پرکھوں میں کسی نے نوکری نہیں کی کسی کی۔“ وہ ناپسندیدگی سے بولے تو فاران آفندی مسکرا دیے۔

”جو آپ کا حکم آغا جان! ویسے بھی اب تو سب وائسڈ اپ کرنا ہے یہاں سے۔ آپ حکم کریں کب حاضر ہو جاؤں؟“ وہ جذباتی ہوئے تو آغا جان کا پتھر دل بھی پگھلنے لگا۔ مگر باپ تھے۔ ماں نہیں جو دل کا بھید ظاہر کر دیتے۔

”اڑ کے تو نہیں آؤ گے ظاہر ہے۔ سب کام ختم کرو وہاں سے اور آ جاؤ۔ بہت کاٹ لی جلا وطنی۔“

”ٹھیک ہے آغا جان۔“ وہ خوش تھے۔ بے حد خوش۔ گردش دوراں نے انہیں پہلے سے کمزور کر دیا تھا اور کچھ جگر کا عارضہ جان کا دشمن ہو رہا تھا۔

”اور تمہو کہاں ہے؟“ آغا جان کے اچانک سوال پر وہ خاموش سے ہو گئے۔ پھر دھیسے لہجے میں بولے۔

”یہیں ہے آغا جان۔ کچن میں۔ موحد آنے والا ہے تو کھانا بنا رہی ہے شاید۔“

”اس کا دل نہیں چاہا راضی نامے کو فاران آفندی؟“ آغا جان نے طنزیہ ہنکارا بھرا تھا۔ وہ جلدی سے بولے۔

”نہیں نہیں آغا جان! ایسی بات نہیں۔ بس ماں ہے نا۔ تو اسے اپنا دکھ بھلائے نہیں بھولتا۔“

”ہم نے اسے تو سزا نہیں دی تھی۔ اس نے تو تمہاری سزا بھگتی۔ تمہارے جرم کی سزا پائی۔“

”جی۔ آغا جان!“ وہ چپ سے ہو گئے۔ مبین آفندی اور سہیل آفندی فی الوقت ایک طرف خاموش تماشائی بنے بیٹھے تھے۔

”سورتوں کی عادت ہوتی ہے آغا جان! دکھوں کو تمام عمر بچوں کی مانند سینے سے لگا کے رکھتی ہیں۔ ہم وہاں سے نکلے تو موحد کو نمونیا ہو گیا تھا۔“ بے حد دکھی لہجے میں کہتے ہوئے وہ کھم سے گئے۔ تینوں نفوس دم سادھے متوجہ تھے۔

”پھر؟“ آغا جان نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔ لاڈلے پوتے کی یاد اور اس کی معصوم شکل نے اچانک ہی سینے پر ہاتھ مارا تھا۔ ان کا لاڈلا راج دلار۔

انہیں یاد آیا۔ کتنا پیارا ہوا کرتا تھا وہ انہیں۔ اکلوتا پوتا۔

”پھر یاجود علاج کے نمونیا بگڑتا چلا گیا آغا جان۔“ انہوں نے سائیڈ پہ رکھا پانی کا گلاس اٹھا کے منہ سے لگالیا۔ دونوں بھائیوں نے فاران آفندی کے لہجے کی نمی کو بخولی محسوس کیا تھا اور دم بخود بیٹھے آغا جان نے تودل سے۔ خالی ہاتھ گھر سے نکلنے والے آدمی نے کیسے اسپتالوں میں دھکے کھائے ہوں گے۔

”بہر حال۔ وہ ماں ہے۔ وہ وقت وہ دکھ بھول نہیں پاتی۔ میں تو سمجھتا رہتا ہوں اس کو۔ باقی سب باتیں آکر ہوں گی آغا جان۔ میں تفصیل میں جانے کی ہمت نہیں پاتا خود میں۔ مگر آپ کو وعدہ کرنا ہو گا آغا جان کہ اب آپ ہمیں نہیں ٹھکرائیں گے۔ بہت جدائی مسہلی ہم نے۔ اب ہم آپ کو کھونا نہیں چاہتے۔ ماں تو کھودی میں نے اپنی۔“ وہ بے پناہ جذباتی ہو کر رو ہی دیے تھے۔

”اکیلا آدمی چودہ برسوں سے دنیا کے نجانے کیسے حالات سے نبرد آزما رہا تھا کہ اب ہمت جواب دے گئی تھی اس کی۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ پھر بات ہوگی۔ فوراً واپسی کی تیاری پکڑو۔“ آغا جان نے تیزی سے بات سمیٹی۔ تو وہ آزدگی سے مسکرا دیے آغا جان کو ان کی مسکراہٹ اور تاثرات سے عجیب سا تاثر محسوس ہوا۔ مگر وہ لمحہ بھر کی بات تھی۔ وہ اب دونوں بھائیوں سے گفتگو میں مصروف تھے اور آغا جان ایک طرف بیٹھ کر ان کے چہرے پر نظریں جمائے اپنی برسوں کی پیاس بجھانے میں۔



وہ تھکا ہوا تھا جب گھر پہنچا۔ ماما سے سلام دعا ہوئی۔ تازہ دم ہو کے کھانے کی میز پر پہنچا تو ماما اور بابا جان بالکل خاموش تھے۔

کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے سوالیہ انداز میں ابو اچکا کر بابا جان سے حالات معلوم کرنے چاہے۔ تو انہوں نے ابو سے ماما کی طرف اشارہ کر دیا۔

”کیا بات ہے۔ دونوں چھاؤنیوں میں خاموشی ہے آج تو۔“

وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔ تو سویٹ ڈش کا ڈونگا لے کر آتی ثمو کی آنکھوں میں پھر سے نمی اترنے لگی۔ انہوں نے ڈونگا میز کے وسط میں رکھا۔ کرسی پہ بے دم سی گریں اور میز پہ سرنگا کے رونے لگیں۔

فاران آفندی کے ہونٹ بھنچے۔ آنکھوں میں لالی سی اترنے لگی۔ موحد کا تو مانو دل ہی کچل ڈالا ہو کسی نے پھرتی سے اٹھ کے ثمو کی طرف بڑھا۔

”ماما۔ کیا ہو گیا۔ کیوں رو رہی ہیں؟ میں تو یونہی بکواس کر رہا تھا۔ آئم سوری۔“

جھک کر انہیں بانہوں کے گھیرے میں لیے وہ پریشان سا تھا۔

”تمہارا قصور نہیں ہے۔ یہ کسی اور ہی دکھ کو رو رہی ہے۔“ فاران قدرے ناراضی سے اسے شرمندگی کے حصار سے نکالتے ہوئے ثمو کو دیکھ رہے تھے۔

”میں ساری عمر بھی اپنے دکھ کو روؤں تو اس کی تکلیف میرے دل سے نہیں جائے گی فاران صاحب۔“ وہ بھیگا چہرہ اٹھا کر روتے ہوئے بولیں۔ تو موحد نے لب بھینچ لیے۔ پھر بے چینی سے پوچھا۔

”ہوا کیا ہے ماما۔ آپ بتائیں بابا جان۔؟“ اس کا رخ خن فاران کی جانب تھا۔ جو کڑی نظروں سے ثمو کو دیکھ رہے تھے۔

”کھانے کی میز پہ بے برکتی پھیلا رہی ہو۔ اچھی بات ہوگی جو سب رزق چھوڑ کے اٹھ جائیں گے۔“

”ماما روئی کیوں ہیں بابا جان؟“ موحد کے لہجے میں ضد کا عنصر واضح تھا۔ یہ کوئی عام سی بات تو نہ تھی کہ ثمو یوں بے بسی سے رو دیتیں۔ اور فاران آفندی بجائے بوکھلانے اور پریشان ہو کر انہیں چپ کروانے کے انہیں مزید ڈانٹتے۔ کچھ تو گڑبڑ بھی معاملے میں۔

”فہ یار! تم بھی نا۔ کھانا کھا لو پہلے پھر بات کرتے ہیں۔“ وہ جھپٹا کر کہتے اب تنبیہی نظروں سے ثمو کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں بھی فوراً ہی احساس ہو گیا کہ انہوں نے غلط موقع پر غلط رد عمل دیا تھا۔ سو فوراً ہی دوپٹے سے منہ پونچھتے ہوئے خود کو نارمل کرنے لگیں۔

موحد کو علم تھا۔ اب فاران آفندی نے کہہ دیا کہ کھانے کے بعد بات ہوگی تو وہ جتنا بھی اصرار کر لیتا۔ اب بات کھانا کھانے کے بعد ہی کھلنی تھی۔

اس کے بعد لاکھ ٹمرونے مسکرا مسکرا کر بھدا صیرار ہرڈش اس کے آگے کی ٹمروہ بھوک اڑ جانے کے باعث تھوڑا ہی کھانا کھاپایا۔ حالانکہ ہرڈش اس کی پسندیدہ تھی۔
کھانے کے بعد ٹمروہ برتن اٹھانے لگیں تو ہمیشہ کی طرح تھکے ہونے کے اور ٹمروہ کے منع کرنے کے باوجود موحد نے اس کام میں ان کی مدد کی۔ وہ جلد از جلد ٹمروہ کی آزر دگی اور پریشانی کا مآخذ جاننا چاہتا تھا۔
”میں اور تمہاری ماما اسٹڈی میں بیٹھتے ہیں۔ تم ذرا مزے داری کریم کافی تو بنا کے لاؤ۔“
بابا جان پر سکون تھے۔ ٹمروہ کے برعکس وہ قطعاً ”پریشان نظر نہیں آتے تھے۔ وہ بے بسی سے ٹمروہ کو دیکھنے لگا۔ تو وہ نظریں چرا گئیں۔

”بھئی۔ تمہارے جیسی کافی تو تمہاری ماما بھی نہیں بنا سکتیں۔“ وہ توصیفی انداز میں اس کا شانہ تھپتھپا کر محبت سے بولے اور اسٹڈی کی طرف بڑھے تو ٹمروہ کو اس نے مرے قدموں سے ان کے پیچھے جاتے دیکھا۔
گہری سانس بھرتا وہ چٹن میں چلا آیا۔ پھر پانی بواٹل کرتے کافی پھینٹتے اور پھر کافی بنا کر اس میں کریم ڈالتے ہوئے اس نے ہر ممکنہ پریشانی کو سوچ ڈالا جو ٹمروہ کی اس قدر دل آزاری اور رونے کا باعث بن سکتی ہو۔
پھر ایک دم سے اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

”گڈ گاڈ۔“ اس کی پیشانی کو گرم لہر چھو کے گزری۔ ”کیس بابا جان کی بیماری سے متعلق تو کچھ بات نہیں؟“ دل گہرائی میں کہیں ڈوب کے ابھرا۔

واقعی۔ یہی بات ہوگی۔ وگرنہ بابا جان اتنے سکون اور ماما اتنی ”تھڑولی“ کا مظاہرہ نہ کرتیں۔

اس نے جلدی سے رے اٹھائی اور تیز قدموں سے اسٹڈی روم کی طرف بڑھا۔ اس کا دل اوہام و خدشات سے بھرا ہوا تھا۔ مگر اسٹڈی کے باہر ہی اس کے قدم ٹھٹک گئے۔ اندر سے پہلے بابا جان کا اونچا لہجہ سنائی دیا اور اس کے بعد ٹمروہ کا۔

وہ دروازے پر دستک دے کر اندر آیا تو وہاں خاموشی چھا چکی تھی۔ اس نے رے بابا جان کی رائٹنگ ٹیبل پر رکھی اور ان دونوں کو ایک ایک مگ تمہا کر اپنا مگ ہاتھ میں لیے ماما کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔
ایک نظر میں ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ ٹمروہ کی پلکیں نم تھیں یعنی وہ پھر سے رو رہی تھیں۔

”اب بتائیں۔ کیا بات ہوئی ہے جس نے ماما کو اتنا آزرہ کر دیا ہے؟“

وہ براہ راست بابا جان کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کافی کا گھونٹ بھر کے مسکرائے۔

”بہت خوب موحد۔ ہمیشہ کی طرح لا جواب کافی۔“ وہ بے بس سا ٹمروہ کو دیکھنے لگا۔ مگر وہ سلگتی نگاہوں سے فاران آفندی کی طرف متوجہ تھیں۔

”بات کو گھما میں مت فاران۔! اتنا تو میرے جذبات کا خیال نہیں کیا حقیقت بتاتے وقت جتنا بیٹے کا کر رہے ہیں۔“ وہ چٹخے ہوئے لہجے میں بولیں۔

”مسئلہ موحد کا نہیں تمہارا ہے ٹمروہ۔“ وہ سنجیدگی سے بولے۔

”موحد کی تو پوری زندگی داؤ پہ لگ چکی اس مسئلے میں فاران۔“ وہ ضبط کھو کے چلا میں اور پھر رونے لگیں۔
موحد نے بوکھلا کر اپنا مگ تپائی پہ رکھا اور ٹمروہ کے ہاتھ سے بھی مگ لے کے رکھ دیا۔

”آخر مجھے بھی تو بتائیں ماما۔ بابا جان۔ بات کیا ہے۔ کیوں معمہ بن رہے ہیں آپ دونوں۔“ وہ زنج آگیا تھا۔

”تمہارے بابا جان ہمیں اسی عقوبت خانے میں واپس لے جانا چاہتے ہیں۔ جہاں انسانیت کے بجائے بے حسی بستی ہے۔“ ٹمروہ پھٹ پڑنے والے انداز میں بولیں۔

”ٹمروہ۔“ فاران صاحب کا انداز تنبیہی تھا۔

”مطلب؟“ ”موحد الجھا۔ اس کا تو ذہن بھی اس طرف نہیں جاسکتا تھا جس طرف کا قصد فاران آندی کے بیٹھے تھے۔“

”آغا جان سے بات ہوئی ہے میری۔ وہ مجھے پاکستان بلارہے ہیں موحد۔ بلکہ ہم سب کو۔“
”انہوں نے گویا موحد کے سر پر بم پھوڑ دیا تھا۔ سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ اس نے بے حد بے یقینی سے فاران آندی کا چہرہ دیکھا تھا۔“

”تمام گلے شکوے دور ہو گئے ہیں۔ انہوں نے مجھے معاف کر دیا ہے۔“ وہ مطمئن سے بتا رہے تھے۔
مگر موحد کے ضبط کی حد اس سے زیادہ نہ تھی۔ طیش کے مارے مٹھیاں بھیجنے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
”انہوں نے؟“ ”انہوں نے معاف کر دیا ہمیں؟ معافی تو انہیں ہم سے مانگنی چاہیے تھی بابا جان۔“ وہ غصے سے بولا تو فاران اپنی آواز میں اسے ٹوک گئے۔

”موحد!“
”بالکل صحیح کہہ رہا ہے موحد۔“ ”شمر کی آنکھوں میں آنسو تھے بھرائے لہجے میں بولیں۔“
”کیسی فضول باتیں کر رہے ہو تم لوگ۔ بزرگ معافی مانگتے اچھے لگتے ہیں کیا؟“ وہ جھلائے۔
”ظلم کرتے بھی اچھے نہیں لگتے۔“ ”شمر چیختی تھیں۔ موحد کو بھی اپنی رگوں میں خون کے بجائے تیزاب دوڑتا محسوس ہو رہا تھا۔“

”اگر یہ مذاق ہے تو اسے ختم کر دیں بابا جان۔ پلیز۔“ وہ پھٹی ہوئی آواز میں بولا۔
ضبط کی طنائیں چھوٹی محسوس ہو رہی تھیں اسے۔
”مذاق نہیں ہے موحد! تم بھی اپنا ذہن کلیئر کر لو۔ ہم سب کچھ واٹسٹاپ کر کے پاکستان جا رہے ہیں۔“
انہوں نے قطعی انداز میں کہا تو وہ بے اختیار غصے میں آکر اپنی آواز میں بولنے لگا۔
”نو۔ نیور۔ کبھی نہیں بابا جان۔ میں ان ظالم لوگوں میں کبھی بھی واپس نہیں جانا چاہتا۔ آپ بھول گئے ہوں گے ان کے ظلم، مگر میرا دل ان کی نفرت سے بھرا ہوا ہے اور بس۔“
”معاف کرنے والوں کو اللہ پسند کرتا ہے موحد۔“

”تو یہ انہوں نے اس رات کیوں نہیں سوچا جب ہمیں اپنے گھر سے نکالا۔“
وہ چلا یا۔ اس نے آج تک فاران آندی کے سامنے کبھی اپنی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ مگر آج تو جیسے خون ابل اٹھا تھا اس کا۔

”آپ تو کہتے ہیں کہ میں آپ کے وجود کا حصہ ہوں بابا جان۔ پھر آپ نے ”ہماری“ زندگیوں کا فیصلہ اکیلے کیسے کر لیا؟“

اس کا انداز زخمی اور لہجہ کرجی کرجی تھا۔ ماں کا دل بری طرح سے تڑپ اٹھا وہ موحد سے لپٹ کر رونے لگیں۔
فاران آندی خود کو خلا میں معلق محسوس کرنے لگے۔
کافی کے گلوں سے اٹھتا دھواں معدوم ہوتے ہوئے اب ختم ہو گیا تھا۔ اور ان تینوں کے پاس الفاظ بھی۔



مہراہ آج بے حد خوش تھی۔
آج اس نے یونیورسٹی سے چھٹی کی تھی۔ ایسے ہی خوا مخواہ نہ دکھائی دینے والی دھول صاف کرنے کے لیے حالانکہ طلال کی ماما کا شام کو آنے کا پروگرام تھا۔

ملاحہ 'فرزین' اور 'ترنمین' واپس آئیں تب بھی وہ کبھی گلہ ان کے پھول ٹھیک کرتی تو کبھی کسی پینٹنگ کو جھاڑتی۔
 "بس بھی گرو مسو۔! نہ تو وہ صوفے کے ہتھے پہ آکے بیٹھنے والی ہیں اور نہ ہی کسی وازیا پینٹنگ میں۔"
 ترنمین نے طنز کیا تو وہ بلا وجہ ہی ہنسی۔ آج تو کوئی بات بری نہیں لگ رہی تھی۔
 "اور اگر آغا جان کو طلال پسند نہ آیا تو؟" ترنمین کو مہراہ کی اتنی خوشی کم ہی برداشت ہوتی تھی۔ بے دردی سے بولی تو مہراہ کی مسکراہٹ پھسکی پڑ گئی۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپلی۔ آپ نے کون سا طلال بھائی کو نہیں دیکھ رکھا۔"
 فرزین نے جلدی سے بہن کو ٹوکا تو وہ میگزین کھول کر صوفے میں دھنستے ہوئے شانے اچکا کر لا پرواہی سے بولی۔
 "میں تو آغا جان کی بات کر رہی ہوں۔ ان کی پسند و ناپسند کے اپنے ہی پیمانے ہیں۔ ضروری تو نہیں انجلینا جولی مجھے پسند ہے تو آغا جان کو بھی پسند آئے۔"

"تم فکر مت کرو۔ طلال کی فیملی کو انوائیٹ کر لینا ہی آغا جان کی آدھی پسندیدگی کی علامت ہے۔"
 مہراہ نے سنجیدگی سے اسے جواب دیا تو وہ سر جھٹک کر میگزین کھنگالنے لگی۔
 ہم عمر ہونے کی وجہ سے وہ اکثر و بیشتر مہراہ کے مد مقابل رہتی تھی۔

شام کو نا صرف طلال کی ماما بڑا بھائی اور بھابھی آئے بلکہ طلال بھی ساتھ ہی تھا۔
 ہلکی پھلکی کڑھائی سے مرن شیفون کی زرد اور میرون قمیص اور ٹراؤڈر میں ملبوس شیفون کے دوٹے کو سلیقے سے سر پہ اوڑھے مہراہ آنکھوں میں محض کاجل کی لائینیں کھینچے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ گالوں سے چھلکتی سرخی آج بلش آن کو مات کر رہی تھی۔

"آپلی۔ ماشاء اللہ۔ آپ کو تو آج کسی میک اپ کی ضرورت ہی نہیں۔" فرزین نے بے ساختہ ستائشی انداز میں کہا تو ملاحہ نے چٹاٹ بہن کو چوم لیا۔

"اُف۔" وہ مزید لال پڑنے لگی۔ ہاتھوں سے رگڑ کر چہرے پہ لکھی محبت کی تحریر گویا صاف کرنے کی کوشش کی۔
 "ایک تو میں پہلے ہی نروس ہوں اور سے تم دونوں مجھے کنفیوز کر رہی ہو۔"

"اور تیسرے طلال صاحب بھی آکے بروکھوے کے لیے بیٹھ گئے ہیں۔" ترنمین نے بالوں کو کچھو میں جکڑتے ہوئے لقمہ دیا۔

"ہاں۔ اسے پتا نہیں کیا سو جھی۔ میں نے منع بھی کیا تھا آنے سے۔" مہراہ ابھی۔ فرزین ہنسنے لگی۔

"تو آغا جان سے کیسے ملاقات ہوتی پھر؟"

"ہاں۔ یہ بھی ہے۔" وہ واقعی ابھی ہوئی تھی۔ ترنمین نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھا۔ اور جتانے والے انداز میں بولی۔

"یونیورسٹی فیلوز ہو تم لوگ۔ سارا دن گپیں لگانے میں گزرتا ہے۔ پسند کر کے گھر بلایا ہے اسے۔ اب یہ شرما شرمی کا ڈراما کیسا؟" مہراہ کے کمرے میں ایک دم سے خاموشی پھیلی۔ تیز ہوا ستانے سے مہراہ کو چھو کے گزری تھی۔

"آپلی۔ آپ بات کو ہمیشہ سیرپسلی لے لیتی ہیں۔ مذاق کر رہے ہیں ہم۔" فرزین نے گھبرا کر بات لپٹنے کی کوشش کی مگر وہ یونہی لبوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ لیے نکل گئی۔

"میں ذرا ڈرائیونگ روم کی صورت حال کا جائزہ لے لوں۔" فرزین بے چاری خواجہ چورن گئی تھی۔ بہانے سے کمرے سے نکلنے لگی تو ملاحہ بھی اس کے ساتھ ہی چل پڑی۔

ترنمین کی باتوں نے حقیقتاً "مہراہ کو دھچکا لگایا تھا۔ ایسا کوئی اعتراض تو امی ابویا آغا جان نے بھی نہیں اٹھایا تھا۔"

ہاں یہ ضرور صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اگر طلال اور اس کا خاندان گھر میں کسی کو پسند نہ آئے تو مہراہ اعتراض یا احتجاج کا حق نہیں رکھتی تھی۔ مگر یہ تزمین۔ مہراہ کا دل سلگا۔

یہ ہمیشہ سے ایسی ہے جل نکلتی۔

وہ چڑ کر سوچتی۔ آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگی۔

جب ڈانگ روم سے اس کا بلاوا آیا تو وہ بہت گھبراہٹ کا شکار تھی۔ سب کے بچ۔ طلال کے سامنے۔

”آپ بے فکر رہیں۔ آغا جان انہیں اسٹڈی میں لے گئے ہیں۔“ ملاحہ نے اس کی مشکل آسان کی تو اس نے اطمینان کی سانس لی اس نے اندر جا کے طلال کی فیملی کو سلام کیا۔

بڑی پروقار سی طلال کی ماما اور ماڈرن سی بھالی۔ مہراہ نے پہلی ہی نظر میں تزمین کو عین طلال کی ماما کے پہلو میں بیٹھے دیکھ لیا۔ اب چاہے تائی جان کی تنبیہ نہ نظر میں ہوں یا چچی جان کی۔ مہراہ کو چائے پیش کرنے کے بعد سامنے صوفے پر تائی جان کے پاس بیٹھنا پڑا۔ جبکہ تزمین مسکرا مسکرا کر ایک طرف رکھے صوفے پر بیٹھی طلال کی بھالی نشاۃ سے باتوں میں یوں مصروف دکھائی دی جیسے پتا نہیں کب کی دوستی ہو۔

طلال کی ماما کی باتوں سے مہراہ کے لیے ان کی پسندیدگی ظاہر تھی۔ جب کہ بلال بھائی کبھی مسکراتے ہوئے کچھ بات کر لیتے۔ مگر بھالی نشاۃ تو جیسے قسم کھا کے آئی تھی کہ مہراہ سے کوئی بات نہیں پوچھے گی۔ وہ تو گویا یہاں آئی ہی تزمین سے گفتگو کرنے تھی۔ مگر فی الوقت تو مہراہ کو طلال کی ماما کی اپنائیت بھری باتیں اچھی لگ رہی تھیں۔

جاتے ہوئے طلال کی ماما نے اس کے ہاتھ پہ ہزار ہزار کے اچھے خاصے نوٹ رکھ دیے۔

”میرا بیٹا دوستی سے آنے والا ہے۔ جو بھی رسم ہوگی اس کے آنے کے بعد طے ہوگی۔ فی الوقت آپ زبان پہ اعتبار کریں۔“

آغا جان نے کہا تھا۔ انہیں طلال سے مل کر مایوسی نہیں ہوئی تھی۔ تایا جان اور چچا جان بھی مطمئن تھے۔

”واہ واہ۔ آپ بڑی امیر ہو گئی ہیں۔“

ان کے جانے کے بعد ملاحہ نے مہراہ کو چھیڑا۔

”میں تو اتنی دعاؤں مانگ رہی تھی کہ آغا جان ہاں کہہ دیں بس۔“ فرزین بھی خوش تھی۔

مہراہ نے بڑی خوشی اور ترنگ میں آکر دونوں کو دو دو ہزار تھما دیے۔

”یا ہو۔“ ان دونوں نے نعولگایا تو تپتے چہرے کے ساتھ وہ ہنس دی۔



زرنگار کی رنگت آنے والے کو دیکھ کر فح پر گئی۔

وہ جیسے صدیوں کی مسافت طے کر کے آیا تھا۔ تھکے ماندے مسافروں جیسی چال کا بو جھل پن صاف ظاہر تھا۔

مگر زرنگار کو سامنے کیا کروہ ایک نئی زندگی جی اٹھا۔

”تم۔ تم یہاں کیوں آ گئے۔ کس نے بتایا تمہیں؟“ وہ متوحش سی اسے پلٹ کر دروازے کی چٹخنی لگاتے دیکھ رہی تھی ایک دم زور سے چلانے لگی۔

”دروازہ کیوں بند کیا ہے تم نے۔ کنڈی کھولو۔ اماں۔ دلاور۔“

وقار نے آگے بڑھ کے اسے شانوں سے تھام کے جھٹک دیا تو وہ تھم سی گئی۔

”یہی چاہتی ہوتا تم۔ شادی کا پروپوزل دیا تو تمہیں پسند نہیں آیا۔ کوٹھے پر رہو گی تو ایسے ہی کوئی آ کے چٹخنی

لگا لے گا۔ تو پھر میں کیا برا ہوں؟“

وہ جلتے سلگتے پتے انداز میں کہہ رہا تھا۔ اور اس سے بھاگتے بھاگتے تھک جانے والی۔ اسے ہمیشہ کے لیے کھو دینے کے افسوس میں مبتلا زرنگار اسی کے سینے پر سر رکھ کے رو دی۔

وقار کا سارا غصہ بھک سے اڑ گیا۔ تو احساسات سبک رو ہونے لگے۔

”کس قدر بے وقوف ہو تم زری۔ میری سانسیں چھین کے اور اپنی سانسیں گنوا کے جینے کو زندگی کہتی ہو تم۔“ اس کے ریشمی بالوں پہ زری سے ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ مدھم لہجے میں کہہ رہا تھا۔

زرنگار یہ آیا سارا غصہ سارا طیش۔ بخارات برہ۔ کہ اڑ گیا تھا۔

”میں تمہاری زندگی برباد نہیں کرنا چاہتی وقار۔ میں تمہیں اس دنیا میں سر اٹھا کے جیتے دیکھنا چاہتی ہوں۔“ وہ چہرہ اٹھا کے اسے دیکھ رہی تھی۔

اس سے صرف چند انچ کے فاصلے پر وہ بے داغ چاند تھا۔ وقار بے اختیار مسکرایا۔ اور اپنی بات پہ زور دیتے ہوئے بولا۔

”اور میں تمہیں برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں تمہیں عزت کی زندگی دینا چاہتا ہوں۔“

وہ اس سے دور ہو کر بلیک کے کنارے جا بیٹھی۔ ”یہ راہ کانٹوں سے بھری ہے وقار۔ گلاب تو بس اوپر ہی اوپر دکھائی دیتے ہیں۔“

”میں ان چند گلابوں کے لیے اپنی تمام زندگی داؤ پہ لگانے کے لیے تیار ہوں زری۔ کیونکہ ان گلابوں کی اہمیت میں اچھی طرح جانتا ہوں۔“

وہ جذباتیت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ زرنگار غم آنکھوں سے مسکرا دی۔ پھکی سی مسکراہٹ بھی اس کے حسن کو گمنانے میں ناکام رہی تھی۔

”میرے ساتھ تم کبھی سر اٹھا کے نہیں چل سکو گے وقار۔ تمہاری فیملی تمہارا خاندان۔ کس نام سے متعارف کرواؤ گے مجھے۔“

”مسز وقار آفندی کے نام سے۔“ وہ برجستہ بولا۔ اتنے ہفتوں کی نجل خواری کے بعد زرنگار کو پالنے کا سرور ایسا تھا کہ اس کا سارا چونچال پن لوٹ آیا تھا۔

”یہ صرف کہنے میں ہی آسان ہے وقار۔ جذباتیت سے باہر نکل کے سوچو۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”تم سے محبت کرتی ہوں۔ کل کلاں یہ محبت میرے سامنے شرمندہ ہو یا مرجائے۔ میں یہ نہیں دیکھ سکتی۔ تو کیوں نہ اچھے دوستوں کی طرح پچھڑ جائیں ہم۔“ وہ مضبوط قدموں سے چلتا اس کے سامنے آیا۔

”کیا میں تمہیں اپنے قول سے پھرنے والا لگتا ہوں؟“ وہ ناراضی سے گویا ہوا۔

”میں تمہیں کسی آزمائش میں نہیں دیکھ سکتی وقار! مجھ سے شادی کے بعد تمہارے لیے زندگی بہت مشکل ہو جائے گی۔ پلیز۔ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”شش۔“ وقار نے اس کے لبوں پہ اپنی انگلی رکھ دی۔

”بہت ہو گیا سمجھنا سمجھانا۔ اب بس۔“ وہ اس کی تحیر سے کھلی آنکھوں میں ذرا سا جھک کے دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

”میں اور تم شادی کر رہے ہیں اور بس۔“ زرنگار نے اس کا ہاتھ اپنے لبوں پر سے ہٹاتے ہوئے متوحش انداز میں پوچھا۔

”اور تمہارے گھر والے۔۔۔؟“

”تم میرے ساتھ دکن بن کے جاؤ گی تو کون ہو گا جو وقار آفندی اور اس کی بیوی کو عزت نہ دے۔ جسے میں قبول کر چکا اسے ان کو بھی قبول کرنا پڑے گا۔“

وہ دھیمے مگر مضبوط لہجے میں کہتا اس کے سارے اعتراضات بہالے گیا تھا۔ زرنگار کو لگا تمام عمر کو ملکوں پہ ننگے پاؤں چلتے ہوئے کٹنے والی زندگی یک لخت پھولوں بھری رہ گزر رہی تھی۔

وہ کھل کے مسکرا دی۔



اگلے روز وہ ترائین کے ساتھ یونیورسٹی پہنچی تو ہر ڈیری ملک چاکلیٹ بار ہاتھ میں پکڑے اسٹوڈنٹ نے اسے منگنی کی مبارکباد دی۔

ترائین حیران تو مہراہ پریشان۔

”واہ پار چپکے چپکے۔۔۔ کسی کو بلایا بھی نہیں۔“ کئی ایک دوستوں نے گلے کیے۔ چاکلیٹ کھاتے ہوئے منہ بنایا۔

”یہ افواہ اڑائی کس نے؟“ مہراہ کے منہ سے نکل گیا تو سب نے حیرت سے چیخیں ماریں۔

”افواہ۔ ادھر طللال نے چاکلیٹس کے ڈبوں پہ ڈبے اس منگنی کی خوشی میں پوری یونی میں بانٹ دیے اور تم ابھی بھی اسے افواہ کہہ رہی ہو۔“ اس کی دوست نے اسے ستائش بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بتایا تو اس کو ہنسی آگئی۔

”بے وقوف ہے وہ تو۔۔۔“ اس کے لہجے سے پیار چھلکتا تھا۔

”ہوں۔۔۔ چپ۔“ ترائین سر جھٹکتی اپنی کلاس کی طرف برہم گئی، مگر اب مہراہ کو اس کی رتی بھر بھی پروا نہیں تھی۔ وہ محتاط نظروں سے ادھر ادھر طللال کو ڈھونڈتی رہی۔ اب تو کسی سے اس کا پتا بھی نہیں پوچھ سکتی تھی۔ ہر کوئی چاکلیٹ کھاتا اسے منگنی کی مبارکباد دے رہا تھا۔ وہ تھک کر اپنے مخصوص سفیدے کے درخت کی طرف برہم گئی۔ ابھی کلاس شروع ہونے میں تھوڑا وقت تھا۔ وہ درخت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے صبح کی ٹھنڈی ہوا کو محسوس کر رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اپنی روح کے ہلکے پن کو بھی۔ تب ہی بھاگتے قدموں کی آواز نے اسے چونک کر آنکھیں کھولنے پہ مجبور کر دیا۔

”یہ لو۔۔۔“ وہ چاکلیٹ یا اس کی جانب بڑھا رہا تھا۔ مہراہ کے ہونٹوں پر خوب صورت سی مسکراہٹ پھیلی۔

”یہ کیا ہے۔۔۔؟“ جان بوجھ کر تنک کر پوچھا۔ وہ اب چاکلیٹ کا رپڑا بنا رہا تھا۔

”میری منگنی ہو گئی۔“ اطمینان سے بتایا۔ مہراہ کے دل میں گدگدی سی ہوئی۔ مگر فی الحال تو اسے جھاڑنا ضروری تھا۔

”کس قدر فضول آدمی ہو تم۔ پوری یونیورسٹی میں دھوم مچا دی منگنی کی۔ ابھی میں سب کو بتا دیتی کہ کوئی منگنی ونگنی نہیں ہوئی تو سب چاکلیٹس اگل دیتے۔“

”جناب آغا جان نے دل و جان سے پسند کیا ہے مجھے۔ اور تمہارے ابو اور چچا جان تو میرے متاثرین میں شامل ہو گئے ہیں باقاعدہ۔“ وہ لمبی لمبی چھوڑ رہا تھا، مگر نگاہ اس کے دل فریب چہرے اور خوب صورت مسکراہٹ پر تھی۔ کل تک جو اندیشے تھے آج اڑ چھو ہو چکے تھے۔

وہ بے ساختہ ہنسی۔ ”اف۔۔۔ یہ تمہاری خوش فہمیاں۔۔۔“

”میں تو انگوٹھی جیب میں ڈال کے لے گیا تھا۔ تمہارے آغا جان نے ٹانگ اڑا دی درمیان میں۔“ آدمی

چاکلیٹ اپنے منہ میں ڈال کر وہ منہ بنا کر بولا۔ اور باقی چاکلیٹ اسے تھما دی۔
 ”چچا جان آرہے ہیں دوپہنی سے۔ وہ بھی شریک ہوں گے فنکشن میں اور ابھی میری بڑی سسٹر نے آنا ہے
 مسقط سے۔“ مہراہ نے مسکراتے ہوئے تفصیل بتائی۔

طلال نے جیب میں ہاتھ ڈال کے ڈبیہ نکالی۔ مہراہ حیران ہوئی۔ وہ تو ایسے ہی سمجھ رہی تھی، مگر وہ واقعی ڈبیہ
 کھول کے انگوٹھی نکال رہا تھا۔
 ”یہ کیا ہے۔۔۔؟“

”یہ میں اسی نیت سے لے گیا تھا اگر اجازت ملی تو پہنا دوں گا، مگر بزرگوں کے اپنے ہی بڑے ضروری مسئلے
 مسائل تھے سوا اب یہ۔۔۔“

شکایتی انداز میں کہتے کہتے اس نے مہراہ کا ہاتھ تھام کر وہ نازک سی انگوٹھی اس کی انگلی میں ڈال بھی دی۔
 ”طلال۔۔۔“ اس کی رنگت میں گلال گھلنے لگا۔ ”تھوڑا ہی تو وقت ہے۔ سب کے سامنے پہنانا۔۔۔“
 ”وہ بھی پہناؤں گا۔ یہ تو تمہاری نیت سے لی تھی۔ پہنا دی۔“ وہ بہت چاہت سے بولا تھا۔ مہراہ کا دل بہت
 ترنگ میں دھڑکا۔

”گھاس شروع ہونے والی ہے۔“ وہ بہانے سے وہاں سے ہٹی۔ تلال کی محبت پاش نگاہوں کا سامنا کرنا کوئی
 آسان کام تھا کیا، مگر وہ ہیں ہری گھاس پہ لیٹ گیا اور گردن تلے ہاتھ باندھ لیے۔ مہراہ کے قدم ٹھٹکے۔
 ”کیا ہوا۔۔۔ تم نہیں چل رہے؟“

”اتنی خوب صورت شکل دیکھنے کے بعد اب سر تعسین ظفر کو کون دیکھے۔“
 وہ شرارت سے کہتے ہوئے آنکھیں موند گیا تو وہ اس کے جواب پر ہنستی ہوئی واپس پلٹ گئی۔



”میں نے اس ماہ کے آخر کی سیٹیں بک کر والی ہیں پاکستان کے لیے ہم تینوں کی۔“
 کھانے سے فارغ ہوتے ہی فاران آفندی نے بیوی اور بیٹے کو مطلع کیا تھا۔ بڑے دنوں بعد یہ موضوع پھر چھڑا
 تھا۔ صاف اور سنجیدہ لب و لہجہ۔ جہاں کسی بحث و مباحثے کی گنجائش نہ تھی، مگر خاموش رہنا موحّد کی تو گویا موت
 تھی۔

”بابا جان! آپ زیادتی کر رہے ہیں۔“
 ”معاف کرنے والے کا مقام ظالم سے بلند ہوتا ہے موحّد۔“
 ”تو وہ کیوں نہ بنے معاف کرنے والے؟“ وہ چٹکا۔
 ”ابھی بھی آپ نے ہی معافی مانگی۔۔۔“ ثمر پھٹ پڑیں۔

”معافی مانگنے سے میں چھوٹا نہیں ہو گیا مگر۔ میرے والد ہیں وہ۔ ہاں۔ میں مانتا ہوں کہ میری غلطی نہیں تھی،
 مگر پھر بھی ان کا مقام ایسا ہے کہ میں بنا قصور کے بھی ان سے معافی مانگ سکتا ہوں۔“
 ”اور میں۔۔۔ میں اپنے موحّد کی موت معاف کروں انہیں؟ نمونیا میں مبتلا تھا میرا بچہ اور کیسے ظالموں کی طرح
 سرتار یک رات میں ہمیں گھر سے در بدر کرویا آپ کے آغا جان نے۔“ وہ رونے لگیں۔

”تمہارا بیٹا۔۔۔ تمہارا موحّد تمہارے پاس ہے مگر۔ بھول جاؤ ان خوف ناک لمحات کو۔ گزر گیا وہ سب۔“
 انہوں نے سختی سے کہا تو موحّد نے آگے بڑھ کے ماں کو گلے سے لگالیا۔

”ماؤں کے لیے اتنا آسان نہیں ہوا کرتا بچوں کی تکلیفیں بھلانا کیونکہ ان کے سینوں میں باپ کا دل نہیں

ہوتا۔ ”ثمرہ نے تلخی سے جواب دیا تھا۔

”مسافر کو ایک نہ ایک دن واپسی کا سفر ضرور طے کرنا پڑتا ہے ثمرہ! ہمارا بھی لوٹنے کا وقت آگیا ہے۔ صبر سے کام لیا ہے تو اب اللہ کا شکر بھی ادا کرو کہ اس نے یہ دن بھی دکھایا۔“ وہ ضبط سے بولے۔

”فاران پلیز۔ میرے دکھ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔“

”اتنے سالوں سے تمہارے ہی دکھ کو تو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اب تم میری خوشی کو سمجھو ثمرہ۔“ ان کے لب و لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ ثمرہ بس خاموشی سے آنسو بہانے لگیں مزید کچھ نہیں بولیں۔

”اور تم۔“ وہ لب بھینچے ثمرہ کو اپنے ساتھ لگائے کھڑے موحد سے مخاطب ہوئے۔ ”سب کچھ سمیٹو اس ایک ماہ میں۔ ہم لوگ پاکستان شفٹ ہو رہے ہیں۔ اور اسے میری ریکورسٹ سمجھنا۔“

موحد کے پاس اعتراض کا ایک لفظ نہ بچا تھا۔ وہ دانتوں پر دانت جمائے کھڑا رہ گیا۔



گھر میں دل فریب سا شور و ہنگامہ مچ گیا جب ملائکہ نے سب کو حیران کر دیا اور اپنے بیٹے یوشع کے ساتھ ”آفندی ہاؤس“ آگئی۔ لڑکیوں کی ہاؤ ہو۔ چیخ و پکار۔

”اف۔۔۔ یہ سربراہ ہے۔ ہارٹ اٹیک ہو جاتا خوشی سے مجھے۔“ مہراہ کی بہن سے بہت دوستی تھی اسے بھیجتے ہوئے بولی۔ تو وہ ہنسنے لگی۔ دو سالہ یوشع وہاں صرف ماں اور باپ کو دیکھنے کا عادی تھا۔ یہاں اتنے سارے ہاتھوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر روتا ہوا ماں سے لپٹ گیا۔ تائی جان نے فوراً ”ان ماں بیٹے پر سے روپے وار کے کام والی کے ہاتھ کسی غریب کو بھجوائے۔“

گھر میں خوشی کی لہری دوڑ گئی۔

”اور تم سناؤ۔ طلال کیسا ہے؟“ فرصت سے بیٹھتے ہوئے ملائکہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو وہ آنکھ دبا کر شرارت سے بولی۔

”بہت اچھا ہے۔“

”اوہو۔ اچھا ہے تب ہی تو آغا جان نے اپروول دیا ہے۔“ وہ بھی ہنسی تھی۔

”وہ تو پکی منگنی کے چکر میں آیا تھا۔“ مہراہ نے الٹا ہاتھ لہرا کے ملائکہ کو رنگ دکھائی اور اتر کر بولی۔

”مگر آغا جان نے بڑے چاچو کے آنے کی شرط رکھ دی۔“ آخر میں منہ لٹکایا۔

”اللہ خیر کرے۔ سالوں بعد واپسی ہو رہی ہے۔ یہ کام نمٹا لیتے تو اچھا تھا۔ بھئی ہر کسی کا اپنا موڈ اپنا مزاج۔“

تائی جان نے اندر داخل ہوتے آدھی بات سنی تھی تشویش سے بولیں۔

”ثمرہ تو یوں بھی تنگ مزاج سی تھی۔ بیٹا پتا نہیں کیسا نکلا ہوگا۔“

انہوں نے سوئے ہوئے یوشع پر چادر تھیک کرتے ہوئے ناک چڑھائی۔

وہ بہت سخت مزاج کی خاتون تھیں۔ جن کے چہرے پر مسکراہٹ صرف اپنی اولاد کے لیے آتی تھی۔

”آغا جان نے ایسے ہی پروگرام آگے پہ ڈال دیا۔ انہوں نے بھلا آکر کون سی دھالیں ڈال لینی ہیں۔“

”رشتہ تو ان سے ہے نا امی اور پھر اس ماہ کے آخر تک وہ آرہے ہیں تو ان کے آنے سے پہلے ہی فنکشن بھگتا

لینا کچھ مناسب نہ لگتا۔“ ملائکہ نے رسائیت سے کہا۔

”ارے چلو ہٹو۔“ انہوں نے نخوت سے ہاتھ جھٹکا۔ ”رشتہ ہوتا تو باپ سے نبھاتے۔ بھائی سے نبھایا اس

نے۔ اور اسی ضد میں گھر چھوڑ گیا۔“

”آغا جان نے خود نکالا نہیں گھر سے امی۔“ ملائکہ نے سنی ہوئی معلومات کے مطابق لقمہ دیا۔
 ”اب بھی تو معافی مانگی نا۔۔۔ تب ہی اپنی غلطی کا احساس کر کے معافی مانگ لیتا تو یوں بن باس نہ کاٹا پڑتا۔“
 انہوں نے تیوری یہ بل ڈالے تھے۔
 ”لے کے بد شکونی ڈال دی ہمارے کام میں۔“
 وہ بات ختم ہونے کے بعد بھی بوڑھتی رہی تھیں۔



دن جیسے پر لگا کے اڑے اور آج شام کی فلائٹ سے فاران آفندی چودہ سالوں کا بن باس کاٹ کے واپس لوٹ رہے تھے۔
 ”شکر خدا کا۔۔۔ تمہارے چاچو جان تو ظالم سماج بن گئے ہمارے درمیان۔ مہینہ گزارنا مشکل تھا۔“ طلال کے سکھ کا سانس لینے پر مہوا خوب ہنسی۔ اور پھر ادھر شام آئی اور گزر بھی گئی۔
 سب پریشانی سے کال پہ کال ملتے رہے، مگر فاران کے دونوں نمبرز بند آرہے تھے۔ ساری فلائٹس چیک کر لیں، مگر مسافر نداد۔ اسکا پپر بھی وہ موجود نہ تھے۔
 وہ رات شدید پریشانی کی رات تھی۔ ایرپورٹ انکوائری سے پتا چلا کہ فاران آفندی اینڈ فیملی کی سیٹیں کنفرمڈ تھیں، مگر وہ آئے نہیں تھے۔
 ”مبین۔۔۔ تم کم از کم ایڈریس تو لیتے وہاں کا اس سے۔“ آغا جان کا دل سخت بے چین تھا۔ کبھی اٹھتے کبھی بیٹھتے۔ چڑ کر مبین آفندی سے بولے۔
 ”مجھے خیال ہی نہیں آیا آغا جان۔ یہی سوچا کہ اب تو واپس آرہا ہے ایڈریس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔“ انہوں نے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے دبے لفظوں میں وضاحت بھی کر دی۔
 پریشانی سی پریشانی تھی۔
 اور پھر ایک اداس سی سہ پہر جب آسمان کا رنگ عجیب سا ہو رہا تھا اور دلوں میں بھی اواہام سپرہ ڈالے بیٹھے تھے۔
 فاران آفندی کا ایک نمبر کھلا ملا تو مبین، نمبر ملاتے آغا جان کے کمرے کی طرف بڑھے۔
 ”ہاں۔۔۔ ہیلو۔۔۔ فاران۔۔۔“ رابطہ ملنے پر انہیں سکون ہوا، مگر وہ سری جانب کوئی اجنبی سی آواز تھی۔
 ”کس کا فون ہے مبین۔۔۔ کیا فاران ہے؟“
 آغا جان بے چینی سے اٹھ کر ان کی طرف بڑھے تو دوسری طرف کی بات سنتے مبین آفندی کو جیسے ٹھوکر سی لگی اور وہ اپنے عمر رسیدہ باپ کے بازو کا پے اختیار سہارا لے بیٹھے۔
 ان کی رنگت یکلخت سفید پڑ گئی تھی۔ آغا جان نے ان کے ہاتھ کی کپکپاہٹ بہت اچھی طرح اپنے بازو پر محسوس کی تھی۔
 ”مبین۔۔۔ مجھ سے بات کراؤ۔ فاران ہے کیا؟“ وہ متوحش زدہ سے ہوئے، مگر مبین آفندی کی آنکھوں میں چمکتی نمی نے انہیں سن سا کر دیا۔ مبین آفندی کا موبائل گر گیا۔
 ”فاران۔۔۔ نہیں ہے آغا جان۔۔۔“ وہ کرسی پر ڈھے گئے۔ آغا جان کے دل میں درد کی شدید لہری اٹھی۔
 مبین آفندی کا ٹوٹا ہوا انداز اور آنکھ میں چمکتی نمی ایک ہی اطلاع دے رہے تھے۔
 فاران نہیں تھا۔ فاران نہیں ”رہا“ تھا۔ ان کے ذہن میں جھکڑ سے چل پڑے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ہنتِ سحر



کھڑکیوں کے پار مدہم سردرات کافسوں طاری
تھا۔ دھند میں لپٹے درودیوار میں دکھائی پڑتی روخنیاں
نظر آتی تھیں۔ میں بیڈ پر بیٹھی اس کی عادات و
حرکات کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے پردے برابر کیے
تھے۔ بیٹر آن کیا تھا۔ مجھ پر کبیل برابر کیا تھا۔ اور اب وہ



Downloaded From
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk



ستواں ناک کی نوک پر عینک ٹکائے، ریوالنگ چیئر پر گھوم رہا تھا۔ اس کی آنکھیں گہری سی تھیں۔ اور چہرے پر بلا کا اطمینان اور سکون تھا۔ ٹیبل لیمپ جل رہا تھا، جس کی روشنی ترتیب سے اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

اس نے مجھے دیکھا۔ ”مادام۔۔۔ آج آپ کون سی کہانی سننا پسند کریں گی؟“

”کوئی سی بھی سناؤ۔“ میں نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ حرکت کرتی کرسی رکی۔

”دو ستاروں کی میجک اسٹوری سناؤں؟“ استفسار کیا گیا۔

”پہلے تو کبھی تم نے میرے کمرے پر عمل نہیں کیا۔ آج میری پسند کیسے اتنی اہم ہو گئی؟“

میں نے گہری نظروں سے اسے دیکھا، مگر وہ کچھ نہیں بولا۔ کمرے میں چھائی خاموشی کا پردہ چاک کرتی آواز اس کی تھی یا دیوار پر لگے وال کلاک کی۔ وہ کرسی پر گھومتا ہوا ”Two stars“ سنا رہا تھا اور میں چپ چاپ سن رہی تھی۔ کہانی کے ”درمیان“ میں بولنا روکنے کے خلاف تھا۔

”نیلے آسمان پر دو ستاروں کا ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ جہاں وہ رہتے تھے۔ ہنستے تھے۔ کھیلتے تھے ان کے گھر کے گرد بادلوں کی سفید برف کی سی دیواریں تھیں جن کی اونچائی ان کے خوب صورت گھر کو سورج کی روشنی سے بچاتی تھی۔ ان کے گھر کے کھیت والے باغ میں چیریز، اسٹرابریز کے درخت تھے۔ وہاں تتلیاں اڑتی رہتی تھیں۔ آپ سن رہی ہیں نا؟“ گھومتی ہوئی کرسی کو روک کر ناک سے پھسلتی عینک کو ٹھیک کیا تھا اور پھر خفگی بھری نظر مجھ پر ڈالی تھی۔

میں نے مدھم سی آواز میں کہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ ایک۔۔۔ میں ”سب“ سن رہی ہوں۔ تم کہانی مکمل کرو۔“ مجھے ادھوری کہانیوں سے خوف آتا تھا۔ خاموشی میں اس کی آواز کا اتار چڑھاؤ گول گول گھومنے لگا تھا۔ اب ٹیبل لیمپ کی روشنی اس کی

پیشانی پر ابھرتی شکنوں پر سیدھے سرخ سے گر رہی تھی۔

”پھر ایک دن سرخ آندھی نے بادلوں کے گھیرے کو چیر دیا تھا اور سورج کی شعاعوں سے اسٹرابریز کے درخت اجڑ گئے اور تیلیوں کے پنکھ پکھل گئے۔ دونوں ستارے جلنے لگے تھے۔ آخر کار ایک ستارے نے اپنا مدار چھوڑ دیا اور دھند میں کہیں گم ہو گیا۔ وہ آج تک نہیں ملا اس کا سا تھی ستارہ اسے نگر، نگر ڈھونڈتا رہا، مگر وہ ملا ہی نہیں۔ اب وہ ستارہ کھیلتا بھی نہیں۔ ہنستا بھی نہیں۔۔۔ وہ اپنی جگہ منجمد ہو گیا ہے۔ آج تک اس کی حالت نہیں بدلی۔ باقی ستارے اس کے غم میں اپنی ”جوڑیاں“ توڑ دیتے ہیں، مگر وہ ستارہ ساکت ہے۔“

وال کلاک کی ٹک، ٹک ڈوبتی ابھرتی رہی۔ طویل لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے سر اٹھا کر ایک کو دیکھا تھا۔ اس نے کتاب بند کر کے ٹیبل کی دراز میں آہستگی سے رکھ دی تھی اور ناک پر پھسلتی عینک کو کور میں ڈال کر ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

اسے پتا تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ وہ آہستگی سے اٹھا اور سوچ بورڈ کے قریب جا کر ٹیوب لائٹ بند کر دی۔ کمرے میں اب صرف ٹیبل لیمپ کی ملجی سی روشنی کا ہالہ دیواروں پر لرزے لگا تھا۔

ایک دوبارہ ریوالنگ چیئر پر بیٹھ چکا تھا۔ ساکت حالت میں۔ دونوں ہاتھ ٹھوڑی پر جمائے ہوئے اب میری ”باری“ تھی۔ کہانی سنانے کی۔ وہ ”کتابوں“ سے کہانیاں سنا تا تھا، مگر میں۔۔۔ میں ”زندگی“ سے اخذ کی گئی کہانیاں سناتی تھی۔ کمرے میں حرارت پھیل گئی تھی۔

”میں تمہیں کون سی کہانی سناؤں؟“ میں نے پوچھا تھا۔

”کوئی سی بھی سنا دیں۔“ اس کی گہری آنکھوں میں ”کچھ“ تھا۔ میں نے خود کو برف کے قلعے میں محسوس ہوتا محسوس کیا تھا۔

میں نے دونوں ہاتھوں کو گود میں رکھا ہوا تھا۔

”چلو۔ میں آج تمہیں زمین کے دو پرندوں کی کہانی سناتی ہوں۔“ میں نے کہا۔ وہ ”چپ“ بیٹھاس رہا تھا۔ کیونکہ کہانی کے ”درمیان“ بولنا رولز کے خلاف تھا۔

اور وہ رولز فالو کرنے میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔

”زمین پر دو پرندے رہتے تھے۔ ان میں بچپن ہی سے بہت دوستی تھی۔ چڑیا اور چڑیا۔ دونوں اکٹھے اڑان بھرتے تھے۔ کھجوروں کے باغوں میں شرارتیں کرتے تھے۔ وہ دونوں اچھے دوست تھے پھر ان کے والدین نے ان کی شادی کر دی تھی۔ وہ خوش تھے بہت خوش۔ پھر اللہ نے انہیں ایک چھوٹا سا ننھا منا سا بچہ دیا تھا۔ انہوں نے بچے کو پالا پوسا، بڑا کیا پھر اس کی بھی شادی کر دی اور پھر دونوں کو اللہ نے ایک اور ننھا بچہ دیا۔ جو ان کے بیٹے کا بیٹا تھا۔ وہ بہت خوش تھے۔ مگر۔؟“ برف کے قلعے پر حرارت گرنے لگی تھی۔ میری آنکھ سے آنسو ٹپک کر کمر کے کمرے میں گم ہوتا گیا۔

”پھر کیا ہوا؟“ ایک شہریار نے ”رولز“ توڑا تھا۔

ہمیشہ کی طرح۔

”پھر چڑے کو اللہ نے بلالیا اور چڑیا اکیلی رہ گئی۔ وہ بھی تمہاری کہانی کے ستارے کی طرح مجھد ہو گئی۔“ اندھیرے میں ٹیل لیمپ کی ملجی روشنی میں بھی میرے ”آنسو“ ایک شہریار نے دیکھ لیے تھے۔ وہ کرسی گھماتا ہوا سوچ بورڈ کی جانب بیٹھا تھا۔ یوب لائٹ کی دودھی سی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ وہ کرسی پر ہی بیٹھے بیٹھے میری طرف بیڈ کے نزدیک آیا تھا۔

میرے دونوں ہاتھ تھامے، انہیں چومے اور پھر میرے آنسو پونچھنے لگا۔ وہ دس سالہ لڑکا مجھے ”تسلی“ دے رہا تھا۔

”آپ مت روئیں۔ چڑیا اکیلی نہیں ہے۔ اللہ نے ”ننھا چڑا“ ایک بھی تو بھیجا ہے نا آپ کے لیے۔“ میں نے اس ذہین آنکھوں والے لڑکے کی پیشانی

چومی۔

”اب اگر آپ روئیں تو میں بھی آپ کے ساتھ رو دوں گا۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ دیوار پر لگی پینٹنگ میرے سامنے تھی۔ سفید فروالا گھوڑا جس کے پاؤں اٹھے ہوئے تھے۔

”آپ جانتی ہیں نا کے میں روتے ہوئے کتنا برا لگتا ہوں۔“ میں جانتی تھی وہ کتنا برا ”روتا“ تھا۔

”ہاں۔ میں ”اچھی“ طرح جانتی ہوں۔“ وہ مڑا یوب لائٹ آف کی اور میرے قریب لیٹ گیا۔ میں نے کمرے برابر کیا۔ اس نے کمرے اٹھایا۔ مجھے دیکھا۔ مسکرایا۔

”میں آپ کے ساتھ ہوں۔ ہوں نا۔؟“ میں نے سر ہلادیا۔

روشنیاں گل ہو گئی تھیں، مگر وال کلاک کی ٹک ٹک گو بجتی رہی۔ کھڑکیوں کے پار بریلی دھند پر تے آسمان پر اب بھی ”ستاروں“ کی ”جوڑیاں“ ٹوٹ رہی تھیں۔



میں لاؤنج میں کھڑی بیگ کی زپ بند کر رہی تھی۔ تائی امی غصے میں لاؤنج کا دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر آئیں۔

”تیلعل۔ گارڈن سے گلاب تم نے توڑے ہیں؟“ وہ صاف رنگ کی تھیں۔ غصے میں ان کا چہرہ قندھاری انار کی طرح سرخ ہو جاتا تھا۔ اب بھی ہو رہا تھا۔ میں کمال اطمینان سے زپ بند کرتی واپس پلٹی تھی۔

”جی نہیں تائی۔ میں نے نہیں توڑے۔“ وہ چپ سی آگے بڑھ گئیں۔

غالب سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ اس کا اسپورٹس بیگ کندھے پر لٹک رہا تھا۔

”چاچو۔ ہارن پر ہارن دے جا رہے ہیں اور تم اسٹیجوبی کھڑی ہو۔“ میں نے آواز کی طرف دھیان دیا

ابو نے بیک مرر سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ”آخر تم دونوں کب تک ایک دوسرے کے کام کرتے رہو گے؟“

غالب نے جواب دیا تھا۔ ”Till death“ (آخر دم تک)۔

ٹریفک کے شور میں آواز دب سی گئی تھی۔ ابو نے سنا تھا یا نہیں، مگر میں نے ”سن“ لیا تھا۔ ہم اچھے دوست اچھے ساتھی تھے۔ زندگی کی صبحیں شاملیں اکٹھے گزرتی تھیں۔ ہم جب تک ایک دوسرے کو دیکھ نہیں لیتے تھے، پرسکون نہیں ہوتے تھے ہم ایک دوسرے کے ”وجود“ کا حصہ تھے۔



بریک ٹائم میں ہم اسپورٹس گراؤنڈ میں واک کرتے تھے اور دنیا جہان کی گپیں لگاتے تھے۔ اس دن بھی یہی کر رہے تھے۔ ہم نے چپس کافل سائز پیکٹ لے لیا تھا جو میرے ہاتھ میں تھا اور ہم چلتے ہوئے چپس سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔

”تم نے تائی کو کیوں نہیں بتایا کہ وہ روز میں نے ان کے گارڈن سے توڑے تھے“ میں نے پوچھا تھا۔ ”ویسے ہی۔ مجھے پتا تھا کہ تم نے اپنی ڈرائنگ نوٹ بک میں لگائے ہوں گے۔“

”تم بہت اچھے ہو۔“

”ہاں اور تم بہت کم اچھی ہو۔“ وہ مسکرایا تھا۔

”اچھا تم نے میتھ کے ٹیسٹ کی تیار کر لی۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، مگر کیا تم نے نہیں کی؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ غالب۔۔۔ وہ رات مجھے جلدی نیند آگئی تھی نا۔ اب کیا ہوگا“ مس زبیری تو مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گی۔“ میں بہت پریشان تھی۔ وہ جو میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کھم سا گیا۔

”میں ہوں نا۔۔۔ فکر مت کرو۔ ابھی بریک آف ہونے میں وقت باقی ہے۔ میں تمہیں سمجھا دیتا

تو پتا چلا واقعی ابو ہارن دے رہے تھے۔ ہم دونوں اکٹھے آگے بڑھے تھے۔ سیڑھیاں پھلانگتے پورچ میں آئے، ہیگز گاڑی میں پھینکے۔ میں نے کار کا دروازہ کھولا اور ہم دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے تھے۔

ابو نے جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔ صبح کے وقت روڈ پر کھماگھی سی بھی اخبار بیچتے لڑکے۔ دودھ والے۔۔۔ برے برے منہ بناتے اسکول جاتے ہوئے لڑکے۔۔۔ میں شیشوں کے پار دیکھ رہی تھی۔ ہمیشہ سے ہی یہ میرا دلچسپ ”مشغلہ“ رہا تھا۔

”بات سنو۔۔۔“ غالب نے مجھے خفگی سے پکارا تھا۔ میں اس کی طرف مڑی۔

”مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ۔“ میں نے پوچھا تھا۔ وہ چہرے پر دنیا جہان کی ”مسکینیت“ سجائے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے آخر تھک ہار کر اس کی ٹائی کی ناٹ لگائی تھی۔ وہ یہ کام روزانہ مجھ سے کرواتا تھا اور میں بلا چوں چراں کر بھی دیتی تھی۔

غالب باہر دیکھنے لگا تھا۔

”میری طرف دیکھو۔“ میں نے چڑ کر کہا تھا۔ وہ کمال اطمینان سے میری طرف مڑا تھا۔

”جی۔۔۔ آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟“ میرا دل چاہا وہ پینسل اسے زور سے چبھو دوں جو کہ میں نے پندرہ منٹ کی مشقت لگا کر تراشی تھی۔

”جی۔۔۔ آپ سے ہی کہا ہے۔“ میں نے خفگی دکھائی، مگر رائیگاں گئی۔

”جی۔۔۔ مادام۔۔۔“ وہ شرارت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے جو گرز کی طرح اس کے پیروں میں بھی ویسے جو گرز دیکھے تھے۔

میں نے نیچے اشارہ کیا تھا۔

”کے تو باندھ دو۔“ وہ برے برے منہ بناتا جاگرز کے تسمے باندھنے لگا تھا۔

یہ ہمارے روز کے ”معمولات“ تھے۔ میں اس کی ٹائی کی ناٹ لگا دیتی تھی اور وہ تسمے باندھ دیتا تھا۔

ہوں۔“ اور پھر اس نے مجھے مہتہ کی تیاری کروادی تھی۔ مجھے اس پر ہمیشہ بھروسہ رہا تھا۔



ہم دونوں نے اکٹھے بچپن گزارا تھا۔ ہنستے ہوئے، روتے ہوئے۔ زندگی کے ہر لمحے میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہے تھے۔ وہ بہت اچھی تسلیاں دیتا تھا۔ رات کو ہم قریبی پارک میں چہل قدمی کرنے جاتے تھے۔ آکس کریم کھاتے تھے، میں نے ساری زندگی غالب پر انحصار کیا تھا۔ ہماری پسند، ناپسند ایک دوسرے سے بہت ملتی تھی۔

ایک دوسرے کی غلطیاں سدھارتے تھے۔ بارش میں اکٹھے بھگ جاتے تھے اور اکٹھے ٹیرس پر جھولے پر بیٹھ کر چھینکیں مارتے تھے۔ پاپ کارن کھاتے تھے۔ ابو کی لائبریری کی بھاری کتابیں پڑھتے تھے۔ امی اور تالی کی ڈانٹ کا قطعی اثر نہ ہوتا کہ ان کے نزدیک ہم مٹی کا مادہ تھے۔ جن پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔

وہ میری ڈائری لکھتا تھا اور میں اس کی ڈائری لکھتی تھی۔ واک پر جاتے وقت وہ میرا پرس سامنے رکھتا اور میں اس کا والٹ تھا مے رکھتی تھی۔

سفیدے کے درختوں پر ہم نے اپنے نام لکھے تھے۔ اکثر ہم باتیں ”بڑ“ کے پتوں پر لکھ کر کرتے تھے۔ رات کو لان میں بڑے ابا کا ریڈیو اٹھا کر لے جاتے اور ٹیبل پر ریڈیو رکھا ہوتا تھا اور ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھے پروگرام ”زندگی کہانی“ سنتے تھے۔ ایک دن چائے بنانے کی ”یاری“ اس کی ہوتی تھی اور اگلے دن میں چائے بناتی تھی۔

اخباروں سے لطیفے کاٹ کر بزم ادب کے پیریڈ میں پڑھنا، ہمارا محبوب مشغلہ تھا۔ اسی طرح ہنستے روتے، بھاگتے دوڑتے ہم نے بچپن ایک ساتھ گزارا تھا۔

اور ہم لڑکپن کی دہلیز پر آن پہنچے تھے۔



میری واحد دوست علینہ کی مگنی تھی۔ میں اسی

کے لیے تیار ہوئی تھی، میں نے بلیک کٹر کے چوڑی دار پاجامہ پر سرخ فرائیڈ پہن لیا تھا۔ ہال میں روشنی تھی میں آہستگی سے سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آ رہی تھی۔ میں نے دوپٹا کاندھے پر ڈال رکھا تھا۔ غالب مجھے چھوڑ گیا تھا اور وہی مجھے واپس لینے آیا تھا۔

”اتنی دیر لگادی اور دوپٹا سر پر لو۔“ مجھے وارننگ دی گئی تھی اور میں یہ بات اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ مجھے اپنی بائیک پر لینے آیا تھا۔ میں دوپٹے کا نقاب اوڑھے اس کے پیچھے بیٹھی تھی۔ سڑک پار نظر آئی جگمگاتی روشنیاں کتنی پیاری لگ رہی تھیں نا۔ تارکول کی سڑک پر روشنیوں کا عکس بہت سحر انگیز تھا۔

”غالب۔۔۔ کتنا اچھا لگ رہا ہے نایوں۔“ میں نے بالوں کی لٹ کو کان کے پیچھے اڑسا تھا۔

”ہاں۔۔۔ بہت اچھا لگ رہا ہے۔ آدھی رات کو خوار ہونا۔“

”تم تو وہی سے ہو۔ سڑک کے دائیں بائیں روشنیاں کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔ دل کرتا ہے بندہ دیکھتا ہی جائے۔“ سڑک پر خشک پتے اڑے جارہے تھے۔

”اور جو چچی پریشان ہو رہی ہوں گی وہ۔۔۔“

”امی کو تو پریشان ہونے کی عادت ہے۔“ میں نے کہا تھا۔

”کل یونیورسٹی جاؤں گی کیا؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”نہیں۔۔۔ کل صفائی کرنی ہے پورے گھر کی۔ تو کل نہیں جاؤں گی۔ میری فائل تم سب مٹ کرا دینا۔“

”کل کوئی آرہا ہے۔۔۔ یا ”یوم صفائی“ منانا ہے؟“

میں پاس سے گزرنی کاروں کے شیشوں کے پار دھندلی پڑی روشنیاں دیکھنے میں مگن تھی۔

”ہاں۔۔۔ تمہیں پتا نہیں ہے کیا۔ ابو کے دوست آرہے ہیں اپنے بیٹے کے رشتے کے سلسلے میں۔“

بائیک جھٹکے سے رکی تھی۔ میں گرتے گرتے پیچ تھی۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ ”تم راضی ہو اس رشتے پر۔؟“

”ہاں۔۔۔ تو۔۔۔ ہمیشہ ابو کے گھر میں تھوڑی رہنا ہے

میں نے۔۔۔ بیٹیاں تو آنگن کی چڑیاں ہوتی ہیں۔ ”اڑنا“
مقرر ہوتا ہے نا۔ ”میں نے اداسی سے کہا تھا۔

میرے جواب پر اس نے خاموشی سے بایک آگے
برسھا دینی تھی۔ میں جوار در گرد کی ”روشنیاں“ دیکھنے میں
لگن تھی۔ اس شخص کی آنکھوں کی دھندلی پڑتی
روشنیاں دیکھ ہی نہ سکی۔

رات کے بھیکے پن میں جب بایک پورچ میں رکی
تھی۔ لان میں بونے قد کے چنبیلی کے پودے کی مدھم
خوشبو سارے گھر میں اڑ رہی تھی۔ میں اندر کی جانب
بڑھتی غالب کی آواز پر ”ساکت“ ہوئی تھی۔

”میں نہیں چاہتا کہ تمہارا نام کسی اور کے ساتھ لیا
جائے۔ میں تمہیں جس دن نہ دیکھوں مجھے چین
نہیں آتا۔ مجھے تمہاری ”عادت“ ہو گئی ہے۔
نیلماں۔۔۔ تم جانتی ہو نا۔۔۔ مجھے اپنی عادتیں بدلنا اچھا
نہیں لگتا۔“ میں جب سرد وجود کے ساتھ دروازہ بند
کر رہی تھی تو میں نے اس سیاہ آنکھوں والے شخص
کی آواز سنی تھی۔

”میں تمہیں بہت خوش رکھوں گا۔ کل ہی امی چچی
سے بات کریں گی۔“

میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ دیکھتی تو ”پتھر“
ہو جاتی۔ بھیگتی رات میں ایک سرگوشی بازگشت کی مانند
میرے وجود کے ”گنبد“ میں گھومتی رہی۔

” I want you _ neelmaan _ “
(میں تمہیں چاہتا ہوں نیلماں)



درو دیوار پر لگی ننھی روشنیاں جگمگ کر رہی
تھیں۔ کھڑکی کے پار آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ کھڑکی
کے قریب رکھی نیبل کے ایک طرف رکھی کرسی پر میں
بیٹھی تھی اور دو سری کرسی پر غالب بیٹھا تھا۔

”تم کافی کیوں نہیں پی رہی ہو؟“ وہ بے چینی سے
پوچھ رہا تھا۔ نیبل پر دو کافی کے کپ رکھے تھے۔ مدھم
خوش گوار دھواں کمرے میں پھیلنے لگا تھا۔
”تم نے آج اچھی کافی نہیں بنائی۔“

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔“ وہ زچ ہوا تھا۔ چاند کی
تر چھی روشنی ایرانی غایے میں مدھم سی ہو رہی تھی۔
میں نے کرسی سے ٹیک لگائی تھی۔ باسی مہندی کی
خوشبو حواسوں پر چھانے لگی تھی۔

”میں کیوں جھوٹ بولوں گی۔“ میں نے پوچھا تھا۔
”پہلے تو تم چپ چاپ میری بنائی کافی پی لیتی تھیں۔
اب اعتراض کیوں؟“ اب وہ پوچھ رہا تھا میں نے کپ
اٹھا کر ایک گھونٹ لیا تھا۔ واقعی کافی بہت ”مزے“ کی
تھی۔

”پہلے میں تمہاری دوست تھی اب تمہاری بیوی
ہوں۔“

”کیا مطلب۔۔۔ تم میرے ہر معاملے میں انٹرفیئر
کرو گی؟“

”بالکل۔۔۔ مجھے اس کا حق ہے پورا۔“ میں نے
اطمینان سے دوسرا گھونٹ بھرا تھا۔

وہ اپنی ”کافی“ کا کپ بھول چکا تھا۔ میں نے آہستگی
سے کپ ”بدل“ دیا تھا۔

”چلو۔۔۔ چھوڑو۔۔۔ اچھا میں تمہیں آج کچھ بتانا
چاہتا ہوں۔“ تمہید باندھی جا رہی تھی۔ میں نے
دونوں بازو نیبل پر رکھ کر اسے بغور دیکھا تھا۔ کانچ کی
ست رنگی چوڑیاں بچ اٹھی تھیں۔

”میں نہیں جانتا تھا نیلماں کہ میری زندگی میں
تمہاری اتنی اہمیت ہوگی۔۔۔ مجھے اس کا بہت دیر سے

احساس ہوا۔ مجھے تمہاری باتوں کے علاوہ کبھی کسی کی
گفتگو متاثر نہیں کر سکتی۔ تمہیں دیکھ کر میری فیلنگز

عجیب سی ہو جاتی ہیں۔ جیسے نیو ایر کے پٹانے پھوٹے
ہیں۔ مجھے تمہاری ہسی کی کھنک سننے کی عادت ہے۔

میں اکیلے ڈائریاں نہیں لکھ سکتا تھا۔ کافی نہیں پی سکتا
تھا۔ آئس کریم نہیں کھا سکتا تھا۔ تمہارے بغیر میں

”زندگی کہانی“ نہیں انجوائے کر سکتا تھا۔۔۔ مجھے اب پتا
چلا کہ یہ سب کیا تھا؟ تمہارے بغیر میں ”ادھورا“

ہوں۔ تم مجھے میرا second heart لگتی ہو۔
جس کا نہ ہونا مجھے مار ڈالے گا۔“

ایک کافی کا کپ خالی ہو چکا تھا، مگر دوسرے کپ

سے ہلکی سی بھاپ اٹھ رہی تھی۔ میں حیرت سے اس شخص کو دیکھ رہی تھی جس کے نزدیک پیار، محبت، یہ سب کچھ ”دقیانوسیت“ تھا۔ وہ مجھ سے ”اظہار محبت“ کر رہا تھا۔ انداز کافی ”عجیب“ تھا، مگر متاثر کن تھا۔ وہ میرا ہاتھ تھامے کہہ رہا تھا۔ ”آئی ریلی لویو۔“ میں منجند بیٹھی تھی۔ وہ تشویش سے بولا۔ ”میں نے ٹھیک کہا نا۔ مجھے اصل میں پتا نہیں کہ ایسے موقعوں پر کیا کہتے ہیں۔“ میں نے اس روشن پیشانی والے کی اس بات پر قہقہہ لگایا تھا۔ ”ایک ڈینٹ اور اسمارٹ شخص کا اظہار محبت ایسا ہی دل کو چھو لینے والا ہوتا ہے۔“ چاند کی روشنی پورے کمرے میں بکھرتی جا رہی تھی۔ ”میں تمہیں ہمیشہ خوش رکھوں گا۔ کبھی اداس مت ہونا میں ہوں نا سب سنبھال لوں گا۔“



میں لان میں اپنی شال اوڑھے بیٹھی ہوں۔ پانچ دن پہلے غالب نے مجھ سے کہا تھا۔ ”جانے کیوں بیٹے کا باپ بننے کے بعد اور دادا بننے کے بعد بھی میری محبت تمہارے ساتھ اول روز کی طرح تازہ ہے۔ آج بھی میں تمہارے ساتھ کافی پی کر واک کر کے ریلیکس محسوس کرتا ہوں۔“ اور میں کتنا ہنسی تھی اس بات پر اور وہ چپ چاپ مجھے دیکھتا رہا۔

”میں نے ایک بات تمہیں کبھی نہیں بتائی؟“ اس نے کہا تھا۔ میں حیران تھی کہ وہ کون سی بات تھی جس سے میں ”لا علم“ تھی۔ جو میں نہیں جانتی تھی۔ ”جانے کیوں مجھے آج تک اس بات کا اندازہ نہیں ہو سکا ہے کہ تم مجھے ”ہنستی“ ہوئی زیادہ اچھی لگتی ہو یا پھر ”غصے“ میں لڑتی ہوئی۔ جھگڑتی ہوئی۔“ میں حیران بیٹھی تھی۔ کتنی عجیب بات تھی نا کہ ہم خود کو ”بہت“ زیادہ جانتے ہوئے۔ سمجھتے ہوئے بھی سمجھ نہیں پاتے تھے۔ میں نے کبھی کبھی غالب کو غصے میں دیکھا تھا، مگر

میری زندگی میں آنے والے سارے مردوں میں اس جیسا (polite) مہربان کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے شال کا پلو اپنے اوپر ڈال لیا ہے۔ فجر کی ٹھنڈی ہوا میں عجب منجند کر دینے والے احساسات سے تھے، میں نے ہتھیلیوں کو آپس میں بھینچا تھا۔ زندگی کتنی ارزاں ہوا کرتی ہے نا۔ پل میں رست کی طرح ہتھیلیوں سے پھسل جاتی ہے۔ اک آنسو لڑھکتا ہوا میرے ہاتھوں پر گرا تھا۔

میرا دل چاہ رہا ہے چیخ چیخ کر روؤں۔ چلاؤں۔ مگر حواس سلب ہوئے جاتے ہیں۔ اب کھڑکی کے ساتھ والی ٹیبل پر ایک کپ خالی پڑا رہے گا۔ کوئی پینے والا نہیں ہوگا۔

کافی کی تہہ سی جم جائے گی۔ چاند اپنا سفر طے کرتا ہوا طنزیہ نظر مجھ ”اکیلی“ پر ڈالتا منزل کی طرف رواں دواں ہو جائے گا اور میں ڈائریاں ہاتھ میں تھامے بیٹھی روتی رہوں گی۔

لان میں ”زندگی کہانی“ کے سرٹوٹ جائیں گے۔ میں غائب دماغ سی بیٹھی رہوں گی۔



بہنوں کے لیے خوشخبری
خواتین ڈائجسٹ کے ناولوں پر

40% رعایت

یہ رعایت صرف ہماری دکان

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 - اردو بازار، کراچی پر دستیاب ہے

ایک بال تھا میرے پاس بھاگتا ہوا آیا تھا۔ اس کے بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے میرے ہاتھ چومے تھے۔

”آج میں اور آپ دس بجے شاپنگ کرنے جائیں گے۔ آئس کریم بھی کھائیں گے۔ آپ کو کون سا فلیور پسند ہے؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔ میں ”غلاط“ تھی۔ میرے پاس آئس کریم سیر کرنے والا ”ساتھی“ تھا۔

”مجھے اسٹرابیری پسند ہے۔“ میں نے کہا تھا۔ ایک نے سر ہلایا تھا۔ پھر مجھے بغور دیکھا تھا۔

”شام سات بجے ریڈیو پر ”زندگی کہانی“ سننے لان میں آئے گا۔ آپ آئیں گی نا دادو؟“

ایک شہریار کے آگے میں ہتھیار ڈال رہی تھی۔ زندگی کہانی انجوائے کرنے کا تسلسل برقرار رہے گا۔ وہ کہنے لگا تھا۔

”I shall wait for you...“

میں نے گہرا سانس لیا تھا۔ ”میں ضرور آؤں گی ایک۔“

میں اسے اس کے نام سے بلاتی تھی۔ مجھے اچھا لگتا تھا۔

ایک نے تازہ پھول میری شال میں ڈال دیے تھے۔

”رات کو آپ کے بیڈروم کی کھڑکی والی ٹیبل پر بیٹھ کر چائے پیئیں گے۔“ میں نے سکون محسوس کیا تھا۔ جانے کیوں؟

چاند مجھے ”اکیلا“ نہ دیکھ کر کھسانی ہنسی ہنسنے لگا۔ میں جانتی تھی۔

”چائے نہیں کافی پیئیں گے۔“

”کھیک ہے دادو۔ مگر کافی میں بناؤں گا۔“ وہ برجوش ہو کر بولا تھا۔ میں نے سخت نظر ایک پر ڈالی تھی۔

”جی نہیں۔ ایک شہریار! تم بھی اپنے دادا کی طرح اچھے کافی میکر نہیں ہو۔“

وہ خفا ہو کر پیٹھ موڑ گیا تھا۔ میں نے اسے اپنے سامنے کھڑا کیا تھا اور روشن پیشانی چومی تھی۔

”پتا ہے ایک۔ دادو کو اکیلے رات کو بہت ڈر لگتا تھا، مگر جب سے تم میرے پاس ہوتے ہو میں بے فکری محسوس کرتی ہوں۔ میں جانتی ہوں تمہارے دادا مجھے کبھی اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔ آج ”تم“ ہو میرے پاس۔ اب مجھے اکیلے کافی نہیں پینی پڑے گی۔ اب مجھے اکیلے دو انہیں کھانی پڑے گی۔ میرے پاس اچھا قصہ گو ہے جو مجھے رات کو اچھی اچھی کہانیاں سنایا کرے گا۔“ سورج کی روشنی ایک کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

”آپ میری دوست ہیں۔ میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ آپ کو ڈر لگے تو مجھے بتا دیجیے گا۔ آپ جانتی ہیں ناکہ میں کتنا brave ہوں؟“ پوچھا گیا تھا۔ میں نے ہنسی دبائی تھی۔

”ہاں۔ میں جانتی ہوں ایک بہت بہادر ہے۔“

چہرہ جوش سے خون چھلکانے لگا تھا۔ ہم اٹھ کر اندر جانے لگے تھے۔ میں نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تھا۔ جب پیچھے سے آواز آئی تھی۔

”am nothing without you...“

”I...“

(میں آپ کے بغیر کچھ بھی نہیں) سالوں پہلے غالب کے الفاظ پر میں ساکت ہوئی تھی اور آج ایک کی آواز نے مجھے ”پتھر“ جیسا کر دیا تھا۔ میں نے اسے پلٹ کر دیکھا تھا۔

”آپ کبھی پریشان نہ ہونا۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ ہوں نا؟“

وہ پوچھ رہا تھا۔

میں بھیگی پلکوں کے ساتھ مسکرا دی تھی۔

I know-you are with me...“

”Yes“

(ہاں مجھے پتا ہے۔ تم میرے ساتھ ہو۔)

زندگی کے سفر میں ہمیشہ ہمارے پاس ”سہارے“ ہوتے ہیں، مگر ہمیں انہیں ڈھونڈنے میں بس وقت لگتا ہے۔

مگر پھر بھی کوئی نہ کوئی مل ہی جاتا ہے۔

رشتہ سالانہ

تیزی سے صفحات پر نظریں دوڑا رہی تھی۔ تمام رسالوں کی فہرستیں چاٹ لیں۔ اک موہوم سا خیال تھا کہ میں اس بار سدرہ بھابھی نے اپنا قلم نہ آزمایا ہو، اس نے کئی بار انہیں مشورہ دیا تھا۔

”وہ آگئے۔؟“
آج اس نے کوئی چوتھی بار دیوار پر لٹک کر آہستگی سے پوچھا تھا جواباً ”رملہ نے ہاتھ جوڑے۔“
”خدا کے لیے بھابھی! جیسے ہی آئیں گے فوراً“
آپ کو بتاؤں گی بلکہ دینے آجاؤں گی۔“
”اچھا۔۔۔ اچھا“ آہستہ تو بولو، کوئی سن لے گا۔“ وہ شاکی نگاہ دائیں بائیں دوڑاتی دیوار سے ہٹنے لگی تو رملہ نے پوچھ ہی لیا۔
”آخر معاملہ کیا ہے؟ اس بار آپ زیادہ ہی منتظر نہیں ہیں۔“

سدرہ دھیماسا مسکرائی۔ ”تم خود ہی دیکھ لیتا۔۔۔“
اور سیڑھی سے نیچے اتر گئی۔

رملہ حیران تھی ڈائجسٹ ہمیشہ پہلے ہفتے میں آتے ہیں اور یہ بات سدرہ بھابھی کو بہت اچھی طرح پتا ہے، لیکن اس بار پہلی تاریخ آنے سے چند دن پہلے ہی بے تابی۔ ان کا انتظار اس کا تجسس برہا رہا تھا۔

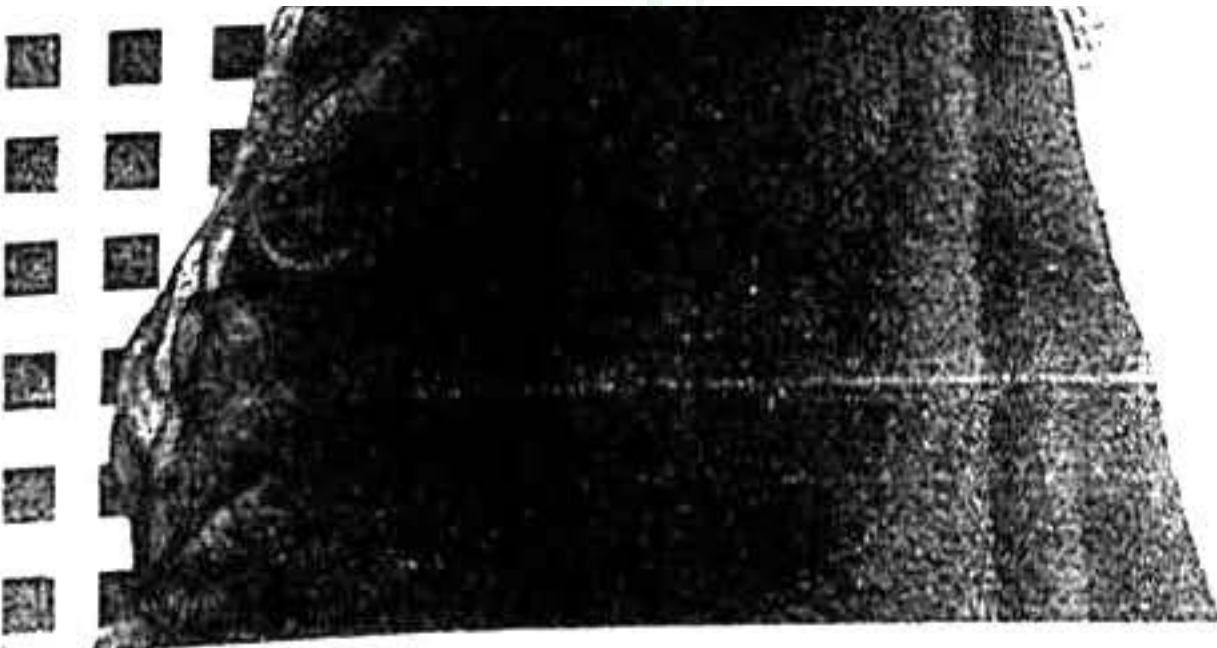
لبے دنوں کی اترتی شام فرحت کا قدرتی انوکھا احساس رکھتی ہے۔ برندوں کی واپسی، کرنوں کا پلٹنا، ہوا کا گزر۔ وہ پیڈل فین کے پہلو میں کرسی بچھائے



Downloaded From

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

www.pdfbooksfree.pk



”آپ اتنی اچھی باتیں کرتی ہیں، لکھتی کیوں نہیں۔“

”ضروری تھوڑی ہے، جو باتیں کی جائیں، وہ لکھی بھی جائیں۔“

کیا پتا اب احساس ہو گیا ہو، لیکن فرسیت میں کوئی ناول تو کیا افسانہ بھی ان کے نام پر نہ تھا۔ تجسس بد مزہ ہوا۔ غالباً ”بھیا گھر آتے ہوئے معمول کی طرح تمام رسالے لے آئے تھے۔ اس کے بھی اور ہمسائی سدرہ بھا بھی کے بھی۔ بھا بھی کا یہ ذاتی کام تھا جو نہایت رازداری سے رملہ ہی نبھا رہی تھی، مگر شام کے اس وقت بھا بھی کی امانت ان کے گھر دینے جانا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

”نا بابا نا۔“ اس نے کان کی لو چھوئی۔ ”اگر رات کو چھت پر چار پائیاں بچھانے آئیں تب نہیں تو دوپہر میں دے دوں گی۔“ مگر بھا بھی کے اصرار کے سبب بڑھتے تجسس نے تمام فرستیں چھانٹ لیں۔ سارے اندازے غلط نکل ہی رہے تھے کہ اچانک نظر کئی مہینوں سے چھپتے کالم پر رکی جو مقبولیت کی سند پا چکا تھا۔

”اسے رے۔“ اس نے تیزی سے مطلوبہ صفحہ نکالا۔

س۔ ”شادی کب ہوئی؟“

ج۔ ”یکم اپریل کو۔ قسم سے باجی! بڑی آرزو تھی اس دن کے نکاح کی، جی بھر کے فول بنایا، پل پل انجوائے کیا بس جی، بیان سے عاری ہیں لفظ میرے۔“

”ہیں۔۔۔ بھا بھی کی شادی اپریل میں؟ جہاں تک اسے یاد تھا خاصی ٹھنڈک تھی، پر کیا کہتے ہیں بسا اوقات جون کی تیز بارشوں میں بھی چادر لپٹنے کو جی چاہ جاتا ہے۔ خیر۔“

”شادی سے پہلے کیا مشاغل اور دلچسپیاں تھیں؟“

”لیں باجی جی۔ شادی سے پہلے کے مشاغل بھی پوچھنے والی بات ہے، جناب مشاغل ہی مشاغل تھے، چھت پر چڑھ کر ہر آتے جاتے راہ گیر کو وٹے (کنکر) مارتی تھی، یہ مت سمجھئے گا بے چارے بڈھوں کو بھی

جناب دیکھ بھال کر، تاک تاک کر، نو عمر لڑکوں کو۔۔۔ پر کوئی بھی کم بخت قابو نہ آتا، اوپری مخلوق سمجھ کر سر پر پیر رکھ، بھاگ جاتے، منحوس! پھر جی میں نے رشتے کے لیے خوب وظیفے، نوافل پڑھنا شروع کیے، کیا کسی نے چلے، مراقبے کاٹے ہوں گے، جو میں نے کاٹے، کوئی بھولے بھٹکے سے رشتہ مانگنے آہی جاتا، دم درود پڑھ پڑھ ایسی پھونکیں مارتی بڑے بڑے پیر حیران، بڑی ہی منتوں مرادوں سے خواہش بر آئی تھی، وہ بھی شاید اس لیے کہ ساس صاحبہ ایک آنکھ سے کالی تھیں، دوسری میں نے کرنی تھی۔“

”اللہ! رملہ نے بمشکل ہنسی روکی۔ ”آئی اور کالی۔۔۔ اف“

”یعنی دل میں ارادہ باندھا تھا، باجی تبلیغی جماعت والے کہتے ہیں ارادے کا بھی بڑا ثواب ہے، تو جناب جی وہی ہے رب میرا جو ہمارے گمان کو یقین میں بدل سکتا ہے، ہو کئی شادی۔“

جملے کے ہر طرف سے خوشیوں کی چاشنی ٹپکتی تھی۔

س۔ ”اس رشتے میں آپ کی مرضی شامل تھی یا بزرگوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا۔؟“

ج۔ ”میں اور جھکاؤں سر۔!“ تعجب ہوا۔ ”بزرگوں نے جھکایا۔۔۔ ہزار فیصد میری مرضی شامل تھی، وظیفے، چلے کاٹ کاٹ کمر تختہ ہو گئی تھی، دراصل اک بار بچپن میں کھیلتے کودتے سن لیا تھا، مولیٰ لڑکیوں کی شادی مشکل سے ہوتی ہے، یقین مانیں، دل جان میں ایسا صدمہ اُترا، ہر وقت لی پی لو، بھوک ہی بھوک، پھر تو میں صدمے سے مولیٰ تو گیا مولیٰ تر ہوتی گئی قدرے چھوٹی بھی ہو گئی، بالکل سنس بال کی طرح، اب ایسے میں کوئی رشتہ آجائے غنیمت، عجلت اتنی تھی کہ مولوی صاحب کے پوچھنے سے پہلے ہی میرے منہ سے نکل گیا قبول ہے، قبول ہے، قبول ہے، بعد میں پتا چلا وہ تو اپنے بیٹے مقبول کو پکار رہے تھے۔“ مقبول نکاح کا رجسٹر مدرسے رہ گیا ذرا بھاگ کر لانا۔۔۔ ہا ہا۔۔۔“

س۔ ”منگنی کتنا عرصہ رہی، فون پر بات ملاقات۔۔۔؟“

ج۔ ”ساس کے ارادے تو سالوں منگنی پر رُخانے کے تھے، مگر جناب جی میں نے ایک دن فون کھڑکا دیا۔ اپنے ہونے والے ہیڈ کراؤن (سرتاج) کو، اور ایسے سوے بہائے کہ ہماری اماں دل کی مریضہ ہیں، اپنی آخری سانسوں میں میری خوشی دیکھنا چاہتی ہیں، لو پھر دیکھو، دو ہفتوں کے اندر اندر۔۔۔“

س۔ ”سسرالیوں کے بارے میں تصورات کیا تھے۔۔۔؟“

ج۔ ”بڑے ہی خوف ناک تھے، حلقہ یاراں سے سن رکھا تھا خلائی مخلوق نما ہوتے ہیں سسرالی، ویسے آپس

کی بات سے، کان آگے لائیں۔۔۔ قسم سے ظاہری طور پر سب خلائی مخلوق کو مات دیتے ہی لگے، مولیٰ تازی ساس اوپر سے کانی، کالے سوکھے لم تڑنگے سنبجے سر، اب ایسے سنبجے اور کانی کی اولاد جیسی رہی ہو سکتی تھی، ویسی ہی تھی۔۔۔ خیر میں نے کسی کی باتوں کو دل پر لے کر اپنی صحت برباد نہیں کی، کیوں کہ اپنی صلاحیتوں پر یقین تھا۔“

لکھائی سے لگتا تھا خوب مسلز کو تھکا ہو۔

س۔ ”شادی کے لیے آپ کو اپنی تعلیم کی قربانی دینی پڑی یا کوئی اور۔۔۔؟“

ج۔ ”بابا جی جی! تعلیم سے تو خیر کبھی وزیر تعلیم کو واسطہ نہیں تو قربانی کیسی۔۔۔ ہاں البتہ ایک قربانی دی تھی، دراصل میرے نکاح والے دن میری چھوٹی بہن نے چوری چھپے میرے جینز کی جوتی نکال کر پہن لی، جب میری نظر پڑی، پیٹ میں بڑے وٹ (بل) پڑے، بس جی میں بڑے سے مجمع میں تھی، ویسے تو خیر میں لوگوں کی پروا کرنے والوں سے نہیں، مگر ماں جانی سمجھ کر معاف کر دیا، لیکن دل میں گالیاں بڑی دیں کہ۔۔۔“

(دانت ایسے دبائے جیسے بہن بیچ میں آگئی ہو۔)

”پاؤں سرس کھینی کے، اتنی بوائے سرف“

صابن سے دھو دھو ماٹھے، ہیل کانے، سوچ آئے ہنستی، دندنا تلی منگتی پھر رہی ہے، گر کر اگلے دانت ٹوٹ جائیں۔۔۔ جب کچھ نہ ہوا تو سلگتے دل کو یہ سوچ کر قرار آگیا چلو! جوتی کے عوض پورا بندہ مل رہا ہے، گھائے کا سودا نہیں ہے۔“

س۔ ”رخصتی سے پہلے آخری رسم یا رخصتی کے بعد پہلی رسم کیا ہوئی؟“

ج۔ ”ہاں بابا جی جی، ہمارے ہاں بھی سب کی طرح رخصتی سے پہلے آخری رسم رونے دھونے کی ہوتی ہے، اماں نے بڑا لپٹا لپٹا کر جھوٹے (جھوٹے) دیے ایسی خوف ناک آوازیں نکالیں سوئے بچے خود کش بلاسٹ سمجھ کر چلانے لگے، پر میں نے اماں کے کان میں آہستہ سے کہا۔ ”اماں بس کر اپنا ڈراما کیوں میرے دس ہزار کے میک اپ کے پیچھے پڑی ہے۔۔۔“ اور

جناب رخصتی کے بعد ان کے گھر عجیب رسمیں دیکھیں، سب سے پہلے تو چولوں (چوکھٹ) میں ساس صاحبہ تیل ڈالنے لگیں، بھئی یہ کیا؟ آتے ہی مجھے گرانے کا انتظام، میں نے خاموشی سے گزرتے گزرتے خالہ ساس کو اڑنگی (ٹانگ اڑانا) دی، بڑی اتراتی پھر رہی تھی اوپچی ہیل پر، سنبھل نہ پائی، تیل پر پھسل اور دھڑام۔۔۔ انھیں نگاہ قریب کھڑے ہنستے بھانجے پر گئی، غلط فہمی میں اس کے دو جڑ دیے، لو جی! شروع ہو گئی دونوں خالہ ساسوں کی دھینگا مستی، پھر کیسی رسم، کہاں کی رسم، کون سی رسم، بہت دیر تو انہیں چھڑانے میں لگ گئی، جب ان کے ہیرا سائل بدل گئے، تب جا کر کہیں مجھے کمرے میں چھوڑ آنے کا ارادہ کیا، وہاں ایک اور عجیب رسم دیکھی، سوکھے سے کانے جیسی میری نند، جس نے ساڑھی لپیٹ رکھی تھی، یقین مانو گمان ہوتا تھا۔ مردے کی مرہم پٹی کی ہو، پہلے تو اس نند نے میرے میاں کی ساری جیبیں خالی کروائیں پھر وہ رسم یاد آگئی، جی جناب! ان کے ہاں دولہا، دلہن کمرے میں قدم رکھنے سے پہلے جو اپنے جوتے سے دوسرے کایاؤں دبا دے، سمجھو وہ حاوی

سے نامضحکہ خیز؟ اب وہ سوکھی تیلی نند زمین پر بیٹھی اس کوشش میں بھی میری ٹانگ کو جما کر رکھے گی تاکہ بھیا آسانی سے پاؤں رکھ دیں میں نے بھی پوزیشن تارلی میاں کو دیکھوں گی بعد میں پہلے اس سے تو نمٹوں جیسے ہی اس نے سنبھلنے کے لیے زمین کا سہارا لیا میں نے بھی پاؤں اٹھا، ہیل اس کی انگلیوں پر رکھ دی۔ اوہو، ہو ہو پھر جو قیامت خیز ہوڑ بچے آئندہ نہیں کرنے لگی یہ رسم۔

س۔ ”پہلی بات جو شوہر نے کی یاد دیکھ کر کیا منہ سے نکلا؟“

ج۔ ”درفٹے منہ! ان کے منہ سے کیا نکلتا تھا البتہ میرے منہ سے نکلتے نکلتے بچا جیسے ہی کلف لگی ہڈیاں چر مڑاتے قریب بیٹھتے دیکھا میں نے گھونگٹ الٹ ٹانگ دیائی ”زیادہ طرم خانی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے میاں پہلے یہ کالا سیاہ منہ اور سری (سر) جس پر

کڑوا تیل تھوپ رکھا ہے دھولو۔“

جی کڑوا تیل تو نہیں لگایا۔ وہ تو اماں نے روغن بادام۔“

ہاں۔ میں نے بات کائی ”تو کڑوے باداموں کا ہی ہو گا نا بڑی بدبو آ رہی ہے۔“

”بولے تو ریس ریس کر کے تھے پردھونے کے لیے فوراً اٹھ گئے“ میری اگلی ہانک۔ ”یہ اپنے گولڈن دانت بھی مانجھ لے نا۔ اور جو کالے ڈورے ڈالے ہیں نا آنکھوں میں نکال کر آنا۔“ انہوں نے حیرت سے مڑ کر دیکھا پھر سابقہ نرم آواز میں بولے ”اجی سرمہ تو نہیں لگایا ہوا۔“

”دکھ رہا ہے مجھے بھی وہ تو خیر قدرتی سارے چہرے پر انڈیلا ہوا ہے۔ پردھو آنا۔“ اس کے علاوہ تو کوئی مکالمہ نہیں ہوا ہمارے درمیان۔“

س۔ ”منہ دکھائی میں کیا دیا پسند آیا؟“

ج۔ ”ایک پرانی سی انگلی لائے تھے ڈرتے ڈرتے سامنے رکھی میں نے ہی ترس کھا کر احسان عظیم کیا اپنی انگلی آگے کر دی لائے ہو تو پہنا بھی دو جب وہ

پہنانے لگے میں نے ایسی زور سے ان کی ہتھیلی پر چندی وڈی (چٹکی بھری) کہ پھر ساری زندگی شرافت کے لبادے میں ہی رہے وہ۔“

ہر سوال پر رملہ کی آنکھیں ابلتیں ہونٹ شرقا پھلتے رہے اور اچھلتے پیٹ سے اففف نکل رہا تھا۔ ”سدرہ بھابھی آپ بھی نا۔“

سدرہ رملہ دونوں پڑوسن تھیں ایک دوسرے کی ہمدرد، خیر خواہ، سہیلیاں، اکثر ایک دوسرے سے تبادلہ خیالات ہوتا رہتا۔ جس میں زیادہ تر حصہ رسالے ان میں چھپنے والے ناول، افسانے یا ان پر بننے والے ڈرامے پھر توجہ ایک خاص کالم نے کھینچ لی۔ وہ بہت بہت دیر افسردگی کے ساتھ اس پر تبادلہ خیال کرتیں، ان بہنوں کے لیے ڈھیر دعائیں یہاں تک کہ نماز روزہ کے بعد بھی وہی بہن یاد آجاتی، لقمے اندر جانے مشکل ہو جاتے، آنسو حلق میں پھنسنے لگتے تھے۔ رملہ پر تو کچھ زیادہ ہی اثر ہو گیا تھا۔ کیونکہ کنواری تھی شادی

کے نام سے کانوں کو ہاتھ لگاتی بلکہ کئی رشتوں کو رو دھو کر انکار کر دیا۔ سدرہ اب اکثر سمجھاتی تھی۔

”بے وقوف! شادی نسل انسانی کی بقا کے لیے بہت ضروری ہے شادی تو آسودگی کا نام ہے۔“

”کون سی آسودگی بھابھی۔ ج۔ رکھاریاں، ق پھالیہ سب کی ایک سی کہانی ذلت، حقارت۔ اور آپ کی تو آنکھوں دیکھی ہے۔ بابا میں تو کنواری بھلی ہوں۔“

”کم عقل لڑکی۔“ سدرہ نے اس کے سر پر چپٹ لگائی۔ ”سسرال تو سسرال ہے نہ ہم اپنے عمل سے اسے مہکم بنا سکتے ہیں اور نہ ہی ساس نند۔ یا ہر طرح کے حالات اور رسموں کو انجوائے کرنا چاہیے تاکہ ڈرنا۔“

”بھابھی آپ جانے کیسے مسکرا لیتی ہیں مجھے میں تو حوصلہ نہیں ہے۔“

”دیکھو اگر کہیں لڑکی کو دبا کر رکھا جاتا ہے اور وہ برداشت کر لیتی ہے تو کبھی نا کبھی جیت اس کی ہوتی

ضرور ہے اور سسرال والوں کو بھی بھلے دیر سے ہی سہی، مگر خیال آتا ضرور ہے، بہر حال تم نئی نسل کی لڑکی ہو، تم میں کچھ ہمت، کچھ حوصلہ زیادہ ہونا چاہیے، جہاں تک ٹھیک ہے، وہاں تک بات منوانے کا۔ اور سب لڑکیاں رش، مہر جیسی تھوڑی ہیں، کچھ تیز بھی ہوتی ہیں۔“

غالباً وہ اس ماہ کا سالہ پڑھ کر بہت روئی تھی۔ دل بھر بھر آتا، اوپر سے بھا بھی کی باتیں۔؟
”میں نے تو آج تک نہیں دیکھی سنی تیز لڑکی، جانے آپ نے کہاں دیکھی۔“

”چلو رونا چھوڑو۔“ اس نے اس کے آنسو صاف کیے۔ ”بہت جلد ملوگی گٹھڑی، دیر، بہو سے اسی کالم میں اور جتنا تم اور باقی سب روئے ہوں گے، اس سے زیادہ ہنس کر، کفارہ ہو جائے گا ہر ظلم زیادتی کا۔“ اور آج اسی غائبانہ دیر، بہو سے شرف ملاقات ہو رہا تھا۔

س۔ ”شادی کے بعد کیا تبدیلیاں آئیں۔۔۔ گھر کا کام کتنے عرصے میں سنبھالا؟“

ج۔ ”بابی جی! میں اس خرد بول غنی نسل سے بالکل نہیں ہوں، تبدیلی و بدیلی کے نعرے مجھے پسند نہیں، جیسی تھی، ویسی ہوں اور کام۔۔۔ الحمد للہ تیرہ سال ہو گئے، ابھی تک نہیں سنبھالا، آئندہ تیرہ سالوں تک بھی ارادہ نہیں، پھر خیر سے بہو آجائے گی، دراصل شادی کے چند دن بعد ہی میری افریقن گائے جیسی جیٹھانی نے کہا، اب تمہارا ہاتھ کھیر میں ڈلوا دینا چاہیے، میں چپ رہی، اگلے دن ہی وہ مولی کھیر کا دہ گچہ چڑھا مجھے پکارنے لگی کہ گھوٹے میں چلاؤں میں نے بھی اتنی ہوساری سے اس کے ہاتھوں سے ڈوئی پکڑی کہ اس کا آدھا ہاتھ ابلتے چاول میں گیا، آہا ہا، بڑی آئی میرا ہاتھ ڈالنے والی، پھر میری ساس کو ہوش آیا ایک دن کہنے لگیں۔ ”آج روئی تم پکاؤ“ میں نے بھی چپ کر کے ایسی شان دار بنائی، واہ، بھئی واہ، سر کی چونکے دونوں آنکھیں کھیں، اسی لیے کھالی نہیں بلکہ مولی گائے کو آہستگی سے کہا۔ ”بیٹا! مجھے تم اتار دو، اور ساس

کائی۔۔۔ وہ کھا گئی۔ پھر جو ساری رات پیٹ کے درد سے تڑپی، دوبارہ جرات نہیں ہوئی مجھے کوئی کام کہنے کی۔“
س۔ ”میکے اور سسرال میں کیا فرق دیکھا، ان کے کھانوں میں فرق محسوس ہوا؟“

ج۔ ”بس جی! میکہم سے اور سسرال س سے اتنا ہی فرق محسوس ہوا، اور رہی کھانوں کے ذائقے کی بات اگر تو کانے جیسی سوکھی تیلی نند گوشت بھی بنائے تو اپنے جیسا سوکھا سڑا ہی بناتی ہے اور اگر جٹھانی۔

جسے جلنے کڑھنے کی بیماری ہے وہ بنائے تو جلا بھنا، ہاں اگر کائی ساس صاحبہ لگائی، بجھائی کی عادت بالائے طاق رکھ کر بنائیں تو میں زہر مار کر ہی لیتی ہوں، آخر کو میرا میاں ہی کو لہو کا نیل بنا کر لاتا ہے، اتنا تو فرض ہے میرا کہ کھالوں۔“

س۔ ”سسرال میں کن چیزوں پر تعریف ہوئی یا کسی نے مداخلت وغیرہ کی؟“

ج۔ ”اے لو بابی! ہمت ہے ان کی مجھ پر تنقید کرنے کی ہمدی سے زبان نہیں کھینچ لوں گی۔“ (انداز ہپاں سے لگتا تھا آستین کمینوں تک چڑھ کئیں اور پھر ہنسی کا فوارہ۔)

”مداخلت کی خوب کہی، میرے میاں کی کوئی دور کی رشتہ دار خاتون اکثر ہی آدھمکتیں، میری ساس کو الٹی سیدھی پٹیاں پڑھانے لگ جاتیں۔ ایک دودھ تو میں نے برداشت کیا، جب باز نہ آئیں تو ادھر وہ آئیں، اور میں ان کے گھر، ان کی بہو کو ٹریننگ دینے لو پھر۔“ پھر ہاتھ پر ہاتھ مارتی۔ ”پھر ہمت نہیں کی، لگائی، بجھائی کی، اپنا گھر ہی سنبھالنا مشکل ہو گیا اسے۔“

س۔ ”سسرال والوں سے توقعات پوری ہوئیں؟“

ج۔ ”بالکل جی، بالکل پوری ہوئیں، بلکہ ضرورت سے زیادہ ہوئیں، میرے سونے، جاگنے، اٹھنے بیٹھنے کسی معاملے میں کوئی دخل اندازی تو کیا جھانک نہیں سکتا، ایک بار گھر کی واشنگ مشین خراب ہو گئی۔ مولی گائے آئی لہراتی ”کپڑے دھوئے ہیں، مشین نکال لو۔“ لو بتاؤ اس کے باپ نے دی تھی جو اسے نکال

— دوں میں نے مر اساکہ دیا ”مرضی ہے نکال لو۔“ پھر دل میں سوچا مشین تو اسٹیل کی ہے، کیوں نہ نیچے سے تار کاٹ کر سرامشین سے جوڑ دوں ہمیشہ کے لیے جان چھٹے گی گائے سے، خس کم جہاں پاک میں کر بھی لیتی ایسا مگر اس منحوس کی قسمت اچھی تھی ایسی جی گئی رات کو ہی آئی۔ میں نے اپنی مشین پھر سے پیک کر ڈھیر سامان اوپر رکھ دیا اور کہا، چلو بیٹا واپڈانے مہلت دے دی، اپنی ہی ٹھیک کروالو پھر ایک بار سوکھے تنکے نما نند لہرائی آئی۔ میرے ماربل کے ڈز سیٹ کا ڈونگہ نکال جانے لگی، میں نے اٹھایا ٹیشے کا گلاس اسے پیچھے سے مارنے کے لیے، پھر سوچا سر ہی توڑنا ہے تو اپنا ٹیشے کا گلاس کیوں ضائع کروں، پھر میں نے اسٹیل کا گلاس اٹھا دے مارا اس کی کمر پر، بیچ گئی وہ مگر مڑ کے پیچھے نہیں دیکھا دوبارہ کسی چیز کو۔

س۔ ”بچوں کی پیدائش — کیسا رہا تجربہ؟“
ج۔ ”ہا! آئے کیا یاد کروادیا“ دل پر ہاتھ بڑا تھا ”قسم سے بڑا ہی کڑا وقت تھا، بڑی چیخ دھاڑ مچائی میں نے، میں اپنی اماں کی طرف تو نہ گئی بلکہ انہیں سارے خاندان سمیت بلالیا، کیوں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا تا مجھے؟ بھئی جن کی اولاد ہے کریں خرچا بھی۔“
س۔ ”بچے کی پرورش کے سلسلے میں کسی نے مدد کی۔؟“

ج۔ ”بچہ پالنا اور وہ بھی اپنا، خاصا ہی مشکل کام تھا، ایک تو بیٹا اوپر سے ریس ریس بالکل اپنے خاندان کے سڑے مزاج پر گیا تھا، اور کیا مجال کوئی دو منٹ کو پکڑ لے۔ اب وہ سیدھے رستے ماننے والے تو تھے نہیں، پھر میں نے ہی انگلیاں ٹیڑھی کیں بلکہ گندی، یعنی اتنا گند مچایا، جہاں جی چاہا بچے کو دھویا، ادھر پھینک، ادھر نہیلاں رکھ، الٹیاں کروا، ان کی ہر چیز میں گندے ہاتھ ڈال مہینے کے اندر ہی نوز تو نوز (ناکوں تک) بھریا، ایک دن ساس نے خود ہی کہا۔“
”بہو رانی! منے کو میں خود سنبھال لوں گی، تم بس اسے دودھ پلا دیا کرو۔“ بتاؤ ہو گئے ناسیدھے۔

س۔ ”آپ نے سسرال کا ماحول بہتر کرنے کی کوشش کی؟ کس حد تک کامیاب رہیں؟“
ج۔ ”میں نے سن رکھا تھا جیٹھانی کے ساتھ بڑے سخت ہیں وہ سب، مگر میری خداداد صلاحیتوں سے مجھے کوئی کوشش کرنی ہی نہ پڑی، بلا مقابلہ کامیاب۔“
س۔ ”سسرال میں آپ کی اہمیت، آپ کا مقام؟“
ج۔ میرے تمام جوابات سے اندازہ تو ہو گیا ہوگا، میری اہمیت اور مقام کا، لیکن پھر بھی بتاؤں، اہمیت کا یہ عالم ہے باجی، میں کمرے سے نکلوں ادھر سب اپنی جان چھپاتے، جسم سنبھالتے جگہ خالی کر دیتے ہیں، خاص کر افریقن گائے گدے جیسے بدن پر چنڈی (چٹکی) مارنے کا قسم سے مزہ ہی الگ ہے، اور میاں۔ ہا ہا ہا۔“ (بڑا لمبا قہقہہ تھا۔)

”پچھلے ہفتے کا تازہ واقعہ سن لو، میری ساس کی بھانجی آئی ہوئی تھی اور میاں جی بیٹھ گئے سامنے کالے کالے ڈیلے گھما اسے گھورنے اسماٹ بننے کی کوشش کر رہے تھے، میں نے اچانک انٹری ماری۔ صرف اتنا ہی کہا تھا ”جانتے ہوناں، تم کون ہو۔؟“
ان کی منمناتی کانپتی آواز برآمد ہوئی ”جی بیگم میں ڈفر نعیم، نہیں ظفر نعیم“ لو بتاؤ بے چارے اپنا نام بھول ظفر سے ڈفر بن گئے میرے پریشاں۔“
کوئی تک تو نہیں بنتی تھی اس سے نصیحت لینے کی۔ وہ تو خود چلتی پھرتی بہو آرٹ اکیڈمی تھی مگر پھر بھی ادارے نے آخری سوال جانے کیوں پر داغ دیا۔
س۔ ”کوئی پیغام، نصیحت، مشورہ کنواری لڑکیوں کو۔ یاد دعا وغیرہ۔؟“

ج۔ ”میں اتنا ہی کہنا چاہوں گی سسرالیوں سے قطعاً“ نہیں گھبرانا چاہیے، اپنے اندر خود صلاحیت پیدا کریں، ہو بننے کی، پہلے دن ہی ایسے تیور دکھائیں، پھر دیکھو۔ کیسے جھلے یا گلوں کی طرح سر گرائے پھرتے ہیں تمہارے آگے پیچھے، اور اگر کوئی مسئلہ ہو تو مجھ سے رجوع کریں، ایمان سے ایسے گر سکھاؤں گی۔ اوہو ہو۔“ (سر ملنگوں کی طرح دھنا گیا تھا۔) ”اور باجی

جی، دعا تو صرف ایک چھوٹے سے شعر کے ذریعے دے سکتی ہوں، حاضر خدمت ہے۔

”ساس نند چنگی ہوں، تو جندی ہوں۔“

(اچھی ہوں تو زندہ ہوں)۔“

ننس تان فونواں دیوار اتے ننگی ہوں“

(نہیں تو فونو دیوار پر لٹکی ہوں)

اس دعائیہ شعر کے بعد تو رملہ کا ہنسی روکنا دشوار ہو گیا تھا۔ اس کا جی چاہا تھا ان کا یہ کارنامہ ”بقول ان کے کافی ساس یا ڈفر عیم کے سامنے رکھ دوں اور پھر ان کی ہمت دیکھوں۔ ہا۔ ہا۔ ہا بڑی دھاک بٹھا رہی ہیں قارئین پر۔ خیر۔ اب اس قابل رشک کارنامے کو بھابھی تک پہنچانے کے لیے اسے کل تک کا انتظار کرنا تھا۔ غالباً آسمان ہاڑ کے بادلوں سے گھر رہا تھا۔

آج چھت پر سونے کا تو سوال ہی نہ تھا۔

تقریباً ”دن کے بارہ بجے تھے۔ وہ تمام کاموں سے فارغ ہو کر پکٹ تھامے ان کے گھر تک آئی تھی۔ بڑی عجیب بات تھی۔ کل شام سے اب تک بھابھی سدرہ نے ایک بار بھی رسالوں کا نہیں پوچھا تھا۔ شاید گھر پر کوئی آیا ہوا ہو، عموماً تب ہی بھابھی نظر نہیں آتی تھیں جب ان کے بقول ان کی افریقن گائے یا پھر کانے جیسی نند بمع میل تشریف فرما ہوں۔ اسی خیال کے تحت قدرے سنبھلتے ہوئے اس نے دلیز پر قدم رکھا تھا۔

”یہ ہوتا ہے ملک شیک؟“ ساتھ ہی چھنا کے کی تیز آواز آئی تھی۔ ”تیرہ برس ہو گئے شادی کو ابھی تک میری پسند کا شیک نہیں بنا سکیں برف ہی برف بھر کے لے آئیں۔ اونہ اس سے تو بہتر تھا سا دودھ منہ پر مار دیتیں۔“

ڈفر۔ نہیں ظفر بھائی اس وقت گھر پر۔“

اسے اچھنبھا ہوا ”اوہ“ پھر یاد آگیا ”آج تو ہڑتال ہے۔ اور اس ڈفر جیسے بھائی کے سامنے بھابھی کو رسالے دینا۔“ اوں ہوں۔“ اس نے واپسی کا ارادہ کرتے مڑتے مڑتے اک آخری نگاہ جالی کے پردے سے بھابھی سدرہ پر ڈالی۔ نہایت سنجیدہ کہیں کہیں

خوف کے آثار۔ ان کے پہلو میں ماتھا تیوریوں سے بھرے ان کی ساس جسے کافی ہونے کا خطاب دیا گیا تھا۔ اچھے بھلے دونوں ڈیلے گھما کبھی بہو، کبھی بیٹے کو گھور رہی تھیں۔ بھابھی گلاس کی کرچیاں اٹھانے فرش پر بیٹھی تھیں۔ ان کے لکھے ایک ایک سوال کا جواب رملہ کے دماغ میں دھماچو کڑی مچانے لگا۔

”اتنی بہادری سے لکھ سکتی ہیں، دکھا نہیں سکتیں۔“ اس کی ابھرتی سوچ کو بھابھی کی پرانی باتوں نے دبا دیا۔

”رملہ ڈیر! ہم سب عورتوں کی کہانی ایک جیسی ہی ہوتی ہے، مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں، کوئی ہمیں رلاتا چاہے، ہم واقعی رو دیں، جو ہم کر نہیں سکتے، سوچ کر خوش تو ہو سکتے ہیں، اب اتنا تو حق ہے ہی۔“ سفید مخروطی انگلیاں کانچ کی کرچیاں سمیٹتی۔ رملہ کے لیے یہ منظر بہت تکلیف دہ تھا۔

”آج“ گہری سسکاری۔ شاید کوئی ٹکڑا نرم جلد میں پیوست ہوا تھا۔ بھابھی کی آنکھوں میں پانی آیا ہی تھا کہ ظفر بھائی تیزی سے اٹھے اور قدرے ڈپٹے ہوئے گویا ہوئے۔

”اگر غصے میں میرے ہاتھ سے گلاس چھٹ ہی گیا تو کیا ضروری تھا ہاتھ سے اٹھاؤ، جھاڑو نہیں ہے گھر میں۔“ وہ ان کی زخمی انگلی تھامے کرچی نکال کر گھائل پور کو اپنی پور سے دبا رہے تھے تاکہ خون رکے۔ ماتھے پر بل ڈال کر ہی سہی مگر عقب سے ساس نے مرہم پکڑا کر احسان عظیم کیا تھا۔

”یہ لگا کر بیٹا باندھ لے۔ آج روٹی بازار سے لے آتا۔“ اسے بھابھی کا کہا جملہ شدت سے یاد آیا۔

”رملہ! اس رشتے میں اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے، یہ تو تانے بانے جیسا رشتہ ہے، کھنچاؤ اور ڈھیل کے اصول ہوتے ہیں، اگر کھنچاؤ ہی کھنچاؤ ہو تو کپڑا اکڑ کر پھٹ جاتا ہے، اگر ڈھیل ہی ڈھیل ہو تو جھرجھر کرتا بہت ہی بودا بننا ہے، بس ڈھیل اور کھنچاؤ ہو، مگر متوازی۔“

ظفر بھائی نے جانے آہستگی سے کیا سرگوشی کی تھی، بھابھی کی آنکھوں میں پانی تھا مگر موتوں پر نرم ریشم سی مسکراہٹ تھی۔



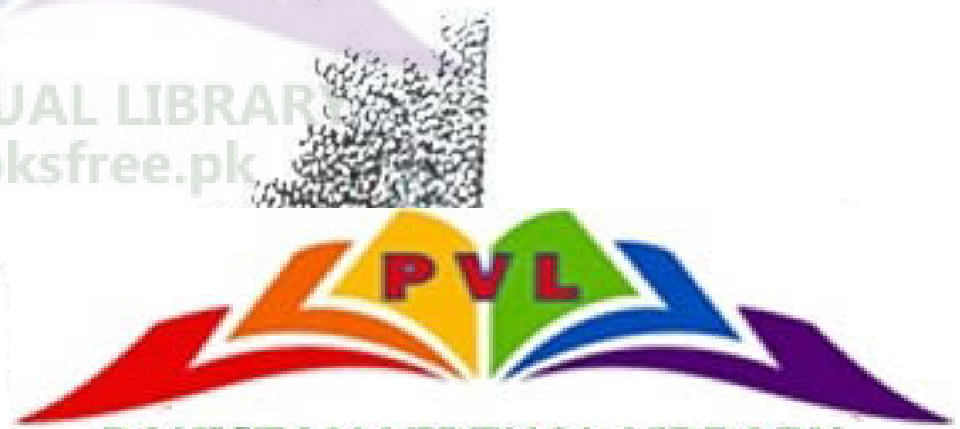
کوئی تعویذ دیا کا

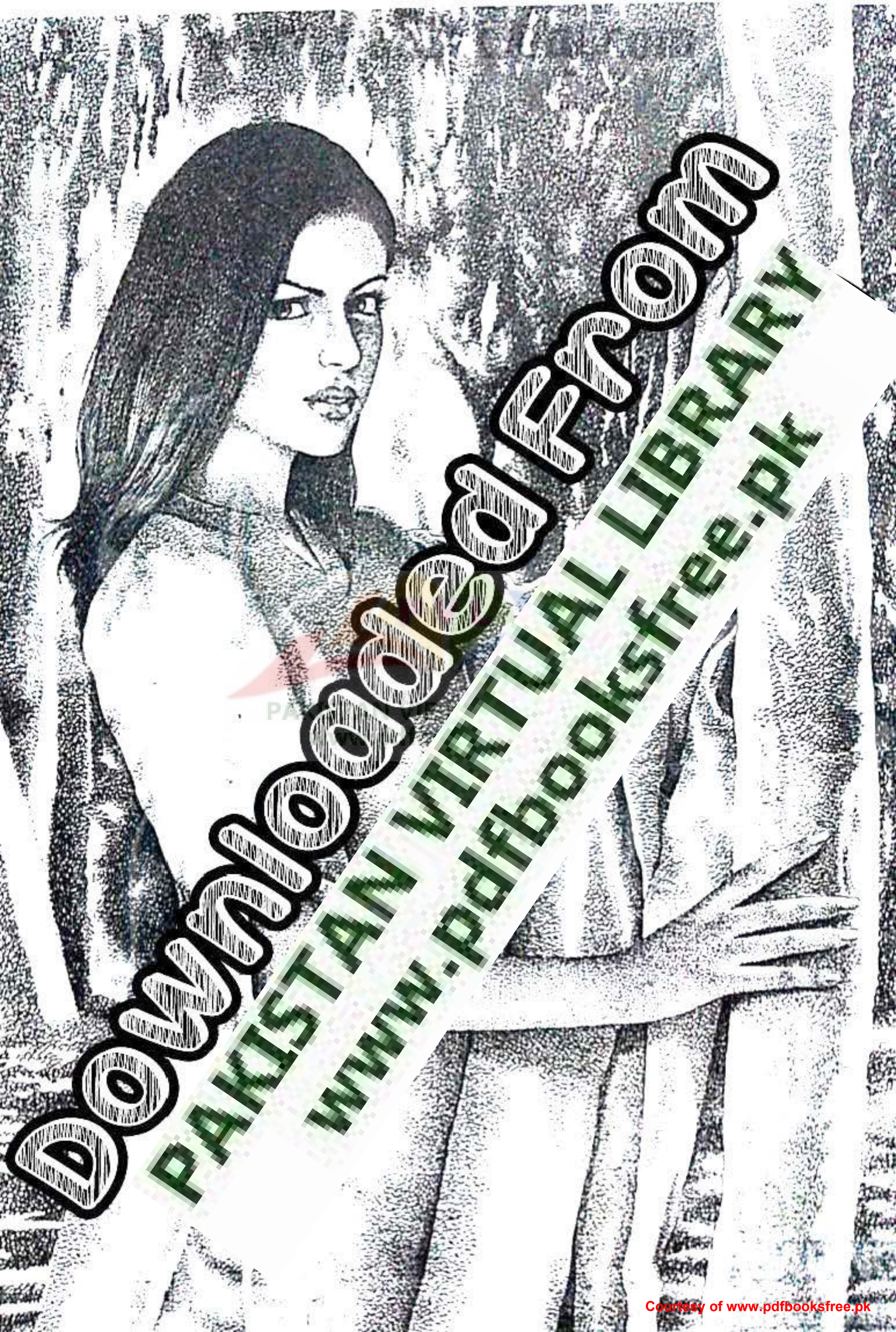
کوئی تعویذ ہو رد بلا کا
محبت میرے پیچھے پڑ گئی ہے
اپنی رہائش گاہ سے دس منٹ کی پیدل مسافت پر
واقع اس جھیل کنارے سرشام آنا اس کا معمول تھا۔
اور پچھلے نو دنوں سے یہ شعر نوک زبان پر آتا بھی جیسے
معمول بن گیا تھا۔ براؤن ریشمی بال، بھوری آنکھیں
اور سنہری رنگت والے اس وجہہ شخص کو پچھلے سترہ
روز سے ایثار مصطفیٰ اس جھیل کنارے دیکھتی آرہی
کاؤلیٹ

تھی مگر پچھلے نو روز سے اس شخص پر نگاہ پڑتے ہی بغیر
کسی ارادے بنا کسی شعوری کوشش کے بے اختیار
یہ شعر اس کے ذہن میں کسی بے تاب پنچھی کی طرح
پھر پھرانے لگتا تو وہ اپنے اختیار ارادے اور کوشش
سے دل ناداں کو بہلاتی۔

”ایثار مصطفیٰ! حسین صورتیں سب ہی کو دلکش
لگتی ہیں، سو اگر تم بھی متاثر ہو گئی ہو تو یہ کوئی ایسی
انوکھی بات نہیں کہ اسے محبت کا نام دیا جائے۔“
محبت کا سحر جینا دو بھر کر دے گا، اس اندیشے کے
تحت وہ پچھلے نو دن سے اس ”جادو“ کے توڑ کے لیے
یہی ایک ”منتر“ پڑھتی آرہی تھی۔ سر جھٹک کے وہ
جھیل کنارے اس حصے کی سمت بڑھنے لگی، جہاں
رکھے پنچ۔ بیٹھ کر پانی سے الوداعی مصافحہ کرتی۔ سویرج
کی کرنوں کا نظارہ کرنا اب اس کی پختہ عادت بن گئی تھی۔

وہ سر پہ پی کیپ پہنے، دونوں ہاتھ پینٹ کی جیب میں
ڈالے، اپنی بھوری آنکھیں نیلی جھیل پہ جمائے، اسی
جگہ کھڑا تھا، جہاں اس نے اسے اول روز دیکھا تھا۔
پچھلے سترہ روز سے اس دلکش جھیل کی مقناطیسی
کشش شاید اسے بھی بے بس کر کے یہاں کھینچ لانی
ہے۔ ایثار نے ”پالو“ کے قریب سے گزرتے ہوئے
سوچا اور گہری سانس کھینچ کر اس کے مخصوص پرفیوم کی
مہک کو اپنے اندر قید کرنے کی کوشش کی۔ ایک ناکام
کوشش۔ بھلا خوشبو بھی کبھی قید ہوئی ہے؟ اپنی
مخصوص جگہ پر پہنچ کر اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔
پچھلے نو روز سے غیر محسوس طریقے سے عادت کا حصہ





Downloaded From

PUBLIC DOMAIN VIRTUAL LIBRARY
WWW.PDFBOOKSFREE.PK

ہی بنتا جا رہا تھا۔
 ”مجھے اب اپنی یہ مخصوص جگہ بدل لینی چاہیے اور
 کسی ایسی جگہ کو چننا چاہیے جہاں سے اس کی صورت
 واضح نظر آئے۔“ اپنی مخصوص جگہ بیٹھتے ہوئے اس
 کے دل میں خیال ابھرا۔ اس بات کی طرف اس کا آج
 بھی دھیان نہیں گیا کہ نوروز سے یہ خیال بھی بلا ناغہ
 ہی ذہن میں وارد ہوتا رہا ہے۔ گزرے نو دنوں سے
 نجانے کون کون سی حرکتیں اور کون کون سے فقرے
 بے خبری میں ہی عادت کا حصہ بنتے جا رہے تھے۔
 ”ایثار مصطفیٰ! جادو بڑا زور آور ہے۔ اور اس کے
 کاٹے کے منتر میں دم نہیں۔ سو کچھ ایسا ضرور ہونا
 چاہیے جو اس سحر کے اثر کو زائل کر کے کسی بھی ممکنہ
 خطرے سے بچالے۔“ اس کے پاس سوچنے کے لیے
 اتنی باتیں تھیں کہ بعض اوقات کئی اہم باتوں پر
 دھیان دینے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ سو اس وقت
 بھی وہ نہ جان پائی کہ اس فقرے کی عمر بھی نو دن ہے۔
 مگر اس کے جواب میں آنے والے خیال کا آج پہلا
 روز تھا۔

”ممکنہ خطرہ۔۔؟ بھلا محبت کا جادو چل جانے کی
 صورت میں ایسا کون سا نقصان ہو گا جو کاٹے کا منتر
 ضروری ٹھہرا ہے۔“ اس نے دور کھڑے اس
 شخص پہ نگاہ ڈالی۔ فاصلہ ہونے کے باعث اس کے
 نقوش واضح نہیں تھے مگر ایثار مصطفیٰ کو اس کی
 صورت اذیر تھی۔ اس کے خدو خال دنیا کے مغربی حصے
 میں رہنے والوں سے مماثل تھے۔ وہ غیر ملکی تھا اور
 شاید غیر مسلم بھی۔ اس کے ظاہری حلیے اور مغربی
 نقوش سے ہر اجنبی یہی اندازہ لگاتا۔

”اگر یہ غیر ملکی غیر مسلم بھی ہے تو یہ محبت مجھے
 خوار کر کے رکھ دے گی۔ لا حاصل محبت جی کا جنجال
 ہوتی ہے۔ سو لازم یہی ٹھہرا کہ اس ”ممکنہ خطرے“
 سے خود کو بچالیا جائے۔“ جھیل میں کنکر پھینک کر وہ
 دائرے گننے لگی۔ ایک، دو، تین۔۔

”یوں بھی محبت کے معاملے میں میرے نصیب
 نے کب اتنا ساتھ دیا ہے کہ کسی قسم کی خوش گمانی کی

گنجائش بھی نکلتی۔“ اس نے گہری سانس بھر کے سوچا
 تو چار برسوں کی دوری پر کھڑی مجتبیٰ مسعود کی آواز
 قریب ہی سے سنائی دی۔ جو اس نے ایثار کے خونی
 رشتوں کی بے بسی پر گوش گزار کی تھی۔

”ایثار! جن بے حس لوگوں سے تم محبت کرتی ہو،
 ان سے بدلے میں محبت کی خواہش تمہاری حماقت
 ہے۔ اسی حماقت کے سبب تم نے اپنی زندگی اجیرن کر
 لی ہے۔ اب تمہیں خدا کا واسطہ ہے، کسی سے محبت
 کرنے لگو تو مقابل سے بدلے میں محبت کی خواہش نہ
 رکھنا، یا پھر محبت ہی کسی ایسے شخص سے کرنا جس کے
 نزدیک تم پہلے ہی بہت اہم ہو۔“ مجتبیٰ مسعود کی بہت
 پہلے کئی گئی بات اسے بڑے ہی غلط وقت پر یاد آ کر بے
 گل کر گئی۔ جو اگر اس وقت یاد نہ آتی تو وہ دل کو
 بھلانے کے لیے کوئی نہ کوئی پہلو ڈھونڈ ہی لیتی۔

”اگر میں بدلے میں محبت پانے کی تمنا سے تائب
 ہو بھی جاؤں تو ایسے کئی اور معاملات بھی ہیں جو جینا
 دشوار کیے ہوئے ہیں۔“ مجتبیٰ مسعود کی بات کے
 جواب میں اس نے کہا تھا۔

”جانتا ہوں بخوبی۔ تمہارے ساتھ مسئلہ پتا ہے
 کیا ہے؟“ ایثار مصطفیٰ کو خود اس سے زیادہ جاننے کا
 دعویدار اب اس کی ذات کے متعلق تجزیہ کرنے کے
 لیے تیار تھا۔

”تم اکثر چیزوں کو ”جو ہے“ اور ”جیسا ہے“ کی بنیاد
 پر قبول کر لینے کے بجائے ”کیوں ہے؟“ اور ”کیسے
 ہے؟“ کی کھوج میں نکل پڑتی ہو۔ سوچنا اور گہرائی میں
 اتر کر سوچنا جیسے ”خطرناک عارضے“ میں مبتلا ہو تم۔“
 مجتبیٰ نے اسے آگاہ کیا تھا اور ایثار مصطفیٰ کی رگ رگ
 سے واقفیت کا دعویدار بھلا غلط کیسے ہو سکتا تھا؟

چار برس قبل وہ اگر مجتبیٰ کی تشخیص کر وہ ”بیماری“
 کی حقیقت کو تسلیم نہیں بھی کر پائی تھی تو اس کے چند
 روز بعد ہی اسے قبول کرنا پڑا تھا۔ جب کھانے کی میز پر
 اس کی مٹی بابا کے درمیان ہونے والی جھڑپ نے
 اسے افسردگی کی انتہاؤں پہ پہنچا دیا تھا۔ یہ جھڑپ کوئی
 نئی بات تو نہیں تھی۔ یہ تو ان کا معمول تھا۔ جسے دونوں

ہی پوری ذمہ داری سے نبھاتے بھی تھے۔ نئی بات تو یہ بھی نہیں تھی کہ دونوں ہی غصے کی انتہا میں جہالت کی پاتال میں اتر کر ایک دوسرے کی کردار کشی میں سبقت لے جانے کی دھن میں بے قابو ہو رہے تھے مگر یہ قصہ ضرور نیا تھا کہ بابا نے ایک دم ضبط کھوتے ہوئے کھانے کی میز پر رکھی تیز دھار چھری می کی طرف پھینکنی چاہی تھی۔ وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو بھی جاتے اگر جو مجتبیٰ سرعت سے اٹھ کر انہیں قابو نہ کرتا۔ اس صورت حال یہ زارا اور ابراہیم نے فقط چند لمحوں کے لیے نگاہ اٹھا کے دیکھا تھا اور دوبارہ پلیٹ پہ جھک گئے۔ ان دونوں کے نزدیک اس سارے ڈرامے کی کوئی اہمیت نہ تھی۔

اس نے نہایت دلگرفتی سے یہ سارا منظر دیکھا اور پھر اداسیوں میں گھر کے سوچا۔

”یہ روز کا قصہ ہے تو میرا دل اس کا عادی کیوں نہیں ہو جاتا؟ میرا من کیوں برسوں سے اس گھر کے امن کے ناممکن قیام کے لیے ہمکتا ہے؟ جتنی محنت کوشش یہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں کرتے ہیں اگر اس سے نصف جدوجہد خود کو اچھا ثابت کرنے میں کریں تو زندگی نہ اتنی بیزار ہو نہ اتنی دشوار۔“ مایوسی اور قنوطیت کا دورہ آج پھر پڑا تھا۔ مجتبیٰ بابا کو لے کر ان کے کمرے کی سمت بڑھ گیا تھا۔ کچھ لمحوں بعد می بھی بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کر چلی گئیں۔ اس نے چچ پلیٹ میں رکھا اور پلیٹ دور کھسکائی۔ اور لا تعلقی سے کھانا کھاتے اپنے بھائی ابراہیم اور بہن زارا کو ایک نظر دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

بابا سے خلع کا مطالبہ کر کے می اپنے حق مہر کی رقم گنوانا نہیں چاہتی تھیں اور بابا می سے انتہائی حد تک بے زار ہونے کے باوجود اگر می کے دل میں پلٹی خواہش کو پورا کر دیتے تو انہیں حق مہر کے پانچ لاکھ دینے پڑتے۔

گروٹوں کا کاروبار کرنے والے بابا کے لیے پانچ لاکھ کی ادائیگی کیوں مسئلہ بنی ہوئی ہے؟ وہ اس سوال کے متعلق سوچتی تو جواباً ”ضد اور انا“ کے سوا کوئی تیسرا

لفظ اس حوالے سے ذہن میں جگہ نہیں بناتا تھا۔ ضد اور انا کی اس جنگ میں ہارنا کوئی بھی نہیں چاہتا تھا۔ سو می گھر چھوڑنے کے بجائے دن میں تین بار تو کم از کم ضرور بابا کو اپنی صورت دکھاتی تھیں۔ کیونکہ بابا نے ان سے کہہ رکھا تھا۔ ”مجھے تمہاری صورت سے نفرت ہے اپنی شکل ذرا کم ہی دکھایا کرو۔“ ہر بار سامنا ہونے پر اپنی زبان کی ”کرامات“ بھی ضرور دکھاتی تھیں۔ وہ بابا کو اتنا زچ کر دینا چاہتی تھیں کہ وہ اپنی شکست تسلیم کر کے ان کا مطالبہ مان کر انہیں فلاح قرار دے دیں۔

لیکن بابا میں شاید برداشت کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ وہ می کی حرکتوں سے زچ ہو جانے کے بعد بھی نہ ان کا مطالبہ ماننے پر رضامند تھے نہ اپنی ہار۔

کمرے میں ٹھن کا احساس بڑھ گیا تھا۔ اس نے بے چین ہو کر کھڑکی کھول دی اور آسمان پہ تیرتے بادلوں سے شیر بھالوا اور جولاہا بنانے لگی۔

”یا پھر شاید می ہی ہار مان لیں۔ آخر بابا نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا تھا جو کامیاب بھی ہو سکتا تھا۔“ بادلوں کا ”گھوڑا“ چاند پہ سوار ہوا تو چاندنی چند لمحوں کے لیے قید ہوئی۔

”اگر جو حملہ کامیاب ہو جاتا تو۔۔۔؟“ اس سے آگے کا سوچ کے اس کی سانس بھی رکنے لگی۔ اس نے زور سے سر جھٹکا۔

”یہ بھی مقام شکر ہے کہ آج مجتبیٰ ڈنر کے لیے یہیں رگ گیا تھا۔ ورنہ بابا کو بروقت ان کے ارادے سے باز رکھنا کیسے ممکن ہو جاتا؟“ بادلوں کا گھوڑا چاند سے اترتا تو چاندنی بھی آزاد ہو کر چاروں اور پھیل گئی۔ مگر چندیل کے لیے ہی اس کے پیچھے بادلوں کی پری سواری کے لیے تیار کھڑی تھی۔

”اور یہ بھی صد شکر کہ پیپو ان دنوں داد سے ملنے راولا کوٹ گئی ہوئی تھیں۔ اگر جو یہیں ہوتیں تو مجتبیٰ کی یہاں موجودگی ممکن نہ تھی۔“ وہ آفس سے واپسی پر ہمیشہ سب سے پہلے اپنی صورت اپنی ماں کو ہی دکھانے میں آسودگی محسوس کرتا تھا۔

”بری“ نے چاند کی سواری چھوڑی تو چاروں اور پھیلی ٹھنڈی چاندنی میں اس نے ابراہیم اور زارا کو پورچ کی طرف بڑھتے دیکھا۔ خوش باش، شاد مگن سے۔ فردا کی کسی بھی قسم کی فکر سے آزاد۔ ہنسی، قمقمے کی مالا جپتے ہوئے۔ ”جو ہو گا دیکھا جائے گا“ کا زندہ اشتہار۔

”یہ بھی خوب زندگی جی رہے ہیں۔ کسی بھی پریشان کن بات کو زیادہ اہمیت دیے بغیر۔ مگر میرے لیے ایسی زندگی جینا کیوں دشوار ہے؟“ آسمان کی وسعتوں پہ نگاہیں جمائے وہ گویا رب سے استفسار کر رہی تھی۔

”شاید اس لیے کہ میں گہرائی میں اتر کر سوچنے جیسے خطرناک عارضے میں مبتلا ہوں۔“ جواب میں بے اختیار ہی اسے مجتبیٰ کی کسی بات یاد آئی تو وہ مسکرا دی۔ ”خدا جانے یہ بندہ اس قدر درست اندازے کسے لگا لیتا ہے؟“ اس نے تسلیم کیا۔ اس کی صلاحیت کو بھی اور اپنے عارضے کو بھی۔

”گو تم بدھ کے گیان دھیان میں اگر خلل نہ پڑے تو میں اندر آجاؤں؟“ مجتبیٰ نے کمرے میں داخل ہو جانے کے بعد اجازت طلب کی اور مسہری کے سرہانے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے پلٹ کر ایک نظر مجتبیٰ کو دیکھا اور مجتبیٰ کی مخالف سمت میں مسہری کے پائلٹی بیٹھ گئی۔

”بابا کے انداز سے لگتا ہے کہ اب وہ کسی حتمی فیصلے تک پہنچ کے رہیں گے۔“ دل میں پلتے خدشے کو اس نے زبان دی۔

”کیا کہہ سکتے ہیں۔۔۔؟“ اس نے گہری سانس بھر کر کندھے اچکائے۔

”ویسے ماموں کہہ رہے تھے وہ اب تک یقیناً کسی فیصلے تک پہنچ چکے ہوتے، مگر کوئی وجہ ہے جو انہیں روکے ہوئے ہے۔“

اپنے دونوں بڑے بچوں کو وہ کافی سمجھ دار سمجھتے ہیں۔ جو اپنے والدین کی چپقلش کا کوئی اثر نہیں لیتے۔ مگر ایثار مصطفیٰ کی وجہ سے وہ اپنے ضبط کو بہت آزماتے

ہیں۔ وہ اسے کسی صورت دیکھی نہیں کرنا چاہتے۔“ مجتبیٰ مسعود نے اس کو کسی قسم کے برے خیال سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے بغور ایثار کی صورت دیکھی۔

”اچھا۔۔۔؟“ طنزیہ ہنسی کے ساتھ اس نے سر جھٹکا۔ اس کے والدین اپنی اولاد کے لیے فکر مند رہتے ہیں۔ اس ایک بات پر اعتبار شاید وہ اس وقت بھی نہ کرے جب اس بات کی سچائی میں کوئی شک نہ ہو۔

”میں چند دنوں میں امی کو لینے راولا کوٹ جا رہا ہوں۔“ مجتبیٰ لب بھینچ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”تم چلو گی۔“ مجتبیٰ نے استفہامیہ نگاہیں اس پر جمائیں۔

طبیعت پر عجب بے زاری سی طاری تھی۔ دل بہلنے پر کسی طور آمادہ ہی نہیں تھا۔ سو اس نے انکار کرنا چاہا۔

”میری بات مانو! چلی چلو۔“ اس نے ایثار کا ارادہ بھانسنے ہوئے مشورہ دیا۔ ”بے کار فکروں سے دور رہو گی تو وہاں تمہارے دن یہاں سے بہتر گزریں گے۔“ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ وہاں پر سکون رہا کرتی تھی۔

ٹینشن زدہ ماحول سے دور رہنے کی وجہ سے بھی اور داد کی پر شفقت اور مہربان وجود کے زیر سایہ ہونے کے سبب بھی۔ مگر پھر بھی دل یوں لمحوں میں رضامند ہو جانے پر متامل تھا۔ سو وہ اتنی جلدی ہامی کیسے بھرتی؟

”اوگو تم بدھ!“ وہ زچ ہوا اس کے اتنا سوچنے پر۔ ”میں تمہیں یونہی تو گوتم بدھ نہیں کہتا۔ اتنا غور و فکر تو کوئی ماں اپنی بیٹی کا رشتہ آنے پر بھی نہیں کرتی ہو گی۔“ اس کے چڑنے پر وہ ہنس دی۔

”جب کوئی فیصلہ کر لو تو مجھے آگاہ کر دینا۔ میں چلا۔“ وہ چڑا ہوا تھا۔ اور پھر داد کی شفیق بانہوں میں سماتے اور پھپھو سے پر خلوص پیار وصول کرتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

بابا اس فیملی کا حصہ ہوتے ہوئے ان سے مختلف کیوں ہیں؟ بقول داد کہ دادا بھی محبتوں کے معاملے میں دوسروں کو مقروض کر دیا کرتے تھے۔ تو پھر بابا کیوں حقدار کو بھی محبت خیرات کی طرح دیتے ہیں؟ ان

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- ✽ کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- ✽ نئے بال اگاتا ہے۔
- ✽ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- ✽ مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- ✽ یکساں مفید۔
- ✽ ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت 150/- روپے

سوہنی ہیرائل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری
کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں
یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدایا جاسکتا ہے، ایک
بوتل کی قیمت صرف 150/- روپے ہے، دوسرے شہروں والے مٹی آڈر بھیج
کر جسر ڈپارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے مٹی آڈر اس
حساب سے بھجوائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے 350/- روپے
- 3 بوتلوں کے لئے 500/- روپے
- 6 بوتلوں کے لئے 1000/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرائل ان جگہوں
سے حاصل کریں
بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

سوالات کے جوابات اسے نہ پہلے کبھی مل سکے تھے نہ
اس وقت۔ مگر اس کے باوجود اس نے اتنا ضرور محسوس
کیا تھا کہ اس کے لیے راولا کوٹ کی ”فضا“ میں
افسردگی اور پریشانی کا تناسب کراچی کے مقابلے میں کافی
کم تھا۔

”سنو! تم ثانی امی کے پاس مستقل رہنے کا فیصلہ کرلو۔
شادر ہوگی۔“ یہ بات اگلی شام وہ جھیل کنارے اس
کے ساتھ چہل قدمی کرتے اسے تروتازہ دیکھتے ہوئے
کہہ رہا تھا۔

”انٹر تمہارا تمام ہوا۔ اب گریجویشن یہیں کسی
اچھے سے کالج سے کرلیتا۔“ وہ کس طرح خوش رہ سکتی
ہے؟ اس بات کے متعلق سوچنا اور کوشش کرنا، مجتبیٰ
کی آرزو بنتی جا رہی تھی۔

”مجتبیٰ! بونٹنگ کریں؟“ اس کا مشورہ مناسب لگنے
کے باوجود وہ اپنی عادت کے مطابق فوری فیصلہ نہیں
کرپائی، سو بات بدل کر اس نے مجتبیٰ کا دھیان بھی اس
طرف سے ہٹانا چاہا۔

مجتبیٰ اس کی اس کوشش پہ ہنس دیا۔
”اور اگر تم میرا مشورہ مان لوگی تو میرا وجدان کہتا ہے
کہ تم بتانا ابو کی طرح روز اس خوب صورت جھیل کو
خراج تحسین پیش کرنے بھی ضرور آوگی کہ اس کی
دلکشی تمہاری کلفت دور کرنے کا سبب ہے۔“

اس کے دادا عمر کے اس حصے میں جب ناتوانی جسم کا
اضافی عضو بن جاتی ہے اپنے سارے کاروبار کی ذمے
داری بیٹے مصطفیٰ شاہد کو سونپ کر فارغ ہوئے تو
قنوطیت نے کسی ان چاہے وجود کی طرح ان کے اندر
گویا ڈیرا ہی جمالیا۔

اپنے ڈاکٹر دوست کے مشورے پر وہ تبدیلی آب و
ہوا کی غرض سے جب راولا کوٹ پہنچے تو بنجوسہ جھیل
نے انہیں اپنے سحر میں جکڑ کر گویا عمر قید کی سزا سنادی۔
پھر وہ کبھی لوٹ کر کراچی نہ جاسکے۔ جھیل کے قریب
خوب صورت گھر کی تعمیر اور بلا تانچہ جھیل کی سیر
قنوطیت کا بہترین علاج ثابت ہوئی تھی۔ یہاں کے
شدید موسم نے قوت برداشت برعکالی تو بر فباری اور

تھی۔ مگر اسے اس بات کا یقین تھا کہ یہاں ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا فرد موجود نہیں، سوائے یہ بھی یقین کرنا پڑا کہ وہ اسی سے مخاطب ہے۔

”وہ مجھ سے ہوئے، ہم کلام اللہ اللہ!“ اسے معروف گائیکہ فریدہ خانم کی سسلی کی طرح یاد آئیں۔ ”یہاں قریب ہی کہیں مسٹر جوزف کا گھر ہے۔ مگر میں راہ بھول گیا ہوں۔ آپ اگر رہنمائی فرمادیں تو عنایت ہوگی۔“ شستہ اردو، نرم لہجہ اور رہنمائی کی بات۔ اس کے حیران ہونے کے لیے کوئی ایک بات تو تھی نہیں، سو دوتی بھر کے حیران ہوئی۔

”پچھلے سترہ روز سے کسی معمول کی طرح مخصوص راہ پر آنے جانے والا شخص واپسی کی راہ کیسے بھول سکتا ہے؟“ وہ متحیر تھی۔ ”اور راستہ اگر پیچیدہ ہو تب بھی یقین کی کوئی صورت نکل ہی آتی ہے۔ سڑک کی سیدھ میں چلتے ہوئے، بائیں سمت پہلا موڑ مڑتے ہی دور سے دکھائی دینے والا خوب صورت کانچ۔ نہ اتنی دور تھا، نہ ہی آڑی ٹیڑھی ٹکیوں میں آباد کہ راستہ بھٹکنے کا اندیشہ ہو۔“ اس کے چہرے پر حیرت کا تاثر باقی کسی بھی تاثر سے گمراہ تھا۔

”بہت ممکن ہے کہ یہ شخص بھی آج محبت کے توڑ کا منتر پڑھ بڑھ کے بیزار ہو گیا ہو اور آج بے بس ہو کر مجھ سے گفتگو کی چاہ میں یہ ہمانہ بنا بیٹھا ہو۔“ یہ دل اور اس کی خوش نہیں۔ اسے اپنے دل میں وارو ہونے والے اس اچانک خیال پر ہنسی آئی۔

”کمال تو محبت کے جذبے سے مغلوب نہ ہو جانے کے لیے“ وظیفہ ”پڑھا جا رہا تھا“ اور کہاں سیدھی سادی مدد کی درخواست کو بھی محبت کے معنوں میں ڈھالا جا رہا ہے۔ تم بھی نا ایثار۔! کبھی کبھی کمال کر جاتی ہو۔“ اس نے اپنا ہی مذاق اڑایا۔

”میں دراصل پچھلے کئی روز سے رستہ ہاؤس میں رہائش پذیر تھا۔ کل شب میرے نانا مجھے زبردستی اپنے گھر لے گئے۔ اب پہلی دفعہ میں ہی راستہ ذہن نشین کر لیتا میرے لیے کالی دشوار ہے۔ کیونکہ میں اس محلے میں کئی کند ذہن واقع ہوا ہوں۔ پلیز آپ مدد

جی ہوئی جھیل کا نظارہ بھی دشوار نہ رہا۔ عمر قید کی یہ خوب صورت سزا انہوں نے زندگی کی آخری سانس تک، بخوشی کائی اور اگلے جہاں کا رخت سفر باندھا تو دادو کو لگا کہ وہ بھی اب راولا کوٹ کی ہی عادی ہو گئی ہیں اور اسی لیے شاید مجبئی کو یقین ہو چلا تھا کہ ایثار بھی یہاں خوش رہے گی۔ اس نے مجبئی کا مشورہ مان لیا تھا اور آج چار برس بیت جانے کے بعد مجبئی کی پیش گوئی بھی سچ ثابت ہو گئی تھی۔ وہ مطمئن رہنے لگی تھی۔

اس نے کلائی پر بندھی کھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ مغرب کی اذان ہونے والی تھی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ آس پاس موجود سیاحوں کی تعداد بتدریج کم ہو رہی تھی۔ اس نے کن اکھیوں سے ”پالو“ کی جانب دیکھا اور واپسی کی راہ پر قدم بڑھائے۔ وہ ماتھے پر نکلے گاگنز، شرٹ کے گر بن میں انکا کرہاتھوں سے بال سنوار رہا تھا۔

اک چہرہ میری نگاہ میں ہے
کوئی یوسف ہے اور چاہ میں ہے
دل پھر بے ایمانی پر اتر آیا تھا۔ اس نے سر جھٹکا
نگاہوں کا رخ بدلا اور اپنی راہ چل دی۔
”محبت میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔“ دل کا دھیان پھر محبت میں اٹک گیا۔

”اف! تم خاموش کیوں نہیں ہو جاتے۔؟“ اس نے نگاہیں نیچے رکھے دل کو ڈپٹا۔

اپنی راہ پر چلتے ہوئے وہ اس کے قریب سے گزری تھی۔ اسی وقت اس نے محسوس کیا کہ ”پالو“ نے بھی واپسی کی راہ لی ہے اور اس کے پیچھے قدم بڑھائے ہیں۔ پورٹریٹ کی مہک اس کے تعاقب میں چلی آرہی تھی۔ رستہ ہاؤس کی بغلی راہ سے ہوتے ہوئے، سرسبز پہاڑ سے گزر کر اور سڑک تک پہنچنے تک، وہ کسی کے قدموں کی چاپ اپنے عقب میں سنتی آئی۔ دفعتاً ایک آواز نے متوجہ کیا۔

”ایکسکوز می میم!“ وہ بے اختیار پلٹی۔
”اس نے مجھے مخاطب کیا ہے؟“ وہ بے یقین

کر دیں۔" اس نے ایثار کے تاثرات سے خدا جانے کیا اندازہ لگایا تھا جواب سر کھجاتے ہوئے، کسی قدر شرمندگی سے اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔

مسٹر جوزف نہ سماجی کارکن تھے نہ ٹی وی پہ آنے والی کوئی معروف شخصیت جو وہ بنا اپنے ذہن پہ زور دے محض نام جان کر ہی شخصیت تک پہنچ جاتی۔ مگر وہ فقط نام جان کر ہی شخصیت تک پہنچ گئی تھی۔ کیونکہ بقول دادو دادا کی ان سے اچھی صاحب سلامت تھی۔ جس کے سبب دادو کی شناسائی بھی ہو گئی۔ جواب دادا کی وفات کے بعد دور کی سلام دعا تک رہ گئی تھی۔ اس نے گردن ہلا کے رخ موڑا اور راستہ بتانے کا قصد کیا۔

"میں ڈپلیس سے آیا ہوں۔ اور یہاں کشمیریوں کا مہمان ہوں۔ مہمان ہونے کی حیثیت سے میں آپ سے ایک درخواست کر سکتا ہوں؟" اس نے ایثار کا ارادہ بھانتے ہوئے عاجزانہ کہا۔

ایثار کے کچھ کہتے لب باہم پیوست ہوئے اور سوالیہ نگاہیں اس کی جانب اٹھیں۔

"آپ اگر راستہ بتانے کے بجائے میرے گھر تک کمپنی ہی دے دیں تو؟" اس نے سر کھجایا۔ جھجک کر کی گئی فرمائش شاید وہ اسی طرح سر کھجا کر ہی بیان کرتا تھا۔ ایثار نے گہری سانس فضا کے سپرد کی اور آگے کی جانب قدم بڑھا دیے۔

"بہت شکریہ!" مسکرا کر اس نے ایثار کے پیچھے قدم بڑھائے۔

"میں اتنی اچھی تو نہیں کہ کسی بھی اجنبی کی ایسی فرمائش بغیر کسی عذر کے مان جاؤں۔" اپنے ہم قدم ہوئے شخص کو اس نے کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے سوچا۔

"بہت بہتر ہوتا اگر جو میں کوئی بھی وجہ بیان کر کے سہولت سے انکار کر دیتی۔" وہ خاموشی سے نگاہیں جھکائے راستہ طے کرنے لگی۔

"میرا نام ڈیوڈ ہے۔ امریکہ سے تعلق ہے میرا۔ یہاں اپنے نانا سے ملنے آیا ہوں۔" اس نے مسکرا کر اپنا تعارف کرایا اور نگاہوں میں "اور آپ کا سوال

سموئے اس کی سمت دیکھا۔

ایثار نے اس کی مسکراہٹ کا جواب لبوں پہ مسکان سجا کے ضرور دیا مگر اس کی آنکھوں میں چلتے تعارف کے سوال کو بہت خوبی سے نظر انداز کر کے نگاہوں کا رخ بدلا۔

"محض تعارف ہی تو چاہ رہا ہے، سو کیا قباحت ہے جو تم اپنا تعارف نہیں کروا رہیں؟" ڈیوڈ کی ہمراہی میں مسرور دل، داغ کے اس فیصلے پہ تلملایا۔

"اس شخص سے روابط کہیں جان کا عذاب نہ بن جائیں۔" اس نے ضدی دل کو سمجھانے کی بے کاری سعی کی۔ مگر وہ سمجھنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔ ہنوز مچلنے لگا۔

"دل کی ایک مانو تو وہ اپنی منواتا چلا جاتا ہے۔" اس کے قدم سست پڑنے لگے۔ اس کے برابر چلتا شخص جو اس کی خاموشی اور سنجیدگی کے باعث اب خود بھی خاموش تھا، ایثار کے سست پڑتے قدموں کے باعث اس سے دو قدم آگے بڑھ گیا اور اس سے اگلے قدم پر ہی وہ موڑ تھا جس کے مڑتے ہی جوزف انکل کا خوب صورت کانچ نگاہوں کے سامنے آ جاتا۔ ڈیوڈ ایثار سے قبل ہی وہ موڑ مڑ گیا اور اچانک ہی چونک کے پلٹا۔

ایثار متحیر سی موڑ پہ ہی رک گئی۔ اس نے ایثار کی متحیر صورت دیکھی اور لب بھینچے۔

"تو کیا یہ شخص راستہ نہیں بھولا تھا۔؟ تو کیا یہ شخص میرے اندازے کے مطابق واقعی آج جاوے کے توڑ میں ناکام ہونے کے بعد یہ حرکت کر بیٹھا ہے؟ کیا واقعی۔" پتھر اس کے کہ دل خوش گمانیوں کے محل تعمیر کرتا وہ بول اٹھا۔

"یہ سچ ہے کہ میں راستہ بھول گیا تھا۔ مگر اس موڑ کو دیکھ کر میری میموری، ری فریش ہو گئی سو۔" اس نے مسکرا کر کندھے اچکائے۔

"میرے خدا! حد ہوتی ہے خوش فہمی کی بھی۔" اس کا اپنا دل اس کے کہے میں بالکل نہیں تھا۔ سو وہ جنبھلائی۔ "بھلا ایک امریکی معشری معاشرے کا پروردہ، ایک لڑکی سے بات کرنے کے لیے ڈرامے کیوں

سوال!

”اوہ خدا! تیرا شکر ہے۔“ اس نے ایثار کی بات کے جواب میں بے اختیار شکر ادا کیا۔ ”آپ کچھ بولیں تو۔۔۔ ورنہ پچھلے تین روز سے میں اس ایک بات پہ اللہ کی بہت ناشکری کر چکا ہوں کہ اتنی حسین صورت اور قوت گویائی سے محروم۔“ وہ مسکراتے ہوئے کسی قدر شرارت سے گویا ہوا۔

”حسین صورت۔۔۔؟“ اس کی نظروں میں اپنا سانولا عام سے نقوش والا چہرہ آیا۔ ”کمال ہے یہ شخص بھی۔“ وہ سر جھٹک کے مسکرا دی۔ ڈیوڈ نے اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھا اور حوصلہ پا کے گویا ہوا۔ ”آپ کا نام جان سکتا ہوں۔۔۔؟“ وہی جھٹک کر اور سر کھچا کر گئی فرمائش جسے وہ دو روز قبل نظر انداز کر گئی تھی۔

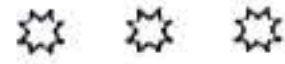
”ایثار۔“ وہ دھیسے سے گویا ہوئی۔
”ایثار۔۔۔ گڈ یعنی قربانی؟“ اس نے نام کا مفہوم بتا کر اس سے تائید چاہی تو ایثار حیران رہ گئی۔
”کی اردو بولنے والے کی انگریزی بہت اچھی ہو تو یہ بات کوئی ایسے اچھے کی نہیں۔ کوئی انگریز اگر اردو بولے تو یہ بھی کوئی ایسی حیرانی کی بات نہیں۔ لیکن اگر اردو بولنے والا انگریز شخص اپنا لب و لہجہ بھی اردو بنالے اور مشکل الفاظ کے معنی بھی با آسانی بتا دے تو سننے والا کسی قدر حیران ضرور ہوتا ہے۔ سوائے بھی حیرانی ہوئی۔

”حیران نہ ہوں۔“ وہ اس کی حیران صورت سے حفا اٹھاتے ہوئے بولا۔

”سات سے سولہ سال تک کی عمر کا عرصہ میرا کراچی میں بیتا ہے۔ اردو سے واقفیت ہوئی تو مجھے یہ زبان اتنی اچھی لگی کہ ڈپٹی چلے جانے کے بعد بھی اس زبان کو مزید سیکھنے کی کوشش جاری رکھی، سواب میں کہہ سکتا ہوں کہ میں آپ سے زیادہ اچھی اردو جانتا ہوں۔“ اس نے اترانے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ وہ اس بیچ کے قریب پہنچ گئے تھے جہاں سیاحوں کی تعداد نسبتاً کم ہونے کے باعث ایثار کی نشست

کرے گا؟ کبھی تو عقل کو بھی کام میں لے آیا کرو ایثار ڈیر! پڑے پڑے مولی بھی ہو گئی ہے اور زنگ آلود بھی۔“ اس نے خود اپنے آپ کو ہی لتاڑا۔ اور تیزی سے واپسی کی راہ لی۔

وہ دل کو مزید بے وقوفیاں کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ سوائے پچھے ”رکے“ منہ سے ”کی آواز بھی ان سنی کر گئی۔



اس کے اندر کوئی خوف تھا جو روز کے معمول میں مغل ہوا۔ اور چار برسوں سے جھیل کنارے کی سیر پچھلے دو روز سے متاثر ہوئی۔ مگر دل کی من مانیوں سو تیسرے روز ہی اس کے قدم پھر جھیل کی سمت بڑھنے لگے۔

وہ اسے دور سے دیکھ کر ہی مسکرایا تھا۔ ایثار اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اپنی مخصوص جگہ کی سمت بڑھنے لگی تو وہ دائیں جانب سے اس کے ہم قدم ہوا۔

”ہیلو!“ اس نے دوستانہ مسکراہٹ لبوں پہ سجائی۔
جواباً ”ایثار نے فقط مسکرا کر اکتفا کیا۔
”آپ دن سے نظر نہیں آئیں۔۔۔؟ خیریت رہی؟“

اس نے میری عدم موجودگی محسوس کی۔ دل خوشگوار انداز میں دھڑکا۔

ہاں کی۔ مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تم اس کے اس عمل کو کوئی الٹے سیدھے معنی پہناؤ۔ اس کی اب اپنے دل سے ذرا کم ہی بنتی تھی سو اس نے اپنی نظروں کا رخ بائیں جانب موڑا اور اثبات میں گردن ہلا دی۔

”اس روز میری راہ بھول جانے کی بات کو آپ جھوٹ جان کر شاید برا مان گئی تھیں۔ حالانکہ وہ جھوٹ بالکل نہیں تھا۔ مگر پھر بھی معذرت۔“ وہ شرمندہ تھا۔ ایثار نے اس کی سمت دیکھا اور گویا ہوئی۔
”میں نے آپ کی بات کو سچ ہی مانا، سو برا لگنے کا کیا

خاص تھی۔

”نوبرس کا عرصہ کراچی میں گزارنے کے باعث میں یہاں کے رسم و رواج، لوگوں کے رہن سہن، مذہب اسلام اور عورتوں کے مقام و مرتبے سے بھی کسی حد تک آگاہ ہوں۔“ وہ ایثار کے ساتھ بیچ پہ کافی فاصلہ چھوڑ کے بیٹھا اور اپنی بات کو ثابت کر دیا۔ ایثار مسکرائی۔

”آپ کی مسکراہٹ بہت دلکش ہے۔“ ایثار کے چہرے کو نظروں کے حصار میں لیتے ہوئے اس کے دل میں جو خیال ابھرا اس کا برملا اظہار بھی کر دیا۔ بے اختیار ہی ایثار نے لب بھینچ لیے۔

اس مغربی معاشرے کے پروردہ شخص کے لیے یہاں کے اقدار و روایات سے آگاہ ہونے کے باوجود اس کے مطابق چلنا مشکل نہیں بھی تھا تو اسے یاد رکھنا دشوار ضرور تھا۔

”اوہ گاڈ!“ ایثار کے لب بھینچ لینے پر اسے اپنی غلطی کا احساس فوراً ہی ہو گیا تو اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیر کے گویا اپنی کمزور یادداشت کا ماتم کیا۔

”یا اللہ! یہ شخص اور اس کے انداز!“ اس نے اپنے بچاؤ کے لیے نگاہوں کا رخ بدلا۔

”ہمارے یہاں لڑکیاں کسی غیر مرد کے یوں سرانے پر برامانتی ہیں۔“

”میرے علم میں تھا، مگر میں بھول گیا۔“ وہ شرمندہ تھا۔ ”سوری!“ اس نے اپنے کان پکڑ کر اپنی براؤن آنکھیں اس پہ جمادیں تو اس کا دل دھڑک اٹھا۔

پارہ! یہ میرے لیے کوئی راہ فرار چھوڑے گا بھی یا یونہی چاروں جانب سے گھیرا تنگ کرتا جائے گا؟ وہ گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی اور واپسی کے لیے بہانہ تلاش کرنے لگی۔

”میری نماز کا وقت ہو رہا ہے۔“ اس نے کلائی موڑ کے وقت دیکھا۔

”چلوں گی اب۔“ اس کی سمت دیکھے بغیر وہ تیزی سے چلتی چلی گئی۔

یہ شخص کسی بھوت کی طرح میرے ذہن سے

کیوں چمٹ گیا ہے؟ اس نے بے بسی سے سوچا۔ ایسا کیا کروں کہ اس کا خیال دل و دماغ سے نکل جائے۔ گھر کی سمت بڑھتے ہوئے وہ لاچاری سے سوچنے لگی۔

چند روز یہاں کا رخ نہ کرو، وہ مہمان ہی ہے۔ چلا جائے گا۔ دماغ نے راہ بھائی۔

بہت خوب! ایسا کرنے سے میں تمہیں چین لینے دوں گا کیا؟ دل آج کل اس کا دشمن بنا ہوا تھا۔ کوئی بات نہیں۔ میں بے چینی سے رہ لوں گی۔ اس نے بے چارگی سے دل کو جواب دیا۔

اس سے کیا ہو گا؟ دل و دماغ سے اس کا قبضہ ہٹانے کے لیے یہ طریقہ علاج کامیاب نہیں ہو گا۔ ”کوشش کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں۔“ وہ دل پہ غلبہ پانے کے چکر میں تھی۔

”یہ کوشش بھی تم دو روز قبل کر کے دیکھ چکی ہو۔“ دل مغلوب ہونے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔ ان ہی سوچوں میں الجھتے، وہ مخصوص راہ پہ چلتی چلی گئی۔ دھیان ارد گرد کے بجائے کہیں اور ہی تھا۔

”شکر ہے، تمہیں گھر کا راستہ مل گیا۔ میں بس ابھی آدھے گھنٹے میں نکلنے ہی والا تھا۔“ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی سامنے صوفے پہ بیٹھے مجتبیٰ نے اسے دیکھ کر شکر کا کلمہ پڑھا۔ مجتبیٰ کی آواز پہ اس نے بڑی دقتوں سے منتشر دھیان کو سمیٹا اور مسکرائی۔

”کب آئے؟“ وہ مجتبیٰ کے مقابل صوفے پہ بیٹھ گئی۔

”کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔“ مجتبیٰ نے اس کے کھوئے کھوئے انداز کا نوٹس لیا۔

بابا کے کاروبار میں مجتبیٰ کا باب برابر کا حصہ دار تھا۔ دوبرس قبل اسلام آباد میں ان کی کمپنی کی براچ کھولی گئی تھی۔ تب سے وہ جب بھی کاروبار کے سلسلے میں اسلام آباد آتا تو کئی گھنٹوں کا سفر طے کر کے راولا کوٹ بھی ضرور آتا۔ اکثر وہ اتنی عجلت میں ہوتا کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ہی واپس جانے کے لیے تیار ہوتا۔

”کراچی میں سب ٹھیک ہیں۔“ ہمیشہ کی طرح

آج بھی مجتبیٰ سے ملاقات کے بعد اس کا پہلا سوال یہی تھا۔

”ہاں۔“

”اور مئی بابا۔۔۔؟“ مجتبیٰ اس کے آدھے سوال سے پورے سوال تک پہنچا۔ اگرچہ وہ مجتبیٰ کا جواب جانتی تھی مگر اس سوال سے وابستہ امید سے وہ کبھی جھکڑا نہیں کرتی تھی۔

”ان کے تعلقات ہنوز پاک بھارت تعلقات جیسے ہیں۔ بہتری کے آثار دور تک دکھائی نہیں دیتے۔“ مجتبیٰ یہ جاننے کے باوجود کہ ایسے حقائق اس کی افسردگی میں اضافے کا باعث بنتے ہیں اس سے کوئی بھی بات چھپا نہیں پاتا تھا۔

وہ چپ سی ہو گئی۔

”زارا نے اپنے انٹیریور ڈیزائننگ شوروم کھولنے کے ارادے پر اپنے کسی دوست کے ساتھ مل کر عمل کر ڈالا ہے۔ پچھلے ہفتے اس کی افتتاحی تقریب تھی۔“ مجتبیٰ نے اس کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے نسبتاً اچھی خبر سنائی۔

”یعنی اس بار اچھی خبر بھی لائے ہو ساتھ۔“ وہ مسکرائی۔ ”کوئی اچھی خبر ابراہیم سے متعلق بھی سنا دو۔“

”ابراہیم سے متعلق۔۔۔؟“ وہ ہنسا۔

”ابراہیم کبھی کمال شخص ہے۔ کل اپنے فرینڈ کے ساتھ اس کی بائیک پہ سوار جسٹ فار انجوائے منٹ ایک شخص کا موبائل چھینا اور نیٹھی مجھٹی سے گزرتے ہوئے سمندر میں پھینک دیا۔“ وہ اس پر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ یہ کوئی اہم بات نہیں لا پروا سالجہ اختیار کیے ہوئے تھا۔ مگر وہ اپنی ایسی کوشش میں ذرا کم ہی کامیاب ہو پاتا تھا، سوا اس وقت بھی ناکام ہوا۔ ”میرے خدا!“ ابراہیم کی ایسی حرکتیں اسے رنج پہنچاتی تھیں۔ مجتبیٰ نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”اچھا تم اپنے بھائی کے لیے پریشان ہو۔ میں سمجھا اس شخص کے لیے ہو جس کا موبائل چھنا۔“ اس نے طنزیہ لہجہ اختیار کیا۔

”بائے دی وے! اس سارے قصے میں تمہارے بھائی کے ساتھ تو ایسا کچھ نہیں ہوا جس پر افسردہ ہوا جائے۔“ ہنوز طنزیہ لہجہ۔ اس نے ناراض نظروں سے مجتبیٰ کی سمت دیکھا۔

”ایسی حرکتوں کے باعث وہ پکڑا بھی جاسکتا ہے۔“ اس نے فکر مندی کی وجہ بتائی۔

”پکڑا جائے گا تو بالکل صحیح پکڑا جائے گا۔ مگر اس بے چارے کا کیا ہو گا جو مفت میں بلا وجہ ہی لٹا۔“ وہ آج اسے تسلی دینے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔

”مادی چیزوں کی بھلا کیا اہمیت مجتبیٰ! اصل چیز تو رشتے ہیں۔“ ابراہیم کی ایسی حرکتوں سے نفرت کرنے کے باوجود وہ اس کی وکالت کیے گئی۔

”تمہارے لیے ایسا کچھ کہنا اس لیے دشوار نہیں ایثار! کہ تم نے پیدا ہوتے ہی دولت کی فراوانی دیکھی ہے۔ یہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو بہت کوشش اور محنت کے بعد پیسے کی صورت دیکھتے ہیں۔ سوائے اہمیت بھی دیتے ہیں۔“ بولتے بولتے وہ مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے خاموش ہوا۔ اسے اندازہ ہوا کہ اس کی بے کلی میں اضافے کا باعث بن رہا ہے۔ سوائے موضوع بد لٹا پڑا۔

”ماموں نے تمہارے لیے یہ کتابیں بھجوائی ہیں۔“ اس نے ایک طرف رکھی میز سے چند کتابیں اٹھا کر اس کی طرف بڑھائیں۔ اس حقیقت سے آگاہ ہونے کے باوجود کہ بابا اس پر ایسی کوئی عنایت نہیں کر سکتے۔ اس نے مجتبیٰ کی بات کو سچ مان لینے کا بھرپور تاثر دیا تھا۔

اگر کوئی شخص محض آپ کی خوشی کے لیے آپ سے جھوٹ بولے تو پھر آپ کا بھی فرض بنتا ہے کہ اس شخص کی خوشی کے لیے حقیقت سے باخبر ہونے کے باوجود اس پر یہ ظاہر کریں کہ اس کی سچائی میں کوئی شبہ نہیں۔ مگر مجتبیٰ اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کے دل کی بات تک پہنچتا تھا، سو ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔

”کراچی کی خبریں تم نے سن لیں اب تم مجھے یہاں

کی خبریں سناؤ۔“ اس کے ذہن میں ایثار کا کھویا کھویا
الجھا الجھا سا انداز پھر نمودار ہوا۔

”یہاں کی خبروں میں کچھ بھی ایسا خاص نہیں جو
گوش گزار کیا جائے۔“

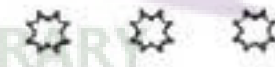
”لیکن آج یقیناً“ کچھ ایسا خاص ہوا ہے جس نے
تمہارے ذہن پر اپنا تسلط جمایا ہوا ہے۔“ مجتبیٰ کے
یقین سے کہنے پر اس کا دل یکبارگی دھڑکا۔

اس کا حقیقت چھپانا دشوار تھا اور سچائی بتادینا اس
سے زیادہ دشوار۔

”نہیں۔۔۔ آج بھی کچھ خاص نہیں ہوا۔“ اس
ایک لمحے میں اس پر منکشف ہوا کہ وہ یہ حقیقت اسے
کبھی نہ بتا پائے گی۔ سونگا ہیں حیرانے لگی۔

مجتبیٰ نے شدت سے اس کے بدلے ہوئے رویے
کو محسوس کیا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ ایثار کوئی بات اس
سے پوشیدہ رکھنا چاہ رہی تھی۔

”او کے! شاید میرا وہم ہی ہو۔“ وہ ایثار پر یہ ظاہر
نہیں کرنا چاہ رہا تھا کہ اسے اس کے جھوٹ پر اعتبار
نہیں۔ سو مسکرا کر اس کے جھوٹ کو قبول کر لیا۔



”میں جب سات برس کا تھا تب میری ماں نے مجھے
میرے نانا، نانی کے پاس کراچی بھیج دیا۔ کیونکہ تب وہ
بیمار رہتی تھیں۔“ اس نے اپنے گانگڑا تار کرتیخ پر اپنے
اور ایثار کے درمیان رکھے۔ دل و دماغ کے درمیان
جاری جنگ میں جیت ضدی دل کی ہوئی تھی۔ اب یہ
اس کی ڈیوڈ سے کون سی ملاقات تھی؟ اسے یاد نہیں
تھا۔

”کراچی میں میرے دن اچھے گزرے۔ اپنے نانا
سے میری خوب دوستی ہو گئی۔ آج بھی میرے بہترین
دوست میرے نانا ہی ہیں۔“ اس نے دور جھیل میں
کنکر پھینکا۔

”جب میں سولہ سال کا تھا تو نانی کے انتقال کے بعد
نانا اداس رہنے لگے تھے۔ تب میں نے حد درجہ بور ہو
کر بے وفائی کی حد کر دی اور نانا کو ان کے حال پر چھوڑ

کے واپس ڈپس چلا گیا۔“ وہ ہنس کر اپنا کارنامہ بیان کر
رہا تھا۔

”ڈپس پہنچ کر مجھے پتا چلا کہ میری ماں کسی مسلمان
شخص سے شادی کر کے خود بھی مسلمان ہو گئی ہے۔“
اپنی ماں کی دوسری شادی کی بات وہ بڑے آرام سے
عام سے کچھ میں کر رہا تھا۔ جیسے اس کے نزدیک اس
بات کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔

”میری ماں کی دوسری شادی میرے لیے اتنی حیران
کن نہیں تھی وہاں ایسا ہونا عام سی بات ہے۔ مگر
میری ماں کے مذہب بدل لینے نے مجھے ضرور حیران کیا
تھا۔ میری ماں اچھی خاصی مذہبی عورت تھی اس نے
کیسے اتنی آسانی سے اپنا مذہب چھوڑ دیا۔؟ یہ بات
اکثر مجھے حیران کرتی۔“

”آپ کی ماں کو اس مسلمان شخص سے محبت ہو گئی
ہو گی اور محبت ایسا کروادیتی ہے۔“ کچھ جاننے کی جستجو
میں وہ بے اختیار کہہ گئی۔

”محبت۔۔۔؟“ وہ مذاق اڑانے والے انداز میں ہنسا۔
”ایسی کسی محبت کو میں نہیں مانتا۔“ اس نے سر جھٹکا۔

”محبت آپ کو اپنے مذہب سے بھی تو ہوتی ہے۔
مگر یہ کیسی محبت ہے جو آپ کو اپنے محبوب مذہب
سے موڑ دیتی ہے۔ جس سے آپ کا تعلق اپنی پیدائش
سے ہوتا ہے۔“

”کیا ضروری تھا کہ مجھے اس شخص سے محبت ہوتی،
جس سے ملن کی امید ایک فی صد بھی نہیں۔“ ڈیوڈ
کے خیالات جان کر وہ بے اختیار پچھتائی تھی اللہ سے
شکوہ کر گئی۔

”لیکن دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی بھی تو نہیں
جنہوں نے اپنا مذہب بدل لیا ہے۔ صرف ایک آپ
کی والدہ تو نہیں۔“

”لیکن میں ان لوگوں کی بات کر رہا ہوں جو بہت
مذہبی ہوتے ہیں۔ جنہیں اپنے مذہب سے محبت ہوتی
ہے۔ مذہب کو بہت زیادہ اہمیت نہ دینے والوں کے
لیے تو یہ عمل شاید کچھ ایسا مشکل نہ ہو۔ لیکن میری
ماں تو مذہب سے بہت زیادہ لگاؤ رکھتی تھی۔“ اس نے

اپنی پچھلی بات کی وضاحت کی۔

”پھر تو آپ خود بھی کافی مذہبی ہوں گے؟“ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ استفسار کیا۔

”نہیں بالکل بھی نہیں۔“ وہ ہنسا۔ ”میں زیادہ تر اپنے نانا کے ساتھ رہا ہوں تو مذہب سے میں بھی ان کی طرح کوسوں دور ہوں۔“

اس کے جواب نے ایثار کے دل میں کسی اطمینان اتار تو امید بھی اس پاس منڈلانے لگی۔

”یہ کہتا ہے کہ میں مذہب سے بہت دور ہوں اور مذہب سے دور رہنے والوں کے لیے مذہب کی تبدیلی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ سو یہ ناممکن تو نہیں کہ یہ اپنا مذہب چھوڑ دے۔“ اس پاس منڈلانے والی امید نے سرگوشی کی۔

”یعنی مذہب کی تبدیلی آپ کے لیے کبھی دشوار ثابت نہیں ہوگی؟“ اس نے نگاہیں چراتے ہوئے دھڑکتے دل کے ساتھ سوال کیا۔ ضروری نہیں تھا کہ اس سوال کا جواب بھی امید افزا ہو۔

”نہیں۔ میرے لیے ایسا عمل دشوار نہیں ہو گا۔“ دل ایسا ہی کچھ سننے کا متمنی تھا۔

مگر یہ دل اور اس دل کی تمنائیں۔ ”مگر میم! میں کیوں بلاوجہ ہی اپنا مذہب بدلنے لگا؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کھوجتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”بلاوجہ نہیں۔“ اس نے بے تالی سے کہا۔ ”ایسا ہونا ناممکن تو نہیں کہ کوئی آپ اپنا دل ہار دے۔“ ”نہیں یار! ایسا نہیں ہو سکتا۔“ اسے گویا یقین تھا۔

”ایسا ہو چکا ہے۔“ رواروی میں اس کے لبوں سے پھسلا ڈیوڈ کی آنکھوں میں تحیر سمٹ آیا۔

”اف خدا! یہ زبان سے ادا ہو جانے والے الفاظ واپس کیوں نہیں ہوتے۔“

”میں کہنا دراصل یہ چاہ رہی تھی کہ فرض کریں ایسا ہو چکا ہے۔“

”چلو“ فرض کر لیا کہ ایسا ہو چکا ہے۔“ وہ محفوظ

ہوتے ہوئے بولا۔ ”تب بھی یار! مذہب تو وہ بدلے نا جس کے ساتھ محبت کا حادثہ ہو گیا ہے۔“ وہ ہنوز مسکرائے جا رہا تھا۔

ایثار کا دل یکبارگی دھڑک کے رکا۔ اس لمحے اس پر کھلا کہ وہ اپنے مذہب سے محبت اس شخص سے زیادہ کرتی ہے، تو پھر یہ فرض کر لیتے ہیں کہ محبت کا حادثہ آپ کے ساتھ پیش آگیا ہے۔“ اسے جو جواب درکار تھا وہ پچھلے سوال سے نہ مل سکا تو اس نے سوال بدل ڈالا۔ اس کے خوابوں کی زندگی کا انحصار ڈیوڈ کے جواب پر تھا، سو وہ ہمہ تن گوش ہوئی۔ اس نے چند لمحوں تک سوچا اور پھر سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”شاید مذہب کو اہمیت دوں۔“ وہ یقین و بے یقینی کی کیفیت کے درمیان بولا۔ ایثار کے دل میں اداسی بڑے اطمینان سے لمبے قیام کے لیے پاؤں پیارے بیٹھ گئی۔

”شاید کیوں۔؟ کیا آپ کو یقین نہیں ہے؟“ دل میں ایک موہوم سی امید اب بھی باقی تھی۔ ”نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں شاید ایسا نہ کر سکوں۔“ کچھتے ہوئے وہ پھر شاید کہہ گیا۔

موہوم سی ٹمٹماتی امید ایک دم بجھ گئی۔ دل میں ملال اتر آیا اور آنکھوں میں نمکین پانی۔ ”چلیں۔؟“ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور رخ موڑے جانے کے لیے بالکل تیار۔

آنکھوں کے کنارے ٹھہرے اشکوں کو اس نے بڑی دقت سے حد پار کرنے سے روکا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ دو قدم اٹھانے کے بعد وہ تیسرے قدم پر ٹھک کے رک گئی۔ نگاہ دور سے آتے مجتبیٰ پہ پڑ گئی تھی اور دل بے ہنگم انداز میں دھڑک اٹھا تھا۔ وہ ان ہی کی طرف متوجہ تھا۔ اس کے اس طرح ٹھہر جانے پر ڈیوڈ بھی تھلیدا ”رکا۔ تیز قدموں سے چلتے ہوئے مجتبیٰ عین اس کے سامنے آ رکا۔ چہرے پہ سنجیدگی کے تاثرات لیے وہ اسے کچھ برہم بھی لگا۔ دل میں موجود چور کے باعث ایثار سے نگاہیں ملانا دشوار ہوا۔ ورنہ بظاہر ایسی کوئی بات تو نہیں تھی جو نگاہیں چرا لے

منٹ کی ملاقات کے لیے تم اتنا لمبا سفر کیسے طے کر لیتے ہو؟

”تم بھی تو روز بلا ناغہ ہی یہاں آنا فرض کی طرح نبھاتی ہو۔ تم میں بھی بڑا اسٹیجنا ہے۔“ اس کے فقرے میں طنز اور لہجہ کی آمیزش بڑی واضح تھی۔

”میری بات اور ہے۔ میں تو۔۔۔“ ایثار نے اس کے طنز اور لہجہ کو اپنا دھم سمجھ کر نظر انداز کیا اور کچھ کہنا چاہا۔ مگر مجبئی نے اسے فقرہ مکمل کرنے نہیں دیا۔

”بات اور نہیں ہے ایثار! بات ایک ہی ہے۔ میرے یوں پندرہ بیس منٹ کی ملاقات کے لیے اتنا لمبا سفر طے کرنے میں بھی اور تمہارے۔۔۔“ اس نے نچلا لب دانتوں تلے دبا کر بات ادھوری چھوڑی۔

”یہ مجھ سے اس لہجے میں بات کیوں کر رہا ہے؟“ اس کا تیز لہجہ ایثار کو رنج پہنچا رہا تھا۔

”میرے علم میں نہیں تھا کہ تمہیں میری آمد اتنی ناگوار گزرے گی۔“ وہی رخ و ترش لب لہجہ۔

”مجھے تمہاری آمد کبھی بری نہیں لگی مجبئی! تم بات کو غلط معنوں میں کیوں لے رہے ہو؟“ اسے مجبئی کے ایسے رویے پہ دکھ بھی تھا اور حیرت بھی۔ اور یہ شخص کہتا ہے میں تمہیں خود تم سے زیادہ جانتا ہوں۔

تمہارے چہرے کے رنگوں سے تمہارے دل کی بات آرام سے پالیتا ہوں۔ پھر آج اسے دشواری کیوں پیش آرہی ہے؟ اور دشواری تو درحقیقت اسے ہی پیش آ رہی تھی، مجبئی کے اس نازیبا رویے کو سمجھنے کے لیے دگر نہ مجبئی تو ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کے چہرے سے اس کے دل کا راز پا گیا تھا۔ اور نتیجتاً

رقابت کے جذبے سے مغلوب ہو گیا تھا۔

”مگر آج تمہیں میری آمد بری لگی ہے اور اس کی وجہ وہ انگریز کا بچہ ہے، جس سے تمہاری آج کی ملاقات ادھوری رہ گئی۔“ طیش میں اس کے تند لب و لہجے سے جن الفاظ کی ادائیگی ہوئی اس نے ایثار کے لبوں کی گردش تیز کر دی۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ غصے سے بھی اور اپنی ہتک کے احساس سے بھی۔

یوں آپے سے باہر تو وہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ اور اگر

جائیں۔ ”اسلام علیکم! مجبئی! کیسے ہو؟“ بالآخر اسے بولنا پڑا۔

مجبئی نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور اپنی کھوجتی سنجیدہ نگاہوں سے ڈیوڈ کو گھورے گیا۔ ایثار کو اس کا انداز بڑا عجیب لگا۔

”یہ ڈیوڈ ہیں۔“ ایثار نے ڈیوڈ کی سمت دیکھا اور پھر مجبئی کی طرف دیکھ کر تعارف مکمل کیا۔ ”ڈیلس سے آئے ہوئے ہمارے مہمان۔“

مجبئی سپاٹ چہرہ لیے کھڑا رہا۔ ایثار کو اس کے انداز الجھن میں مبتلا کرنے لگے۔

”اور مسٹر ڈیوڈ! یہ میرے کزن ہیں مجبئی!“ ڈیوڈ نے مسکرا کر خوش دلی سے مجبئی کی سمت ہاتھ بڑھایا۔ جسے بغیر گرم جوشی بلکہ کسی قدر سرد مہری سے تھاما گیا تھا۔

”میں پچھلے بیس منٹ سے تمہاری راہ دیکھ رہا ہوں۔ اگر یہاں نہ آتا تو تم سے ملے بغیر ہی جانا پڑتا اور ایسا میں چاہتا نہیں تھا، سو یہاں آ گیا۔“ ڈیوڈ کو مکمل نظر انداز کیے وہ ایثار کی جانب مڑا۔

”اوکے! مس ایثار! میں چلا۔ آپ سے ملاقات اب کل ہوگی۔ اوکے بائے!“ اس نے گاگلز آنکھوں پہ جمائے اور مزید کچھ بھی کہنے سے بغیر آگے بڑھ گیا۔

کیوں ہوگی ہماری ملاقات کل۔۔۔؟ ان بے مقصد ملاقاتوں سے بھلا کیا فائدہ حاصل ہو گا ہمیں؟ وہ لمحہ بہ لمحہ دور ہوتے ہوئے ڈیوڈ کی پشت کو گھورتے سوچے گئی۔

کہتے ہیں، محبت ملن کی محتاج نہیں۔ وہ خدا جانے محبت کا کون سا درجہ ہوتا ہے؟ میں تو یارب! اس سوچ سے ہی ہلکان ہو جاتی ہوں۔ اس نے لب بٹھپے۔

مجبئی نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں پیچھے مڑ کے دیکھا اور ناگوار سی نگاہ ڈال کر اس کے اور ڈیوڈ کے درمیان آیا۔

ایثار نے خود کو کمپوز کیا اور مسکرائی۔ ”تم میں بڑا اسٹیجنا ہے مجبئی! خدا جانے محض تیس پینتیس

پینتیس

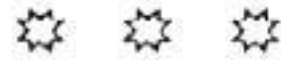
ہوا بھی تھا تو ایسی زبان۔۔۔؟ وہ متحیر تھی اس کے لب و لہجے پر۔

”مجبتی! غصے کے سبب تم اپنی عقل کھور ہے ہو۔ تمہارے الفاظ مجھے دکھ پہنچا رہے ہیں۔“ اس نے مجبتی کو اس کے بدترین رویے کا احساس دلانا چاہا۔

”ٹھیک کہہ رہا ہوں میں۔“ اس نے درشتی سے کہا۔

”مجبتی۔!“ دکھ اور صدمے سے وہ بے جان ہوئی اور حرکت کرنے سے معذور ٹھہری۔ مجبتی پلٹا اور تیز قدموں سے واپسی کی راہوں پہ چل پڑا۔

آنکھیں جو کب سے برسنے کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھیں ایک دم چھلک پڑیں۔ ارد گرد کا منظر دھندلا گیا۔ اور دکھ کی کہر سے اندر کی دنیا بھی۔



”رات تمہارے باپ کا فون آیا تھا۔“ دادو نے صوفے پہ اس کے برابر نشست سنبھالی اور ہاتھ میں پکڑے سیب کی ایک قاش کاٹ کر اس کی سمت برسھائی۔

”حیرت مجھے اس بات پر ہوئی کہ تمہارے باپ کو میرا نمبر یاد رہا۔“ دادو کو بھی اس کی طرح اس کے باپ سے دو سری کئی شکایتوں کے ساتھ یہ شکوہ بھی تھا کہ وہ شاذ و نادر ہی فون کیا کرتے تھے۔

”کہہ رہا تھا مریم نے مجبتی کے لیے تمہیں بازگا ہے۔ کسی کو کوئی اعتراض نہیں۔ تمہاری مرضی پوچھ کے بتادوں۔“ دادو نے بلاوجہ کی تمہید باندھنے کے بجائے سیدھے سبھاؤ مطلب کی بات کی۔ وہ بے چین ہوا ٹھسی۔ ہاتھ میں پکڑی سیب کی قاش اس نے واپس پلیٹ میں رکھ دی

نجانے کیوں دل میں پلتی وہ شدید خواہش جس کی تکمیل کا دور تک کوئی امکان ہوتا ہے نہ اشارہ اسی خواہش کے پورا ہونے کے لیے لاشعور کسی معجزے کا ہمہ وقت منتظر کیوں رہتا ہے اس نے اپنا نچلا لب بری طرح کاٹا۔

”جتنی ذہنی ہم آہنگی تم دونوں کے درمیان ہے اس کے بعد لگتا تو نہیں کہ تمہاری مرضی ہماری مرضی سے الگ ہوگی۔ مگر پھر بھی میرا خیال اگر غلط ہے تو بتا دو۔“

دادو کی بات پہ اسے گیارہ روز قبل کے مجبتی کے وہ دل دکھانے والے الفاظ پھر سے تنگ کرنے لگے۔ جسے بھلانا بڑی دقتوں سے ممکن ہوا تھا۔ غصے کا احساس ایک بار پھر تمام احساسات پر حاوی ہوا۔

”اسے احساس کیوں نہیں ہوا اب تک کہ اس نے مجھے کتنی تکلیف پہنچائی ہے۔“ مجبتی کی طرف سے معذرت کی امید بھی ہر گزرتے دن کے ساتھ معدوم ہوتی جا رہی تھی۔

”پھر کیا جواب ہے تمہارا؟“ اس کی خاموشی پر دادو کو پھر پوچھنا پڑا۔

”دادو پلیز!“ وہ جھنجھلا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”ایسی کسی بات کا جواب میں فی الحال نہیں دے سکتی۔“ بے زاری سے کہتے اس نے باہر کی سمت قدم برسھائے۔ دادو نے حیرت سے اس کی سمت دیکھا۔ ایسے چڑچڑے پن کا مظاہرہ تو اس نے بھی نہیں کیا تھا۔

”میں کچھ دیر میں آئی دادو!“ اس نے دروازے کے پاس رک کر دادو کو اطلاع دی اور باہر نکل گئی۔

قسمت کے کھیل بھی عجیب ہیں۔ کبھی نہ سمجھ میں آنے والے۔ اس نے بے بسی سے لب کھلتے ہوئے راہ میں آئے پتھر کو ہلکی سی ٹھوکر لگائی۔ آخر ایسے لوگ ہماری زندگی میں آتے ہی کیوں ہیں۔ جو قسمت میں کسی حساب سے بھی نہیں آتے۔ ایک نہایت ضدی اور سرکش آنسو بڑے ضبط کے باوجود پلکوں پہ آٹھرا۔ اور اگر زندگی میں آ بھی جاتے ہیں تو پھر دل میں یہ خواہش ہی کیوں پیدا ہوتی ہے کہ یہ ہماری زندگی سے کبھی نہ جائیں۔ عجب بے بسی سی بے بسی تھی۔

یا الٹی! تیرے اختیار میں تو سب کچھ ہے۔ پھر تو نے کیوں میرا نصیب اتنا برا لکھا۔ اس حوالے سے اپنے اللہ سے شکوے شکایات کا سلسلہ بھی اب پرانا ہو چکا

تھا۔

زندگی بھر بھی اگر ہم اللہ کی نعمتوں، احسانوں اور عنایتوں کے سائے تلے رہیں تو بھی شکر کا کلمہ زبان پہ شاذ ہی آتا ہے اور اگر دکھ کی، مشکل کی یا تکلیف کی آنچ بھی پڑ جائے تو شکوے شکایات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ انسان کی ایسی کوتاہیوں سے صرف نظر، صرف وہی کر سکتا ہے جو ماں سے برہ کر چاہے۔ سوچ ہے کہ اللہ اپنے بندوں کو ستر ماؤں سے برہ کر چاہتا ہے۔ وہ مخصوص راہوں پہ چلتی ہوئی، مخصوص جگہ پہ پہنچی تو ٹھنک کے رک گئی۔ وہ سامنے ہی تو بیٹھا تھا۔ جس سے اب کبھی نہ ملنے کا اس نے گیارہ روز قبل قصد کیا تھا۔

وہ بے دھیانی میں اس سمت نہیں آئی تھی۔ مگر یہ خیال ضرور دل میں موجود تھا کہ یہ وہ وقت نہیں ہے جس میں اس کی موجودگی کا امکان بھی ہو۔ سو وہ اس سمت آگئی۔ اور اگر وہ اسے دیکھ نہ لیتا تو وہ خاموشی سے پلٹ بھی جاتی۔ مگر اس نے اسے دیکھ لیا تھا سو وہ خاموشی سے بیچ پہ بیٹھ گئی۔

”تھینک گاڈ! آپ نظر تو آئیں۔ آج اگر آپ نہ آتیں تو میں نے پکارا نہ کر لیا تھا“ آپ کی طرف آنے کا۔ ”اس نے بڑی بے ساختگی سے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ وہ خاموش ہی رہی۔ دل کچھ بھی کہنے سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔

”دیے خیریت تو تھی نا؟“
”ہاں!“ اس نے اشیات میں گردن ہلائی۔
”کراچی گئی ہوئی تھی۔“ اسے اندازہ تھا کہ اگلا سوال کیا ہوگا، سو اس نے بغیر پوچھے ہی ذہن میں آنے والے اس بروقت جواب کو گوش گزار کیا۔
”اچھا!“ وہ ملے سے ہنسا۔

”میں تو پچھلے کئی روز سے بڑی مستقل مزاجی سے دن میں کئی بار یہاں کے چکر لگاتا رہا ہوں۔ آپ آگاہ کر کے بھی تو نہیں گئی تھیں نا اپنے کراچی جانے کے متعلق۔“ اس نے شکوہ کیا۔
”کیوں آگاہ کرتی۔۔۔؟“ طبیعت کا چڑچڑاپن برہا اور

مزید برہ کر کمال کو پہنچا۔

”میں یہاں آپ سے ملنے کے ارادے سے تو کبھی بھی نہیں آئی۔“ اسے اس شخص پہ شدید غصہ آیا جس کے باعث اس کا جینا از حد دشوار ہوا تھا۔
”پچھلے چار برسوں سے یہاں آنا میرا معمول ہے، اور آپ سے ملاقات اسی معمول کے سبب ہوئی رہی ہے۔“ آنکھوں میں نمی اترنے کا احساس ہوا تو اس نے رخ موڑ لیا۔

اس کے یوں معمولی بات پر اتنا برہم ہونے پر ڈیوڈ نے کسی قدر حیرانی سے اس کی سمت دیکھا۔
”اوکے! جو کچھ آپ نے کہا، سو فی صد درست۔ میں اس سے انکاری نہیں مگر۔“ اس نے ایثار کا مزاج ٹھنڈا کرنے کی ایک کوشش کی۔

”مگر جتنا آپ میری بات سے ناراض ہوئیں بات اس قدر ناراضی والی تھی نہیں۔“ اس خدشے کے تحت کہ وہ مزید مشتعل نہ ہو جائے، ڈیوڈ نے جھجکتے ہوئے، سر کھجا کر اپنا فقرہ مکمل کیا۔ ”پھر بھی بہت معذرت۔“

ایثار نے رخ موڑ کر اس کے شرمندہ چہرے کو دیکھا اور نادام ہوئی۔ خواب جتنے مرضی اونچے دیکھ لو مگر قسمت کے آگے مرضی نہیں چلتی۔ اس کے آگے ہم بے بس ہی ہوتے ہیں۔ سو اس کے مزاج کی تلخی اور چڑچڑاپن اسی بے بسی کی دین تھا۔ قسمت کی بے رخی کا احساس اس وقت شدت سے ہو رہا تھا، سو اسے خود کو سنبھالنے میں وقت لگا۔

”سوری۔“ اس نے بے چارگی سے لب کاٹے۔
”دراصل کبھی کبھار مجھے دورہ پڑتا ہے۔ بے سبب ہی، بلا وجہ ہی غصہ کرنے کا۔“ وہ دانستہ مسکرائی تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

”آپ کی بات پر مجھے اپنی زندگی کی پہلی محبت یاد آ گئی۔“ اس کی آنکھوں کی چمک ایک دم بڑھی۔
”پہلی محبت۔۔۔؟ یعنی کئی محبتیں نمشا چکا ہے۔“ اس نے سوچا، مگر خاموش رہی تو وہ از خود کہنے لگا۔
”مجھے زندگی میں پہلی محبت بیس برس کی عمر میں

دور تھی سے ہوئی تھی۔ جس شاپنگ سینٹر سے میں شاپنگ کیا کرتا تھا وہاں وہ سیکرٹری تھی۔ ”لیوں پہ مسکراہٹ سجائے وہ جیسے ماضی کے کسی واقعے سے محفوظ ہو رہا تھا۔“

”اچھی لڑکی تھی۔ سنہری بالوں اور گوری رنگت والی۔ مجھے لگتا تھا کہ میں اس کی محبت میں بری طرح مبتلا ہو گیا ہوں۔ اسی قسم کے احساسات وہ بھی میرے متعلق رکھتی تھی۔“

ایثار اداسی سے اپنے ہاتھ کی لکیوں میں دل کی خوشی ڈھونڈنے لگی۔

”اسے بھی اکثر بلا وجہ ہی غصہ ہونے کا دورہ پڑتا تھا اور میری کبھی بھی یہ عادت نہیں رہی کہ میں کسی کی اونچی آواز آسانی سے برداشت کر لوں۔ سوا یک روز وہ غصے سے مجھ پہ چلائی تو میں بالکل برداشت نہیں کر سکا اور گھما کے ایک ہاتھ جڑ دیا۔“ بات کی ابتدا اسے لبوں پہ جچی محفوظ سی مسکراہٹ جو درمیان میں دھیمی پڑی تھی وہ دوبارہ سے ہونٹوں پہ مچلنے لگی۔

اسے افسوس ہونے لگا کہ ایک کمزور لڑکی پہ ہاتھ اٹھا کے محفوظ ہو رہا تھا۔

”نتیجتاً وہ غصے سے پاگل ہو گئی اور پاس پڑا ہوا ایش ٹرے اٹھا کر میرے سر پہ دے مارا۔ میری نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اور جب تک تکلیف کچھ کم ہوئی اور آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تب تک وہ فرار ہو چکی تھی اور کچھ ایسی فرار ہوئی کہ آج تک نہیں مل سکی۔“ وہ اب ہنس رہا تھا۔

”میرے خدا!“ وہ اس ”کمزور“ سی لڑکی کی ایسی زور آوری پہ متحیر ہوئی۔

”شروع میں تو میں نے اسے ڈھونڈا، کیونکہ سر پہ موجود زخم تکلیف دیتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ بھولتا گیا۔ مگر اب جب کبھی اس سارے معاملے کو سوچتا ہوں تو نجانے کیوں غصے کے بجائے ہنسی آتی ہے۔“ اس کی بات کی صداقت کا اندازہ لبوں سے جدا نہ ہونے والی مسکراہٹ سے بخوبی ہو رہا تھا۔

”کبھی کبھی تو مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے کہ وہ آخر گئی

کہاں؟ اس خوب صورتی سے غائب تو صرف جادوگر ہی ہوا کرتے ہیں۔ کہیں وہ سچ جادو گرنی تو نہیں تھی؟“ اس نے شرارت سے استفسار کیا۔

ایثار نے کندھے اچکائے تو وہ ہنس دیا۔

”یہ پہلی محبت، آخری بھی تھی یا...؟“ وہی قسمت کی بے بسی جو اس وقت لفظوں میں طنز بن کے اتری۔

”اللہ نہ کرے“ آخری کیوں ہونے لگی؟“ اس نے ڈرنے کا ڈراما کرتے ہوئے مصنوعی خفگی سے ایثار کو گھورا۔

ایثار نے اس کی طرف دیکھا اور سوچا ”دور تھی کی جادوگری کا تو علم نہیں، مگر اتنا ضرور یقین ہے کہ تمہارا جادو مجھ پہ کچھ یوں اثر انداز ہوا ہے کہ توڑ کا کوئی عمل بھی اثر انگیز ثابت نہیں ہو رہا۔“

”دوسری محبت کا آغاز“ پہلی محبت کے اختتام کے چند روز بعد ہی ہو گیا تھا۔ ”وہ اپنا دوسرا“ کارنامہ بیان کرنے لگا۔

”اللہ جانے یہ ”محبت“ کسے سمجھتا ہے؟ یہاں تو ایک محبت ہی جان کو آگئی ہے۔“ اس نے گہری سانس لی۔

”دوسری بار بھی مجھے یہی لگ رہا تھا کہ میں جولیا سے شدید محبت کرنے لگا ہوں۔ جب جولیا کو بھی یہ دہم ستانے لگا تو ہم دونوں ہی شادی کرنے کے لیے سنجیدہ ہو گئے۔“ ہر بات پر مسکراتے ہوئے وہ ایثار کو آج بڑے ہی خوشگوار موڈ میں لگ رہا تھا۔ جبکہ خود اس کا دل بڑا ہی مضطرب اور بے کل۔

”ہم دونوں ساتھ ایک ہی فلیٹ میں رہنے لگے۔ شروع شروع میں تو ہم اچھے دوستوں کی طرح بڑے ہی پیار محبت سے رہے۔“

”ایک ساتھ“ ایک ہی فلیٹ میں...؟“ ایثار ایک دم چونکی۔ ”اللہ جانے یہ شادی سے قبل کا ذکر کر رہا ہے یا بعد کا؟“

”مگر بعد میں“ میں بوری ہونے لگا۔ اس کی قہر سے مجھے اکتاہٹ ہونے لگی۔ ”اس کی گفتگو سے ایثار کا چہرہ

چاہیے تھا کہ یہ کس کروار کا ہو گا۔ اس نے لب کاٹے۔

لیکن مجھے اگر اندازہ بھی ہوتا تو میں کیا کر لیتی؟ دل پھر اس کے آگے تن کے کھڑا ہو گیا تھا۔ اسے تسلیم کرنا پڑا۔

اس شخص سے نفرت کرنا کبھی بھی میرے لیے ممکن نہیں ہو گا۔ وہ اپنی اس کمزوری سے بخوبی آگاہ ہو گئی تھی سو بے چارگی سے سوچے گئی۔

”شکر ہے شہزادی صاحبہ آج جلدی لوٹ آئیں۔“ اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی مجتبیٰ جو دادو کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا ٹھٹک کے رکا اور مسکرا کے گویا ہوا۔

اس نے سمجھ کیا رکھا ہے مجھے۔؟ اپنی جاگیر یا کوئی غلام جو یوں طنز کر رہا ہے۔ ”غصہ بے بسی بے کلی اور نارسائی کے ملے جلے احساسات نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو ناکارہ کیا۔ وہ آج اپنے پچھلے رویے پر معذرت کرنے کے موڈ میں تھا، سو طنز یا گفتگو کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

”ورنہ مجھے تو لگ رہا تھا کہ اب تو تم سے ملنے کے لیے لپائنٹمنٹ لیتا پڑے گا۔“

پچھلی بار بھی میں بے سبب ہی اس کے عتاب کا نشانہ بنی تھی۔ غصہ تمام احساسات پر غالب آیا اور نقطہ عروج پہ پہنچا۔ سو وہ کہیں تو کھٹکنا تھا اس لیے مجتبیٰ پہ ٹکلا۔

اس نے مجتبیٰ کو طمانچہ جڑ دیا۔ مجتبیٰ ہکا بکا اس کی صورت تکے گیا اور وہ تیزی سے اس کے عقب سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔



”ایثار! آخر ایسی کون سی وجہ ہے جو تم مجتبیٰ سے شادی کے لیے رضامند ہی نہیں ہو رہیں؟“ دادو آج اچھی خاصی جھنجھلائی ہوئی تھیں۔

”میں نے انکار تو نہیں کیا دادو!“

”تو ہاں بھی تو نہیں بھری۔ کوئی فیصلہ کر لو۔ چاہے

سرخ پڑ گیا۔

”اس لیے میں نے جولیا سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کیونکہ مجھے لگنے لگا تھا کہ میری دوسری محبت کی مدت بھی ختم ہو گئی ہے۔“ وہی مسکراتا لہجہ۔

”یعنی شادی سے پہلے ہی۔۔۔“ اسے شاک لگا۔

”یارب! یہ مجھے کس شخص سے محبت ہو گئی ہے؟“

اسے بے انتہا افسوس ہوا۔ وہ جانتی تھی وہ جس ملک کا شہری ہے وہاں ایسا ہونا عام سی بات ہے۔ مگر یہ خیال کبھی آیا ہی نہیں تھا کہ وہ خود بھی ایسی برائیوں میں ملوث ہو سکتا ہے۔

”اور اس محبت کو بھی آپ میری آخری محبت مت سمجھے گا۔“ وہ اس کے خیالات سے بے خبر کئے گیا۔

آخر میرا دل اس کی طرف مائل ہی کیوں ہوا؟ کاش یہ میرے لیے ایک عام سا شخص ہوتا، اتنا خاص نہ ہوتا تو میرا دل یوں دکھی تو نہ ہوتا اس انکشاف پر۔ وہ مضطرب بھی ہوئی اور اس کی بات از سر نو سوچ کر مشتعل بھی۔

”دوسری کے بعد بھی کئی محبتیں ہوئیں۔ مگر اب پتا چلتا ہے کہ جب واقعی محبت ہوتی ہے تو ہم نہ اس سے اکتاتے ہیں نہ بے زار ہوتے ہیں۔ بلکہ مزاج کے برخلاف اوپری آواز بھی برداشت کر لیتے ہیں۔“

”اور اب یہ“ واقعی محبت“ اللہ جانے کیسی محبت ہو گی؟ اور کیا کچھ سننا پڑے گا۔“ غصہ جو تھما نہیں تھا، مزید بڑھا اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا ہوا؟“ اس کے یوں اچانک اٹھ جانے پر ڈیوڈ نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھاما۔

اسے گویا کرنٹ لگا۔ ایک دم جلال میں اس نے ڈیوڈ کا ہاتھ پوری شدت سے جھٹکا۔

”آئی ایم سوری!“ اسے اپنی غلطی کا فوراً ہی احساس ہو گیا۔ مگر ایثار نے اس کی نادم صورت پر ایک قہر بھری نگاہ ڈالنا بھی گوارا نہ کیا اور نہایت ناگواری سے رخ موڑ کر تیز قدموں سے اس سے دور ہوتی گئی۔

”بیہودہ گھٹیا انسان۔“ اس کا خون کھولنے لگا۔

بڑی غلطی ہوئی مجھ سے۔ مجھے پہلے ہی اندازہ ہو جانا

ہم سب کو مایوس کر دینے والا ہی۔“ دادو کا پناہ صبر
لیریز ہوا تھا اور اب ان کی گفتگو سے ناراضی جھلکتی
تھی۔

ہامی بھریوں دادو! مجتبیٰ میرے دل میں کسی اور کے
بیرے کا سراغ پا گیا ہے۔ اب وہ بہت بدل گیا ہے دادو!
اس کا دل چاہا وہ یہ سب دادو سے کہہ کے اپنے دل کا
بوجھ ہلکا کر لے۔ مگر اسے اپنے اس خیال پہ عمل کرنا
دشوار لگا سو وہ خاموش رہی۔

اسے اب میری پروا نہیں رہی۔ ڈیڑھ ماہ سے اوپر
ہو چلا ہے مگر اسے بالکل احساس ہی نہیں ہے کہ اس
کے الفاظ نے مجھے اتنا دکھی کیا تھا کہ بلا ارادہ ہی میرا ہاتھ
اٹھ گیا۔ اسے اپنی خطا کا احساس نہیں تھا۔ اس نے
سارا قصور مجتبیٰ کے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔

جو کچھ دل چاہتا ہے وہ تو ممکن ہے ہی نہیں تو پھر
میں کوئی ایسا فیصلہ کیوں کروں جو سب کو مایوس کر
دے۔ ہامی تو بھرنی ہی ہے اس رشتے پر۔ مگر بس ایک
معصوم سی خواہش تھی کہ وہ اپنے ڈیڑھ ماہ پہلے کے
ناروا رویے پر شرمندگی کا اظہار کرے۔ جو اگر اس کے
لیے مشکل ہے تو یونہی سہی۔ وہ ٹھنڈی آہ بھر کے اپنی
معصوم خواہش سے دستبردار ہوئی۔

”دادو!“ دادو جو اس کی مسلسل خاموشی سے اکتا کر
جا رہی تھیں اس کی پکار پہ رکیں۔

”بابا تک میری بات پہنچا دیں کہ میری مرضی ان کی
مرضی سے مختلف نہیں۔ وہ میرے لیے جو مناسب
سمجھیں اس پر عمل کر ڈالیں۔“ بات کے اختتام تک
نمی لہجے میں کھل سی گئی۔ نجانے کس دکھ پہ وہ اس کا
انداز نہ لگا پائی۔ دادو نے مسکراتے ہوئے آسودگی سے
اس کی پیشانی چومی۔

”میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو اپنی ایثار کو
آسودہ و مسرور کھنا ہے۔ اس ایک بات کی صداقت پہ
تم کبھی شبہ نہ کرنا کہ میرے لب ہمیشہ تمہاری خوشیوں
کے لیے دعا گو رہیں گے۔“

انتظار صرف اس کے ہامی بھرنے کا تھا سو بات
فورا ”کراچی پکنی اور ایک ہفتے بعد کا دن مقرر ہو گیا۔“

”منگنی کی تقریب میں ہی شادی کی تاریخ بھی طے
کر دیں گے۔“ منگنی سے ایک روز قبل صبح ناشتے کے
بعد دادو نے جو خبر سنائی اس نے اسے حواس باختہ کر
دیا۔

”دادو! یہ بہت جلدی ہے۔ میں شادی ابھی نہیں
چاہتی۔“

”شادی ابھی نہیں ہو رہی۔ صرف ڈیٹ فکس کی
جائے گی۔“ دادو نے اس کے اعتراض کو ٹالنا چاہا۔

”تو ٹھیک ہے پھر ڈھائی دو سال بعد کی ڈیٹ فکس
کیجیے گا۔ میں ابھی شادی نہیں کروں گی۔“ اس نے
تند لہجے میں ہٹوہری سے کہا۔

”ایثار! فضول ضد کیوں کرنے لگی ہو؟ جب سب
کچھ اپنے باپ کی مرضی پر چھوڑ چکی ہو تو اب اس
انتہائی غیر اہم بات کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا۔“ دادو ان
دونوں اس کے وجہ بے وجہ کے چڑچڑے پن سے عاجز
آگئی تھیں۔ سو اپنے لہجے کو تیز ہونے سے نہ بچا
سکیں۔

”مجھے کیا پتا تھا کہ اس قدر بے تکا فیصلہ آپ کو
میرے لیے مناسب لگے گا۔“ وہ جھنجھلائی۔

”ایثار! مجھے بحث و مباحثے سے کبھی دلچسپی نہیں
رہی۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے اپنے باپ سے کہو۔“
دادو ناگواری سے کہتے ہوئے لاؤنج سے اٹھ کر چلی
گئیں۔

اس نے برہمی سے گود میں دھراکشن ایک طرف
پھینکا اور سر ہاتھوں میں گرا لیا۔ جو کچھ دل کی خواہش
ہے وہ کسی طور ممکن نہیں۔ خدا جانے اب اطمینان
قلب نصیب ہو گا بھی یا نہیں؟ بے بسی سے اس نے
لب کچلے۔

لا حاصل محبت بھی کسی گناہ کی سزا سے کم نہیں۔
افسردگی اس کے گرد اپنا حصار تنگ کرنے لگی۔

اور اب یہ اللہ ہی جانے کہ کسی کو بھلانا واقعی اتنا
دشوار ہوتا ہے یا میں ہی اس معاملے میں بہت کمزور
ثابت ہو رہی ہوں۔ اپنی کوششوں میں پیہم ناکامی اسے
مایوس کرنے لگی۔

اور اب بابا کا یہ فیصلہ۔۔۔ اس نے بے زاری سے صوفے کی پشت سے کمر نکالی۔ یوں لگتا ہے جیسے تقدیر مجھے سنبھلنے کا وقت دینے کو بھی تیار نہیں۔

اطلاعی گھنٹی بجی تھی۔ اس نے چونک کر گھڑی کی سمت دیکھا۔ ابھی کافی وقت پڑا تھا، کراچی سے اس کی فیملی کے آنے میں۔ دادو سے خود ساختہ ناراضی کا دور چل رہا تھا۔ سو اس نے بڑی ڈھشالی سے گھنٹی کی آواز کو نظر انداز کیا اور آنکھیں موند لیں۔

”ڈیوڈ تم سے ملنے آیا ہے۔“ دادو کی آواز پہ اس نے پٹ سے آنکھیں کھولیں۔ دل کی دھڑکنوں کی ترتیب بری طرح بگڑی۔

”ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے۔ جا کے مل لو۔“ ڈیوڈ کا ذکر وہ سرسری طور پر دادو سے کر چکی تھی، سو وہ اس سے غائبانہ متعارف تھیں۔

”جی اچھا!“ یگانگت بیزاری نے اڑان بھری تھی۔ اکتاہٹ، اکتا کر بھاگی اور افسردگی اپنا محاصرہ توڑ کر۔ دادو کچن کی جانب چل دیں۔ اور اس نے ڈرائنگ روم کی سمت قدم بڑھا دیے۔

وہ سیٹی پہ دھیمے سروں میں کوئی دھن بجاتا، دونوں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے طائرانہ نگاہوں سے ڈرائنگ روم کا جائزہ لے رہا تھا۔ گویا وقت گزاری مقصود ہو۔ وہ اسے مدتوں بعد دیکھ رہی تھی۔ کم از کم اسے تو یہی لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ بڑے دلکش انداز میں خوشدلی سے مسکرایا۔

”السلام علیکم!“ ڈیوڈ نے بڑے بشاش لہجے میں سلام کیا۔

”وعلیکم!“ ایثار نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ افسردہ دلی کی کیفیت آن کی آن میں بدلنے پر وہ حیران بھی ہوئی اور پریشان بھی۔ خوشی اگر یونہی اس کی ملاقات سے مشروط رہی تو آنے والے شب و روز کیسے ہوں گے؟ اس کا اندازہ مشکل نہیں۔ پریشانی کی بات یہی تھی۔

”سوری ایثار!“ بیٹھتے کے ساتھ ہی وہ بولا۔ ”ایثار! میں اپنی اس حرکت پہ سخت نادم ہوں۔ جو آپ کے

مزاج پہ اتنی گراں گزری کہ آپ نے پلٹ کر خیر ہی نہیں کی۔ حالانکہ وہ ایک غیر اختیاری حرکت تھی۔ جس پر میں بعد میں بہت پشیمان ہوا۔“ شرمندگی اس کے الفاظ سے ہی نہیں، چہرے سے بھی عیاں تھی۔

”مجھے اگر کوئی بات ناگوار گزری بھی تو اب تو میں اسے بالکل بھول گئی ہوں، سو آپ بھی بھول جائیں۔“ اس کی شرمندہ صورت ہی ایثار کے لیے کافی تھی۔

”شکر ہے۔۔۔ آپ کی کمزور یادداشت میرے حق میں بہتر ثابت ہوئی۔ ورنہ میں تو گھر سے ٹاک سے لکیریں کھینچنے کی مشق بھی کر کے آیا تھا۔“ اس نے مسکرا کر شرارت سے کہا۔

”تو پھر لکیریں کھینچ ہی لیں ورنہ آپ کی پریکٹس تو رائیگاں جائے گی۔“

”اس کی پروا نہیں۔ مجھے فکر ہے آج کا دن نہ رائیگاں جائے۔“ وہ سنجیدہ ہوا اور اس کی معنی خیزی پہ ایثار چونکی۔

”آج میرے نانا کی بہترویں سالگرہ ہے۔“ اسی پل دادو چائے کی ٹرالی سمیت نمودار ہوئیں۔ وہ مودب ہو کے بیٹھا ”باقاعدہ طور پر تو کبھی نہیں منائی اور آج بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ لیکن اگر آپ میری گزارش پہ سالگرہ اٹنڈ کرنے آجائیں تو۔۔۔“ سر کھجاتے ہوئے اس نے جھجک کر اپنی خواہش گوش گزار کی۔

آپ بلائیں، اور ہم نہ آئیں۔ ایسے تو حالات نہیں۔ بے اختیار ہی زبان کی نوک تک آجانے والے الفاظ کو اس نے لب بھینچ کے روکا۔ تم اپنے دل کے آگے اتنا مجبور نہ ہوا کرو۔ تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تم نے اب اس سے کبھی نہ ملنے کا قصد کیا تھا۔ اندر سے اٹھنے والی آواز کو اس نے واضح طور پر سنا اور گہری سانس بھری۔

دادو نے ایک نظر ڈیوڈ کو دیکھا اور پھر اس کی متذبذب صورت کو۔

”تقریب و قریب کچھ نہیں ہے دادو! بس میں وش کروں گا اور نانا کیک کاٹیں گے۔“ اس نے مسکرا کر

وضاحت کی۔
 ”اچھا!“ دادو بھی مسکرا دیں۔
 ”چلی جانا ایثار! شام میں۔“ دادو نے گویا اس کی مشکل حل کی۔

”شام میں نہیں دادو! ابھی میرے ہمراہ میرے نانا میرے ساتھ ساتھ ایثار کے بھی منتظر ہوں گے۔ کیونکہ میں یہاں اسی مقصد کے تحت آیا ہوں اور انہیں بتا کر آیا ہوں۔“ اس نے دادو کو تفصیل سے آگاہ کیا۔

آئندہ کبھی نہ ملنے کے فیصلے پر عمل میں آج تک نہیں کر پائی۔ کچھ نہ کچھ ایسا ہو ہی جاتا ہے جو سارے ارادے ملیا میٹ کر دیتا ہے۔ دل نے کسی بھی الزام سے خود کو بری کیا۔

لیکن ایسا تو کچھ نہیں ہوا جو تمہارا جانا لازمی ٹھہرے۔ تم معذرت بھی کر سکتی ہو جانے سے۔ اس کے اندر کی یہ مانوس آواز بڑی فرض شناسی سے موقع پر وارد ہو جاتی تھی۔

مگر میں کیسے انکار کر کے اسے مایوس کروں؟ وہ بڑی آس سے آیا ہے۔ دل کے پاس ہر بات کا جواب تھا۔ تم جب ایک فیصلہ کر چکی ہو تو پھر تمہیں کسی کی آس، نرا اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ دل و دماغ ایک دوسرے کے خلاف مورچہ بند تھے۔ اب پسپائی کس کا مقدر ٹھہرتی یہ دیکھنا تھا۔

”چلی جاؤ ایثار! مگر جلدی آجانا۔ اپنی ماں اور بہن کے آنے سے پہلے ہی۔“ جس سے وہ نہ جانے کا پکا ارادہ کر کے انکار کا بہانہ سوچ رہی تھی، اسی سے دادو نے اسے مخاطب کیا۔ وہ اب ڈیوڈ سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتی تھی، مگر اس سے دادو کی بات ٹالی نہ گئی۔ سو چند پل متذبذب رہنے کے بعد اس نے دادو کی بات مان لی۔

”موسم بڑا دلکش ہو رہا ہے۔“ گھر سے نکلتے ہی ڈیوڈ نے کہا۔ موسم بہار کے اوائل دن تھے۔ ابر آلود فضا کی بنا پر بارش کا امکان تھا۔

”ویسے کہا جاتا ہے کہ انسان کے اندر کا موسم اچھا

ہونا چاہیے، باہر کی رت خود بخود خوب صورت لگے گی۔“ اس کی جگر جگر کرتی بھوری آنکھوں میں آج کچھ ایسا ضرور تھا جو اس کے دل کی بے پناہ خوشی کا پتا دے رہا تھا۔

”اب معلوم نہیں موسم واقعی اچھا ہے یا مجھے ہی لگ رہا ہے۔“

ایثار نے اپنے ہم قدم چلتے اس خوش باش سے شخص کو نظر بھر کے دیکھا۔ ”کیا آپ ہمیشہ ہی اپنے نانا کی سالگرہ پہ اتنا ہی خوش ہوتے ہیں؟“ اس نے کسی قدر حیرت سے استفسار کیا تو جواباً وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

”اچھا یعنی آپ کے خیال میں میری غیر معمولی خوشی کا سبب یہی ہے؟“

”ظاہر ہے۔ پھر اور کچھ سمجھوں؟ کوئی اور وجہ ہے بھی تو آپ نے مجھ سے تو ذکر نہیں کیا؟“ یہ شکوہ نہیں تھا، وجہ جاننے کی ایک کوشش تھی۔

”نہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کوئی اور نہیں۔“ متبسم لہجے میں بتاتے ہوئے اس نے اصل وجہ چھپائی۔

”اب ایسی بھلا کیا وجہ ہوگی، جو یوں مخفی رکھی جا رہی ہے۔“ اس کے یوں پوشیدہ رکھنے پہ وہ بد مزہ ہوئی۔

”ایک بات پوچھوں؟“ چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے ایثار سے استفسار کیا۔ جواباً ایثار نے استفہامیہ نگاہوں سے اس کی سمت دیکھا تو وہ سر کھجا کر کہنے لگا۔

”میتے دن میرے بغیر کیسے گزرے؟“ اس کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا جس نے ایثار کو چونکایا۔

کہیں اسے شک تو نہیں ہو گیا کہ میرے وہ دن بڑے بے کیف و بے رونق گزرے ہیں۔ ”ایثار نے اس کا چہرہ ایک نظر میں کھوجنا چاہا، مگر کامیاب نہ ہو سکی تو بنا جواب دیے نگاہوں کا رخ بدلا۔

”میرے خدا!“ ڈیوڈ نے لب بھینچ کر کسی قدر افسوس سے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”شاید پھر آپ کے مزاج کے خلاف بول گیا

ہوں۔" ایثار کی خاموشی اسے خفگی لگی۔
 "افو! اب اتنی سی بات پہ اسے خفگی کا گمان ہونے لگا ہے۔" وہ جھنجھلائی۔

"نسوری! معافی چاہتا ہوں۔ آئندہ ایسی کوئی بات نہیں کہوں گا جس میں آپ کی ناراضی کا شبہ بھی موجود ہو۔" وہ پشیمان تھا اپنے لفظوں کی ادائیگی پر۔

"کیا مصیبت ہے؟" بظاہر ہنستے کھیلتے ہوئے بھی کوئی احساس ضرور تھا جو بے کل رکھتا تھا، سو مزاج کا چڑچڑاہٹیں از سر نو عود آیا۔

"مجھے کوئی بات گراں نہیں گزری۔ آپ برائے کرم۔۔۔" لب کاٹتے ہوئے اس نے بات ادھوری چھوڑی۔

اس کے بے زار لب و لہجے پر ڈیوڈ نے لب بھینچ کر خود کو مزید کچھ کہنے سے روکا۔

آخر کیوں میں اس کے احساس سے خود کو آزاد نہیں کر پارہی؟ بے بس سی سوچ داغ میں ادھر سے ادھر چکرانے لگی۔ بستر ہوتا جو میں اس کے ساتھ نہ آتی۔ اس سے مل کر تو احساس زیاں مزید شدت سے حملہ آور ہوتا ہے۔ وہ عاجز ہو گئی۔ تمام راستہ اسی قسم کی سوچیں دامن گیر رہیں سو موڈ بھی آف رہا۔

ڈیوڈ کی چپ نے بڑی وفاداری سے رہائش گاہ تک ساتھ نبھایا۔ مگر مزید اس کے نانا نے ڈیوڈ کی خاموشی کو ساتھ نہیں نبھانے دیا۔

"تم ان دنوں اپنی من مانی بہت کرنے لگے ہو۔ چھوٹی باتوں میں بھی اور اہم معاملات میں بھی۔" جوزف انکل نے اس وقت قدرے ناراضی سے کہا جب ڈیوڈ نے انہیں زبردستی چھری تھماتے ہوئے باقاعدہ کیک کاٹنے کو کہا۔

اس سالگرہ کا اہتمام جوزف انکل کی مرضی کے خلاف کیا گیا ہے۔ جوزف انکل کے براہم مزاج سے اس نے اندازہ لگایا۔

"میری تو کسی بات کو بھی تم قابل عمل نہیں سمجھتے۔ جو دل میں سما جائے پھر اس پر عمل مجھے دکھ پہنچا کے بھی ضرور کرتے ہو۔" وہ کسی بات کی وجہ سے ڈیوڈ

سے ناراض تھے سو اس کا اظہار برملا بغیر کسی لحاظ کے کر رہے تھے۔

"کچھ خیال کر لیں۔ مہمان کے سامنے ہی میری عزت رکھ لیں۔ میری بقیہ "تعریف" بعد میں کر لیجیے گا۔" شاکی لہجے میں اس نے کسی قدر ناراضی سے کہا۔

"ہاں۔۔۔ مہمان کے دل میں کوئی برا خیال نہ آئے۔" انہوں نے چبھتی ہوئی نگاہ ایثار پر ڈالی۔

"باقیوں کی خیر ہے۔ ان کی تمہیں پروا بھی کب ہے۔ اب بس یہی اہم ہیں۔" ایثار کے پورے جسم کا لوہو چرے پہ سمٹ آیا جو زف انکل کے لب و لہجے پر۔ ڈیوڈ نے ہڑبڑا کے پہلے اسے اور پھر اپنے نانا کی سمت دیکھا۔

"آپ کی ناراضی مجھ سے ہے، تو پلیز اسے مجھ تک ہی محدود رکھیں۔" اس نے دبے لہجے میں التجا کی۔

"تمہاری زندگی میں ان چند دنوں میں کئی تبدیلیاں آئی ہیں۔ سواپ مزاج کی تبدیلی معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ مجھے اب تمہارا رویہ بہت کم تکلیف دیتا ہے۔ حالانکہ کسی اور کو بہت اہمیت دینا میں اب بھی محسوس کرتا ہوں۔" بات کے اختتام پر انہوں نے پھر اسے نا پسندیدگی سے دیکھا۔

ان دونوں کے درمیان وجہ ناراضی اس کی ذات ہے۔ اس نے ٹھیک ٹھاک اندازہ لگایا۔

مشفق سے جوزف انکل جو ہمیشہ ہی اس کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ مگر آج ان کا ناقابل فہم رویہ اسے متحیر کر رہا تھا۔ ان کی ناراضی اپنے نوا سے سے تھی۔ مگر وہ اسے کیوں بیچ میں رگید رہے تھے؟ وہ یہ جاننے سے قاصر تھی۔

"میں اپنی صفائی میں کہنے والے تمام الفاظ آپ کے سامنے ایک سے زائد بار دہرا چکا ہوں۔ سواپ مزید کیا کہوں؟" وہ مکمل طور پر بے بس ہوا تو جوزف انکل گنجی سے ہنس دیے۔

"مناسب بھی یہی ہے کہ اب کچھ نہ کہو۔ تم جتنا کہہ چکے ہو، میرے لیے کافی ہے۔" وہ بدستور مشتعل تھے۔

ان کی گفتگو کے ساتھ ساتھ ایثار کی سبکی کا احساس بھی برہم رہا تھا، سو وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔
”میں چلتی ہوں۔ دادو راہ تک رہی ہوں گی۔“ وہ پٹی اور تیز قدموں سے واپسی کی راہ لی۔

”ایثار! وہ پکارتے ہوئے اس کے پیچھے لڑکا۔
”مس ایثار! پلیز! بات سنیں!“ اس کے پیچھے وہ باہر تک آیا۔ ایثار نے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا۔

”سوری ایثار! میں بہت شرمندہ ہوں، اپنے نانا کے رویے پر۔“ ایثار نے اس وقت بھی اس کی سمت نہیں دیکھا، جب وہ اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے شرمندگی سے کہہ رہا تھا۔

”کوئی بات نہیں۔ مجھے ناگوار نہیں گزرا۔ وہ میرے بزرگ ہیں۔“ جوزف انکل کی تلخ باتیں پھر سے ذہن میں آئیں تو رگوں میں دوڑتے لہو کی رفتار ایک بار پھر بڑھی۔ مگر اس نے ”دل میں کچھ، زبان پہ کچھ“ کے مصداق منافقت سے کام لیا۔

”پھر آپ یوں اچانک کیوں اٹھ آئیں؟“ اس نے چند لمحے خاموشی سے ایثار کی سمت دیکھنے کے بعد استفسار کیا۔

”مجھے اچانک ہی یاد آیا تھا کہ دادو نے جلد آنے کا کہا ہے۔ کراچی سے میری فیملی آرہی ہے نا، میری منگنی کے سلسلے میں۔ کل منگنی ہے میری۔“ وہ اب اس کی طرف دیکھنے سے دانستہ گریزاں رہتی تھی۔ سو اس وقت بھی نگاہیں سامنے راستے پر جمی رہیں۔

ایثار کے انکشاف پہ ایک لمبی چپ ان دونوں کے بیچ آکھڑی ہوئی۔

اسے ایک دم چپ کیوں لگ گئی ہے۔ خوش فہمی پھر سر اٹھانے لگی۔

کیسے اسے میری منگنی کی خبر نے رنج تو نہیں پہنچایا۔ اس نے ذرا کی ذرا نگاہ اٹھا کے دیکھا۔ وہ اپنی کلائی پہ بندھی گھڑی اتار کر اس کی چابی گھما رہا تھا اسے اپنی جانب متوجہ پا کر مسکرایا۔

”بند ہو گئی ہے۔“ وہی خوش باش، بے فکر البجہ، جس میں کسی بھی قسم کے ہلکے سے دکھ کی رمت کا شبہ

بھی نہیں ہو سکتا۔ ٹھنڈی آہ بھر کے اس نے نگاہیں دوبارہ سامنے کی جانب موڑ لیں۔

”جی تو کیا کہہ رہی تھیں آپ؟“ اس نے گھڑی جیب میں رکھی اور سابقہ موضوع کی طرف آیا۔ ”کل آپ کی منگنی ہے۔ ہے تو خوشی کی خبر مگر مجھے تو شاید بر سنبیل تذکرہ مطلع کیا جا رہا ہے۔“ اس نے دھیمے لہجے میں ہچکچاتے ہوئے یوں کہا جیسے وہ شکوے کا بالکل حق ہی نہ رکھتا ہو۔

بات سچ تھی، سو وہ خاموش رہی۔ اس سے مروتا، بھی تردید نہ ہو سکی۔

اب شاید یہ مجھ سے مدعو کرنے سے متعلق استفسار کرے۔ یہ اس کا خیال تھا، سو وہ منتظر بھی رہی۔ مگر وہ پھر مزید اس وقت تک نہیں بولا، جب تک ایثار کی رہائش گاہ تک نہیں پہنچ گیا۔

”اوکے! مس ایثار!“ اس نے الوداعی لہجے میں کہا اور گیٹ کے باہر ہی اپنے قدم روک لیے۔ ”میں اب چلوں۔“ وہ مسکرایا۔

نارسائی کا کرب دل میں اس وقت اپنی موجودگی کا احساس بڑی شدت سے دلانے لگا۔ اس نے بے بسی سے لب چلے۔

”سدا خوش رہنا۔“ دھیمے لہجے میں آخری فقرہ کہہ کے وہ پلٹا اور قدم بہ قدم اس سے دور ہونے لگا۔

”سدا خوش رہنا۔“ ایثار نے اس کے الفاظ زیر لب دہرائے اور سوچا۔ یہ التجا تھی، دعایہ بدایت...؟ وہ یہ بات نہ اس کے لبوں کے لیے پہچان سکی نہ تاثرات سے۔ سو بے دلی سے سر جھٹک کر اندر کی طرف برہم گئی۔



”جوزف صاحب آئے تھے تم سے ملنے۔“ وہ قیلوے کے بعد اٹھی تو دادو نے اسے مطلع کیا۔ وہ ایک دم چونکی۔

”کیوں؟ خیریت...؟“ ذکر چھڑتے ہی اسے اندازہ ہوا کہ ان کے وہ کئی روز پہلے کے دل دکھانے

والے الفاظ آج بھی ذہن کے کسی گوشے میں موجود ہیں۔

”خدا جانے۔“ دادو نے لاعلمی کا مظاہرہ کیا۔

”تم سے کوئی اہم بات کرنا چاہتے تھے شاید۔“ دادو نے خیال ظاہر کیا۔

”تو مجھے اٹھا دیتیں ناں۔“ اس نے بے چینی چھپاتے ہوئے نارمل لہجے میں کہا۔

”میں نے تمہیں جگانا چاہا تھا مگر انہوں نے خود ہی روک دیا۔“ دادو نے اس کی طرف چائے کا کپ برہمایا۔

”تنہا تھے یا۔۔۔؟“ اس نے دل کی کیفیت چھپاتے ہوئے سرسری لہجے میں پوچھا۔

”ہاں! تنہا تھے۔ تم تو شاید آگاہ ہو کہ ان کا نواسا تو اپنے وطن لوٹ گیا ہے۔“ دادو کے جواب پر دل کی سرزمین پر گہرا سناٹا چھا گیا۔

”ہاں! مجھے اندازہ تھا کہ وہ کبھی نہ کبھی تو اپنے وطن لوٹ جائے گا۔ اس نے اداسی سے سوچا۔

مگر دل خوش فہم کو لگتا تھا کہ وہ جانے سے قبل ملنے ضرور آئے گا۔ سواب پتا چلا کہ میں اس کے لیے نہایت غیر اہم تھی۔ اس نے کپہ جوں کا توں میز پر رکھ دیا۔

”جاتے سے پیغام چھوڑ گئے ہیں تمہارے لیے۔“

”کون۔۔۔؟“ دل کی دھڑکنیں منتشر ہوئیں۔ دھیان ڈیوڈ کی طرف تھا سوا سے لگا دادو ڈیوڈ کے متعلق کہہ رہی ہیں۔

”جوزف صاحب اور کون۔“ دادو نے اس کی غائب دماغی پر کسی قدر حیرت سے کہا۔

”اچھا! وہ سنبھلی۔“ کیا کہہ رہے تھے؟

”کہہ رہے تھے کہ مجھ سے آگے مل لے۔ کوئی ضروری بات کرنی ہے۔“ دادو نے چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا تو وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہو آؤں دادو؟“ بے اختیاری میں وہ اپنی بے تابی پر قابو پانا بھولی۔ اس کی بے تابی پر دادو نے کسی قدر

تعجب سے گھور کے اسے دیکھا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

”خدا جانے ضروری بات کیا ہو؟“ شرمندگی سے کہتے ہوئے وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

”بے کار کا مسہنس بے چین کیے دے رہا ہے۔“ اس نے اپنی بے تابی کے مظاہرے پر گویا صفائی پیش کی۔

”چلی جاؤ۔ میں نے کب تم پر پابندی لگائی ہے؟“ دادو بھلا کب اسے شرمندہ دیکھ سکتی تھیں، سو خالی کپ اٹھا کے وہاں سے چل دیں۔ گہرا سانس لے کر وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر کی راہ لی۔

آسمان مکمل بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بالکل ایسے جیسے میرا دل اداسی اور افسردگی سے اس نے سوچا۔

”موسم بڑا دلکش ہو رہا ہے۔“ اس کے کان کے قریب کوئی بولا۔ اس نے بے بسی سے نچلا لب دانتوں تلے دبایا اور دانستہ اپنا دھیان سامنے درخت پہ بیٹھے پرندوں کی جانب مبذول کیا۔

”انسان کے اندر کا موسم اچھا ہونا چاہیے، باہر کی رت خود بخود خوب صورت لگے گی۔“ وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔

اس کی یاد کے پیوند لگ گئے ورنہ میرے وجود کی اڑ جاتیں دھجیاں کتنی فاصلہ طے ہوا تو اس نے جوزف انکل کو اپنا منتظر پایا۔ انہوں نے پہلے اس کی پر تکلف چائے سے خاطر مدارات کی۔ وہ ”ضروری“ بات جاننے کے لیے بے چین تھی سوا سے ان کی یہ بلا وجہ کی ڈرامے بازی کھلی۔

”آپ نے مجھے کس لیے بلایا ہے؟“ بالآخر اسے استفسار کرنا پڑا۔ چند پل انہوں نے اس کی صورت تکلی۔ پھر گہری سانس لے کر گویا ہوئے۔

”اپنے نواسے کی زندگی کی چند اہم باتیں آپ کے علم میں لانے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا، سو سوچا آج اس ضرورت کو پورا کر لوں۔“ انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

اس کی یاد کے پیوند لگ گئے ورنہ میرے وجود کی اڑ جاتیں دھجیاں کتنی فاصلہ طے ہوا تو اس نے جوزف انکل کو اپنا منتظر پایا۔ انہوں نے پہلے اس کی پر تکلف چائے سے خاطر مدارات کی۔ وہ ”ضروری“ بات جاننے کے لیے بے چین تھی سوا سے ان کی یہ بلا وجہ کی ڈرامے بازی کھلی۔

”آپ نے مجھے کس لیے بلایا ہے؟“ بالآخر اسے استفسار کرنا پڑا۔ چند پل انہوں نے اس کی صورت تکلی۔ پھر گہری سانس لے کر گویا ہوئے۔

”اپنے نواسے کی زندگی کی چند اہم باتیں آپ کے علم میں لانے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا، سو سوچا آج اس ضرورت کو پورا کر لوں۔“ انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

اس کی یاد کے پیوند لگ گئے ورنہ میرے وجود کی اڑ جاتیں دھجیاں کتنی فاصلہ طے ہوا تو اس نے جوزف انکل کو اپنا منتظر پایا۔ انہوں نے پہلے اس کی پر تکلف چائے سے خاطر مدارات کی۔ وہ ”ضروری“ بات جاننے کے لیے بے چین تھی سوا سے ان کی یہ بلا وجہ کی ڈرامے بازی کھلی۔

اس کی یاد کے پیوند لگ گئے ورنہ میرے وجود کی اڑ جاتیں دھجیاں کتنی فاصلہ طے ہوا تو اس نے جوزف انکل کو اپنا منتظر پایا۔ انہوں نے پہلے اس کی پر تکلف چائے سے خاطر مدارات کی۔ وہ ”ضروری“ بات جاننے کے لیے بے چین تھی سوا سے ان کی یہ بلا وجہ کی ڈرامے بازی کھلی۔

”خدا خیر کرے۔“ اس کا دل بلاوجہ ہی دوسو سوں میں گھرا۔

”ڈیوڈ سے متعلق۔؟“ اس نے استفسار کیا۔
 ”ڈیوڈ نہیں، عبد اللہ۔“ انہوں نے گویا تصحیح کی۔
 ”عبد اللہ۔؟“ نا سمجھی کے عالم میں اس نے زیر لب دہرایا۔

”ہاں۔۔۔ وہ اب مسلمان ہو گیا ہے۔“ ان کے سپاٹ چہرے کو وہ چند ثانیوں تک بے یقینی سے دیکھتی رہی۔

”اچھا۔۔؟“ یقین آنے کے بعد اس نے اپنی بے ساختہ خوشی کو بڑی دقتوں سے چھپایا۔

”کیسے۔؟“ ان کے ہر قسم کے جذبات سے عاری چہرے کو دیکھ کر اس نے جھجک کر پوچھا۔

”یہ سب کچھ بتانے کے لیے تو آپ کو بلایا ہے۔“ انہوں نے گہری سانس لے کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔ یوں جیسے یہ ذکر ان کے لیے ناپسندیدہ ہو یا پھر یوں جیسے کوئی مجبوری حقیقت بتانے پر مصہر ہو۔

”ڈیوڈ میری چستی بیٹی ”میری“ کا بیٹا ہے۔ میری کی تربیت میں بچپن ہی سے اس کی ماں نے مسیحی مذہب کی محبت کا درس دیا۔ جو اس کے مذہب سے لگاؤ سے ظاہر بھی تھا۔ مگر اس کی ایک عادت سے میں خائف بھی رہتا تھا اور تلاں بھی۔ وہ اکثر اپنے مذہب کا مذہب اسلام سے موازنہ کرتی رہتی، اور پھر الجھتی رہتی۔“

انہوں نے تھکی تھکی سی سرود آہ بھری۔ ”وہ ہمیں جانتی تھی کہ لاشعوری طور پر وہ مذہب اسلام سے متاثر ہونے لگی تھی۔ مگر میں بے خبر نہیں تھا۔ میں اس کی طرف سے فکر مند رہنے لگا تھا سو جلد ہی اس کی شادی ڈیلس میں مقیم اپنے خالہ زاد کے بیٹے سے کر دی۔ شادی کے بعد اس کی فون کالز سے اس کی خیریت اور اپنے مذہب سے ان کی انیسیت کی خبر نے مجھے کافی مطمئن کر دیا۔“ وہ بات اپنے اطمینان کی کر رہے تھے، مگر وہ ایثار کو اس سے حد درجہ آزرہ خاطر لگے۔ وہ ایک دم خاموش ہو گئے تھے۔

”شاید ماضی کے واقعات اس وقت ذہن پر تسلط

جمائے ہوئے ہیں۔“ اس نے ان کی پرسوج نگاہوں سے اندازہ لگایا۔

”گزرتے وقت نے اسے ایک بیٹے سے نوازا، جو سات برس کی عمر کو پہنچا تو اس کی ماں نے اگلے بچے کی آمد کے سبب اسے ہمارے پاس کراچی بھیج دیا۔ وہ وقت بڑا حسین تھا۔“ ان خوب صورت دنوں کی یاد بھی ان کی رنجیدگی میں کمی کی وجہ نہیں بن پارہی تھی۔ وہ مسلسل افسردگی کے حصار میں ہی تھے۔

”اور وقت کو تو یوں بھی گزرنے کی جلدی ہوتی ہے، سو حسین وقت اور بھی سبک رو ہوا۔ ایک روز اطلاع ملی میری مسلمان ہو گئی ہے۔ یہ خبر ہمارے لیے کسی صدمے سے کم نہیں تھی۔ خصوصاً ”میری بیوی“ کے لیے۔ اس کے لیے یہ صدمہ سہارا حد درجہ دشوار تھا۔ سو مجھے یقین ہے کہ میری بیوی کی موت کا سبب یہی خبر تھی۔ پھر تو جیسے زندگی سے ساری رونق ہی اٹھ گئی۔ ڈیوڈ ابھی کم عمر تھا۔ یہ بے رونق قہقہے نہیں کر پایا اور واپس اپنے وطن لوٹ گیا۔ زندگی بے کیف تو تھی ہی ڈیوڈ کے جانے کے بعد مزید ہوئی۔ بہر حال۔۔“ انہوں نے آہ سرود بھری۔

”وہ وقت بھی گزر ہی گیا۔ مگر اب کراچی کی فضا میں میرے لیے پہلے جیسا سکون نہیں تھا۔ سو میں نے وہ شہر چھوڑ دیا۔ ڈیوڈ سے میرا یہی فونک رابطہ برقرار تھا، سو بارہ برس بعد اس کی آمد کی اطلاع نے میرا دل خوشی سے بھر دیا۔ وہ یہاں صرف مجھ سے ملنے کی خاطر، صرف میری محبت میں آیا تھا۔ مگر پھر یہاں اس کے طویل قیام کا سبب محض میری محبت نہیں کسی اور کی محبت بھی تھی، جو اس کے واپسی کے ارادے کو متزلزل کرنے کا موجب بن رہی تھی۔“ وہ ایک دم ہی خاموش ہو گئے تھے۔ مگر محض دم لینے کے لیے پل بھر کو ہی۔

”شروع کے چند دن اسے جھیل کا سحر اپنی جانب کھینچتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ جھیل کے سحر پر کسی اور کا سحر غالب آنے لگا۔ جس روز اسے اس بات کا ادراک ہوا، اس نے مجھ سے آگے کہا۔“ ان کی نگاہوں کے سامنے

وہ دن پوری جزیات کے ساتھ ابھرا۔

”نانا! روز شام کے وقت جھیل کنارے ایک لڑکی آتی ہے۔ نہ اس کی آنکھیں جھیل سی گہری ہیں نہ رنگت سونے جیسی۔ مگر اس میں کوئی بات ایسی ضرور ہے جو اس کی موجودگی تک مجھے صرف اس کی طرف متوجہ رکھتی ہے۔“ اس نے سیب پر اپنے دانت گاڑے۔

”بیٹا جی! ذرا دھیان سے۔ یہ دیلیس نہیں کشمیر ہے۔ یہاں اگر کسی لڑکے کو کوئی دوشیزہ اچھی لگتی بھی ہے تو وہ اس کا اظہار اسی صورت کر سکتا ہے اگر جو وہ لڑکی اس کی بیوی ہو۔“ نانا نے اپنے لیے کافی پھینٹتے ہوئے مصروف سے انداز میں اسے آگاہ کیا۔

”جانتا ہوں۔“ اس نے اپنے نانا کو اپنی آگاہی سے مطلع کرنا ضروری سمجھا۔

”تب ہی مجھے اس سے بات کرنے کے لیے ڈراما کرنا پڑا۔“ وہ اپنا ”کارنامہ“ یاد کر کے محظوظ سے انداز میں مسکرایا۔

”میں نے اس سے کہا، میں راہ بھول گیا ہوں، برائے مہربانی! مسٹر جوزف کے گھر تک رہنمائی کر دیں۔ میرا خیال تھا وہ استفسار کرے گی ”کون مسٹر جوزف؟“ مگر آپ تو کافی مشہور شخصیت ثابت ہوئے۔ وہ نہ صرف پہچان گئی، بلکہ گھر تک بھی پہنچا دیا۔“

اس انکشاف پہ ایثار نے چونک کر جوزف انکل کی سمت دیکھا۔

”تو کیا میں جسے اپنی خوش فہمی سمجھ رہی تھی وہ حقیقت تھی؟“ اس کے دل کی دھڑکن بری طرح بے ترتیب ہوئی۔

”اس کے حلیہ بتانے پر میں پہچان گیا تھا کہ وہ لڑکی کون ہے۔“ جوزف انکل اس کی طرف بالکل متوجہ نہیں تھے۔ وہ سر جھکائے اپنی پتا سناتے ہوئے گویا یہ طے کیے ہوئے تھے کہ اسے ہر بات سے آگاہ کرنا ہے۔ ”یہ مجھے اس حقیقت سے کیوں آگاہ کر رہے ہیں جو میری بے کلی میں اضافے کا باعث بن رہی ہے۔“

اس کی بے چینی بڑھی۔

”لیکن میں زیادہ فکر مند اس لیے نہیں ہوا کہ یہ اس کی پہلی محبت نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی لڑکیوں سے اس لحاظ سے متاثر ہو چکا تھا، سو میرا خیال تھا، یہ محبت بھی چند ہفتوں سے زیادہ نہیں چل سکے گی۔ مگر بڑی غلطی پر تھا میں۔“ وہ زہر خند ہوئے۔

”اس کا احساس مجھے تب ہوا جب ایک روز اس سے ملاقات کے بعد وہ بڑا مسرور سا لوٹا۔“ ان کی نگاہوں کے سامنے ماضی کا وہ منظر پھر چلنے لگا۔

”اس کی محبت میری رگوں میں لہو کی طرح دوڑنے لگی ہے۔ میں اسے پانے کے لیے سنجیدگی اختیار کر چکا ہوں۔ میرے اس ارادے پہ عمل میں ’سوائے مذہب کے کوئی اور رکاوٹ نہیں۔ یہ میں نے اس کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے۔ سول کی خوشی کی خاطر میرا مذہب بدلنا از بس ضروری ہو گیا ہے۔“

”میرے خدا!“ یہ انکشاف اس کی اداسی برہانے کا باعث بن رہا تھا۔ کیونکہ یہ سب کچھ اگر اسے اسی وقت پتا چل جاتا تو وہ اسے پانے کی ہر ممکن سعی کرتی۔ مگر وہ تو کسی کوشش کے اس سے دستبردار ہو گئی تھی، اس کا حصول ناممکن سمجھ کر۔

”اس کے ارادے کی پختگی اس کے لفظوں سے ہی نہیں، اس کے لہجے سے بھی ظاہر تھی۔ سو اس کے فیصلے سے شدید اختلاف کے باوجود میں کچھ کہہ نہیں پایا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا اگلی ملاقات پہ یہ سب کچھ اس کے گوش گزار کرنے کا۔ مگر وہ اپنے اس ارادے پہ عمل نہیں کر پایا۔ کیونکہ اس لڑکی نے جھیل کنارے آنا چھوڑ دیا تھا۔ جبکہ ڈیوڈ روز، بلا ناغہ اس سے ملنے کی چاہ میں وہاں پہنچ جاتا تھا۔ مگر وہ اسے نہیں ملتی تھی۔ ان دنوں وہ حد درجہ بے چین و مضطرب رہنے لگا تھا۔ وہ دن میں کئی بار اس جگہ سے گزرتا جہاں سے اس کے گزرنے کا امکان بھی ہوتا۔ کئی روز بعد جب ملاقات ہوئی تو حد درجہ خوشی کے سبب وہ اپنے آپ میں نہیں رہا، سو اپنی بے اختیاری حرکت سے اسے ناراض کر بیٹھا۔“ انہوں نے نگاہ اٹھا

کراچی بات کی اثر انگیزی اس کے چہرے پہ کھوجنی چلی ہو انہیں سولے بے قراری کے کچھ نہ ملا۔
 ”کاش۔۔۔ لے کاش! یہ سب اگر مجھے اسی وقت پتا چل جاتا تو زندگی میں یہ اضطراب مقدر نہ ٹھہرتا۔“
 اس نے لب کھنتے ہوئے آنسوؤں پہ پابندی لگانے کی سعی کی۔

”پھر تو گویا بے چینی اس کے اندر اپنا مسکن بنا بیٹھی ہو اس سے ملنے کی چاہ میں سارا سارا دن گھر سے باہر رتا۔ مگر سب کچھ بے کار جاتا رہا۔ اسی بے چینی کی حالت میں اس نے مذہب اسلام اپنا لیا۔ اس روز قدرے سکون کی حالت میں اس نے مجھ سے کہا۔
 ”مذہب کی تبدیلی کے بعد مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میرا آدھے سے زیادہ مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ بڑا پریشان تھا میں اس حوالے سے۔“ اس پل میں نے اندازہ لگایا کہ یہ کام اس کے لیے بھی اتنا تسلسل نہیں تھا۔“ بولتے بولتے ان کے لہجے میں تھکاوٹ اتر آئی تھی۔ انہوں نے پی کا گلاس لبوں سے لگایا۔

”خدا کی دین کا حل بھی عجب ہے۔ وہ چیزیں نواز دیتا ہے جہاں تک سوچوں کی رسائی کا بھی امکان نہیں ہوتا۔ آگ کی تلاش میں نکلنے والا بندہ خدا واپسی پر پیغمبری کی عظیم الشان ”روشنی“ لیے لوٹتا ہے۔ کبھی نصیحتوں کے انبار بھی ”عمر“ کو ابو جہل بنانے سے نہیں روک سکتے۔ اور کبھی قتل کے ارادے سے آنے والا ”عمر“ بسن کی زبان سے فقط چند آیات سن کر ہی۔“ رضی اللہ تعالیٰ عنہ“ کے مرتبے پر پہنچ جاتا ہے۔“
 ڈیوڈ کو یوں با آسانی ہدایت مل جانے پر دل چند لمحوں کے لیے ہی سہی اداسی سے کنارہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

”اس کی اس حرکت پر میرا ضبط جواب دے گیا۔ میں نے اس پر خوب چیخ چلا کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ وہ میری کڑوی کسمپلی سر جھکا کے سننے کے باوجود اپنی من مانی سے باز نہیں آیا تھا۔“ یکایک وہ خاموش ہوئے اور اس کے چہرے پہ نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔
 ”جانتی ہو میری سالگرہ والے دن وہ تمہیں یہاں

کیوں بلایا تھا؟“

اس نے سوالیہ نگاہیں اٹھائیں۔

”تمہیں اپنے ارادے سے آگاہ کرنے کے لیے، اور تمہاری مرضی معلوم کرنے کے لیے۔“

اس نے گہری سانس لے کر نظریں جھکائیں۔ وہ مجھے اس حد تک چاہتا رہا اور میں بے خبر رہی۔ جب اس وقت لا علم رہی تو یارب! اب اس حقیقت سے آگاہی کیوں ہوئی؟ اب تو یوں لگ رہا ہے جیسے منزل دو گام پر تھی مگر میں اپنی کم عقلی کے سبب خود اسے کھو بیٹھی۔ اسے لگا دل کی سر زمین سے رخصت ہو جانے والا اطمینان اب کبھی لوٹ کے نہیں آئے گا۔

”وہ اس روز بے انتہا خوش تھا۔ مگر تمہاری منگنی کی خبر نے اس کے ارادے بھی ملیا میٹ کیے اور ساری خوشی بھی۔ اس کی شوخی، مسکراہٹ، بے فکری کہیں دور دلیس جا کے بس گئیں۔“ نواسے کے اضطراب کا اثر ان کے لب و لہجے پر بھی ہو گیا تھا۔

”اسے یقین تھا کہ وہ اگر اس وقت بھی تمہیں پروپوز کرتا تو تم اپنے کزن کے مقابلے میں اسے ترجیح دیتیں۔ مگر اسے یہ بھی یقین تھا کہ عین منگنی والے روز تمہارا اس طرح کا کوئی بھی فیصلہ تمہارے لیے کئی مشکلات پیدا کر دے گا اور وہ تمہیں کسی بھی طرح کی آزمائش میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔“

اسے ہر بات سے آگاہ کر دینے کے بعد وہ ایک دم خاموش ہو کر کسی سوچ میں ڈوبے۔ خاموشی کا وقفہ جب لمحوں سے منٹوں تک پہنچا تو وہ آہستہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ویسے بھی دل پہ دھرا بوجھ اب آنسوؤں کے ذریعے کم ہونا چاہتا تھا۔

”کافی دیر ہو گئی ہے۔ چلوں گی اب۔“ مڑ کے اس نے دروازے کی سمت قدم بڑھائے۔

”تم جانتی ہو ان سب باتوں سے میں نے تمہیں کو کیوں آگاہ کیا ہے؟“ اس نے اپنے عقب میں ان کی آواز سنی تو ٹھٹھک کے رکی۔

”اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ان سب باتوں سے تمہیں لا علم ہی رکھوں، ورنہ حقیقت جان کر تمہارے

دل کی کسک مزید بڑھ جائے گی۔ اس کے خیال میں بظاہر جس خواہش کا پورا ہونا ناممکن لگ رہا ہو اور پھر ہمیں بتا چلے کہ اس خواہش کا پورا ہونا ناممکن تو کیا مشکل بھی نہیں تھا۔ بس ہماری لاعلمی اس خواہش کی تکمیل کی راہ میں حائل رہی تو اس وقت کا افسوس ایک ”کاش“ کی صورت ساری زندگی ساتھ بھاتا ہے۔ وہ تمہاری زندگی کو اس ”کاش“ سے بچانا چاہتا تھا۔

کس قدر درست اندازہ لگایا ہے اس نے۔ یہ ایک ”کاش“ اب پیچھا چھوڑنے والا نہیں۔ اس نے افسردگی سے سوچا۔

”مگر انہوں نے اس کی ہدایت کے برخلاف مجھے حرف بہ حرف حقیقت کیوں بتادی؟“ وہ حیران تھی۔

”اسی لیے میں نے تمہیں تمام حقیقت بتادی۔“ وہ اس کی حیرانی بھانتے ہوئے بولے۔

”دل پہ مت لینا، مگر ایثار! مجھے یہ بات بھولتی نہیں کہ ڈیوڈ نے صرف اور صرف تمہاری وجہ سے اپنا مذہب چھوڑا اور جب تک مجھے یہ بات بھولتی نہیں مجھے تم غصہ رہے گا۔“ انہوں نے اپنی صاف گوئی اور لہجے کا تیکھا پن اس سے چھپانے کی بالکل کوشش نہیں کی۔

”اس کے علاوہ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ میں اپنے نواسے کی محبت میں بہت خود غرض ہو گیا ہوں۔ میری نگاہوں سے اس کا اداس چہرہ ہٹا نہیں۔“ ان کے لہجے میں وہی بے گانگی اور درست سی سمٹ آئی تھی جو اس نے ان کی سالگرہ والے دن سہی تھی۔

”جس ہستی کے سبب میرے نواسے کا چین و سکون برباد ہوا، اسے پرسکون دیکھنے کا میں خود میں حوصلہ نہیں پاتا تھا۔ اب تم چاہے میری اس حرکت پہ کچھ بھی سوچو، مجھے اس کی پروا نہیں۔“ ان کا حسد عروج پہ پہنچ چکا تھا۔ ان کے تیکھے لہجے پہ ایک پھکی سی مسکراہٹ نے ایثار کے لبوں پہ چھب دکھائی اور وہ مڑ کے دوبارہ دروازے کی سمت بڑھ گئی۔

خدا جانے میں انہیں اتنی پرسکون کب لگی جو یہ مجھے بے سکون کرنے کے لیے کوشش کرنے لگے۔

چہرے پہ چند بوندیں گری تھیں۔ اس نے سر اٹھا کے دیکھا۔ بادل پانی سے لبالب بھرے ہوئے تھے۔ بالکل اس کے دل کی طرح۔

”مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں، جوزف انکل! کہ آپ کی محنت بھی رائیگاں نہیں گئی۔“ اس نے تصور میں انہیں مخاطب کیا۔

”آپ کی ”محنت“ کے ”کاش“ کا پچھتاوا اب تمام عمر مجھے اپنی کوتاہی یاد دلائے گا۔ میں کیوں اتنی بے خبر رہی؟ مجبوری تو بغیر کسے میرے دل کی بات پالیتا ہے۔ ڈیوڈ میرے جذبات سے باخبر تھا۔ پھر میں ہی کیوں نہ جان پائی؟“ برستی بارش کا فائدہ اٹھا کر اس نے اپنے آنسوؤں کو بنے دیا۔

”کیا میری محبت اس درجے تک نہیں پہنچی تھی کہ میں اس کی ان کہی تک بھی بہ آسانی پہنچ پاتی۔“ برسات کے پانی میں ممکن پانی گھلتا جا رہا تھا۔

”اگر تم یہ سوچ رہی ہو کہ برسات کے سبب تمہارے آنسو نظروں میں نہیں آسکیں گے تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔“ وہ نہ جانے کب اس کا ہم قدم ہوا تھا، وہ محسوس ہی نہ کر سکی۔

”تمہارے آنسو میری نظروں میں بننے سے پہلے ہی آجاتے ہیں۔“ مجبوری کا یہ دعویٰ نیا نہیں تھا۔

”یہ شخص ہر بات سے آگاہ ہے، سو اس سے کوئی بات مخفی رکھنے کی کوشش بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں۔“ اس کے آنسوؤں میں روانی آگئی۔

”ایثار!“ وہ دو قدم آگے بڑھ کے اس کے مقابل رکا۔ اس نے رک کر نگاہ اٹھائی۔

”تمہارے آنسو مجھے تکلیف میں مبتلا کر دیتے ہیں۔“

ایثار نے دھندلی نگاہوں سے سامنے دیکھا اور ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے۔ اس شخص کے لیے جو اسے شدید اور بے لوث چاہتا تھا۔

کھلے گلے

جانے مجھے کیوں نہ پتا چلا اور میں نے اس کا سر پر بیٹ مارا۔ اف میں نے میں نے۔ ”قاسم بھائی سینے پر مکتے مارتے۔“ میں نے اس کا سر پھاڑ دیا۔“

علی کا سارا وجود اینٹھ گیا، کھارے پانیوں سے لبالب بھرے کٹورے اپنی بے بسی پر نوحہ کنٹاں تھے۔ شعور کی تختیوں پر کھدے وہ مناظر ابھی تک سامنے لہرا رہے تھے۔

”تم سائیکو کیس بنتے جا رہے ہو ہمارے لیے ایک ہی دفعہ کیوں نہیں ہم سب کا گلا گھونٹ دیتے تم۔ کتنے جنونی ہو تم وحشی انسان ابھی اس کا پچھلا زخم ٹھک نہیں ہوا اور آج تم نے اس کا سر پھاڑ دیا۔“ تایا قاسم کو پیٹتے جاتے اور وہ کسی سی صورت بنائے منمناتا رہتا۔

”ابا چھوڑ دیں بھائی کو، پلیز ابا۔ اگر ہاشم بھائی زندہ بچ گئے ہیں تو آج آپ قاسم بھائی کو مار ڈالیں گے۔ بس کریں۔“ منظر میں روداہ کی آمد ہوتی اور وہ اپنے خیف ہاتھوں سے قاسم کو پیٹنے سے بچاتی۔

”اس کینے کو مر ہی جانے دو، اگر یہ زندہ رہا پونہی ہمیں اذیتیں دیتا رہے گا۔ اس کے جنون کو ختم کرنا ہی ہو گا۔“ تایا ابا ہانپتے کانپتے بولتے جاتے۔ اور تب تک ٹھڈوں، اپنی چھڑی سے اور قریب موجود کسی بھی شے سے پیٹتے جب خود نہ تھک کر گر پڑتے۔ اس منظر کے بعد ایک واقعہ اور اس کے سامنے لہرایا۔

”قاسم۔ قاسم نیچے آؤ۔“ تایا ابا دھاڑتے۔ قاسم اترے چہرے کے ساتھ سامنے آکھڑا ہوتا۔

”منہ چھپا کے کیوں پڑے ہو اب وحشی انسان۔ کس کس کو ادھیڑ کر رہے ہو۔ اور نہیں تو اپنے باپ

ہوا تھم تھم کر چل رہی تھی۔ گویا نخریلی حسینہ، ناز واداد کھاتی دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہی ہو۔ بلاشبہ یہ شوخی اس پر خوب بیچ رہی تھی۔ یک لخت ناچتی، ٹھمکتی قمری کی مانند ہوا کی سرسراہٹ تھی۔ ہوا کو کسی کایوں نخل ہونا پسند نہ آیا تھا۔ شاید کھلتی ہوئی نیلے کی کلیوں نے چپکے چپکے اپنی خوشبو کو سمیٹ کر منہ بند کلیوں میں چھپا لیا تھا۔ ماحول میں سبز پتوں کی باس تنہا رہ گئی، اس تنہائی میں قریب آتے قدموں کی چاپ ابھرنے لگی، اڑان بھرتی قمری کو یہ جسارت ناگوار گزری، اور وہ قاسم سے دور ہوتی چلی گئی۔ فضا میں خنکی عود آئی تھی، اس ذی نفس کے رخساروں پر کھارے پانیوں کی سی نمی پھیلتی جاتی جسے فضا نرمی سے اپنے اندر سمیٹے جا رہی تھی۔

چوڑے چکے شانوں والا مرد سر اور شانے جھکائے زمین پر نظر جمائے لڑکھڑاتے انداز میں چلتا جا رہا تھا۔ قرمزی پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر اس پر قربان ہوئے جا رہے تھے۔ قمری ایک الوداعی ناراض نظر اس پر ڈال کر سرو قد اشجار کی فلک بوس ٹہنیوں کو چھوتی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

سبز پتوں کی باس میں روانی سے گرتے کھارے پانیوں نے شرکت کی، اور ہر طرف اسی کاراج بڑھنے لگا، اداسیوں نے گھیرے تنگ کر دیے۔ تب ہی ایک منظر آنکھوں کی ساکت پتلیوں پر جھننے لگا۔

”ابا میں نے جان بوجھ کر نہیں مارا۔ بس وہ رول توڑ رہا تھا، تم کے ابا وہ۔“ قاسم بھائی کی منت بھری آواز سماعت کے پردے پھاڑنے لگی تھی۔

”ابا میں تو اس کا سب سے اچھا دوست ہوں۔ ابا



اور اپنی اس جوان بہن کا ہی خیال کرلو۔ کتنا رسوا کراؤ
گئے ہمیں اور۔ ”تایا ابا کی آواز ان کی ڈھلتی عمر کی چغلی
کھاری تھی۔ وگرنہ قاسم کسی کو پیٹ کر آتا اور تایا ابا
اسے مار مار کر ادھ موانہ کر دیتے“ یہ بعید از قیاس بات
تھی۔
”ابا میں کیا کروں، مجھے غصہ آجاتا ہے۔ میں جتنی

ماہنامہ شعاع اپریل 2016 103

بھی کوشش کرلوں میں آپے میں نہیں رہتا۔“
 یادوں کے مٹتے ہیولے اس کے جسم میں انگارے
 دوڑانے لگے تھے۔ علی نے شدت ضبط سے اپنی
 مٹھیوں کو سختی سے بند کیا۔ سبزپتوں کی باس میں کافور کی
 بو پھیلنے لگی۔

کڑوا دھواں جو اس کے اپنے جلتے جسم و جاں سے
 آزاد ہو کر اوپر اٹھتا تھا وہ اس کے خلق میں پھسنے لگا۔
 آنکھوں میں قہقہے بڑھنے لگی۔

”پاگل خانے چھوڑ آتا ہوں پھر تمہیں“ میں اب
 مزید اپنے چھوٹے بھائی کے بچوں کو پٹتے نہیں دیکھ
 سکتا۔ کب تک وہ تمہاری دیوانگی کی بھیمنٹ چڑھتے
 رہیں گے۔“

”ابا ایسے نہ کریں۔ ایک بس ایک موقع اور دیں
 بھائی کو۔ پلیز ابا۔“ رودابہ نے تایا ابا کے سامنے دیوار
 بنے ہوئے کہا۔

”لے جانے دو“ اور ہٹو سامنے سے۔ بلکہ جو کل
 شام اس نے تمہارا ہاتھ جلایا تھا وہ بھول گئی ہو تم۔“
 یادوں کی یلغار نے اسے ادھ موا کر ڈالا تھا۔ وہ اس جال
 کے شکنجے میں تھا۔ لیکن اس کے بے ربط قدم اسے تھکا
 ڈالنے کے قریب تھے کہ جب وہ مضطرب اور نڈھال
 انداز میں بائیں طرف بنی روش پر بیٹھ گیا۔

وہ اگر یہ سمجھتا تھا کہ گھر سے فرار ہو کر حقیقت سے
 منکر ہو سکتا ہے۔ تو یہ خیال ہی غلط تھا۔ اس کے
 اعصاب مسلسل دباؤ کی وجہ سے تسل ہو رہے تھے۔

”تمہیں رودابہ سے شادی کرنا ہوگی“ اسے میرا
 فیصلہ سمجھو یا حکم“ بس تمہیں ہر حال میں ایسا کرنا
 ہوگا۔“ ابو کی پاٹ دار آواز نے اس کا تعاقب کیا۔ اس
 نے گھبرا کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔

”ابو! آپ جانتے ہیں میں وہاں شادی نہیں کروں گا
 پھر زبردستی کر کے نہ آپ خوش رہ سکیں گے نہ میں۔“
 علی کے دو ٹوک لہجے سے ابو ذرا گھبرائے تھے لیکن
 ظاہر کیے بنا رد عمل دیا۔

”علی اگر ایسا ہوگا تو میرا بھائی ساری زندگی کے لیے
 میرا ممنوع رہے گا۔ کیا میں اسے اپنے قریب آنے کا

موقع نہ دوں۔ تم ہم دونوں کو علیحدہ کر دینا چاہتے ہو
 کیا؟“

”میں ایسا تو نہیں چاہتا لیکن میں خود کو مجبور پاتا
 ہوں۔ علی مدافعتانہ انداز میں بولا۔

”میں سمجھ سکتا ہوں یہ“ لیکن قاسم اب ذہنی طور پر
 بالکل تندرست ہے“ اگر ہم ہی اسے سپورٹ نہیں
 کریں گے تو وہ خود کو تنہا محسوس کرے گا۔ تم جانتے ہو
 وہ آشد پسند اس لیے بنا کیونکہ بچپن میں وہ اپنی ماں کو

تمہارے تایا ابا کے ہاتھوں پٹتے دیکھتا تھا۔ اس کی
 پرورش اس کی ماں نے ان ہی خطوط پر کی تھی۔“
 ”لیکن کیوں ابو!“ اس نے ان کی ادھوری بات سن
 کر کہا۔

”بس آگے میں تمہیں کچھ اور نہیں بتا سکتا ہاں اتنا
 کہوں گا جو زہر اس کی ماں نے اس معصوم کی رگوں
 میں بھرا تھا۔ وہ اب ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ ہم مل کے
 سب ٹھیک کر لیں گے نئی الحال ماضی کو چھوڑ کر ہمیں
 حال میں ایسے اقدام کرنے ہیں جو ہم سب کے روشن
 مستقبل کی ضمانت ہو سکیں۔ کل شام نکاح کے لیے
 تیار رہنا۔ میں امید کرتا ہوں تم اس مشکل وقت میں
 اپنے باپ کو تنہا نہیں کرو گے۔“ وہ اس کا شانہ تھیک
 کر چلے گئے۔ لیکن وہ یہ نہ جان سکے کہ وہ وہیں رگ
 گیا۔ بت بنا شاید اسے وہاں کھڑے قرن بیت گئے
 ہوں پھر وہ ایک دم سے اپنے کمرے سے نکل کر باہر
 چلتا گیا۔ چلتا گیا۔ اس کے ذہن و قلب پر بوجھ تھا کہ
 بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ تھک کر درد سے چور ہوتے قدموں
 کے ساتھ وہ رات کے تیسرے پہر ایک فیصلہ کر کے
 لاؤنج کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔
 اب وہ قدرے بہتر محسوس کر رہا تھا۔ شاید ہاں۔ شاید
 نہیں۔ خیر۔



اگلی رات اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ان کے
 آنگن میں اتری تھی۔ باہر ڈھول کی تاپ‘ تالیوں کی
 گونج اس پر کوئی اثر نہ کیا رہی تھی۔ علی انتہائی بددلی

سے آئینے کے سامنے کھڑا شہروانی کے بٹن عجلت میں بند کر رہا تھا، لیکن بٹن تھا کہ بند ہی نہ ہو رہا تھا۔ اس کے ظاہری تاثرات کے ساتھ اس کے اندر کے تاثرات میں یکسانیت پائی جاتی تھی۔

تاثرات کا درجہ حرارت منفی ڈگری سے نچلے درجوں میں جا چکا تھا جہاں پر سرد ترین، منجمد تاثرات اپنی تمام تر ہولناکیوں سمیت موجود ہوتے ہیں۔ ”خوشی“ یا ”خوش کن احساس“ کا خیال بھی اس کے

نمل خانوں میں غنقا تھا۔ ہر سو سفید ذرے اڑے جارہے تھے جو جذبات کو منجمد کر دینے کے درپے تھے۔ وہ تیزی سے اپنی تیاری کر رہا تھا گویا اس کے پاس وقت کم ہو۔ گیلے بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتا وہ آئینے میں خود کو اجنبی نگاہوں سے تولتا رہا پھر یکایک ٹھہر کر گردن موڑی۔ نیم وادروازے کے پاریدھر ہنسی گونجی۔ اس ہنسی میں بلاشبہ کوئی ایسی کھنک تھی جس کے سامنے شاید سارے سُرخ تھے۔ وہ ہنسی سب سُرور میں عروج پر تھی خوشی کی لہریں اس سے پھونتی تھیں۔

علی کی کشادہ پیشانی پر پسینہ اترتا پھر ہتھیلیاں گیلی ہوئیں، چند لمحے وہ ساکت کھڑا رہا پھر دوڑ کر چوٹ پار کی۔

”بات سنو رودابہ!“ علی نے اونچی آواز میں پکارا۔ ”جی!!“ رودابہ حیرت سے پلٹی اور سب سبج قدم رکھتی آگے آئی۔ اس کی سہیلی جب پرے چلی گئی تو ملی نے اس کی کلائی کو اتنی سختی سے تھاما کہ رودابہ کو لگا اس کی نیس کٹ دی گئی ہوں۔ وہ خوف سے اسے ٹکٹنے لگی۔

”بہت خوش ہوتا۔ بہت جلد اس خوشی سے بھی چھٹکارا پا لوگی تم۔“ رودابہ کی سماعت کو سرد آواز سنائی دی۔

بھاری، سخت آہنی گرفت تلے نیلے کی کلیوں اور گلاب کی پتیوں نے احتجاج کیا۔ گھور سیاہ پتلیوں میں کڑوے پانی نے جگہ بنائی اور لہو رنگ سے رنگے مومنوں میں فریاد اتر آئی۔

”میرا کیا قصور ہے؟ آپ کیوں مجھے رُسوا کرنے پر

تلے ہیں۔ میرے باپ کے لاغر تن میں اب اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ بیٹی کے اجڑنے پر حوصلہ کر لے گا۔ وہ مرجائے گا۔ انہیں مت مارے پلینز۔“

”تو جاؤ پھر تم خود جا کر سب کے سامنے انکار کرو کہ تم مجھ سے نکاح نہیں کرو گی۔“ سارا وزن اس کے کندھوں پر ڈال کر وہ اس کی کلائی جھٹک کر آگے بڑھنے لگا تو اس کی سماعت کسی آواز سے زنجیر ہوئی۔

”میں کبھی انکار نہیں کروں گی۔ سن لیا آپ نے۔“ اس نے مردہ ہوتی ہمت کو جھٹکے سے سہارا دینا چاہا، لیکن ناکام رہی۔

”تمہارے بھائی نے مجھے بہت زخم دیے ہیں اب تمہاری باری ہے۔ ایسا ہے تو ایسا ہی سہی اگر تم اس کا تاوان بھرنے کو رضا مند ہو تو کوئی مسئلہ نہیں، میں تمہیں اذیت سے پر زندگی دوں گا۔ سن لیا تم نے۔“ سرد لفظوں نے رودابہ کو ادھ موا کر دیا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

ماحول میں باسی ”مردہ“ پھولوں کی خوشبو رینے لگی۔ پتیاں جا بجا اس کے گجروں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں۔ اس کی ذات بھی یونہی ان بے جان ہوتے پھولوں کی طرح بکھرنے لگی تھی۔

چٹکی ہوئی چاندنی اس کے سر پرے پر نظریں نکائے نہیں تھک رہی تھی۔ وہ خاموشی سے سیلیوں کے ساتھ آئی اور اسے قاسم اور اس کی دلہن کے پہلو میں بٹھایا گیا۔

تایا ابانے آتے ہی اس کا ماتھا چوما اور اسے دعا دی۔ اتنی دقتوں سے وہ خود کو قابو میں کیے ہوئی تھی کہ اسے حیرت تھی وہ اب تک مری کیوں نہیں۔ ان الفاظ میں موت جیسا ٹھنڈا اور بے رحم تاثر تھا۔ انتہائی خوف ناک۔ وہ بمشکل لبوں سے مسکراہٹ چپکا کر چہرے کے تاثرات نارمل رکھے ہوئے تھی کہ اس کی نشست پر اس کا اضافہ ہوا۔ درد اس کی کلائی میں پھر سے لوٹ آیا تھا۔ سرمئی نگاہوں میں کڑوے پانی نے اٹلاند کر آنے کی جسارت چاہی تھی۔ وہ بے بس بیٹھی رہی۔

جانے پھر لمحے کیسے بیتے تھے۔ اس کو کچھ ہوش نہ رہا۔ اس کی سوچوں کو دھچکا تب لگا جب اس نے ابا کو خود سے نکاح کی اجازت لیتے پایا۔ اس کی سماعت نے علی کے اقرار کو من و عن سنّا۔ اسے ایک گونہ اطمینان ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھا اور معذرت کرتے ہوئے سب سے دور چلا گیا۔ مروت تو اس میں نام کو بھی نہ تھی۔ تاروں نے مسکرا کر اسے مبارک باد دی تھی۔ ہواؤں نے سماں باندھ ڈالا تھا۔ گلاب کے پھولوں کی خوشبو لوٹ آئی تھی۔ دور کہیں جیسے مور مور رقص تھے۔

رودابہ نے نکاح کے بعد اپنے بھائی قاسم کی مہندی میں بھی حصہ لینا تھا، سو وہ ان تیاریوں میں لگ گئی۔ ادھر علی کمرے میں دائیں سے بائیں چکر کاٹ کاٹ کر پاگل ہوا جا رہا تھا۔ ”مجھے اس سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ ساحرہ ہے۔ وہ باندھ لے گی مجھے، بہت غلط ہو گیا۔“ لامتناہی سوچیں اسے گھیرے میں لینے لگیں۔ پھر اس نے خود کو اس کے سامنے پایا۔ وہ تو یوں مطمئن تھی جیسے اس کا خواب پورا ہوا ہو۔ ادھر وہ حلے پیر کی بلی بنا ہوا تھا۔ اسے شدید طیش کی لہر نے آگھیرا۔ وہ پلٹا، نشست پر اپنی دلہن کے ساتھ براجمان قاسم مسکرا کر اس سے بات کر رہا تھا۔ منظر سے رودابہ غائب ہوئی اور اس کی کنپٹیوں میں لہوا بلنے لگا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اضطرابی عمل تھا۔ باہر پٹاخوں اور فار کی آوازیں آرہی تھیں۔ سب لڑکے ہوائی فائرنگ کر رہے تھے۔

اس کا ہاتھ اٹھا اور قاسم کا نشانہ تاک کر گولی سائلنسر لگے پستول سے نکل کر راستے میں معلق ہو گئی۔ وہ گولی اس کے نہاں خانوں میں موجود کسی جذبے کو جا لگی۔

”ہاں۔۔۔ وہ وہی تھی۔ وہی۔۔۔“ علی کو لگا گولی اسے لگی ہے۔ چاروں طرف خون کے چھینٹے اڑتے رہے اور اس کو بھگوتے رہے۔ رودابہ کے کندھے سے خون ابلتا دیکھ کر وہ اس کے پاس دوڑتا ہوا آیا اور رودابہ کی بند ہوتی آنکھوں میں سوائے بے یقینی کے اور کوئی جذبہ نہ تھا۔

وہ ماننے سے ڈرتا تھا۔ خوف کھاتا تھا کہ رودابہ سے اس کا کوئی بھی جذبہ مشترک ہے۔ آج جب خود اسے اپنے ہاتھوں سے گولی ماری تو اس کا یقین اس کے سامنے اڑدھے کے روپ میں آن کھڑا ہوا تھا۔

”سب اسپتال میں ہیں تم کہاں ہو، تمہاری بیوی یہاں مر رہی ہے اور تم کہیں اور ہو۔“ ابو کی چیختی ہوئی آواز موبائل کے اسپیکر پر گونج رہی تھی اور وہ گونگوں کی طرح بس انہیں سنے جا رہا تھا۔

”آجاؤ اب ورنہ اگر وہ مر گئی تو میں تمہیں اس کامنہ بھی نہیں دیکھنے دوں گا۔“ وہ الفاظ نہیں تھے، پکھلا ہوا سیدھ تھے جو اس کی سماعت میں بہہ رہے تھے۔ ”اگر وہ مر گئی۔“ اتنے خوف ناک الفاظ اس نے آج تک نہیں سنے تھے۔

”قاسم کو گولی مارتے ہوئے وہ کہیں نہ تھی، اچانک کہاں سے آگئی تھی۔“ وہ خود کلامی کرنے لگا۔ اس کی ذہنی حالت انتہائی مخدوش تھی۔

”ہاں جب وہ لہرا کر گری تھی تو پھولوں کی پتیاں جو اس نے تھام رکھی تھیں اس پر گرتی چلی گئیں۔“ اسے وہ منظر پھر سے یاد آیا تھا۔ علی نے سختی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں، لیکن ایسا کرنے سے وہ حادثہ نہیں بھول سکتا تھا۔

”علی تم یہاں ہو؟ پلیز چلو۔ تم نہیں جانتے اس وقت اسپتال میں تمہارا ہونا کتنا ضروری ہے۔“ ہاشم بھائی اس کا ہاتھ پکڑ کر لجاجت سے کہنے لگے۔ اس کی پریشانی کو رودابہ کی خراب حالت پر محمول کرنے لگے۔

”ایک میں ہی تو غیر ضروری ہوں بھائی۔ میں نے رودابہ کو گولی ماری۔ ان ہاتھوں سے۔“ ہاشم بھائی بے یقینی سے اسے گھورنے لگے۔

”تم۔۔۔ تم نے رودابہ کی جان لینے کی کوشش کی۔“ ایک دم ہاشم بھائی نے بپھر کر اس کے چہرے پر چائنا رسید کیا۔

”اگر اتنی ہی نفرت تھی تو گلا گھونٹ دیتے۔ وہ زندگی اور موت کے درمیان یوں جھول تو نہ رہی ہوتی، آخر کیا بگاڑا تھا اس نے تمہارا۔ تم۔۔۔ وہ تیز تیز بولتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

تھا۔ پاسی گلابوں کی مہک اسے اندر جانے پر اکساتی رہی، مگر وہ چپ کی بکھل مارے بیٹھا رہا۔

”اٹھو! دیکھو وہ تمہیں بلارہی ہے۔“ ہاشم بھائی نے علی کے کندھوں پر دباؤ برھاتے ہوئے کہا۔ فضا میں جلت رنگ سی ہنسی گونجی تھی۔ اس نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا تھا۔ وہ خوف زدہ تھا؟ نہیں، وہ اقرار سے ڈرتا تھا۔ پھر اس نے قدموں کو اٹھتے پایا جو چلتے چلتے بے بس ہوئی رودابہ کے بیڈ کے قریب جا کر خود ہی کھتم گئے۔ جیسے جانتے ہوں کہ یہی منزل ہے۔

”تم ہر دفعہ کیوں قاسم بھائی کے دفاع میں آگے آجاتی ہو۔“ دھیمی آواز میں سلسلہ کلام جوڑا۔ خاموشی جو سامنے چوبلی کھڑکی سے جھانک رہی تھی، مسکانے لگی۔

”وہ میرے بھائی جو ہیں۔ کیا یہ کافی نہیں۔“ وہ نقاہت زدہ آواز میں دھیرے سے بولی۔

علی گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے قریب پڑے صوفے پر ڈھیر ہوا۔ اس کی رودابہ سرخ خون سے رنگی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں تھاما گلاب کی پتیوں کا تھال ایک جھٹکا لگنے سے الٹ گیا تھا۔ پھر وہ کندھے پر ہاتھ رکھ کر جھٹکنے لگی۔ جھٹکتے جھٹکتے زمین سے جا لگی۔ چہرے کا رخ البتہ علی کی جانب تھا جو اس سارے معاملے پر دم بخود تھا۔ رودابہ کے رنگین شرارے کو جلتے دیوں سے آگ لگنے لگی اور اب علی کے وجود میں شرارے پھوٹنے لگے۔

خاموشی مسکاتے مسکاتے لب بھینچے دونوں کو تنکے لگی۔ پھر سرخ پھیر کر دور ہتی گئی۔

”سوری رودابہ۔“ وہ ہولے سے پڑ پڑایا تھا۔ اور یہ بریڈا ہٹ بہت مشکل سے وہ سن پائی تھی۔ صد شکر تھا کہ وہ مسافر بننے سے پہلے لوٹ آیا تھا۔

وہ دھیرے سے آنکھیں موند گئی۔ گلابوں کا گداز پن اس کے وجود کا احاطہ کرنے لگا۔ گلابوں کی سوندھی مہک ابے کھلتا گلاب بنانے لگی۔



”میں قاسم بھائی کو گولی مارنے لگا تھا۔ وہ شاید زمین پر بیٹھی تھی۔ میں اسے نہیں دیکھ پایا تھا۔ جب میں نے گولی چلائی تو وہ کھڑی ہو رہی تھی۔ تو۔۔۔ اسے لگ گئی۔“ علی کی زبان سارا قصہ سناتے ہوئے لڑکھڑا رہی تھی۔ دور جھینگروں کی آہ و بکا کی آوازیں تھیں، نوچے تھے۔ اس کی ہتھیلی سے پھوٹی مردہ گلابوں کی خوشبو سرسرا نے لگی۔

”تم نے یہ سب کیوں کیا آخر۔؟“ ہاشم بھائی نے اصل وجہ پوچھی۔ جواب میں وہ سب بتانا چلا گیا۔ ”قاسم بھائی نے آپ کا سر پھاڑا تھا۔ میری ناک کی ہڈی توڑی، وغیرہ وغیرہ۔“ وہ سب باتیں کھل سے سنتے رہے۔ پھر بولے تو ان کے لہجے میں ٹوٹے کانچ کی آواز تھی۔

”تم چھوٹے تھے، حساس بھی، جب ہی کچھ باتوں کی آگہی نہ ہونے کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے، اگر تم جان جاتے تو قاسم کو کبھی گولی مارنے کی جسارت نہ کرتے، تائی امی کا کردار ٹھیک نہ تھا۔ جب تایا ان کو روکتے وہ اور باغی ہوتیں اسی سرکشی میں انہوں نے قاسم بھائی کو بھی ورغلا یا اسی لیے وہ جنونی ہو گیا۔ بچپن کے نقش اس کی رگوں میں لہو بن کر دوڑتے رہے۔ وہ اپنے غصے پر کنٹرول نہ کر پاتا۔ پھر گھر چھوڑ کر تائی بھاگ گئیں۔ پھر بنو مسخ شدہ شخصیت قاسم نے اپنائی اس میں اس کا تو کوئی قصور نہ تھا۔“ ہاشم بھائی کے لہجے میں کھارے پانیوں کی سی نمی تھی۔ علی سر جھکائے سرخ آنکھوں سے ہر طرف لہو کے چھینٹے اڑتے دیکھتا رہا۔ اس کی روح گھاگل ہونے لگی۔ جذباتی پن میں اس نے بے وقوفی کی حد پار کر ڈالی تھی۔ وہ از حد شرمندہ تھا۔



”مریضہ کو ہوش آگیا ہے۔ اب آپ ان سے مل سکتے ہیں۔“ ڈاکٹر کی آواز خوش کن تھی یا شاید علی کو لگی۔ وہ سخی بیچ سے جس تیز رفتاری سے اٹھا تھا۔ ایسے ہی پھر بیٹھ گیا۔ وہ کم از کم اس وقت ان بے یقین آنکھوں سے ہم کلام ہونے کی جسارت نہیں کر سکتا

سمیرا حمید

روح اللہ

”اللہ کی محبت محبوب ہے۔“

یہاں ایسے بے بس کر کے رکھا ہوا ہے۔
”جو ماں کے حصے سے بچ گیا تھا وہ میرے حصے میں
ڈال دیا گیا ہے۔ بے رحمی کا دروازہ ابھی بھی بند نہیں
ہوا۔“

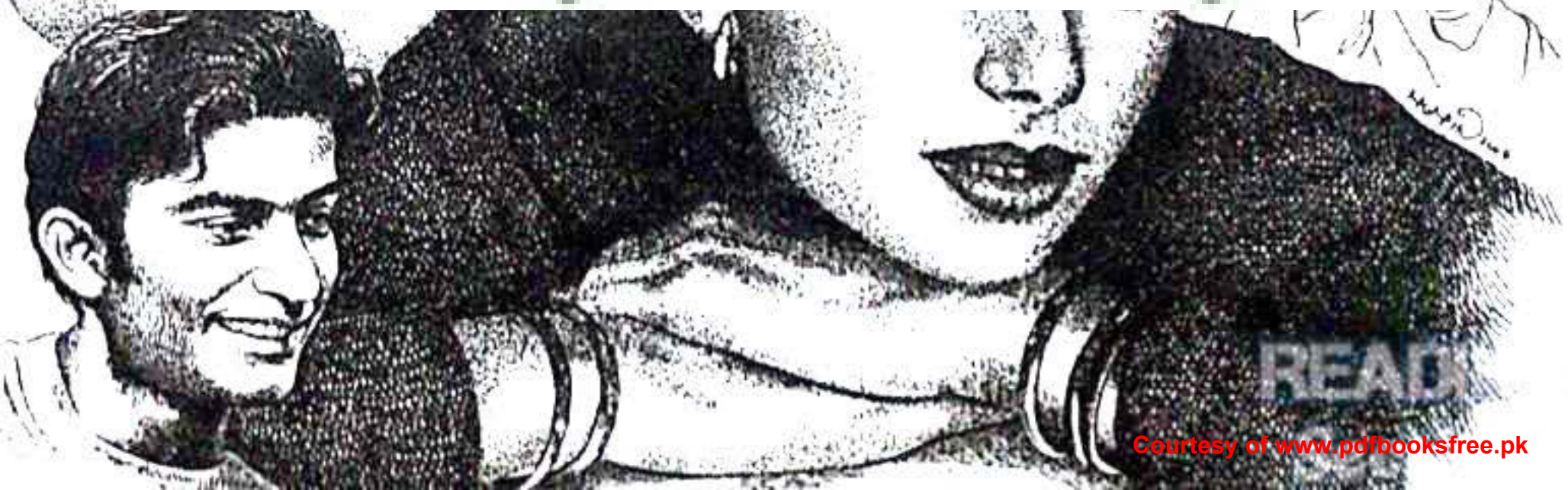
لبنان کے پہاڑی گاؤں کے سرنگ نما گھر کے
اندھیرے کمرے میں بند سیبل پیاس کی شدت سے
صحرا ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے اندر کی پچی پچی رحم دلی
اس صحرا میں کانٹے بن کر ابھر رہی ہے۔ لکڑی کا کواڑ
بند ہے، کواڑ سے اگلا کواڑ بھی بند ہے۔ اس کا منہ کس
کر پاندھ دیا گیا ہے۔ وہ دے کے مریض کی طرح
کھائیں کھائیں کر اپنی جان دے دینا چاہتی ہے۔ اس
کے خون میں نفرت حلول کرتی جا رہی ہے کہ اسے

اس کا دل اس غم سے ناسور بن گیا اور خیال نے
اس کے روم روم کو نئے سرے سے ”نافرمان“ کر دیا۔
”کاش ماں جان لیتی کہ خدا نے باقی ماندہ سزا کے
لیے مجھے امریکہ سے یہاں لا پٹا ہے۔ اپنے اس بندے
کے ہاتھوں جو اس کی عبادت کرتا ہے اس بندے کے

مکمل ناول

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Downloaded From
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk





لیے جواسے فراموش کرنے کا گناہ کرتا ہے۔“

اس احساس نے یقین ہو کر اس کے اندر آگ لگا دی کہ وہ اس جگہ صرف اس لیے بند ہے، کیونکہ وہ موسیٰ کی شان میں گستاخی کرتی رہی ہے۔ اس کے منہ پر پھٹ مار چکی ہے اسے ذلیل کرتی رہی ہے۔ وہ اسے یہاں اٹھا کر لے آیا ہے، کیونکہ وہ اس کا مذاق اڑاتی رہی ہے۔ اس پر لعنت بھیجتی رہی ہے۔

چٹائی پر اوندھی گری وہ شدید نفرت سے نبرد آزما تھی۔ اگر اس کے ہاتھ پر آزاد ہوتے تو وہ دنیا کو بھسم کر دینے کا اہتمام کرتی۔ اگر اس کا منہ کپڑے میں کسا ہوا نہ ہوتا تو وہ بلند آواز میں چلا کر دنیا کو وحشت زدہ کر دیتی۔ اگر اس کے آس پاس صرف اندھیرا نہ ہوتا تو اس کے واویلے پر حشر بپا ہوتا۔

”اگر میں بددعا دے سکتی تو موسیٰ کو دیتی کہ اس کے دل میں وہ آگ بھڑک اٹھے جو اسے موت سے آشنا تو رکھے لیکن موت عطا نہ کرے۔“

اپنے تنہا ہونے کے یقین نے اس کا سکون تہ وبالا کر دیا۔ نیند میں کئی بار اس کی آنکھ کھلی، کئی بار اس نے خود کو لبنانی گاؤں سے بروکلین میں پایا۔ اندھیرے کی زیادتی اسے بار بار جھنجھوڑتی رہی۔

”ہم جو اچھے عمل کرتے ہیں وہ روشنی میں ڈھلتے جاتے ہیں، پھر یہ روشنی موت کے بعد ہمارے ساتھ رہتی ہے۔ سینبل موت کے بعد میرا سفر اندھیروں کی ہمراہی میں گزرنے والا ہے۔ میں کوشش کر کے بھی اپنے لیے روشنی اکٹھی نہیں کر سکی، لیکن تم تو ضرور کر لیتا۔“

ماں روشن موم لیے اس پر جھکی ہوئی کہہ رہی تھی، وہ ماں جو مر چکی تھی۔



ماں۔
امریکی شہر بروکلین میں طلوع ہونے والا سورج اس دن صبح سے ہی ایسے دل گرفتہ تھا جیسے اسے کسی قبر میں

غروب ہونے کا حکم ملا ہو۔“

وہ گھر آئی تو ماں میز پر سر رکھے ایسے بیٹھی تھی جیسے وہ میز سے راز و نیاز میں مصروف ہو۔ چونکہ ماں کو ہر خاص و عام چیز سے راز و نیاز کرنے کی عادت تھی۔ اس لیے اس نے کسی قدر غصے سے ماں کا دیکھا۔ اسے ہر دوسری چیز کی طرح اپنی ماں سے بھی نفرت تھی۔ بلکہ اسے سب سے پہلی نفرت اپنی ماں سے ہوئی تھی۔ اس کا بس چلنا تو وہ خوں کو گلا گھونٹ کر مار دیتی۔

بچن کا ونٹر پر کھانا کھانے کے لیے پلیٹیں اور چمچ تیار رکھے ہوئے تھے۔ کیا ماں اس انتظار میں تھی کہ وہ آئے اور وہ دونوں مل کر کھانا کھائیں۔ اس نے ایسا سوچا بھی کیسے کہ وہ اس کے ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھ کر کھانا کھائے گی۔ کیا وہ بھول گئی کہ بیروت میں اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اگر وہ بھول بھی گئی ہے تو وہ اسے یاد کرا دے گی۔

برتنوں نے بہت شور کیا مگر ماں نے سراٹھا کر نہیں دیکھا۔ آج سے پہلے ایسا ہوا تو نہیں تھا کہ وہ گھر

آتی تو وہ یوں میز پر سر رکھے اونگھ رہی ہوتی۔ کیا وہ اتنی ہی گہری نیند سو رہی تھی؟ جب سے وہ لبنان سے بھاگ کر امریکہ آئی ہے وہ کبھی گہری نیند نہیں سو سکی، اس کا تو یہ ہی کہنا رہا ہے۔ پھر آج کیسے؟ آج وہ جاب پر بھی نہیں گئی؟ کیوں؟ اس کے ساتھ کھانا کھانے کے لیے!!

کھانا گرم کر کے، پلیٹ اٹھا کر میبل اپنے کمرے میں آگئی اور اپنے کمرے کی کھڑکی کے پٹ میں آڑی ترچھی بیٹھ کر کھانے لگی۔ دو گھنٹے بعد اسے گھر سے باہر جانا تھا۔ الارم لگا کر وہ سو گئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو اس نے حیرت سے الارم کلا راک کی طرف دیکھا۔ وہ بج رہا تھا اور ٹھیک پندرہ منٹ بعد بج رہا تھا۔ الارم ہاتھ میں لے کر اس نے غور سے دیکھا۔ اس نے تو دو گھنٹے بعد کا الارم سیٹ کیا تھا اور الارم پندرہ منٹ بعد ہی بجنے لگا تھا۔ اس نے الارم کلا راک اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔

”اس گھر کی ہر چیز بے کار ہے۔“
دوبارہ اسے نیند نہیں آ سکی۔ اپنی اسانمنٹ کے

لیے اسے کچھ کتابیں چاہیے تھیں۔ اسے بک اسٹور اور لائبریری جانا تھا ورنہ وہ رات تک سو سکتی تھی۔ وہ شاور لینے لگی۔ آدھے گھنٹے بعد شیشے کے سامنے کھڑی ہو کر وہ اپنے بال خشک کر رہی تھی جب دیوار سے زخمی ہو کر گرا ہوا الارم پھر سے بجنے لگا۔ اس بار اس نے الارم اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

”اس گھر میں سب سکون برباد کرتے ہیں۔“

جیب وہ نیچے آئی تو ماں میز پر سر رکھے ویسے ہی سو رہی تھی۔ اسے حیرت تو ہوئی لیکن ماں کے پاس رک کر پوچھنا کہ وہ میز پر سر رکھے کیوں سو رہی ہے اس نے اپنی توہین جانا۔ ماں سے کلام نہ کرنے کا عہد وہ کر چکی تھی اور پوری ایمان داری سے اسے نبھا رہی تھی۔

وہ رات کو واپس آئی تو حیرت انگیز طور پر ماں وہیں میز پر اسی حالت میں بیٹھی تھی۔ گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے ہال کی بتیاں روشن کیں اور کھانے کی میز کے سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ کر ماں کو دیکھنے لگی اور پیر جھلانے لگی۔ میز کے عین سامنے کی دیوار کی

کیل پر لٹکی لکڑی کے دانوں کی تسبیح ہل رہی تھی۔ کھڑکیاں بند تھیں ہوا تھی نہ کوئی ارتعاش پھر وہ تسبیح کیوں ہل رہی تھی؟

”کیا واقعی اس گھر میں میری کی روح بھٹکتی ہے۔“ اس نے تسخّر سے سوچا۔

وہ کچن میں آئی اور اس بار اس نے برتنوں کا استعمال پر شور انداز سے کیا۔ پلیٹ کو گر جانے دیا، گلاس ٹوٹ جانے دیا، چمچے کو پین میں زور سے پٹخا، پھر بھی ماں کا سر میز سے نہیں اٹھا۔

”تو یہ چاہتی ہے کہ میں اسے پکاروں اس سے بات کروں۔ ہونہ! ڈرامہ کر رہی ہے۔“ کھانا نکال کر وہ اوپر چلی گئی۔ کتابیں کھول کر اپنے سامنے پھیلا لیں لیکن پھر کتابوں کے صفحے الٹتے اسے بے انت ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ اسے لگا کہ کوئی بدروح اس کے پاس کھڑی اس کی گردن میں اپنے دانت گاڑ رہی ہے۔ وہ

بھاگتی ہوئی نیچے آئی۔

”ماں! اس نے تھوڑا جھنجھلا کر کہا، لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ کیل پر لٹکتی تسبیح ابھی بھی ہل رہی تھی۔ وہ ماں کی پشت سے اس کے سر کی طرف جھکی اور ایک دم دہشت زدہ ہو کر تیزی سے پلٹی کہ کچن کاؤنٹر پر رکھے کئی برتنوں سے ٹکرا گئی۔ خون کی ایک باریک لکیر ناک سے نکل کر میز پر گر کر جم چکی تھی۔

اس نے آگے بڑھ کر ماں کے کندھے کو ہلایا اور پھر اپنے ہاتھ کو اس کی ناک کے قریب رکھا۔ جس تیزی سے پیچ اس کے منہ سے نکلی تھی ایسے ہی اس کے پیروں سے جان نکلی۔ پہلے وہ میز کے قریب زمین پر گری پھر وہ گرتے پڑتے میز سے دور ہوتی گئی۔

”عدینہ مر گئی۔“

وہ اتنا سہم جائے گی اسے اندازہ نہیں تھا۔

”میں ایسے مرنا چاہتی ہوں کہ میں ہوں اور خدا۔ میری موت کی خبر میرا جسم تو دے، لیکن میری روح نہیں۔ اپنی موت میں مکمل تخلیہ میں چاہتی ہوں۔“

”ماں چلی گئی۔“ مہیبل نے اٹھنے کی کوشش کی اور دیوار کا سہارا لینا چاہا، لیکن وہ اٹھ نہیں سکی۔ اس نے

سستی بیک لکچر



ثمرہ بخاری

قیمت - 300 روپے

مکمل کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

سر اٹھا کر دیکھا، تسبیح اوپر کیل پر موجود تو تھی، لیکن پیشانی کے مخراب کی طرح جامد تھی۔ اس ساری دھوکہ دی پر اس کا جی کھول گیا اور غصے کی زیادتی اور نفرت کی تیزی کی وجہ سے وہ اٹھ کر میز کی طرف آئی۔ سفید بالوں کی لٹیں جو میز کے تختے پر بکھری تھیں کو اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے پرے کیا اور آنکھوں کو دیکھنا چاہا، آنکھیں بند تھیں۔

”دنیا کے نظاروں سے میرا دل اب چکا ہے۔ جب دوسری دنیا میں میری آنکھیں کھلیں تو ان میں وہ بینائی نہ ہو جو میں اس دنیا میں رکھتی تھی۔ جو کچھ میں اس دنیا میں دیکھ چکی ہوں وہ میں اس جہاں میں جاتے ہی بھول چکی ہوں۔“

اب جب اس کی موت کی تصدیق وہ کر رہی چکی تھی تو اس نے اپنی ہمت کو نئے سرے سے مجتمع کیا اور عدینہ کے سر کو اٹھا کر کرسی کی پشت سے لگانا چاہا۔ اس مقصد کے لیے جب اپنا ہاتھ اس نے ماں کو سر کو اٹھانے کے لیے بڑھایا تو اس کا ہاتھ کسی کانغذ سے ٹکرایا۔ اس نے سر کے نیچے ہاتھ ڈال کر کانغذ باہر نکال لیا۔

”کاش خدا کو دھوکا دیا جاسکتا۔ کاش اس سے جھوٹ بولا جاسکتا۔ میری کتنی خواہش ہے کہ میں خدا کے سامنے سوانگ بھر کر جاؤں اور وہ میرا یقین کر لے۔ میں کانغذ پر اس کا نام لکھوں اور اسے اپنے اعمال نامے پر سب سے اوپر رکھ دوں اور پھر اس کے ہر سوال پر میں یہ کانغذ اٹھا کر اس کے سامنے کر دوں کہ یہ ہی میرا جواب ہے۔ میں تو صرف اسے ہی جانتی ہوں، میں نے اسے ہی پڑھا ہے، اسے ہی دیکھا ہے۔ اسے ہی سنا ہے۔ کاش میبیل ایسا ہو جائے، کاش میں اسے دھوکا دے سکوں، کاش صرف ایک کانغذ میرا اعمال نامہ ہو۔ اے اللہ۔“

عدینہ کے ہاتھ سے لکھا۔ ”اللہ“ اب میبیل کے ہاتھ میں تھا۔

”زندگی جس کے حکم سے قائم ہوتی ہے، موت بھی اسی کے حکم سے واقع ہوتی ہے۔ صرف یہ ہی وہ دو حکم

ہیں جن کی تکمیل ہم بلاچون و چرا کرتے ہیں۔ کیا ہی اچھا، وہ میبیل کے ہم باقی کی ادائیگیوں میں بھی ایسے ہی بے مثال ہوں۔“

وہ کچن میں گئی اور برتن اٹھا اٹھا کر دیکھنے اور سونگھنے لگی۔ کیا ماں نے خودکشی کی ہے، زہریا ہے۔ ”میں بہت پہلے خود کو ختم کر لیتی، اگر مجھے معلوم نہ ہوتا کہ زندگی سے انحراف خدا کو کس قدر سخت ناپسند ہے۔ انسان کے کھاتے میں یہ گناہ اسے گوارا ہی نہیں۔“

وہ صوفے پر بیٹھ گئی اور فون ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اسے عدینہ کی موت کی اطلاع دینی تھی۔ اسے اپنے بڑوس میں جانا تھا۔ پھر وہ اوپر جا کر سو جائے گی۔ اگلے دن کفن دفن کے لیے اسے قبرستان جانا ہوگا، پھر وہ کالج چلی جائے گی۔

”موت خدا سے قرب کا امکان ہے، لیکن جو دنیا میں خدا کے قرب کی خاک نہ پاسکے، موت اس کے لیے انعام نہیں۔“

اس نے ڈاکٹر کو فون کیا، پھر مسٹر اینڈ مسز پیام ہیکمی کے گھر جانے کے لیے گھر کے دروازے سے باہر نکلی۔ اس کی اس کارروائی سے بے نیاز عدینہ میز پر ویسے ہی سر رکھے سو رہی تھی۔

”صرف میرا دل جانتا ہے کہ میں نے کسی محبوب کی طرح موت کا انتظار کیا ہے۔ صرف میں یہ جانتی ہوں کہ ہر رات کو میں نے اپنی آخری رات سمجھا ہے۔“

وہ مسز پیام ہیکمی کے گھر کے دروازے کے باہر کھڑی تھی۔

”اندر آ جاؤ میبیل، میں کھانا لگا رہی ہوں۔“ مسز پیام ہیکمی دروازہ کھول کر فوراً ”اندر چلی گئیں۔ وہ پیچھے کھڑی رہ گئی۔

”میبیل!“ اندر سے مسز پیام ہیکمی کی آواز سنائی دی۔ وہ اس کا اندر انتظار کر رہی تھیں پھر انہیں باہر آنا پڑا۔

”تم اندر کیوں نہیں آرہیں؟“ وہ اس کے ایسے

کھڑے رہنے پر حیران تھیں۔
”ماں جا چکی ہے۔“

پلیٹ کو نیپکن سے صاف کرتے مس پام پیکی
کے ہاتھ رک گئے۔

گھر آتے ہی وہ سیدھی اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی
اور کمرے کا دروازہ لاک کر کے بیڈ پر آکر سو گئی۔ ساری
رات وہ سوتی رہی۔ البتہ دوبار اس کی آنکھ کھل گئی۔
ایک بار اس نے کھڑکی میں میری کو کھڑے دیکھا اور
دوسری بار میری اور عدینہ دونوں کو۔ باقی سارا وقت وہ
سوتی رہی۔

”وہ رات لمبی بھی تھی اور ٹھنڈی بھی۔“

صبح اٹھ کر اس نے شاور لیا۔ اس کے کمرے کے
دروازے پر مسز پام پیکی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چٹ
چسپاں تھی جس پر انہوں نے کفن دفن کے بارے
میں لکھا تھا اور یہ کہ وہ ان کے گھر آکر ناشتا کر لے۔ تیار
ہو کر جب وہ ناشتا کرنے کے لیے مسز پام کے گھر جا رہی
تھی تو نیچے کھانے کی میز پر ماں ویسے ہی میز پر سر جھکا کر
بیٹھی تھی فرق صرف اتنا تھا کہ اس نے ”سفید
کپڑے“ پہن رکھے تھے۔

”وہ دن تسلیم شدہ تھا اس انجام کے ہاتھوں جسے
ابتدا سے ہی طے کر دیا گیا تھا۔“



تابوت میں اس نے اس کاغذ کو رکھوا دیا تھا جس
کے لیے ساری عمر اس کی ماں تڑپتی رہی تھی۔ جس پر
سر رکھ کر وہ مر گئی تھی۔ جس کی خاموشی نے اسے کہیں
کا نہیں چھوڑا تھا۔ جس سے وہ ڈرتی تھی۔ جس سے
منہ چھپانے کے لیے اس نے ہر اہتمام کیا۔ جس کے
لیے اس نے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ پھر بھی وہ اسے
نہیں مٹا۔ اللہ۔۔۔

”جو مشکل سے بھی نہ ملے اسے آسانی سے چھوڑ
دینا چاہیے ماں۔“

”تمہیں ایسی بات نہیں کرنی چاہیے سیبل مجھے
خود سے خوف زدہ نہ کرو۔ جس دائرے سے میں نکل

چکی ہوں اس دائرے میں تمہیں دیکھنا چاہتی
ہوں۔ اگر اولاد صالح ہو تو وہ اگلے جہاں میں والدین کے
لیے آسانیوں کی وجہ بنتی ہے۔“

”والدین صالح نہ ہوں تو اولاد کیسے ہوگی ماں۔ کچھ
انسان تاریخ دہراتے ہیں اور کچھ گناہ۔“

”تمہیں گناہ کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے
سیبل اللہ کو یہ پسند نہیں۔“

”آپ کو بھی اللہ کی پسند ناپسند کے بارے میں
نہیں سوچنا چاہیے۔ اللہ کو آپ پسند نہیں۔“

”میں اسے پسند نہیں بھی ہوں تو بھی میں اسی کا بندہ
رہوں گی۔ میرے پاس یہ اعزاز ہمیشہ رہنے والا ہے۔“

”اعزاز کتنا بھی بڑا کیوں نہ ہو ماں۔ وہ انعام نہیں
ہوتا۔“

”جو اعزاز اللہ کی طرف سے ہو اس سے بڑھ کر
کوئی انعام نہیں ہو تا سیبل۔۔۔“

”میری ماں ان ہی اعزازوں اور انعاموں کے لیے
پاگل ہو گئی۔ وہ جس چیز پر یقین رکھنے کے لیے مجھے کہتی

اس پر اپنا ہی یقین کھودیتی۔ پتا نہیں یہ کون سا کیرا ہے
جو انسانوں میں رنگ آتا ہے اور وہ اللہ اللہ چلانے

لگتے ہیں۔ میں نے نفرت کی ہے ایسے لوگوں سے۔۔۔
میں نفرت کروں گی ایسے لوگوں سے۔۔۔“ قبرستان سے

آنے کے بعد اس نے اپنی ویڈیو بلا گنگ کی۔
”یوں اللہ اللہ چلانے والے ابنارمل لوگوں سے

میں بے زار ہوں۔ یہ اپنا جینا تو حرام کرتے ہی ہیں
ساتھ دوسروں کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔ میں ابھی ایسی

ہی ماں کو قبرستان چھوڑ کر آئی ہوں۔ اب مجھے گھر کا
کچھ حساب کتاب دیکھنا ہے۔ ماں کی ڈائری کا کہنا ہے

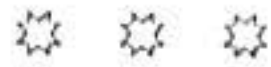
کہ ان کی محفوظ کی گئی رقم میرے کام آجائے گی۔
انہوں نے ڈائری میں میرے لیے کافی ہدایات لکھی

ہیں۔ یعنی انہیں اپنی موت کا علم تھا؟ جس عورت کو
ساری زندگی اپنی معافی کا علم نہیں ہو سکا اسے اپنی

موت کا کیونکر حکم ہو سکتا ہے؟ جس پر زندگی مشکل
سے بھی مہربان نہیں ہوئی موت آسانی سے کیسے

مہربان ہو گئی؟ وہ لمبا عرصہ زندہ رہنے کا عذاب بھگتی

رہی پھر اس نے موت کی صورت رحم کی چاہ ہی کیوں کی؟



”رحم۔“ میری وہ دوائے جسے حاصل کرنے کے لیے میں کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

”میں سمجھی نہیں ماں۔!“

”سمجھ جاؤ گی یہ بتاؤ سہیل! کیا تم میرا ایک کام کر سکتی ہو؟“

”آپ مجھے اسکول کا ہوم ورک کرنے کے لیے نہیں کہیں گی۔ میں ہفتے کے چھ دن یہ کام کر کے تھک جاتی ہوں آج چھٹی ہے۔“

”یہ اسکول ورک نہیں، مام ورک ہے، کرو گی نا؟“

”ماں! میرے کلاس فیلوز کہتے ہیں کہ آپ کی شکل وچ (جادو کرنی) سے ملتی ہے۔“

”ہر گناہ گار کی شکل وچ سے ملتی ہے۔ گناہ وہ جادو ہے جو ہماری شکلیں بگاڑتا ہے۔ مجھے خوشی ہے میری اصلیت نمایاں ہو رہی ہے۔ جس آنکھ سے فرشتے مجھے دیکھتے ہیں اسی آنکھ سے بچے مجھے دیکھ رہے ہیں۔“

”مجھے برا لگتا ہے میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔“

”مجھے یہ برداشت ہے۔ مجھے وچ کھلائے جانے پر کوئی اعتراض نہیں یہ ایک بہتر نام ہے۔“

”میں تو ان کی ماں کو وچ نہیں کہتی جبکہ مجھے بھی ان کی شکلیں پسند نہیں۔“

”تمہیں خاموش رہنے کی عادت اپنانی چاہیے۔ تم بڑی ہو جاؤ گی تو سب سمجھ جاؤ گی۔“

”آپ بڑی ہیں آپ سب سمجھ چکی ہیں؟“

”میں بری ہوں اور اسی لیے میں سب سمجھ چکی ہوں۔ کیا تم جانتی ہو کہ میں بیمار ہوں؟“

”نہیں۔ آپ ٹھیک ہیں۔“

”میں بہت بیمار ہوں سہیل بہت زیادہ۔“

”آپ کو ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے۔“

”ڈاکٹر کے پاس ہی جانا چاہتی ہوں، لیکن مجھے بہت شرم آتی ہے۔ میرا دل خوف سے کپکپانے لگتا ہے۔“

میرا ڈاکٹر مجھے سب کچھ کرتے دیکھ چکا ہے۔ اب اس کے سامنے کس منہ سے جاؤں سہیل؟“

”آپ مجھے ساتھ لے کر جائیے گا۔ آپ کو ڈر نہیں لگے گا۔“

”میں تمہیں اس کے سامنے بھیجنا چاہتی ہوں۔“

”آپ کو بھی جانا ہو گا نا ماں۔ آپ ٹھیک نہیں ہوتا چاہتیں کیا؟“

”چاہتی ہوں، ٹھیک ہی تو ہونا چاہتی ہوں، ٹھیک کرو گی مجھے؟“

”میں آپ کو ٹھیک کرنے کے لیے سب کروں گی۔ میں ڈاکٹر کے پاس جاؤں گی۔ آپ کے لیے دوائے کر آؤں گی۔“

عدینہ نے اس کے سر پر اسکارف باندھ دیا اور پھر اس کے ہاتھ دعا کی صورت اٹھا دیے۔

”کہو اے اللہ میری ماں عدینہ کو معاف کر دے۔“

”اے اللہ ماں کو معاف کر دے۔“

”اس عدینہ کو جس نے اپنے شوہر کے منہ پر کالک تھوپی اور اپنے بچوں کو ذلت کی زندگی گزارنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔ اللہ معاف کر دے کہ اس نے اپنے باپ کی عزت کے سب ہی پردے چاک کیے اور ماں کی شفقت سے بھرے سب ہی جام الشہیے۔“

”ڈاکٹر اللہ معاف کر دیں ماں کو۔“ سہیل دہرانے لگی۔

”اور کہو۔“ اے اللہ میری ماں نے یعقوب کے ساتھ کیے گئے عہد میں خیانت کی۔ خیانت کی۔ خیانت کی۔ وہ ایمان داری سے اپنی اس خیانت کو تسلیم کرتی ہے۔ اور خدا سے ”معافی“ کی درخواست کرتی ہے۔

”ماں آپ سے معافی کی درخواست کرتی ہے اللہ ماں کو رحم کی دوائے دے۔“

”یا مین کے لیے اس نے سب کو بھلا دیا۔ یا مین کے لیے اس نے سب کو چھوڑ دیا۔ اے اللہ اب تو اسے نہ بھلا دینا۔ اب تو اسے نہ چھوڑ دینا۔“

”میری ماں کو چھوڑ نہ دینا اے اللہ۔ میری ماں کو

مت بھولیے گا۔۔۔ پلیز۔۔۔“ میبل نے سب دہرا دیا۔
چھوٹی عمر سے اس نے یہ سب باقاعدہ دہرانا شروع
کر دیا۔ پھر اسے یہ ہر رات کرنا پڑتا۔ اکثر دن میں اور
رات میں تو کئی کئی بار۔۔۔ اسے ہر چاکلیٹ، ٹیک، آئس
کریم، گڑیا، کپڑے، جوتے اور ایسی ہی دوسری چیزیں
حاصل کرنے سے پہلے ماں کو یہ ”دعا“ مہیا کرنی پڑتی۔
راتوں کو گہری نیند سے بے دار ہوتا پڑتا، ماں کی گود میں
بیٹھنا پڑتا، سر پر اسکارف باندھ کر ہاتھ اٹھا کر دہرانا
پڑتا۔

”مجھے بہت خوف آرہا ہے میبل! دعا کرو۔ خدا
سے اپنی ماں کے لیے رحم کی التجا کرو۔“ رات کے کسی
پہرماں اسے جگا کر سینے سے لگالیتی۔

رات کے اسی پہرہ خدا سے ماں کے لیے رحم کی
التجا کردیتی۔

”میری قبر میں بہت اندھیرا ہے“ میں نے ابھی دیکھا
ہے۔ میری لیے روشنی لے آؤ میبل!“
دعا کر کے وہ ماں کے لیے روشنی مانگ لیتی۔

”میں روز حشر سے بھاگتی پھر رہی ہوں۔ منہ
چھپانے کے لیے مجھے کچھ میسر نہیں۔ میری پردہ پوشی
کے لیے ہاتھ اٹھاؤ میبل۔“

”وہ ماں کی پردہ پوشی کے لیے ہاتھ اٹھا دیتی۔ دس
سال کی عمر تک وہ اس ڈیوٹی کو درد سر کی طرح دہرائی
رہی۔ وہ چڑ جاتی، غصہ کرتی، ماں سے تکرار کرتی،
کمرے میں بند ہو جاتی، چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتی، گھر
سے باہر چلی جاتی ورنہ اپنا منہ سی لیتی۔“

”بس کرو ماں! میں تھک گئی ہوں۔“
”تم نے وعدہ کیا تھا، تم میرے لیے ڈاکٹر کے پاس
جاؤ گی، تم میری دوائے کر آؤ گی۔“ ماں تڑپ تڑپ کر
اس کے سامنے روتی۔



”روشنی اگر کہیں تھی تو وہ اندھیرے کی دہلیز کے
اس پار کھڑی تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔“
لکڑی کا کواڑ کھول کر ام ہانی اندر آئی۔ موم بتی کو

اس نے ایک طرف رکھ دیا اور بیک کرا سے دیکھنے
لگی۔ نقاہت سے میبل نیم جان تھی۔ اس کا سر اپنی
گود میں رکھ کر اس کے منہ پر بندھے کپڑے میں انگلی
پھنسا کر وہ پانی کی دھار کو اس کے منہ کے اندر ٹپکانے
لگی۔ پانی منہ میں تو کیا جاتا، البتہ اس کے سارے
کپڑے بھگو گیا۔ جلدی سے پہلے اس نے خشک
کپڑے سے پانی صاف کیا، پھر وہ ٹیلے کپڑے سے اس کا
منہ صاف کرنے لگی۔ یہ یہاں اس کا دوسرا دن تھا۔
کچھ دیر بعد وہ واپس آئی اور اسے اٹھا کر دیوار کے
سہارے بٹھا دیا۔

”تمہیں بھوک لگی ہوگی، میں تمہارے لیے کھانا
لائی ہوں۔ میں پہلے بھی آئی تھی، لیکن تم اٹھنے کے
لیے تیار ہی نہیں تھیں۔“

میبل نے غصے سے سر کو جھٹکا اور بڑھ کر اسے
اپنے سر کی ٹکرماری چاہی لیکن وہ اس کی پہنچ سے دور
چلی گئی۔

”میں تو تمہیں صرف کھانا کھانا چاہتی ہوں۔“ وہ
بے چارگی سے اسے دیکھنے لگی۔

میبل نے اسے ٹکرمارنے کا خیال دل سے نکالا
نہیں۔

”تمہارا غصہ مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ کیا
میں ظالم ہوں۔ میں بے چین ہو جاتی ہوں۔“

اس کی گردن میں اپنے دانت گاڑ کر میبل اسے
بتا سکتی تھی کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون۔۔۔

”مجھے موسیٰ کا انتظار تھا، لیکن وہ آج بھی نہیں آیا۔
تم کھانا کھاؤ۔“ چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر وہ اس کے
منہ میں ڈالنے لگی اور شہادت کی انگلی کی طرح اس نے
دوسری انگلی کو بھی اپنے دانتوں میں اس سختی سے لے
لیا کہ اگر وہ انگلی کٹی نہیں تھی تو بھی ساری زندگی کے
لیے بے کار ہو چکی تھی۔

اس بار ام ہانی کھڑی ہو کر اپنی انگلی دیکھنے لگی۔ اس
کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ”تمہاری شکر گزار ہوں
میں۔“ کہہ کر وہ کتنی ہی دیر تک کچھ اور نہیں بول
سکی۔

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ کوئی انجان لڑکی آئے گی اور وہ مجھے میرے گناہ یاد کروائے گی۔ ایسے لوگ خاص ہوتے ہیں۔ تم بھی میرے لیے خاص ہو۔“ اتنا کہہ کر اس نے برتن سمیٹے اور موم بتی لے کر چلی گئی۔ ام ہانی کے خون کا ذائقہ اس کے دہن میں اترنے لگا۔ تو اس نے انسانی خون بھی پی ہی لیا۔ موسیٰ کی بہن کا تو موسیٰ کا کیوں نہیں۔ اچھا ہوتا اگر وہ موسیٰ کے منہ ہی نہ لگتی۔ چھوٹے شہروں اور گاؤں کے لوگ بہت شدت پسند ہوتے ہیں۔ یہ جتنے اچھے ہوتے ہیں اتنے ہی اوتھے۔ جتنے مومن اتنے ہی کافر۔

وہ ایک ہفتہ پہلے فریڈرک کے ساتھ لبنان کے پہاڑی گاؤں کزاسیہ آئی تھی۔ گوا سے لبنان سے نفرت ہو چکی تھی، کیونکہ یہیں سے اس کی ماں اپنے گھروالوں کو ذلیل کر کے بھاگی تھی اور یہیں سے اسے بھی لاتیں گھونے مار کر بھگا دیا گیا تھا، لیکن فریڈرک کو اپنے کام کے لیے یہاں آنا تھا اور سیبیل اسے آنے سے روک نہیں سکتی تھی۔ وہ خود کو بھی اس کے ساتھ آنے سے روک نہیں سکی تھی۔ ایک وہی تو تھا جسے وہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی۔

”تم مجھے بور کر رہے ہو، کہاں لے آئے ہو مجھے؟“
”تم نے وعدہ کیا تھا، تم کوئی سوال نہیں کرو گی۔“
”میرا خیال تھا تم بیروت شہر میں رہو گے، پر تم تو ان پہاڑوں میں آگئے ہو۔“

”میرا کام ان ہی پہاڑوں میں ہے۔۔۔“
”ایسے ترقی یافتہ وقت میں پہاڑ ابھی بھی کام دیتے ہیں۔۔۔“ وہ ہنس دی، لیکن وہ خاموش رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کہاں خاموش رہنا ہے۔ یہ اس کی اچھی عادت تھی جو اس وقت بری ہو جاتی، جب سیبیل اسے سننے کے لیے بے تاب ہو جاتی تھی۔ اس نے ساری زندگی اپنی ماں کی باتیں اتنی زیادہ سنی تھیں کہ اب وہ کسی اور کو سننا چاہتی تھی۔ جبکہ فریڈرک کبھی کبھی اتنا خاموش ہو جاتا تھا کہ سیبیل کو باقاعدہ اس سے درخواست کرنی پڑتی تھی کہ وہ چند جملوں کو استعمال کرنے کی زحمت ضرور کرے اس سے اسے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

وہ مسکرا دیا۔ ”نقصان مجھے ویسے بھی کبھی نہیں ہوگا۔“
”تھوڑا بہت نقصان تو ہم سب کو کہیں نہ کہیں ہو ہی جاتا ہے۔“
”مجھے نہیں ہوگا۔ میں اپنے نقصان کو فائدے میں بدلنا جانتا ہوں۔“

”میں بھی سیکھنا چاہوں گی ایسا کرنا۔“
”اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ رہنا ہوگا۔ میں باقاعدہ لیکچر نہیں دوں گا۔ تمہیں خود مجھے نوٹس کرنا ہوگا، ٹھیک ہے؟“
”ٹھیک ہے۔۔۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔

وہ اس کا کالج فیلو تھا، جس سے اس کی تھوڑی بہت ہیلو ہائے تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد ایک دن وہ اس کے پاس آیا اور پوچھنے لگا۔ ”ٹھیک ہونا تم سیبیل؟“
”ہاں!“ اس نے فوراً کہا۔ اسے اس کا یوں آنا اور ایسے پوچھنا بہت اچھا لگا تھا۔ پھر وہ خود اس کے پاس جانے لگی۔ وہ چائے کافی ایک ساتھ پینے لگے۔ ایک دو بار وہ اس کے ساتھ لنچ پر بھی گئی تھی۔ کسی لڑکی نے اس سے پوچھا۔ ”کیا تم فریڈرک کو ڈیٹ کر رہی ہو۔“
تو اس نے تردید نہیں کی تھی۔ وہ اسے پسند کرنے لگی تھی، جسے کم ہی لوگ پسند کرتے تھے۔

فریڈرک کے بارے میں سب جانتے تھے کہ وہ اپنے سوتیلے باپ کی وجہ سے چھوٹی عمر سے ہی گھر سے بھاگ آیا تھا۔ البتہ کچھ کا کہنا تھا کہ اس نے اپنی سوتیلی بہن کو اتنا زیادہ زخمی کر دیا تھا کہ اسے گھر سے نکال دیا گیا۔ اسے کالج سے بھی نکال دیا جاتا، اگر وہ کچھ لوگوں کی ہمدردیاں نہ خرید چکا ہوتا۔ وہ کیا کام کرتا ہے، اس بارے میں کافی طالب علم کافی کچھ جانتے تھے۔ خاص کر یہ وہ منشیات فروش ہے اور خفیہ طور پر خاص لوگوں کی جاسوسی کرتا ہے، پھر انہیں بلیک میل کرتا ہے۔ ایک دن سیبیل نے مذاقاً اس سے پوچھ لیا۔

”کیا واقعی میں تم ڈرگ سپلائر ہو؟“
”ہاں!“ اس نے اطمینان سے کہا۔
”تمہیں ڈر نہیں لگتا؟“ سیبیل کو حیرت ہوئی بھی تو

اس نے ظاہر نہیں کیا۔

”کیسا ڈر۔۔۔؟“

”پولیس سے۔۔۔ موت سے۔۔۔؟“

”پولیس کو میں دوست رکھتا ہوں اور موت میں اپنی جیب میں رکھ کر گھومتا ہوں۔“

”تم جیل چلے جاؤ گے؟“

”جیل جانا میرے لیے اچھا رہے گا“ میرا کاروبار بڑھے گا اور میں نامی گرامی ڈیلر بن جاؤں گا۔“

”لیکن ڈر گز ہی کیوں؟“

”ڈر گز ہی کیوں نہیں؟“

”اس پر پابندی ہے۔“

”تمہیں معلوم ہے کتنے لوگ اسے یوز کرتے ہیں؟“

جب اس کے اتنے زیادہ یوزر ہیں تو ہم اس کا باقاعدہ بزنس کیوں نہیں کر سکتے۔ مجھے اس کے استعمال پر لگی پابندی کی سمجھ نہیں آتی۔ جب یہ کسی بھی سوفٹ ڈرنک سے زیادہ استعمال کی جاسکتی ہے تو اسے سوفٹ ڈرنک کی طرح سیل کیوں نہیں کیا جاسکتا۔“

”تم بلیک میلنگ بھی کرتے ہو؟“

”کبھی کبھی تبدیلی کے لیے۔۔۔“ ہنس کر اس نے سر

کو پیچھے کی طرف جھٹکا۔

”تمہیں یہ ڈر نہیں ہے کہ میں کسی کو بتا دوں گی؟“

”نہیں!“ وہ ہنسا۔۔۔ ”تم بھی میرے جیسی ہو

سیپل۔۔۔ مجھ جیسی نہ ہوتی تو میرے ساتھ بھی نہ

ہوتی۔“

”کیسی ہوں میں۔۔۔“

اس نے قہقہہ لگایا۔ ”تمہیں بھی ہر ایک سے ہر

چیز سے نفرت ہے۔ میری طرح تمہیں بھی کسی کی پروا

نہیں ہے‘ قانون کی۔ مذہب کی۔ اور۔۔۔ خدا کی

بھی۔“

”خدا کی بھی۔۔۔“ اس نے زیر لب دہرایا۔

”ہاں خدا کی بھی۔ کیا میں نے غلط کہا؟“ وہ پوچھ رہا

تھا۔

نہیں! اس نے اپنی ماں کی سرگوشیوں سے جان

چھڑا کر کہا۔

ایک صرف فریڈرک ہی ایسا تھا، جس کے ساتھ وہ بہت مطمئن رہتی تھی۔ وہ آزاد خیال اور جرات مند تھا، تو وہ بھی ایسی ہی ہونا چاہتی تھی۔ اسے اس سے اپنا ماضی چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے یہ ڈر بھی نہیں رہتا تھا کہ وہ اسے خطلی ہونے کا طعنہ دے گا۔ وہ اس کی باتوں پر کیوں اور کیسے جیسے سوال نہیں اٹھاتا تھا۔ کالج میں نشر ہونے والا اپنا ویڈیو کلپ اس نے آیا۔۔۔ دن اسے دکھانا چاہا۔

”تم نے دیکھا ہے اسے؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”میں نے ضرورت نہیں سمجھی سیپل۔۔۔“ کینتھن کی میز کے اوپر بیٹھے اپنی انگلیوں کو اس کی ٹھوڑی سے گال تک لے جاتے اس نے کہا۔

”تم اب دیکھ سکتے ہو۔“

سیپل کا ہاتھ اس نے اپنے ہاتھ میں لیا اور اسے تھپکا۔ ”دیکھو سیپل! یہ تمہاری زندگی ہے اور تمہارا اس زندگی پر پورا پورا حق ہے۔ تم وہ سب کرو جو کرنا چاہتی ہو حتیٰ کہ اگر تم کسی کو قتل کرنا چاہتی ہو تو وہ بھی کرو۔ یہ مت سوچو کہ دوسرے کیا کہیں گے‘ قانون کیا کہتا ہے۔ کوئی بھی قانون ہم سے ہمارا حق نہیں چھین سکتا۔ ہماری خوشی پر ہماری پسند کا اطلاق ہونا چاہیے بس۔۔۔“

”تم میری خوشی کے لیے کیا کر سکتے ہو؟“

”میں تمہاری خوشی کے لیے کچھ نہیں کروں گا‘

البتہ اگر تم میری خوشی ہو تو میں بہت کچھ کر سکتا

ہوں۔“

”تم خود غرض ہو۔“

”تم کبھی ہو جاؤ۔۔۔ زندہ رہو اپنی پوری سانسوں کے

ساتھ‘ آدھی پابندیوں اور پورے قانون کے ساتھ

نہیں۔“

وہ اس کی بات اچھی طرح سے سمجھ چکی تھی اور

اسے بھی۔۔۔ دونوں میں ایک چیز مشترک تھی کہ اگر وہ

اپنی ماں کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتی تھی تو اسے بھی اپنی

ماں کا تذکرہ پسند نہیں تھا۔ وہ آج کی بات کرتا تھا‘ آج

ابھی کی۔ وہ گزرے کل اور آنے والے کل کی بات

میں کہتی۔

”تم نے یہ بھی کہا تھا کہ تمہاری کوئی دعا قبول نہیں ہوتی۔“ وہ چلا اٹھی۔



پہاڑی گاؤں کزاسیہ چھوٹا تھا، لیکن خوب صورت تھا۔ گاؤں کے واحد ہوٹل میں ان کا قیام تھا جس کی عمارت ایسے غار سے مشابہ تھی جسے پتھروں اور لکڑی سے ہوٹل بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ غار پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا جس کے سامنے سے ایک ہی سڑک نکلتی تھی۔ وہ رات کو یہاں پہنچے تھے اور فریڈرک آتے ہی کہیں چلا گیا تھا۔ اسے اکیلے ہی کھانا کھانا پڑا۔

صبح اس نے فریڈرک کے کمرے میں جھانکا تو وہ پھر سے جا چکا تھا۔ وہ یہاں اپنے کام کے لیے آیا تھا اسے گھمانے نہیں۔ وہ اسے پہلے ہی آگاہ کر چکا تھا کہ وہ اسے وقت نہیں دے سکے گا اسے بہت سے لوگوں سے ملنا ہے اور لمبے لمبے سفر کرنے ہیں۔ اسے آئندہ زندگی فریڈرک کے ساتھ ہی گزارنی تھی۔ وہ ابھی سے ان سب باتوں کی عادی ہونا چاہتی تھی۔ ناشتے کے بعد وہ ہوٹل کی نیم تاریک راہ داری سے چل کر باہر آ رہی تھی کہ اسے آواز سنائی دی۔

”گناہوں کی زمین پر دیکھو تو کون اترا ہے۔ خدا کا پیارا موسیٰ۔ کیا کلام کے لیے تمہیں بھی کوئی کوہ طور مل گیا ہے جو اچانک غائب ہو جاتے ہو۔“

”ماں نے بلایا تھا بیمار تمہیں وہ۔“

”ہمارا کاروبار بھی کافی ہے۔ برکت کے لیے دعا کرتے رہنا۔“

”خدا رزق کے ذرائع میسر کرے۔“ (آمین)

خدا کے پیارے کو دیکھنے کے لیے وہ رک چکی تھی اب وہ اس کی طرف پلٹی۔ مغربی مصوروں کے موقلموں سے فن پاروں میں اتری عیسیٰ کی شبیہ جیسا تھا وہ موسیٰ۔ مٹیالے سرمئی رنگ کا موٹے کپڑے کا کرتا پہنے وہ بھٹیڑوں کے ریوڑ کا رکھوالا لگ رہا تھا۔ ہوٹل کے ایک نیم اندھیرے کمرے میں کچھ سامان

سوچنے اور سننے کا قائل ہی نہیں تھا۔ اسے یہ تک گوارا نہیں تھا کہ اس سے پوچھا جائے کہ کل وہ کیا کر رہا ہے۔ پہلے سیبل اس کے ساتھ ساتھ رہا کرتی تھی پھر وہ سیبل کو اپنے ساتھ ساتھ رکھنے لگا تھا۔ ایک دن شاپنگ کے دوران اس نے کھڑے کھڑے ایک انگوٹھی لی اور اسے سیبل کی انگلی میں پہنا دیا۔

”مجھے یہ رنگ اچھی لگ رہی ہے اور تمہاری انگلی میں اچھی لگ رہی ہے، تمہیں کیسی لگی؟“

سیبل نے اپنے دل کو انگوٹھی پہنی انگلی میں دھڑکتے سنا۔ ”بہت اچھی۔“

”ہم دونوں ایک دوسرے کو سوٹ کرتے ہیں۔“ انگوٹھی سمیت اس نے اس کی انگلی کو اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟ مختصر ہی سی۔ سیبل چاہتی تھی وہ اس سے اپنی محبت کا اقرار کرے۔

”نی الحال محبت میں صرف خود سے کرتا ہوں۔“ اور مجھ سے۔۔۔؟

”تم سے بھی کرنے کی کوشش کروں گا۔“ وہ مسکرا دیا۔

”میں تمہارا کام نہیں ہوں فریڈرک! جس کے لیے تم کوشش کرو گے۔“

وہ مسکرا دیا۔ ”مجھے شکایات پسند نہیں، تم میری رنگ واپس کر سکتی ہو۔“

وہ بھی مسکرا دی۔ ”یہ اب میری ہے میں اپنی شکایت واپس لے سکتی ہوں۔“

اس بار اس نے قہقہہ لگایا۔ ”محبت نہیں، لیکن میں تمہاری ایسی باتوں کو پسند کرتا ہوں، تم مجھے اچھی لگتی ہو۔“

”تم بھی وہ واحد انسان ہو جو مجھے اچھے لگے ہو۔“ سیبل انگوٹھی پر انگلی پھیرنے لگی۔

اکثر سیبل کو اپنی ماں موم بتی لیے گھر میں گھومتی ہوئی دکھائی دیتی۔

”میں نے تو دعا کی تھی کہ خدا تمہیں میری طرح بھٹکنے سے بچالے۔“ وہ اس پر جھک کر اس کے کان

نکال نکال کر وہ باہر رکھ رہا تھا۔ جب وہ سیبل کے قریب سے گزرنے لگا تو سیبل نے اس کا راستہ روک لیا اور تسخّر سے اسے دیکھنے لگی۔ کریٹ ہاتھ میں لیے وہ سیبل کی رکاوٹ میں پھنس کر رہ گیا۔

”تو تم ہو خدا کے پیارے جسے ڈھونڈنے کے لیے میری ماں مجھے بھیجا کرتی تھی۔“
وہ اسے ایسے دیکھنے لگا جیسے وہ اس کے ریوڑ کی کوئی بھیڑ ہو۔

”کوئی عیسیٰ جو اس کے زخموں کو مندمل کر دیتا کوئی موسیٰ جو اس کے لیے خدا سے کلام کرتا۔“
”السلام علیکم! اس نے معصومیت سے کہا۔

”جب تک وہ زندہ رہی خدا نے تمہیں چھپائے رکھا تاکہ تم اس کی مدونہ کر سکو۔“ اس کی ہنسی آتش ہو گئی۔

”میں تم پر سلامتی بھیج رہا ہوں۔“
”میں تم پر لعنت بھیجتی ہوں۔“ اس نے اس قدر چلا کر کہا کہ ہوٹل کا عملہ اپنی اپنی جگہ پر رک کر اسے دیکھنے لگا۔

”تمہارا رویہ حیران کن ہے کیا میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں؟“ کریٹ کو نیچے رکھ کر اس نے مسدوب ہو کر پوچھا۔

”میری ماں مر چکی ہے اور مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ حقارت سے کہہ کر وہ آگے بڑھنے لگی۔

”کیا تم بھی مردہ ہو چکی ہو؟“
تیز تیز قدموں سے باہر کی طرف جاتی وہ رکی۔ چھوٹے گاؤں کے آدمی کی جرات نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ وہ سوال کیسے اٹھا سکتا ہے؟ وہ اس کی پشت پر بولنے کی جرات کیسے کر سکتا ہے؟ جو زندہ اس کے سامنے جلال دکھا گئی ہے اس سے مردہ ہونے کا کیسے بوجھ سکتا ہے؟

”اگر میں بھی مردہ ہو چکی ہوں تو؟“ چمڑے کے اونچے جوتوں میں ٹھک ٹھک کرتی وہ واپس اس کے قریب آئی اور اپنی آنکھوں کا طیش اس پر الٹ دیا۔

”حکمتوں میں سے بہترین حکمت سے اللہ تمہیں حیات عطا کرے۔“ (آمین) کریٹ کو زمین سے اٹھا کر وہ چلا گیا۔

”مجھے تمہاری دعا نہیں چاہیے۔“ وہ اس کی پشت پر چلائی۔

”دعا سب کو چاہیے ہوتی ہے۔“ اس نے پلٹے بغیر کہا۔

”مجھے کیا چاہیے اور کیا نہیں یہ بتانے والے تم کون ہوتے ہو۔“
”موسیٰ۔“

غصہ شدید ناپسندیدگی کے احساس میں بدلنے لگا، لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے خود ہی موسیٰ پر حملے میں پہل کی تھی اور جیسے اس معمولی آدمی کے منہ لگی تھی۔ اسے کم سے کم اپنے امریکی پاسپورٹ کی عزت کا ہی خیال کرنا چاہیے تھا۔

پھاٹوں پر گھومنے کے بعد جب وہ تھک گئی تو ہوٹل میں سچ کرنے کے لیے آگئی۔ فریڈرک کا شام تک واپس آنے کا ارادہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کا فون بھی بند تھا۔ جب وہ کوئی خاص کام کرتا تھا تو اپنا ذاتی نمبر بند کر دیتا تھا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ پھر سے باہر آگئی اور دیر تک ادھر ادھر گھومتی رہی۔ راستے میں اسے پھر موسیٰ نظر آیا۔ وہ سڑک کے کنارے درختوں کے جھنڈ کے نیچے کباب لگا کر کھڑا تھا۔ اس کے دائیں طرف پہاڑی نالہ بہہ رہا تھا۔ چھوٹا سا میز تھا جس پر اس نے اپنا ”کباب خانہ“ کھول رکھا تھا۔ ہاتھ میں چھوٹا سا قرآن تھا جسے وہ پڑھ رہا تھا۔ کوئی کباب لینے آتا تو وہ قرآن کو جیب میں رکھ کر کباب بنا کر دینے کے بعد جیب سے قرآن نکال کر پھر سے پڑھنے لگتا۔ استہزائیہ انداز میں ہنستے ہوئے وہ اس کے پاس آئی۔
”کتنے کے ہیں کباب؟“ وہ صبح والی بات کے اثرات کے اس کے چہرے پر دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اسے مزید زنج کرنے آئی تھی۔

موسیٰ آیت ختم کر کے جواب دینا چاہتا تھا کہ اس نے گردن کو خم دے کر بورڈ پر لکھی قیمت پڑھ لی۔

”اتنے ستے“ ایک دم اس کے منہ سے نکلا۔

”میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔“

”یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تمہارے لیے خدا ہی کافی ہے؟“ پہلے قہقہہ لگایا پھر کہا۔

”میں اللہ کو کافی اور ناکافی نہیں بنا سکتا وہ پیمانوں سے بالاتر ہے۔“

”اوہ! تم تو واقعی خدا والے نکلے۔“

”یہ کہنا ٹھیک نہیں۔“

”کام کرتے ہوئے قرآن پڑھنا اتنے ستے کباب بیچنا اور ایسے گھسے پٹے لباس میں ملبوس رہنا خدا کا پارا نظر آنے کے لیے تم نے تو سارا اہتمام کیا ہوا ہے۔“

”تمہیں کس چیز نے یوں مجھ سے اتنی نفرت کرنے پر مجبور کر دیا ہے؟“ قرآن کو بند کر کے وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”مجھے خدا کے پیاروں سے نفرت ہے۔“

”پھر تو تمہیں خود سے بھی نفرت کرنی چاہیے۔“

”مجھے خدا کا پیارا بننے میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔“

”تمہیں اپنا پیارا بنانے کا ارادہ ضرور خدا کا ہو گا۔“

”اوہ! تو تم خدا کے ارادوں کے ترجمان ہو؟“

وہ مسکرا دیا۔ ”تم بھی بن سکتی ہو۔“

”تم تو مجھے خدا کی طرف سے جاب بھی آفر کر رہے ہو؟“

اس بار وہ خود کو کھل کر مسکرانے سے روک نہیں سکا اور اس نے ہاتھ میں پکڑے قرآن کے پیچھے اپنا منہ چھپا لیا۔

”تم میرا مذاق اڑا رہے ہو؟“ اسے اس کی مسکراہٹ زہر لگی۔

”میں نے ایسا نہیں کیا۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا۔

”تم ہنسے کیوں؟“

”میں چھوٹا تھا تو جتنے لوگ نماز پڑھتے تھے میں ان سب سے حسد کرتا تھا۔ میں چاہتا تھا صرف میں ہی نماز پڑھوں، صرف میں ہی خدا کی عبادت کروں۔ کوئی اور کیوں کرے؟ کوئی اور نماز پڑھے گا تو خدا اس کی طرف متوجہ ہو گا۔ میں چاہتا ہی نہیں تھا کہ میرے علاوہ خدا

کسی اور کو دیکھے، کسی اور کو سنے، کسی اور پر بھی توجہ دے۔ وہ صرف میرا ہو، صرف میرے پاس ہو۔ وہ میرے علاوہ کسی کی سنے بھی نہ۔ اسے میری ہی باتیں اچھی لگیں، وہ صرف میری ہی باتوں کے جواب دے۔ تم بھی یہ ہی چاہتی ہو نا کہ خدا صرف تم پر ہی توجہ دے۔ وہ صرف تمہارا ہی رہے۔ تم مجھ پر کسی دشمن کی طرح حملہ آور ہوئی ہو، کیونکہ تمہیں لگتا ہے میں نے سارے کا سارا خدا لے لیا ہے۔“ قرآن کی آنکھوں سے لگا کر اس نے جیب میں رکھ لیا۔

”مجھے اس کی ساری بے توجہی مل چکی ہے اب اس کی توجہ کی پروا کسے ہے۔ تم سارے کا سارا خدا رکھو۔ مجھے سارا چاہیے نہ تھوڑا۔“ اس نے اتنی سختی سے جتایا کہ جواب میں وہ خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

”کیا اب تمہارے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں؟“

خدا کا کوئی اور ارادہ جس کے تم ترجمان بن سکو؟“

”خدا تم پر اپنی مہربانیاں کرتے رہنا پسند کرے۔“

آمین۔“ جیب سے قرآن نکال کر وہ پھر پڑھنے لگا۔

رات کو ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی سے اس نے

موسیٰ کو آتے دیکھا۔ وہ اپنے کباب کا سامان لا کر ہوٹل کے اندر رکھ رہا تھا۔ وہ نیچے تھا اور وہ کھڑکی میں اوپر۔

ایک بار میز کو اندر لے جاتے اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور میبل نے اپنی نظروں کو اس سے ہٹایا نہیں

وہ ساری نا فرمانی لیے اسے گھورتی رہی اور وہ سارا ایمان اپنی آنکھوں میں بسائے اپنی آنکھیں جھکا کر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد وہ پانی چھڑک کر ہوٹل کے سامنے کی

زمین صاف کرنے لگا۔ کرسیاں اور میز صاف کیں

اور اندر سے کھانے کی چیزیں لالا کر باہر رکھنے لگا۔ دو

چھوٹی کاریں سڑک سے آتی نظر آئیں۔ کچھ غیر ملکی

سیاح وہاں آگئے تھے۔ ہوٹل کے کمرے میں موجود

واحد سیاح لڑکی ”میبل“ کو بھی باہر ڈنر کی دعوت دی

گئی، لیکن اس نے کھانا کمرے میں ہی منگوا لیا تھا۔

ایک تو اس لیے کہ وہ موسیٰ کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی

تھی اور دوسرا وہ اپنی شکل موسیٰ کو دکھانا نہیں چاہتی

تھی۔

”یہاں سے ہم بیروت چلیں گے، وہاں تم انجوائے کرو گی۔“

”تم جانتے ہو، میں بیروت نہیں جاؤں گی۔“
”اوہ! سوری میں بھول گیا تھا۔ چلو جہاں تم کہو گی وہاں چلیں گے۔“

فریڈرک چلا گیا تو وہ کتنی ہی دیر تک کھڑکی میں کھڑی رہی۔ اب اسے نیند نہیں آسکتی تھی۔ بایں کی طرح اس کی نیند بھی کبھی گہری نہیں ہو سکی تھی۔ کھڑکی سے باہر اسے ہوٹل کا عملہ نظر آیا۔ وہ کچھ سامان ہوٹل کے اندر لا رہے تھے۔ موسیٰ نے اپنے شانوں پر لکڑیاں اٹھائی ہوئی تھیں۔

”یہ لکڑہارا بھی ہے۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کاٹ کر لا رہا ہے۔ اسے یہ سوٹ بھی کرتا ہے۔“ اسے لکڑہارا بنے دیکھ کر سبیل کو خوشی ہوئی۔

ناشتے کے بعد وہ رات آنے والے سیاحوں کے ساتھ قریبی گاؤں آگئی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ وہاں رہی تو یہ اس کے لیے ٹھیک نہیں ہو گا۔ وہ موسیٰ کو دیکھتے ہی بھڑک جاتی ہے اور پھر اس چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں موسیٰ نظر بھی ایسے آتا ہے جیسے اس کی پانچ کاپیاں ہوں اور ہر کاپی ہر جگہ نہ سہی تو کئی ایک جگہ موجود ہے۔ کوئی سڑک پر چل رہی ہے، کوئی کھڑکی کے نیچے کھڑی ہے، کوئی درختوں کے جھنڈ میں موجود ہے، کوئی ہوٹل کی راہ داری میں عملے سے مصروف گفتگو ہے، کوئی چھوٹے سائز کا قرآن ہاتھ میں پکڑے کہا بوں کے پاس براجمان ہے، کوئی جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لا رہی ہے۔

شام سے پہلے وہ سب واپس آ چکے تھے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ چائے لے کر کھڑکی میں آئی تو اسے کچھ سیاح موسیٰ سے باتیں کرتے ہوئے نظر آئے۔ موسیٰ درختوں، پہاڑوں، پہاڑی نالوں، پرندوں وغیرہ کی طرف اشارے کر کر کے باتیں کر رہا تھا۔ سب اتنے انہماک سے سن رہے تھے جیسے وہ سائنس پر کوئی لیکچر دے رہا ہو۔ کسی نے اس کی پھولی ہوئی جیب کی طرف اشارہ کیا تو اس نے قرآن نکال کر دکھایا۔ سیاح



فریڈرک کے کام ختم ہونے کے آثار معدوم ہی رہے۔ رات گئے جب وہ آیا تو سبیل سوچکی تھی۔
”مجھے چند دن لگیں گے واپس آنے میں۔“ صبح اسے نیند سے جگا کر وہ بتا رہا تھا۔

”کتنے دن؟“ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا، صبح ابھی تک رات کے خوان پر موجود تھی۔

”دو یا تین دن۔ زیادہ سے زیادہ چار دن۔“

”میں چار دن یہاں کیا کروں گی؟“

”تم آس پاس کے چند گاؤں گھوم سکتی ہو۔“

”یہاں کے سب گاؤں ایک جیسے ہیں۔“

”تو پھر سب ایک جیسے گاؤں دیکھ ڈالو۔ کم سے کم تمہیں یہاں زبان کا مسئلہ نہیں ہے۔ عربی تمہاری مادری زبان ہے نا؟“

”میری ماں کی زبان تھی، میری نہیں۔ میری زبان انگلش ہے۔“ وہ برا مان گئی۔

”تم غصے میں ہو، کیا ہوا ہے؟“

”مجھے یہاں کے لوگ پسند نہیں ہیں۔“

”کون لوگ؟“

”سب لوگ۔“ وہ موسیٰ کا نام نہیں لے سکی۔

”اگر تمہیں کوئی تنگ کرے تو تم اس کا استعمال کر سکتی ہو۔“ فریڈرک نے بیک سے پستول نکال کر اس کے سامنے رکھا۔

”تم یہ یہاں بھی ساتھ لے آئے ہو؟“

”اسے ساتھ رکھنا ضروری ہے، خاص کر ان علاقوں میں۔ تم باہر جایا کرو تو اسے اپنے ساتھ رکھ لیا کرو۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں ہوں تمہارے ساتھ۔ ہوٹل کا عملہ بے ضرر ہے، تم بے فکر ہو کر رہو یہاں۔ تمہیں کچھ ہو بھی گیا تو تم جانتی ہو میں کیا کچھ کر سکتا ہوں۔“

وہ مسکرا دی۔ ”تم بہت مصروف ہو، مجھے اپنا کچھ وقت دے دو۔“

عورت نے قرآن کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا تو اس نے قرآن کھول کر اور پڑھ کر سنا دیا اور واپس رکھ لیا۔
”میں نے تم سے کہا تھا نا کہ تم نے دو سروں کو متاثر کرنے کے لیے پورا پورا اہتمام کر رکھا ہے۔“ وہ نیچے اس کے پاس آئی۔ سیاح جا چکے تھے اور وہ درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔

اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور کتاب کا صفحہ پلٹ کر اسناک سے پڑھنے لگا۔

مسیبیل کو پہلی بار معلوم ہوا کہ۔۔۔ ”برا“ ہی سہی پر سوال کا جواب آنا چاہیے ورنہ بہت برا لگتا ہے۔ منہ توڑ اور دل توڑ ہی سہی طنز کا جواب دیا جانا چاہیے۔ ورنہ بہت سبکی ہوتی ہے۔ آپ کی موجودگی کی ”ہاں“ نہ ہو تو ”نہاں“ ضرور ہونی چاہیے۔

”میں کوئی جواب نہیں دیتا تو بھی تمہیں برا لگتا ہے۔“ اس نے کتاب سے سر اٹھا کر اس سے کہا۔ حیرت کا پتلا اس کے اندر تیز تیز سانس لینے لگا۔ اس نے اپنا منہ اس سے پھیر لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کے چہرے پر حیرت زدگی کے آثار دیکھے جبکہ وہ یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ اس کا سر بدستور جھکا ہوا ہے اور وہ کتاب پڑھ رہا ہے۔ اسے موسیٰ کا یہ انداز چیلنج کرتا ہوا لگا اور اس نے یہ چیلنج قبول کر لیا۔



وہ خدا کا پیارا تھا تو وہ خدا کی نافرمان۔۔۔
کیا اب کھاتی سیاح عورت شاید اسے کوئی کہانی سنا رہی تھی جسے وہ سر جھکائے اسناک سے سن رہا تھا۔ عورت چلی گئی تو وہ جائے نماز بچھا کر نماز پڑھنے لگا۔ وہ موسیٰ کے کبابوں کے پاس آئی اور اس نے چلا کر کہا۔
”تم نماز پڑھ رہے ہو اور تمہارے کباب بے یارو مددگار پڑے ہیں۔ انہیں کوئی بھی اٹھا کر کھا سکتا ہے“ پھینک سکتا ہے۔“

موسیٰ نماز پڑھتا رہا۔
اس نے چند کباب کھائے چند پھینک دیے۔ پھر اس نے سارے کباب ایک ایک کر کے پھینکنے شروع

کر دیے۔ رک کر وہ اس کے نقصان کا تخمینہ لگانے لگی جو کافی کم نکلا۔ نقصان ہو تو پورا ہو زیادہ سے زیادہ ہو۔ اس نے ایک ایک کر کے اس کی باقی کی چیزیں بھی پھینکنی شروع کر دیں۔ اس کا چولہا، تیل، مسالا، برتن اور آخر میں اس نے میز بھی الٹ دیا۔ جب موسیٰ نے سلام پھیرا تو تھوڑا سا چونکا۔

”یہ سب میں نے کیا ہے۔“ اس نے دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر فخر سے کہا۔

موسیٰ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔
”تم خدا کی طرف متوجہ تھے تمہارا خدا کہاں متوجہ تھا۔ وہ تمہاری چیزوں کی حفاظت نہیں کر سکا۔“ موسیٰ نے دعا مانگی اور اٹھ کر اپنی چیزیں سمیٹنے لگا۔ وہ میز سیدھی کرتا، چیزیں اس پر واپس رکھتا۔ مسیبیل چیزیں پھینکتی، میز پھر سے الٹ دیتی۔ وہ میز سیدھی کرتا رہا، چیزیں اس پر رکھتا رہا، وہ میز کو چیزوں سے سمیت الٹتی رہی۔

دن شام میں ڈھل گیا، شام رات میں سمٹ آنے کے لیے تیار ہو گئی اور وہ بار بار یہ ہی کرتی رہی۔ پلٹ پلٹ کر کرتی رہی۔ جب وہ تھک گئی اور واپس جانے لگی تو اس نے اپنے پیچھے موسیٰ کی آواز سنی۔

”حادثات مجھے تمہاری طرح تھکا کر چور ہی کیوں نہ کر دیں، وہ مجھے خدا سے متنفر نہیں کر سکیں گے۔ میں اپنی مصیبتوں سے خدا کی محبت کا وزن نہیں کرتا، تم بھی نہ کیا کرو۔“

لفظ۔۔۔ ”تمہاری طرح“ زہر میں بجھا تیر تھا جو اس کے دل میں پیوست ہوا۔ وہ اس کے قریب آئی اور اپنے ہاتھ کی قوت کو آزمایا۔

”اور اس ذلت کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ اس نے تھپڑ کی طرف اشارہ کیا۔

وہ کتنی ہی دیر بے یقینی سے مسیبیل کو دیکھتا رہا۔
”برا لگا؟“ اس نے آنکھوں کو طنز سے گھما کر کہا۔

”اب تم کیا کرو گے؟ مجھے مارو گے؟ گالیاں دو گے؟“
اپنی بے یقینی آنکھیں مسیبیل کے چہرے سے ہٹا کر وہ پھر سے اپنی چیزیں سمیٹنے لگا۔ جب وہ اپنی ساری

”مجھے انسانوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”ہتھیار کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ اس نے جیب سے پستول نکال کر ہاتھ میں لیا۔

وہ مسکرا دیا۔ ”تم مجھے مارنا چاہتی ہو؟ صرف اس لیے کہ میں نے سارے کا سارا خدا لے لیا۔“

مسیبل نے گو صرف دکھانے کے لیے پستول باہر نکالا تھا، لیکن اس بات پر اس کا دل چاہا کہ وہ پستول کوچ مچ چلا دے اور اس کی دونوں آنکھوں کے عین درمیان چلائے۔ ”آج میرا ارادہ تمہیں تنگ کرنے کا نہیں ہے۔ شکل سے ویسے بھی تم کافی غریب لگتے ہو۔“

”میں غریب نہیں ہوں، تم چاہو تو اپنا شوق پورا کر سکتی ہو۔“ اس نے اتنے اطمینان سے کہا کہ مسیبل کو شک ہوا کہ سکون جس گودام سے نکال نکال کر انسانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے وہ اس گودام کا محافظ ہے۔

پیر سے ٹھوکر مار کر سبیل نے اس کی فرمائش اور اپنا شوق پورا کر لیا۔ میز اپنی تمام چیزوں کے ساتھ زمین پر اگر اسے شور سے درختوں پر بیٹھے پرندے ایک ساتھ اڑے۔

”اس اجاڑ گاؤں میں تم میرے لیے تفریح سے زیادہ کچھ نہیں ہو۔“ سوکھی شاخ لہرا کر سبیل نے اس کے شانے پر رکھی۔

”تفریح کی دلدہا اس دنیا میں تم میرے لیے قابل احترام ہو۔“

کیونکہ میں لڑکی ہوں اور خوب صورت بھی ہوں اور یہ دونوں چیزیں خاص بھی ہیں اور مطلوب بھی۔“

”خاص ”رضائے الہی“ ہے اور مطلوب بھی یہی ہے۔“

”تمہیں لگتا ہے تمہاری تبلیغ سے میں مرعوب ہو جاؤں گی؟“

”مجھے یقین ہے تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ اس کی گھنی بھنوں میں رکوع سے قیام میں آئیں اور اس پر ٹھہر گئیں۔

چیزیں سمیٹ چکا تو ایک بار پھر سے مسیبل نے انہیں زوردار ٹھوکر سے زمین پوس کر دیا۔

”اگر تم اپنی حد کا تعین نہیں کر سکتے تو میں نے کر دیا۔“ مسیبل نے ہاتھ سے اس کے گال اور بکھرے سامان کی طرف اشارہ کیا۔ وہ سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا اور وہ بھی تن کر اسے دیکھنے لگی۔ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے آگئے۔ مسیبل جس کے ہاتھ میں میزان ہے اور موسیٰ جو پیمانوں کا قائل نہیں۔

”اگر تمہیں لگتا ہے کہ تمہیں ڈرا کر میں تمہیں اپنا نقصان پورا کرنے کے لیے کہوں گا تو تمہیں اپنی خوش فہمی دور کر لینی چاہیے۔“

”بہت فیاض خدا ہے۔“

”اوہ! تو اس نقصان کے لیے تم خدا سے کہو گے کہ وہ تلافی کر دے۔“

”میں اس نقصان کے فائدے کے لیے خدا سے کہوں گا۔“ موسیٰ نے مسیبل کی طرف اشارہ کیا۔

”میں کسی کا نقصان ہوں نہ فائدہ۔“ وہ بھڑک گئی تو چلانے لگی۔

”کسی کا نہیں۔ خود اپنا۔“

رات بھر وہ خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ اگلے دن وہ سیدھی موسیٰ کے پاس گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ جان لے کہ وہ اس سے ڈرتی نہیں ہے۔ جو للکار اس کی آواز میں ہے وہ اس کی ذات میں بھی ہے۔ وہ قرآن کو ہاتھ میں لیے پڑھ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ میز سے ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا کہ وہ پھر سے اپنا شوق پورا کر لے۔ مسیبل نے اپنے نچلے ہونٹ کو سختی سے اپنے دانتوں کے نیچے دبایا۔ اگر وہ مسکرا دیتی تو اسے تکلیف دینے میں مزہ نہ آتا۔ ہاتھ میں پکڑی بسی سوکھی شاخ کو ہنٹر کی طرح لہراتی، گھٹنوں تک لمبے جوتوں میں چلتی وہ اس کے قریب آئی اور فاصلہ کم کرٹی عین اس کے چہرے کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

موسیٰ چند قدم پیچھے ہٹا۔

”تم مجھ سے ڈر رہے ہو؟“

”مجھے یقین ہے میں غلط نہیں ہوں۔“

”غلط کو کیسے لگے گا کہ وہ غلط ہے؟“

”تم ایک اچھے استاد بن سکتے ہو۔“

”تم اس استاد کی ابتداء ہو سکتی ہو۔“ اس نے اپنی طرف اشارہ کیا اور مسکرایا بھی۔ خون سیل کی رگوں میں ساکن ہو گیا۔ اسے اس کے انداز کی سختی سے خوف بھی آیا۔ وہ اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ ”لوحِ نافرمان“ ہو اور وہ اس پر لکھی تحریر پڑھ رہا ہو۔ اپنی نظر سے اپنے انداز سے۔

”تم جیسے شدت پسندوں کی فوج بڑھتی ہی جا رہی ہے، ٹھیک کرتے ہیں وہ جو تم پر کتے چھوڑ دیتے ہیں۔“ اس کی نظر کا مقابلہ اس نے اس انداز میں کیا۔

”تو کیا تم شدت پسند نہیں؟“

”یہ فیصلہ تم کرو گے کہ میں کیا ہوں۔۔۔ کس بنا پر؟“

”عقل اور مشاہدے کی بنا پر۔“

”عقل اور مشاہدہ؟ تم جیسے گڈریے میں؟“

”گڈریا ہونے میں برائی ہے؟“

”بھٹ سے دو بدو لڑنے میں بھی اچھائی نہیں ہے۔ تمہیں ان سیاحوں کو ہی متاثر کر کے اپنا کام چلانا چاہیے مجھے نہیں۔“

”تمہیں واپس لوٹ جانا چاہیے۔“ موسیٰ کی آواز سرسبز پتوں میں استراحت کرتی ہوا کے سنگ اس کے سامنے آنھری۔

”تمہارے باپ کا گاؤں ہے یہ جو مجھے یہاں سے جانے کے لیے کہہ رہے ہو؟“

”میں تمہیں خدا کے پاس لوٹ جانے کے لیے کہہ رہا ہوں۔“ وہ زمین پر جھکا اور میز کھڑی کرنے لگا۔



شام کو وہ ہوٹل کی طرف جا رہی تھی کہ اس نے فریج سیاح عورت کو موسیٰ کے ساتھ چہل قدمی کرتے دیکھا۔ موسیٰ کا کباب خانہ بند ہو چکا تھا۔ صبح ہی وہ اس کا اتنا نقصان کر چکی تھی کہ شاید ہی اب وہ چند دنوں

کے اندر کھل سکے۔ وہ دونوں کے پاس پہنچ گئی۔

”تمہیں ایسے لوگوں سے بچ کر رہنا چاہیے یہ تمہارے لیے کافی خطرناک ہو سکتے ہیں۔“ اس نے موسیٰ کی طرف اشارہ کر کے انگلش میں کہا۔ عورت سوالیہ نگاہوں میں سیبل کو دیکھنے لگی اور ٹوٹی پھوٹی انگلش میں کہا کہ وہ اس کی بات سمجھ نہیں سکی ہے۔ موسیٰ نے سیبل کی بات کا ترجمہ فریج میں کر کے اس عورت کو بتایا۔ عورت نے سیبل کو دیکھا اور فریج میں جواب دیا۔

”یہ پوچھ رہی ہیں کس طرح کے خطرناک؟“ موسیٰ نے عورت کی فریج کو عربی میں ترجمہ کر کے سیبل سے پوچھا۔

”یہ تمہیں مار سکتا ہے۔ تمہیں بچ سکتا ہے۔ تمہیں لوٹ سکتا ہے۔“ سیبل نے موسیٰ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

موسیٰ کے بتانے پر عورت حیرت سے سیبل اور موسیٰ کو دیکھنے لگی۔ پھر اس نے قہقہہ لگایا۔

”میں اس سب کے لیے تیار ہوں۔ کیا تم بھی تیار ہو۔“ عورت کے کہنے کے بعد موسیٰ نے ترجمہ کیا۔

سیبل کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے موسیٰ کو دیکھا اور اپنے دل میں اتر آنے والے خوف کو دبا دینا چاہا۔ رات کو وہ واپس امریکہ جانے کے لیے تیاری کر چکی تھی۔ اس نے پیکنگ مکمل کی تو فریڈرک کو فون کیا۔

”میں واپس جا رہی ہوں۔“

”ایک دم سے اچانک؟“

”میں بور ہو چکی ہوں یہاں۔“

”میں آرہا ہوں، تین چار گھنٹے میں تمہارے پاس ہوں گا، کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”کیا واقعی تم آرہے ہو یا مجھے ٹال رہے ہو؟“

”میرا کام ختم ہو چکا ہے میں آرہا ہوں سیبل! تم کھانا کھا لینا۔“

رات کا کھانا کھا کر وہ سو گئی۔ پھر بہت سی چیزیں آپس میں گڈو ہو گئیں۔ وہ گہری نیند میں تھی اور اسے

”کون ہے یہ؟“ عورت کی آواز آئی۔

”ہماری مہمان ہے۔“

”مہمان اور ایسے اس طرح؟“

”یہ ایسے ہی رہے گی، کچھ بھی ہو جائے، ام ہانی اس کے ہاتھ پیر نہ کھولنا۔“

”تم اسے یہاں لائے کیوں ہو۔؟“

”میں جلدی میں ہوں، جا رہا ہوں۔ ہرگز اس کا منہ نہ کھولنا، ورنہ یہ چلائے گی۔ تم اسے قابو میں نہیں رکھ سکو گی۔ یہ تمہیں مار دے گی۔“

اس نے مرد کی آواز کو پہچان لیا تھا۔ وہ موسیٰ تھا۔ ”گناہوں کی زمین پر موسیٰ ایک اور گناہ میں اضافہ کر رہا ہے۔“ نیند کے ساتھ یہ خیال صہیل کے ساتھ ساتھ رہا۔

اگلے دن جب وہ ہوش میں آئی تو اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اسے اغوا کر لیا گیا ہے اور اغوا کرنے والا موسیٰ ہے۔ راتوں رات اسے ہوٹل سے اٹھا کر یہاں لا کر پھینکا گیا ہے۔ اسے ان علاقوں کے جرائم سے تھوڑا بہت آگاہی تھی۔ وہ جانتی تھی دیکھتے ہی دیکھتے گاڑیاں کیسے غائب ہو جاتی ہیں، سیاحوں کو کیسے لوٹ لیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ تو یہ ہی ہوتا تھا، خاص کر اس صورت میں جب اس نے خود موسیٰ کو دشمنی کی دعوت دی تھی۔ اسے بالکل حیرت نہیں ہوئی کہ موسیٰ نے یہ کیا ہے۔ اس کی مروانہ غیرت جاگ گئی تھی۔

کمرے میں اتنا اندھیرا تھا کہ اسے گمان ہوا کہ دنیا میں کہیں روشنی باقی بچی ہی نہیں ہے۔ اناج کی بو اس کے نھنوں میں گھس کر اسے بے چین کر رہی تھی۔ وہ چٹائی پر پشت کے بل بائیں رخ پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ پاؤں زمین میں گڑے ایک کندے کی رسی کے ساتھ بندھے ہوئے تھے اور اتنے ہی ڈھیلے تھے کہ وہ دائیں بائیں کروٹ لے سکے۔ کپڑے سے اس کا منہ سختی سے باندھ کر پیچھے کو بھینچا گیا تھا۔

چند گھنٹوں بعد ام ہانی کو اڑکھول کر اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں موم بتی تھی۔

اپنی نیند کی گہرائی پر حیرت تھی۔ اس کے کمرے کا دروازہ دھڑام سے کھلا۔ کچکی کی طرح نیند اس کی آنکھوں سے ذرا سی جھٹکی۔ کسی نے آگے بڑھ کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا، تب وہ گہری نیند سے دھند میں لپٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ اسے اٹھا کر کندھے پر لا د کر گاڑی میں بٹھا گیا۔ اس کا سر کھڑکی سے ٹکرایا اور وہ درد سے کراہ اٹھی۔ وزنی کمبل کو اس نے اپنے اوپر محسوس کیا۔ پھر پتا نہیں کیا کیا اس پر آن گرا کہ بوجھ سے وہ دب گئی۔ سانسوں کی بے ربطی سے اس کا سینہ پھڑپھڑا رہا تھا۔ وہ زندگی میں کبھی گہری نیند نہیں سوئی تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد اور اس کے موم بتی لے کر بدروح بن کر گھر میں گھومنے سے تنگ آکر اگر وہ نیند کی گولیاں کھا بھی لیتی تھی تو بھی وہ گہری نیند نہیں سو پاتی تھی تو پھر آج کیسے؟

گاڑی تیز رفتاری سے اونچے نیچے راستوں پر اچھل رہی تھی۔ اس کی آنکھ تو کھلتی رہی، لیکن اس پر اتنا ڈھیر تھا کہ نہ وہ اسے پرے کھسکا سکی نہ ہی کسی کو دیکھ سکی۔ رات اپنی ساری سیاہی لیے اس کے گرد اپنا جال بنتی چلی گئی اور اسے قیدی بنا کر ہی دم لیا۔

اس کی پشت زمین سے ٹکرائی اور اس کی آنکھیں وا ہوئیں تو بھی اسے اپنے آس پاس اندھیرا ہی نظر آیا۔ تین لوگوں کی سرگوشیاں اس کے کانوں تک تو آئیں، لیکن اس کے دماغ کو مطلب نہیں سمجھا سکیں۔ وہ نیند سے ڈوب کر پھرا بھری تو اندھیرے میں موم بتی کی روشنی میں دو آنکھیں نظر آئیں، وہ اس سے کچھ ہی فاصلے پر تھیں۔ اس نے ہاتھ جھٹک کر ماں کی آنکھوں کو برے کرنا چاہا، لیکن اس کے ہاتھ حرکت نہیں کر سکے۔ وہ بندھے ہوئے تھے۔ اس نے جان توڑ کوشش کی کہ وہ جاگی رہے لیکن اس کی آنکھیں بار بار بند ہو رہی تھیں۔ وہ اتنی وزنی ہو رہی تھیں جیسے اس نے نیند کی کئی سو گولیاں پھانک لی ہوں یا ماری جو نا کے کش بھر لیے ہوں۔

”تمہیں بھوک لگی ہوگی، مجھے موسیٰ نے سختی سے منع کیا ہے کہ تمہارا منہ نہ کھولوں، تم چلانے لگو گی۔ میں کب سے سوچ رہی ہوں کہ تمہیں کھانا کیسے کھلاؤں۔ میں تمہیں چند نوالے کھلانے کی کوشش کرتی ہوں۔ میں اتنی دیر تک تمہیں بھوکا کیسے رکھ سکتی ہوں۔“

اس نے اس کے منہ پر بندھے کپڑے کو کچھ ڈھیلا کیا، لیکن پورا کھولا نہیں اور چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر اس کے منہ میں ڈالنے لگی۔ ان نوالوں کو جیسے تیسے اندر کرنے کے بعد اس نے آخری نوالے پر عورت کی شہادت کی انگلی کو اپنے دانتوں میں شکنجے کی طرح کس لیا، پہلی بار۔ پہلی انگلی کو۔

اپنی انگلی اس کے دہن سے بمشکل آزاد کروانے کے بعد ام ہانی کتنی ہی دیر زمین پر گر کر اپنی تکلیف کو کم کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ اگر سہیل کا منہ کھلا ہوتا تو وہ قہقہہ لگاتی اور اس سے پوچھتی۔ ”کیسا رہا؟“

زمین سے اٹھنے کے بعد موم بتی ہاتھ میں لے کر ام ہانی دہلیز سے باہر جانے لگی تو اس نے گردن موڑ کر اس سے کہا۔

”یقیناً میں بری عورت ہوں گی، لیکن میں تمہارے ساتھ کچھ برا نہیں کروں گی۔“



”میں ایک بری عورت ہوں سہیل، سب سے پہلے میں نے اپنے باپ کے ساتھ برا کیا اور پھر کسی کو نہیں چھوڑا۔ میں تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گی۔“

عدینہ، یعقوب عہدہ کے نکاح میں تھی، جو ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم تھا، خوب صورت تھا اور اس سے محبت کرتا تھا۔ وہ بھی اس سے محبت کرتی تھی، اس وقت تک جب تک موسم بہار نہیں آگیا اور اسے اپنی خالہ کے پاس پہاڑوں پر جا کر رہنے کا خیال نہیں آیا۔ وہ دو ماہ رہنے کے لیے آئی تھی اور دو سال رہ کر گئی۔ جب جب بابا اسے لینے آتے وہ ٹال جاتی، کبھی بیمار ہو کر، کبھی ضد کر کے، کبھی بہانے بنا کر، کبھی منت

کر کے۔ موسم خزاں میں بابا اسے زبردستی اپنے ساتھ لے آئے۔ جب تک یا مین اس کے پیچھے شہر آیا اس کی رخصتی طے ہو چکی تھی۔ وہ گھر سے بھاگ رہی تھی، جب بابا نے اسے پکڑ لیا۔

”میں نے تمہیں پہاڑوں کی سیر کے لیے بھیجا تھا عدینہ، تم نے پستیوں کا رخ ہی کیوں کیا؟ تم جانتی تھیں تم کسی سے منسوب ہو۔ تم نے کسی اور مرد کی طرف توجہ دی؟ تم نے یہ بے ایمانی کیسے کی عدینہ؟“

”محبت کوئی بے ایمانی نہیں ہوتی بابا۔“

”محبت سب سے پہلے انسان کو ”لامذہب“ بناتی ہے۔ بے دین رکھتی ہے۔ پہلے وہ بے شرم ہوتا ہے، پھر جھوٹ بولتا ہے، اور پھر بے ایمانی کرتا ہے۔ انسان وہ سب کرتا ہے جو پہلے نہیں کرتا۔ وہ کفر کا کلمہ بھی پڑھ لیتا ہے، جس پر پہلے وہ توبہ استغفار کرتا ہے۔“

”اگر آپ نے میری رخصتی کر دی تو بھی میں اسی کے ساتھ بھاگ جاؤں گی۔“

”پھر تم بھاگتی ہی پھوگی عدینہ۔ میں نے تم پر کبھی سختی نہیں کی۔ میری نرمی کا کچھ تو اجر دو مجھے۔“

”میں اسے نہیں بھول سکتی۔“

”انسان سب سے پہلے خدا کو بھولتا ہے، کیونکہ وہ انسان کو یاد کر لیتا ہے اور یہیں سے اس کے شرک کی ابتدا ہوتی ہے۔“

”آپ مجھ سے زبردستی کریں گے۔“

”دنیا کا کون سا باپ ہو گا جو اولاد کو گڑھے میں گرنے سے روکنے کے لیے سختی نہیں کرے گا۔ میں بھی کروں گا۔ مت بھولو کہ تم یعقوب کے نکاح میں ہو۔“

”اب میں یا مین سے نکاح کرنا چاہتی ہوں۔“

”تم اپنے شوہر کو فراموش کر سکتی ہو تو یا مین کو بھی کر سکتی ہو۔ میری عزت کا جنازہ نہ نکالو، ورنہ اس جنازے پر فاتحہ میری موت ہوگی عدینہ۔“

”میرے باپ نے میرے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا اور اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اس کا سر کس قدر وزن تھا۔ اتنا وزن تھا۔ اتنا وزن تھا کہ میرے قدموں میں بیڑیوں کی طرح ایسے پڑا کہ میں ایک قدم نہیں ہلا سکی۔ کاش

اگلی بار بھی یہ ہی بیڑیاں مجھے روک لیتیں سہیل۔
 ”اگر یہ میری آزمائش ہے تو میں اس میں سرخرو ہونا چاہتا ہوں۔ تم اللہ سے معافی مانگو اس وقت تک جب تک تمہارے دل میں اطمینان ایسے نہ بھر جائے جیسے صراحی میں پانی اور تم خدا کی نظر کرم سے ایسے نہ بھیگ جاؤ جیسے وضو سے نمازی۔“ بابا نے یعقوب کو سب بتا دیا تھا اور وہ اسے اپنے پاس بٹھا کر سمجھا رہا تھا۔
 ”میں خدا سے معافی مانگ چکی ہوں۔“ اس نے جھوٹ بولا۔ پھر وہ جھوٹ پر جھوٹ بولتی رہی اور یا مین سے بھی ملتی رہی۔ یا مین کی محبت سے اس کا دل ایسے بھرا ہوا تھا جیسے دیوات میں سیاہی۔ اس کی محبت میں وہ ایسے بھیگی ہوئی تھی جیسے لٹے میں شرابی۔

وہ کب تک خود پر جبر کرتی۔ اسے گھر سے بھاگنا پڑا۔ یا مین پہلے ہی سب انتظام کر چکا تھا۔ پہلے وہ عمان گئے پھر سریا اور پھر وہ امریکہ آگئے۔ امریکہ آنے کے بعد یا مین نے یعقوب سے طلاق منگوائی جو یعقوب نے فوراً ”بھیج دی۔ طلاق کے کاغذات پر اس کے گھر سے بھاگنے کے اگلے ہفتے کی تاریخ درج تھی۔ طلاق کے کاغذات پر اس کے باپ کی لکھائی میں پسل سے ایک جملہ لکھا ہوا تھا۔

”میں دیکھوں گا تم کس منہ سے خدا کا سامنا کرو گی۔“

چند دن وہ اپنا منہ آئینے میں دیکھنے سے کتراتا رہی۔ چند راتیں وہ اپنے منہ پر کپڑا ڈال کر سوتی رہی۔ شادی کے بعد دونوں نے چند سال رات دن صرف کام کیا اپنا گھر بنایا اور پھر سہیل ہوئی۔

”اب ہماری زندگی مکمل ہے۔“ یا مین نے کہا اور عدینہ نے اپنے دل میں وحشت کو اترتے دیکھا۔
 ”ہمیں دعائیں دینے والا کوئی نہیں ہے بابا اور۔“

”تمہیں کن دعاؤں کی ضرورت ہے؟“

”سہیل کو دعائیں چاہیے ہوں گی یا مین۔“

”ہم ہیں اس کے لیے دعا کرنے کے لیے۔“

”ہم۔۔۔ لیکن ہم دعا کیسے کر سکتے ہیں؟“

یا مین اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ ”کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟ کیسی باتیں کر رہی ہو؟“
 ”پتا نہیں! بس میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ہم کیا کریں گے، اگر ہمیں دعا کی ضرورت درپیش ہوئی تو۔“

”تو کر لیں گے ہم۔۔۔“ یا مین چلا اٹھا۔
 ”لیکن بابا نے کہا وہ دیکھیں گے میں کس منہ سے خدا کا سامنا کروں گی پھر میں کس منہ سے دعا کر سکتی ہوں۔“

”بکو اس بند کرو عدینہ۔۔۔“
 ”اگر سہیل بیمار ہو جائے تو۔۔۔؟“
 ”تو ہم ڈاکٹر کے پاس جائیں گے۔“
 ”ساری بیماری ڈاکٹر دور نہیں کیا کرتے تم جانتے ہو۔“

”میں یہ جانتا ہوں کہ تمہیں آرام کی ضرورت ہے تم آرام کرو۔“

”کچھ گھنٹوں میں وہ ٹھیک ہو گئی پھر مبینوں اسے تمہیں آرام کرنے کی ضرورت ہے۔“ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ایک دن وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ”بابا مر چکے ہیں اب میرے لیے بد دعا کرنے والا بھی کوئی نہیں رہا۔ یا مین نے اپنے کچھ رالٹوں سے معلوم کروایا۔ وہ واقعی مر چکے تھے۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ مر چکے ہیں۔“ چند دنوں بعد اس نے پوچھا۔

”تم سے نفرت نے۔۔۔“
 ”مجھ سے نفرت؟ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو؟ تم واقعی میں پاگل ہوتی جا رہی ہو۔“

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میرا دل چاہا میں تمہیں جان سے مار دوں سہیل کو کسی گڑھے میں دبا آؤں۔ میرا دل چاہا میں تم سے دور بھاگ جاؤں اور بابا کے قدموں میں گر جاؤں۔“

”تم ان سے اتنی ہی محبت کرتی تھیں تو یہ سب کیوں کیا۔“ وہ ہفتوں بیمار رہی تو یا مین نے چڑ کر کہا۔

”میں ان سے محبت نہیں کرتی تھی۔ اب پتا نہیں

چھپ چھپ کر ملتی کیوں تھیں؟ میری محبت کا دم کیوں بھرتی تھیں؟

وہ بے چارگی سے یامین کو دیکھتی رہی ”ہاں! یہ خدا اب کہاں سے آگیا۔ پہلے تو میں کسی خدا کو نہیں جانتی تھی۔ مجھے تو پرواہ ہی نہیں تھی کہ مجھے خدا کی پرواہ بھی کرنی ہے۔ میں خود نہیں جانتی یامین یہ سب باتیں کیسے میرے ذہن میں آنے لگی ہیں۔ میں تھک گئی ہوں ان باتوں سے لڑتے لڑتے۔ ان کا جواب دیتے دیتے۔ یہ خیالات میرے دل و دماغ پر قابض ہیں۔ انہوں نے مجھے قید کر لیا ہے۔“

”سبیل کا آنا منحوس ہے۔ پہلے تو تم ٹھیک تھیں۔“

”ہاں! سبیل کا آنا ٹھیک نہیں رہا۔ میں جب جب اس کی طرف دیکھتی ہوں مجھے لگتا ہے میں خود کو دیکھ رہی ہوں۔“

”ماں کو بیٹی میں اپنا آپ ہی نظر آتا ہے عدینہ۔“

”خدا نہ کرے وہ مجھ جیسی ہو۔“

”اور تم کیسی ہو عدینہ؟“ غصے سے یامین کو چلا نا پڑا۔

”میں گناہ گار ہوں یامین بدکار ہوں میں۔“ وہ بھی پوری قوت سے چلا اٹھی۔



ایک ہی گھر میں رہتے اس نے یامین کو طلاق کا نوٹس بھیجوا دیا۔ صدے سے زیادہ حیرت سے اس نے عدینہ کو دیکھا۔

”یہ کیا ہے؟ کیسا مذاق ہے یہ عدینہ؟“

”یہ میرا آخری فیصلہ ہے، اگر تم نے مجھے طلاق نہ دی تو میں خود کو ختم کر لوں گی۔ تم منت کرو یا اپنی محبت کے واسطے دو، میں تم سے الگ ہونے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔“

یامین نے بہت بحث کی، بہت کچھ یاد کروایا، وہ چپ چاپ سنتی تو رہی، لیکن بولنے پر آمادہ نظر نہ آئی۔

”یہ صلہ دے رہی ہو تم مجھے میری محبت کا۔ دھوکا

کیوں ان کی محبت سے میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔ اب یہ محبت کہاں سے آگئی۔ اب یہ محبت کیا کرنے آئی ہے۔ بھلا باپ سے بھی کوئی ایسی محبت کر سکتا ہے کہ اس کے بغیر سانس نہ آئے، دم گھٹنے لگے۔ وہ زندہ تھے تو مجھے یاد بھی نہیں آئے، اب وہ مر گئے ہیں تو میرے اعصاب پر سوار ہو گئے ہیں۔ یہ کیسا عذاب ہے یامین جو ان کی محبت کی صورت مجھ پر نازل ہوا ہے۔“

”تم نو سال ان کے بغیر سانس لیتی رہی ہو۔“

”کیسے؟ کیسے لیتی رہی ہوں یہ سانس ان کے بغیر۔ اب تو خلق میں میری جان اٹک گئی ہے۔ جو نو سال تمہارے ساتھ گزارے وہ جھوٹ ہے یا جو ان کے بغیر گزار دیے وہ سچ ہے۔ جب تم میرے پاس نہیں ہوتے تھے تو میں سوچتی تھی کہ کبھی میں تمہارے بغیر بھی رہ سکوں گی؟ اب تم میرے پاس ہو تو میں سوچتی ہوں میں تمہارے ساتھ کیسے رہ رہی ہوں۔“

”میں تمہاری تیمارداری کے لیے تیار ہوں، لیکن تم جسمانی نہیں، ذہنی بیمار ہو۔ سبیل کا خیال رکھنا بھی بھول گئی ہو۔“

”ہم سبیل کو کیا بتائیں گے کہ ہمارے رشتے دار کہاں ہیں؟“

”ہمارا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ ہم نے سب طے کر لیا تھا۔“

”وہ تو ہم نے طے کیا تھا، ہم سبیل کو کیسے بتائیں گے کہ ہم نے یہ طے کیا تھا۔“

”اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ جب وہ بڑی ہوگی تو میں سب دیکھ لوں گا۔“

”اور جو سب دیکھ رہا ہے؟ وہ۔ وہ کیا کرے گا۔؟“

”کون دیکھ رہا ہے؟“

”خدا۔۔۔ کچھ تو اس نے بھی طے کیا ہو گا۔“

”تمہارا باپ مولوی تھانہ تمہارا سابقہ شوہر عالم۔ اب تمہیں یہ باتیں یاد آرہی ہیں۔ اب تم ایسی باتیں کرنے لگی ہو۔ اگر تمہیں خدا کے دیکھنے کی اتنی ہی فکر تھی تو تم میرے ساتھ آئی ہی کیوں تھیں؟ مجھ سے

دے رہی ہو مجھے، جواب دو مجھے؟“

”مجھے طلاق چاہیے۔۔۔ ہر صورت چاہیے۔“

”تم اپنے پہلے شوہر سے شادی کرنا چاہتی ہو۔ تم بد چلن، فاحشہ، میں نے تمہارے لیے اپنی ساری زندگی برباد کر دی۔ میں نے تمہارے لیے کیا نہیں کیا؟“

”جو کیا برا کیا، ہم دونوں نے کیا۔“

اس کے گھر آنے سے پہلے وہ کمرے کا دروازہ بند کر لیتی۔ وہ کمرے کے دروازے پر دستک دے دے کر تھک جاتا۔

”تم نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا عدینہ۔۔۔“ تھک

کر وہ دروازے کے پاس ڈھیر ہو جاتا۔

”میں نے خود کو بھی کہیں کا نہیں چھوڑا۔ جاؤ۔۔۔“

چلے جاؤ۔۔۔ مجھے بھی جانے دو۔۔۔“

”میں تم سے محبت کرتا ہوں، تم سے الگ نہیں رہ سکتا۔“ دکھ کی شدت سے وہ گڑ گڑا رہا تھا۔

”میں اب تم سے محبت نہیں کرتی۔ تم سے الگ رہنا چاہتی ہوں۔“ وہ بھی گڑ گڑانے لگی۔

”پہلے تم مجھ سے محبت چاہتی تھیں۔ اب معافی چاہتی ہو۔“

”اور کیا کیا چاہتی ہو تم۔“ یامین دروازے کو توڑ ڈالنا چاہتا تھا۔

”معافی۔۔۔ رحم۔۔۔ رحم کرنے والا خدا۔۔۔ مجھ سے سب کچھ چھین جائے، یہ بھی چاہتی ہوں۔ میرا سب کچھ چلا جائے یامین، اب مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“

دیکھو مجھ پر ہر چیز کی حقیقت کھل گئی ہے۔ یہ ہی میری سزا ہے یامین۔ جس جس چیز کے پیچھے میں بھاگی وہ میرے لیے مٹی کے ڈھیلوں سے بھی کم قیمت نکلی۔

میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ میں جب تمہیں دیکھتی ہوں، کراہیت میری نس نس میں دوڑنے لگتی ہے۔ میرا خون میرے جسم میں ایسے ہو جاتا ہے جیسے زخموں میں پیپ ہو جاتی ہے۔ میں تمہارے لیے گھر سے نکلی

تھی۔ میرے بیٹے اہمت نے تمہیں اور مجھے اپنی معصوم آنکھوں سے پہلی بار دیکھا تھا۔ مجھے اس کی وہ آنکھ نہیں بھولتی یامین، اس کی آنکھ کے ساتھ مجھے خدا

کی آنکھ یاد آتی ہے۔ تم نہیں جانتے سہیل چھ ماہ کی

تھی جب میں نے اسے چھپا دیا تھا۔“

”سہیل گناہ نہیں ہے ہمارا، بیوی ہو تم میری۔“

”ہاں۔۔۔ گناہ نہیں ہے ہمارا، پھر بھی یامین۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ اگر ایسا ہی نیک کام ہوتی تو مجھے اسے چھپانے کا

خیال کیوں آتا۔“

”تم پر اب نیک بننے کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ اچھا چلو آؤ، ہم دونوں مل کر خدا سے توبہ کریں، ہم خدا سے

معافی مانگیں۔“

”کس منہ سے؟ معافی مانگنے کے لیے بھی تو منہ چاہیے۔“

”وہ توبہ قبول کرتا ہے، کیا تم جانتی نہیں۔“

وہ ہنس دی۔۔۔ ”اگر تمہیں یہ معلوم تھا تو یہ کیوں نہیں معلوم تھا کہ پہلے وہ گناہ سے روکتا ہے توبہ کا درجہ

تو دوم ہے، اول تو گناہ سے باز رہنا ہے۔“

یامین چکرا گیا۔ ”تم درجوں تک پہنچ گئی ہو؟“

”اپنا درجہ معلوم ہوا تو دوسرے درجے یاد آئے۔“

نچلے درجے پر آئی تو اوپر کے درجوں کو گنوا دینے پر رونا آیا۔“

”تم کسی عالم کی طرح باتیں کرنے لگی ہو۔ تمہیں اتنا مومن بننے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”گناہ گار بن گئی ہوں۔۔۔ اب مومن کیسے بنوں گی؟“

”ہم نے کیا گناہ کیا ہے؟ کوئی گناہ نہیں کیا؟ محبت کرتے تھے ہم، شادی کر لی۔ غلطی تمہارے بابا نے

کی۔ کیوں نہیں کی ہماری شادی؟“

”ہاں اتنی سی بات تھی کہ میں تم سے محبت کرتی تھی، پھر اس اتنی سی بات کے لیے میں خود کو کہاں سے

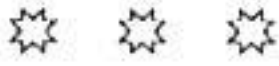
کہاں لے آئی۔ ایک اتنی سی بات کے لیے میں نے اپنے ساتھ کیا کیا؟ اتنی سی چیز محبت کے لیے ”اتنا“ کچھ

کر دیا۔ ایک محبت ہی تو تھی۔ اگر ہم نے غلطی نہیں کی تو اب وہ محبت کہاں گئی جو مجھے تم سے تھی۔“

”اب تم بچھتا رہی ہو؟“

”میں تڑپ رہی ہوں۔“

”شاید یامین خوش نصیب رہا۔“ یامین کے مرنے کے بعد وہ اکثر کہہ دیتی۔



مہیبل نے اپنے باپ کو نہیں دیکھا تھا۔ گھر میں اس کی ایک بھی تصویر نہیں تھی۔ ہاں دعائیں وہ اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا کیا کرتی تھی۔

”جب تم تھوڑی سی بڑی ہو جاؤ گی تو تمہیں میرا ایک کام کرنا ہو گا؟“ عدینہ اس سے اکثر کہتی۔

”میں آپ سے کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ میں کروں گی۔ آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔“

”اگر میں مرجاؤں تو میں نے لا کر میں ریکارڈنگ کر کے رکھ دی ہے تم وہ لے لینا۔“

”میں وہ لے لوں گی اور آپ کا کام کروں گی۔“ اسکول سے آنے کے بعد مہیبل کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس گھر میں واپس آئے۔ اسے اپنی ماں سے کوفت ہوئی تھی۔ وہ عام ماؤں کی طرح نہیں تھی۔

وہ ہر وقت اس سے اپنا کوئی نہ کوئی کام کرواتی رہتی تھی، کچھ نہ کچھ پوچھتی رہتی تھی۔

”تم نے کل رات خواب میں کیا دیکھا؟“

”میں نے دیکھا کہ میں ایک درخت کے نیچے کھڑی ہوں۔ درخت کے سبز پتے میری جھولی میں گر رہے ہیں۔“

”اچھا۔ پھر کیا ہوا؟“

”خواب ختم ہو گیا۔“

”نہیں! تم یاد کرو وہاں کہیں قریب ہی میں بھی ہوں گی۔ سبز خوش حالی کی علامت ہوتا ہے۔ یاد کرو کوئی پتا میری گود میں بھی گرا ہو گا۔“

”مجھے یاد ہے، آپ وہاں نہیں تھیں۔ پھر میری آنکھ کھل گئی تھی۔“

اس کی ماں کو وہم تھا کہ خدا فرشتہ صفت ”مہیبل“ کے ذریعے اسے اپنی معافی کا کوئی اشارہ دے گا۔ خواب کے ذریعے خیال یا الہام کے ذریعے۔ وہ مہیبل کی باتوں کو غور سے سنتی۔ اسے کریدتی سوال پر سوال کرتی۔

”تم نے اپنے ذہن پر بہت بوجھ ڈال لیا ہے۔ میں تمہیں کچھ ہفتوں کے لیے اکیلا چھوڑتا ہوں، تم آرام سے سوچنا۔“

”تم مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا میں۔“

چند ہفتوں بعد وہ واپس آیا تو اس کا فیصلہ وہیں کا وہیں تھا۔ ”خود سے الگ کر کے تم مجھے کیوں سزا دے رہی ہو؟“

”میں خود کو سزا دے رہی ہوں۔ آج سے شروع کروں گی تو کچھ کمی کروا پاؤں گی۔ رائی کے دانے کے برابر ہی سی۔“

”میرے بدلے اب تمہیں رائی کا دانہ چاہیے۔“

”مجھ سمیت ہر چیز کے بدلے۔ اسے معمولی نہ سمجھو یامین۔“

وہ اپنی بات پر سختی سے قائم رہی۔ یامین بھی کسی صورت اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسے ڈرانے کے لیے، پرانی محبت یاد دلانے کے لیے ایک دن اس نے تیز دھار بلیڈ اپنی گردن پر رکھ دیا۔

”میں خود کو مار لوں گا، تمہیں اپنا فیصلہ بدلنا ہو گا۔“

”تم ایک اور غلطی کرو گے۔“

”تم سمجھتی ہو میں مذاق کر رہا ہوں۔“

”میں سمجھتی ہوں تم وقت برباد کر رہے ہو۔“

”تم نے اکیلے ہی میرے اور اپنے لیے فیصلہ کر لیا۔ میں کیا کروں گا؟“

”وہی جو میں کروں گی۔“

اس کے ایسے رویے نے یامین کو اس قدر دل برداشتہ کیا کہ اس نے بلیڈ کو سختی اور تیزی سے اپنی گردن پر رگڑ دیا۔ جس وقت وہ فرش پر گرا اور اس کا خون پھیلنے لگا، اس وقت عدینہ کو احساس ہوا کہ اپنی جان دے دینا کس قدر بڑی قربانی ہے۔

”پھر میں نے یہ قربانی ”یامین“ کے لیے کیوں دی۔“

یامین گردن کے کٹنے سے تو نہیں مر سکا، لیکن عدینہ کے رویے کی سختی نے اس کا دل پاش پاش کر دیا اور وہ داغ کی نس پھٹ جانے سے مر گیا۔

ایک بار اس نے اس کے لیے لٹچ بنایا اور وہ اسے اتنا اچھا لگا کہ اس نے کہہ دیا۔ ”آپ بہت اچھی ہیں ماں۔“
 کچن میں کام کرتی وہ جھٹکے سے پلٹی۔ ”تمہیں کیسے پتا؟“

”کیا ماں۔“

”کہ میں اچھی ہوں۔“

”آپ نے مجھے اتنا مزے دار لٹچ بنا کر دیا ہے اس لیے۔“

”تو تم یہ کہہ سکتی تھیں کہ لٹچ اچھا ہے۔ تم نے یہ ہی کیوں کہا کہ میں اچھی ہوں۔ کس نے کہا تم سے مجھ سے یہ کہنے کے لیے۔“

”کون کہے گا؟“ اس نے حیرت سے منہ کھول کر دیکھا۔

”خدا۔ وہ بچوں کے ذریعے بہت کچھ کہلوا دیتا ہے۔ فرشتے بچوں کے کانوں میں خدا کے پیغامات اتارتے ہیں۔“

”کیسے پیغامات؟“

”وہی پیغامات جو ہمیں چاہیے ہوتے ہیں۔ بچپن میں میری چھوٹی بہن بابا کو کہا کرتی تھی۔ ”وہ آپ کو بلا رہا ہے۔“ وہ آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہتی تھی۔ بابا مجھے ان کی موت آنے والی ہے، لیکن دراصل خدا انہیں اپنے گھر مسمان نوازی کے لیے بلا رہا تھا۔“

”آپ بھی خدا کے گھر جانا چاہتی ہیں؟ آپ بھی مسمان بننا چاہتی ہیں؟“

”مسمانوں کی فہرست سے اپنا نام میں خود کٹوا چکی ہوں سبیل۔“

وہ سوتے میں نظر آنے والے اپنے خوابوں کی تعبیروں کو کتابوں میں کھنگالتی پھرتی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ تعبیروں کو پڑھتے اس کے چہرے پر چمک آئی ہو۔

”آپ خدا کو چھوڑ دیں۔ بھول جائیں۔“

”اب اس نے چھوڑ دیا۔ پہل میں نے کی۔“

اس کا گھر میں رہنا اور عدینہ سے باتیں کرنا ایک عذاب سے کم نہیں ہوا کرتا تھا۔ وہ کوشش کرنے لگی کہ کہے کم گھر میں رہے۔

”تم مجھ سے دور بھاگ رہی ہونا؟“
 ”میں تنگ آچکی ہوں آپ کی باتوں سے۔ میرے دوست ہنستے ہیں آپ کی باتوں پر۔“
 ”میں چاہتی ہوں کہ وہ مجھ پر ہنسیں، سب مجھ پر ہنسیں شاید پھر میرا بوجھ کم کر دیا جائے۔“
 ”آپ میرے دوستوں سے بھی کہتی ہیں کہ وہ خدا سے آپ کی سفارش کریں۔ آپ ان سے بھی ایسی باتیں کرتی ہیں۔“

”آخر اس میں برائی کیا ہے؟“

”اس میں اچھائی بھی کیا ہے؟“

”دعا کرنا اچھا ہوتا ہے سبیل۔!“

”تو پھر یہ اچھا کام آپ خود کریں۔“

”تمہیں اپنی ماں کے درد کو کچھ تو سمجھنا چاہیے۔“

”میری ماں کو بھی میری حالت کو سمجھنا چاہیے۔“

مجھے آپ کی یہ الٹی سیدھی حرکتیں پسند نہیں ہیں۔“

”تمہیں اپنی ماں ہی پسند نہیں ہے۔“

”آپ نے کبھی کوشش ہی نہیں کی کہ میں آپ کو پسند کروں۔ آپ مجھے ہر رات عجیب و غریب کہانیاں سناتی ہیں۔ آپ کو کیوں یہ لگتا ہے کہ مجھے آپ کے ماں باپ میں دلچسپی ہوگی۔ آپ کی پہلی زندگی میں؟ آپ کے بھائیوں، بہنوں میں؟ آپ کے بیٹوں میں؟“
 ”وہ تمہارے نانا، نانی ہیں، تمہارے بھائی ہیں۔“

”ماں! رشتے ناموں سے گنوا کر یاد نہیں کروائے جاسکتے۔ میں اور آپ اس گھر میں اکیلے رہتے ہیں، یہ ہی حقیقت ہے۔ اگر مجھے کسی میں دلچسپی ہے تو اپنے باپ میں ہے۔ بابا کی تصویر تک تو آپ مجھے دکھاتی نہیں ہیں۔ آپ سب کے بارے میں بتاتی ہیں ایک سوائے بابا کے۔“

”میں نے زندگی میں تم سے کبھی کچھ نہیں چھپایا۔ جیسے جیسے تم بڑی ہوتی جاؤ گی، میں تمہیں سب بتاتی جاؤں گی۔“

”مجھے کچھ بھی جاننے میں دلچسپی نہیں رہی۔ آپ صرف یہ بتادیں کہ آپ بابا کی تصویر مجھے کیوں نہیں دکھاتیں۔“

سب دھواں نظر آنے لگتا ہے، سب گھاس پھوس ہو جاتا ہے۔“

”آپ اپنے ساتھ میری زندگی بھی برباد کر رہی ہیں۔ میری عمر دس سال ہے، لیکن آپ نے مجھے وقت سے پہلے بڑا کر دیا ہے۔“

”میں کسی بھی وقت تمہیں چھوڑ کر جاسکتی ہوں۔ تمہیں بڑا کر رہی ہوں تاکہ تم اکیلے زندگی گزار سکو۔“

”میں اکیلے زندگی گزارنے سے نہیں ڈرتی۔ میں آپ جیسی زندگی گزارنے سے نالاں ہوں۔“

”اللہ نہ کرے تمہیں مجھ جیسی زندگی گزارنی پڑے۔“

”آپ سمجھتی نہیں۔۔۔ میں اپنی زندگی میں کچھ بھی کروں گی، آپ کی طرح واویلہ نہیں کروں گی۔“

”تمہیں واویلہ نہ کرنا پڑے سبیل۔ کاش میں دعا کا حق رکھتی، کاش میں اپنا حق نہ گنوا دیتی تو میں تمہارے لیے دعا کرتی۔ میں دعا کرتی کہ۔۔۔ خدا امہیل کو اپنے پیاروں میں رکھے۔ خدا امہیل کو اپنا پیار عطا کرے۔“

”یہ دنیا دعاؤں پر چلتی ہے نا، میری زندگی چلے گی۔“

”یہ دنیا دعاؤں قبول کرنے والے کی مرضی سے ضرور چلتی ہے۔“



اسے اپنی ماں کے رویے کی جتنی عادت ہو چکی تھی اتنا ہی وہ اس سے عاجز آچکی تھی۔ وہ زیادہ تر اپنی ماں سے دور رہنے کی کوشش کرتی۔ اپنے کمرے میں رہتی یا باہر اپنے دوستوں کے ساتھ۔۔۔ ماں حجاب سے آنے کے بعد گھانا بناتی اور خود بھی باہر نکل جاتی۔ وہ

کانفرنسوں میں شریک ہوتی، اسکالرز کے لیکچرز سنتی، کتابیں پڑھتی، باقاعدگی سے لائبریری جاتی۔ ایسی کسی بھی کانفرنس سے آنے کے بعد وہ کچھ دن تو بہت پرسکون رہتی یا کسی اسکالر سے ملنے کے بعد وہ چند راتیں سکون سے سوتی۔

”وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں مجھ سے بھی زیادہ گناہ گار موجود ہیں۔ گناہوں کی زیادتی سے گھبرانا نہیں چاہیے“

”میں تو تمہیں اپنی شکل بھی نہیں دکھانا چاہتی۔ ہم دونوں تمہارے گناہ گار ہیں سبیل۔ ہم اندھے ہو گئے تھے۔ ہم نے تمہیں دنیا میں اکیلا کر دیا۔ اگر ہم گھر سے نہ نکلتے تو تم اچھے شریف خاندان میں پیدا ہوتیں۔ تمہاری اچھی تربیت ہوتی، تمہیں رشتے دار ملتے، تمہیں ان کی نیک تمنائیں ملتیں۔ تم دس سال کی ہونے والی ہو اور تمہیں آج تک کسی کی طرف سے نیک دعائیں نہیں ملیں۔“

”جب آپ دس سال کی تھیں تو کیا آپ کو ملی تھیں؟“

”میری ماں اٹھتے بیٹھتے کہا کرتی تھی کہ خدا تمہیں سرسبز و شاداب رکھے۔“

عدینہ کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ ”اور ایسا ہوا۔۔۔ جب تک میں اپنے باپ کے گھر میں تھی ایسا ہی ہوا۔“

”نہیں ایسا نہیں ہوا۔ ایسا ہوتا تو آپ سبکی نہ ہو جاتیں۔ ثابت ہوا کہ نیک تمنائوں یا دعاؤں سے فرق نہیں پڑتا۔“

”دعا میں کبھی رد نہیں ہوتیں۔ کیا پتا یہ سبزہ مجھے دوسرے جہاں میں مل جائے۔“

”اگر آپ اتنی ہی پر امید ہیں تو مجھے کیوں آدھی آدھی رات کو اٹھا کر کہتی ہیں کہ میں آپ کے لیے دعا کروں۔ آپ اپنی ماں کی دعاؤں کے سہارے وقت کیوں نہیں گزار لیتیں۔ آپ نے بابا سے شادی کی یہ آپ کا فیصلہ تھا، اس فیصلے پر قائم رہیں۔ ہماری خیر کہتی ہیں کسی بھی پروجیکٹ کی کامیابی کا انحصار اس پر کیے جانے والے اعتماد پر ہے۔ آپ کو اپنے کام پر یقین نہیں ہے تو آپ ناکام ہیں۔“

”جب تک مجھے میرے ٹھیک ہونے کا یقین تھا میں کامیاب تھی، جب میں نے حقیقی یقین پالیا، میں ناکام ہو گئی۔“

”پھر آپ ایسے حقیقی یقین کو بھول جائیں جو آپ کو ناکام کر رہا ہے۔“

”یہ بھی میں نے اب جانا ہے سبیل۔ حقیقی یقین جب حاصل ہو جائے تو پھر کچھ اور تمنا نہیں رہتی۔“

خدا کی رحمت پر یقین رکھنا چاہیے۔“

وہ گنگنائے ہوئے کھانا پکائی کھانا کھاتی اپنے بال بناتی، اچھے کپڑے پہنتی، دونوں خریداری کے لیے جاتیں، یا لٹچ باہر کرتیں اور پھر چند دنوں بعد وہ پھر سے اسی حالت میں آجاتی۔ کمرہ بند کر کے روتی رہتی۔ کھانا پینا بھول جاتی اور میبل کو دعا کرنے کے لیے کہتی۔
”آپ اپنے لیے خود ایک مصیبت بن چکی ہیں۔“
میبل چڑ کر کہتی۔

”یہ میرے بس میں نہیں میبل!“

”تو کریں نہ بس میں اپنے۔ اپنا علاج کریں۔“

”بیمار تو میں نے خود کو کر لیا ہے، لیکن علاج میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ تم میرے لیے شفا مانگ لاؤ۔“
میبل۔

”پلیز مجھ سے ایسی باتیں نہ کریں۔ آپ چاہتی ہیں میں آپ کا گھر چھوڑ دوں؟“
”میں نے سب کچھ چھوڑ دیا تو مجھے بھی چھوڑا جانا بنتا ہے، چھوڑ دو مجھے۔“

اس نے کہہ تو دیا تھا کہ وہ فوسٹر ہوم چلی جائے گی، لیکن وہ جا نہیں سکی۔ کچھ بھی تھا لیکن اسے اپنی ماں سے ہمدردی تھی۔ تھوڑی سی ہی سہی لیکن وہ اپنی ماں سے محبت کرنے پر مجبور تھی۔

”آپ بھول گیوں نہیں جاتیں جو کچھ ماضی میں ہوا۔“ ایک دن وہ اپنی ماں کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہہ رہی تھی۔

”تم دعا کرو میں بھول جاؤں۔“

”ہر کام دعا سے نہیں ہوتا ماں۔“

”دعا سے سب کام ہو جاتے ہیں۔“

”آپ گلٹ کا شکار ہیں۔ ایسا ہو جاتا ہے، لیکن اس کے لیے آپ اپنی اور میری زندگی برباد کر رہی ہیں، آپ نارمل نہیں ہیں۔“

”میبل! تم میرے دل کی حالت نہیں جانتیں۔“
”جانتی ہوں، آپ کمرے میں بھی خود کو بند کر لیتی ہیں۔“

”ہاں۔! کمرے میں وارڈروب میں کپڑوں کے

ڈھیر میں، میں خود کو چھپا لیتی ہوں۔“

حیرت سے منہ کھولے وہ اپنی ماں کو دیکھنے لگی۔ یہ بات اسے پہلی بار معلوم ہوئی تھی۔ ”آپ کو ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔“

”میں خدا سے چھپ جانا چاہتی ہوں۔ میرا باپ میری طرف اشارے کر کر کے خدا کو بتاتا ہو گا کہ دیکھو یہ ہے میری وہ بیٹی جس کے پیدا ہوتے ہی میں نے اپنا منہ اس کے کان سے لگا کر ”اللہ اکبر“ کہا تھا۔ وہ میری طرف اشارہ کرتا ہو گا اور پھر شرم سے منہ موڑ لیتا ہو گا۔“

”آپ خود تو پاگل ہو ہی چکی ہیں۔ آپ کا ارادہ مجھے بھی پاگل کر دینے کا ہے۔ آپ کو مجھ پر ترس نہیں آتا۔“

”تمہیں مجھ پر ترس نہیں آتا میبل!“

”مجھے آپ پر غصہ آتا ہے ماں۔!“

عدینہ نے بے چارگی سے میبل کو دیکھا۔ ”آئندہ سے میں خاموش رہا کروں گی۔“

میبل جانتی تھی کہ اس کی ماں جھوٹ بول رہی ہے، وہ کچھ دن خاموش رہنے کا تکلف ضرور کرے گی، لیکن پھر وہ پہلے سے بھی بدتر ہو جائے گی۔ جیسے ہی میبل اسے میسر آئے گی وہ اس کے کانوں پر اپنی زبان کھول دے گی۔

”آپ شادی کر لیں۔“ تیرہ سال کی عمر میں میبل نے اپنی ماں کو مشورہ دیا۔

”تمہیں شرم آتی چاہیے اپنی ماں سے ایسی بات کرتے ہوئے۔“

”آپ کو زندگی کے ساتھی کی ضرورت ہے جو آپ کے دکھ درد کو محسوس کرے۔“

”تم چاہتی ہو میں ایک اور گڑھے میں گر جاؤں۔“
”ایسا کوئی گڑھا نہیں ہے جس میں آپ گری ہوئی ہیں، سب آپ کا وہم ہے۔“

”میں دودھ پینے والے اُحد اور اپنے باپ کی انگلی پکڑ کر مسجد جانے والے اُحت کو پیچھے چھوڑ آئی ہوں۔ جیسے جیسے وہ بڑے ہو رہے ہیں، میرا گڑھا بڑا ہوتا جا رہا

”آپ کسی اسکالر کے پاس جائیں اور سب قبول کر لیں، آپ کے دل کو اطمینان ہو گا۔“

”ایسا میں کئی بار کر چکی ہوں۔ اب تو جب تک میں زندہ ہوں مجھے یہ سب بھگتنا ہی ہو گا۔“

”تو پھر خاموشی سے بھگتیں، آپ یہ کیوں چاہتی ہیں کہ میں بھی بھگتوں؟“



خاموشی وہ واحد چیز تھی جس کی ان دونوں کو اشد ضرورت تھی۔ سمیبل خاموش رہتی، لیکن وہ عدینہ کو خاموش رہنے پر مجبور کرنے سے قاصر تھی۔ عدینہ اگر اس سے بات نہیں کرتی تھی تو پتا نہیں کن کن لوگوں کو سنا دیا جائے، گھر بڑا کران کے سامنے روتی رہتی۔ ان سے لمبی لمبی باتیں کرتی۔ کبھی کبھی تو وہ انجان لوگوں کو اپنے گھر میں رکنے کی اجازت بھی دے دیتی اور رات دن ان کی خدمت گزاری میں ایک کر دیتی۔ جیسے وہ لوگ اس کے نجات دہندہ ہوں۔ ان کے گھر میں ایک ہی کمرہ تھا، دوسرا کمرہ جو سمیبل کا تھا وہ کمرے کے نام پر خاصا بڑا دھبا تھا۔ جب کوئی ایسا مہمان ان کے گھر آتا تو عدینہ اسے اپنا کمرہ دے دیتی اور خود وہ سمیبل کے کمرے میں آجاتی۔ سمیبل اب اس کی موجودگی میں سو نہیں سکتی تھی۔ جب وہ نو سال کی ہوئی تھی تب سے ہی اس نے عدینہ کے ساتھ ایک ہی بیڈ پر سونے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ عدینہ کی حرکتوں سے تنگ آچکی تھی، اب وہ مزید انہیں نہیں جھیل سکتی تھی۔

عدینہ کو پارٹیشن لگوا کر بیٹھک کا کچھ حصہ اس کے کمرے کے طور پر مختص کرنا پڑا۔ سات آٹھ ماہ بعد عدینہ سمیبل کے کمرے کو لینے کی ضد کرنے لگی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے کمرے میں پوری طرح سے اس کی نحوست کا قبضہ ہو چکا ہے، ایک سمیبل کا ہی کمرہ بچا ہے جو ایسی نحوست سے محفوظ ہو سکتا ہے۔ سمیبل کو اور کیا چاہیے تھا وہ اپنے چھوٹے سے کمرے کو چھوڑ کر عدینہ کے بڑے کمرے میں آگئی۔ کچھ عرصے بعد عدینہ نے

وہ گھر بیچ دیا اور نیا گھر لے لیا۔ یہ ان کا اب تک کا چوتھا گھر تھا جو انہوں نے بدلا تھا۔ درمیان میں وہ کئی کرائے کے گھروں میں بھی رہتی رہی تھیں۔ سمیبل اس صورت حال سے پریشان تھی۔ لیکن وہ عدینہ کو باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ کمرے کی طرح جب گھر میں بھی اس کی نحوست درودیاوار میں سما جاتی تو وہ گھر بدل لینے پر بضد ہو جاتی۔

گھر بدلنے بدلتے شاید وہ سارا امریکہ چھان لیتی اگر اسے یہ ڈرنہ ہوتا کہ ایک دن وہ اچانک مر گئی تو سمیبل کہاں جائے گی۔ اسے سمیبل کے لیے گھر لینا ہی پڑتا۔ آج کل وہ جس گھر میں رہ رہی تھیں یہ انہیں اس لیے ستم لگ گیا تھا، کیونکہ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ آسیب زدہ ہے اور پچاس سال پہلے یہاں ایک جوان لڑکی کا قتل ہو گیا تھا۔ جس کا قتل ہو گیا تھا وہ بدروح بن کر گھر میں گھومتی تھی۔ یہ بدروح کسی جوان لڑکی کو زندہ نہیں چھوڑتی۔ پچاس سالوں میں بمشکل چند کرائے دار گھر میں آئے، وہ بھی مستقل نہیں رہ سکے تھے۔ گھر اتنا بڑا تھا کہ تین تو صرف بیڈروم ہی تھے۔ گھر کے اطراف جو کھلی جگہ تھی اس کے اطراف باڑ لگی ہوئی تھی۔ باڑ کے اس طرف لگے درخت ”میری“ کے قاتل کے انتظار میں تھے۔ کھڑکیوں سے ٹکرا کر آنے والی ہوائیں ”میری“ کی آخری سانسوں کی بو سے بو جھل تھیں۔

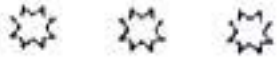
سمیبل کو کسی بدروح سے ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی، وہ خود ایک بدروح کے ساتھ رہتی رہی تھی۔ جب ڈیلر نے اس گھر کے بارے میں بتایا اور انہیں مشورہ دیا کہ اگر وہ بہادر اور یروشن خیال ہیں تو اس مکان کو فوراً ”خرید لیں۔ عدینہ تلخی سے مسکرا دی۔

”میں تو چاہتی ہوں کہ یہ آسیب زدہ ہو۔ یہاں بدروح آباد ہو۔“

اس کی ماں نے اس گھر کو خریدنے میں اتنی جلدی کی اور اتنے جوش کا اظہار کیا کہ ڈیلر تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ ماں کو تو ایک قیمت میں دو چیزیں مل رہی تھیں۔ گھر بھی اور مفت میں بدروح بھی۔ اب وہ اکثر رات کو

”اس سے بہتر بھی نہیں ہوں۔“

سبیل کے جو چند ایک دوست تھے اب وہ انہیں اس گھر میں نہیں لاسکتی تھی، البتہ وہ اکثر ان کے گھر جایا کرتی تھی۔ دوسروں کے گھروں کا ماحول اسے اپنے گھر سے اور بد دل کر دیتا تھا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر اس کے گھر کا ماحول بھی نارمل ہوتا۔ اس کی ماں جاب سے آتی، میز پر کھانا لگاتی، وہ مل کرٹی وی دیکھتیں اور پھر سو جاتیں۔



وہ سو رہی تھی کہ ام ہانی نے اسے جگایا۔ ”میں تمہارے پاؤں کی رسی ڈھیلی کر دیتی ہوں، تم کو نے میں موجود اس بھوسے کے اندر دبک جاؤ۔“ اس نے رسی ڈھیلی کر دی تب بھی وہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں۔ سبیل نے ام ہانی کی دو انگلیاں بے کار کر دی تھیں۔ اس نے ہاتھ پر پٹی باندھی ہوئی تھی۔ بالآخر وہ خود ہی اسے بھوسے کے ڈھیر کی طرف گھسیٹنے لگی، جبکہ وہ خود کو اس ڈھیر سے دور رکھ رہی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے وہ خود تو ہانپنے ہی لگی تھی، سبیل کا بھی تکلیف کے مارے برا حال تھا۔

”تم میرے ہاتھ کھولو، میں تمہاری دونوں ٹانگیں بھی بے کار کر دوں گی۔“ سبیل نے دل میں سوچا۔ ”آخر کار اسے اس کے گرد اجناس کی بوریوں کا ڈھیر لگانا پڑا۔ کچھ بوریاں وہ گھر کے دوسرے حصے سے گھسیٹ کر لائی، کچھ اور سامان اور بستر بھی۔“ ”میرا شوہر کام کے لیے باہر ہے، بچوں کو تمہارے بارے میں معلوم نہیں ہے۔ میں اکیلی یہ سب نہیں کر سکتی، تم سمجھ کیوں نہیں رہی ہو۔“

تھوڑی بہت حرکت سے وہ جتنا کر سکتی، اتنا وہ کر رہی تھی۔ وہ اس کے لائے سامان کو گرارہی تھی۔

”مجھے نہیں معلوم موسیٰ تمہیں یہاں کیوں لایا ہے۔ اپنی دو انگلیاں میں تمہارے منہ سے شہید کروا چکی ہوں۔ آگے بھی مجھے نظر آرہا ہے کہ تم کم سے کم میرا ایک ہاتھ تو بے کار کر کے ہی جاؤ گی، لیکن پھر بھی میں تمہیں نوالے بنا کر کھلانے کے لیے تیار ہوں۔“

ساری بتیاں بجھا کر موم بتی ہاتھ میں لے کر گھر کے چکر لگایا کرتی۔ ایک دن سبیل نے ماں کو تہ خانے میں موم بتی کو فرش پر رکھے اندھیرے میں زمین پر بیٹھے دیکھا۔ وہ ہولے ہولے کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

”آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟“

”میں میری کا انتظار کر رہی ہوں۔“

”آپ اس کا انتظار کیوں کر رہی ہیں۔ وہ مر چکی ہے، بلکہ قتل ہوئی ہے۔“

”اگر وہ واقعی بدروح ہے تو وہ مجھے بھی بہت کچھ بتا دے گی۔“

”آپ بدروحوں کو تو چھوڑ دیں، آپ انہیں بھی میرے جیسا بنانا چاہتی ہیں۔“

”جیسے انسان ایک دوسرے سے ملتے ہیں، وہ بھی باقی کی روحوں سے ملتی ہوگی، وہ بابا سے ملی ہوگی۔“

”ہم ان انسانوں سے ملتے ہیں جنہیں ہم جانتے ہیں، وہ آپ کے بابا کو نہیں جانتی۔“

”میں اسے بابا کے بارے میں بتاؤں گی، وہ جان جائے گی۔“

”ہاں جان جائے گی، اگر وہ اجرت پر کام کرنا چاہتی ہو یا وہ آپ کے کام آنا چاہے۔ اگر وہ سمجھ دار ہوئی تو وہ آپ کے پاس آنے کی غلطی ہرگز نہیں کرے گی۔“

وہ واقعی سمجھ دار نکلی تھی اور اس نے عدینہ کے پاس آنے کی غلطی نہیں کی۔ پھر بھی عدینہ اکثر اسے راتوں کو تلاش کیا کرتی تھی۔ اس کے کان ہر وقت کھڑے رہتے اور اسے لگتا کہ میری اب آئی کہ اب آئی۔ اس نے میز پر موم بتی جلا کر کچھ لکیریں کھینچ کر بھی اسے بلانا چاہا، لیکن وہ نہیں آئی۔

”تم نے دیکھا ایک بدروح بھی مجھ سے دور بھاگتی ہے۔“

”آپ کو یقین ہے کہ یہاں کوئی بدروح رہتی ہے۔“

”ہاں یقین ہے۔ جیسے میں اس دنیا میں رہتی ہوں۔“

”آپ بدروح نہیں ہیں۔“

میں سارا دن اور میرا شوہر ساری رات اپنے گھر کا پہرہ دیتے ہیں۔ میں دن بھر گھر کے دروازے پر کھڑی ہو کر دیکھتی رہتی ہوں کہ کوئی آنے جائے۔ جیسے ہی کوئی گاڑی یا اجنبی مجھے آتا ہوا نظر آتا ہے میرا دل پتے کی طرح کانپنے لگتا ہے۔ تمہیں یقین کیوں نہیں آرہا کہ میں نہیں نقصان پہنچانا نہیں چاہتی۔ ایک گاڑی دو گھنٹے سے گاؤں میں گھوم رہی ہے۔ میں نے سوچا تمہیں چھپا دوں۔“

اسے یقین آگیا کہ وہ اسے نقصان پہنچانا نہیں چاہتی، کیونکہ اسے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ موسیٰ اسے وہاں کیوں چھوڑ کر گیا ہے۔ وہ تو جانتی ہی نہیں تھی کہ موسیٰ اور اس کے درمیان کیا چلتا رہا ہے۔ فریڈرک اسے ڈھونڈ رہا ہوگا اور جب تک فریڈرک یہاں ہے موسیٰ یہاں آنے کی غلطی نہیں کرے گا۔ لبنان کی ساری پولیس فریڈرک نے اکٹھی کر لی ہوگی۔ وہ زیادہ دن تک اس کمرے میں بند نہیں رہ سکے گی۔

رات کو وہ اس کے لیے کھانا لائی اور اس کے منہ میں نوالے بنانا کر ڈالنے لگی اور اس کی دو کی طرح تیسری انگلی بھی میبل نے اپنے دانتوں میں دبالی اس بار پہلی دو سے زیادہ شدت سے۔ ام ہانی اپنا ہاتھ دوسرے ہاتھ میں لپیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھ اس نے اپنی گود میں رکھ لیے۔ میبل مزے سے ام ہانی کو دیکھ رہی تھی، تکلیف کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”جب تم نے میری پہلی انگلی اپنے منہ میں لی تھی تو مجھے یاد آیا تھا کہ جب میں چھوٹی تھی تو میں نے ایک کتے کو اتنے پتھر مارے تھے کہ وہ بلبلا کر وہاں سے بھاگ گیا تھا۔ اس سے پہلے مجھے اپنا یہ گناہ یاد نہیں تھا۔ جب تم نے میری دوسری انگلی اپنے منہ میں لی تو مجھے یاد آیا کہ ایک دن میں پہاڑ پر درخت کے سائے میں بیٹھی تھی کہ میں نے دور سے ایک ضعیف راہ گیر کو آتے دیکھا۔ میں اسے اس وقت تک دیکھتی رہی تھی جب تک وہ گڑھے میں گر نہیں گیا۔ میں جانتی تھی اس راستے میں گڑھا ہے۔ میں اس انتظار میں تھی کہ

بوڑھا کب اس گڑھے میں گرتا ہے اور اسے گرتا دیکھ کر میں کیسے لطف لیتی ہوں۔ بوڑھے کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور میں کافی لطف اندوز ہوئی تھی۔ آج تم نے میری تیسری انگلی اپنے دانت سے چبائی ہے اور مجھے یاد آرہا ہے کہ میں زمین پر بیٹھ کر چیونٹیوں کو اپنی انگلیوں کے نیچے مسلاتی تھی، تم نے بھی تھیک ویسے ہی میری انگلی کو اپنے دانتوں سے مسلا ہے۔“

سکوت اگلے حکم تک کمرے کا دربان رہا۔

”میں اپنے اور گناہ یاد کرنا چاہوں گی۔ میں صبح تمہیں پھر کھانا کھلانے آؤں گی۔“

میبل کو اگلی صبح کا انتظار تھا، وہ اس کی چوتھی انگلی جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی اور اسے یاد آئے گا کہ اس نے میبل کو اغوا کرنے والے کی مدد کا گناہ کیا ہے۔



بحر سیاہ میں نیند خانہ بدوش بنی، خواب چشم کو اکھاڑنے پر کمر بستہ رہی۔

اس حالت میں وہ اتنی دیر سے تھی کہ اگر اب اسے کھول دیا جاتا تو اسے کافی وقت لگتا اپنے جسم کو درست حالت میں لانے میں۔ آنکھیں کھولتے ہی اسے روشنی کا احساس ہوا۔ اس نے سر کو گھمایا تو اس کے عین پیچھے دیوار سے کمر لگا کر بیٹھا موسیٰ نظر آیا۔ ”السلام علیکم۔۔۔“ اس کے متوجہ ہونے پر اس نے کہا۔

اس نے نفرت سے اپنی گردن واپس موڑ لی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر بیٹھی اور دیوار سے کمر لگا کر سانس درست کرنے لگی۔

”میں تم پر سلامتی بھیجتا ہوں۔“ اسے موسیٰ لب بھینچے ہنستا ہوا نظر آیا۔ وہ ہنس سکتا تھا، لطف لے سکتا تھا، یہ سب اس نے اسی لیے تو کیا تھا، تاکہ وہ ایک ایک بات اس کے منہ پر واپس مار سکے۔

موسیٰ افسوس کرنے کے لیے تیار تھا کہ اس کا منہ بندھا ہوا ہے اور وہ دوبارہ جواب نہیں دے سکتی۔ ”یہ پانی پی لو۔۔۔ میں تمہارا منہ کھول دیتا ہوں، لیکن

شور نہ کرنا، پھر کچھ کھا لینا۔“

اس نے اپنا سر ہلا کر رضامندی دی کہ وہ چلائے گی نہیں، لیکن اس نے جیسے ہی اس کا منہ کھولا، اس نے چیخیں مارتا شروع کر دیں۔ اسے جلدی سے پھر سے اس کا منہ باندھنا پڑا۔

”اسی لیے ہوٹل میں بھی تمہارا منہ بند کرنا پڑا تھا۔ ضد کبھی بھی سودمند نہیں ہوتی۔“ وہ تاسف سے بولا۔ ”میں نے تمہیں یہاں رکھا ہوا ہے، تمہارے ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں، تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ تمہیں میری بات مان لینا چاہیے۔ اپنا غصہ اور ضد مجھے نہیں دکھانی چاہیے۔“

اس کی آنکھیں گواہی دے رہی تھیں کہ اگر اس کے ہاتھ بندھے ہوئے نہ ہوتے تو وہ اسے بتاتی کہ بات ماننا کسے کہتے ہیں۔

”خدا تو بندے کو ایسے بے بس نہیں کرتا، نہ وہ ہاتھ باندھتا ہے، نہ منہ سیتا ہے، نہ سماعت چھینتا ہے اور نہ بینائی۔ وہ تو آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ پھر بھی ہم اسے اپنی اکڑ دکھاتے ہیں۔“ رک کر اس نے میبل کو دیکھا جو اسے کچا چبا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”صیام فہمی اور تمہارا دوست فریڈرک تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔ تم انہیں اتنی شدت سے مطلوب ہو کہ تمہارے لیے وہ چند لوگوں کے سر قلم کرنے کے لیے بھی تیار ہیں، ہر انسان اپنے فائدے کے لیے دوسروں کو مارنے کے لیے تیار ہے۔ ہر انسان اپنی طلب میں اندھا ہے۔ انہوں نے ہوٹل میں بھی کافی توڑ پھوڑ کی۔ ہوٹل کا مالک کافی زخمی ہے۔ میں بھی اسی لیے یہاں نہیں آسکا کہ انہیں مجھ پر شک نہ ہو جائے۔ تمہارے کمرے کی کھڑکی سے بستر کی چادر باندھ کر لٹکا دی گئی تھی۔ گاؤں سے شہر جانے والے راستے پر تمہاری کچھ چیزیں پھینکی گئیں۔ تمہارا پاسپورٹ اور باقی کاغذات میرے پاس ہیں۔ کچھ لوگوں نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے انہیں یہ بتایا کہ انہوں نے تمہیں رات کے اندھیرے میں شہر کی طرف جانے والے راستوں پر دیکھا تھا۔ تمہیں ان سے چھپانے کی میں نے پوری

کوشش کی ہے اور ہوتا ہی ہے جو اللہ چاہتا ہے۔

میری بہن ام ہانی بہادر عورت تو ہے، لیکن جلد تھک جاتی ہے۔ وہ تھک کر تمہاری ذمہ داری میں کوتاہی نہ کر دے۔ اس لیے مجھے یہاں آنا پڑا۔ تم نے اس کی تین انگلیاں زخمی کر دی ہیں۔ انسان کو دوسروں کو اتنی ہی تکلیف دینی چاہیے جتنی وہ وقت پڑنے پر خود بھگت لے۔ میں تمہیں یہاں لے کر آیا ہوں، اس لیے تم اپنا غصہ مجھ پر نکال سکتی ہو۔ ام ہانی کو اپنے تین بچوں کے لیے کھانا بنانا ہوتا ہے اور ایک ہاتھ سے معذور شوہر کی دیکھ بھال کرنی ہوتی ہے۔ جب میں تمہارا منہ اور ہاتھ کھول دوں گا تم میری ساری انگلیاں چبا جانا میری گردن نوچ لینا، میری ٹانگیں توڑ دینا۔“

”ہاں یہ ایسا کہہ سکتا ہے، کیونکہ کبھی وہ نوبت آئے گی، ہی نہیں کہ میرے ہاتھ کھلے ہوں گے اور میں اس کی گردن نوچ رہی ہوں۔“

”اگر تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو تو میں تمہارا منہ کھول سکتا ہوں، لیکن اگر تم چیخیں تو پھر میں سختی کر سکتا ہوں۔“

اس نے آنکھوں سے اشارہ کیا کہ منہ کھول دے۔ اس نے منہ کھولا تو اس نے اس پر تھوک دیا۔

”تم تو مومن ہو، مجھ جیسی غلاظت کو ہاتھ نہیں لگاؤ گے، یہ بتاؤ کن غلاظت ہاتھوں میں مجھے دینے والے ہو؟“ موسیٰ نے سختی سے اپنے ہونٹ بچھینچ لیے۔ ”تم سمجھتی ہو کہ جو تم سمجھتی ہو وہی ٹھیک ہے، یہ ہی تمہارا سب سے بڑا قصور ہے، خود کو ٹھیک سمجھنا۔“ کہہ کر وہ چلا گیا۔

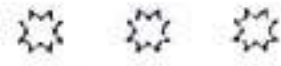
دن میں اس کی بہن پھر کھانا لے کر آئی اور اس کے تین بچوں اور معذور شوہر کے بارے میں جاننے کے باوجود اس نے اس کی چوٹھی انگلی کو اپنے جبرے میں پھنسا لیا اور اس بار وہ اس کے سامنے ہی گھٹنوں کے بل جھک کر زار زار رونے لگی۔

”میں دنیا کے دھندوں میں الجھی ہوئی ہوں اور آرام کی اتنی عادی ہو گئی ہوں کہ خدا کی راہ میں بیٹھ کر اسے پانے کے لیے تیار ہی نہیں، کیسی گناہ گار ہوں

میں۔

”اقرار خدا رسیدہ تھا۔ ساعت ادائے نماز۔“

میبل چپ چاپ ام ہالی کو دیکھنے لگی۔



عدینہ چپ چاپ رہنے لگی تھی۔ وہ میبل سے بھی کوئی بات نہیں کرتی تھی۔ میبل کو تشویش ہوئی۔ ”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟ کچھ دنوں سے آپ بہت خاموش رہنے لگی ہیں۔“

”میں بہت خوف زدہ رہنے لگی ہوں میبل۔“ کپکپاتی آواز میں عدینہ نے کہا اور پھر خاموش ہو گئی۔ میبل کو عدینہ پر بہت ترس آیا۔ وہ دن یہ دن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ کھانا بھی برائے نام کھاتی تھی۔ سودا سلف کی خریداری بھی میبل کو کرنی پڑتی تھی۔ ایک دن وہ سارا دن بستر پر پڑی رہی نہ منہ دھویا نہ کچھ کھایا۔ میبل نے زبردستی چند نوالے کھلائے تو وہ بھی اس نے اگل دیے۔ ”آپ بیمار بھی نہیں ہیں پھر اس سب کا کیا مطلب ہے؟“

”دیکھو میں بیمار بھی نہیں ہوتی، دو دن سے کچھ نہیں کھایا پھر بھی بیمار نہیں ہوتی۔“ میبل نے کوفت سے اسے اکیلا چھوڑ دیا، لیکن آخر کب تک وہ پھر اس کے پاس آئی۔

”ایک ہفتے سے آپ اپنی جاب پر نہیں گئیں گھر میں بند ہیں، وہ آپ کو کام سے نکال دیں گے تو مجھے جاب کرنی پڑے گی، آپ میرے مستقبل کے بارے میں کیوں نہیں سوچتیں۔“

عدینہ ٹٹکنکی باندھ کر میبل کو دیکھتی رہی۔ ”تم میرا ایک کام کرو گی میبل؟“

میبل نے سہم کر عدینہ کو دیکھا۔ ”میں دعا کر دیتی ہوں۔ بس یہ ہی کروں گی، وہ بھی یہیں بیٹھ کر۔“

”ہاں! تم دعا کرو میرے لیے، اپنی ماں کے لیے، تم دوسرے لوگوں سے بھی کہو۔“

”میں اپنی دوستوں کو اپنے گھر نہیں لاؤں گی، وہ اب تک میری تذلیل کرتی ہیں۔“

”تمہاری دوستیں نہیں! اللہ کے بندے۔“

”آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟“

”میبل! تم اپنا ایک دن مجھے دے دو، میں تمہاری منت کرتی ہوں، تمہاری ماں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہے۔“

”ماں! رونا بند کریں۔ میری جان چھوڑ دیں اب۔“ وہ اس ایک دن کا مطلب جانتی تھی۔ جب وہ سات سال کی تھی تب بھی اس نے یہ ایک دن اپنی ماں کو دیا تھا۔ اس کی ماں نے اسے چند جملے ازبر کرا دیے تھے اور ایک مصروف شاہراہ پر چھوڑ دیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بورڈ تھا جس پر لکھا تھا۔ ”اشاپ! سن می پلیز!“ وہ جس کے پاس جا کر کھڑی ہوتی وہ رک جاتا اور جھک کر اس کے پاس بیٹھ جاتا۔

”کہو، میں سن رہا ہوں۔“

”مسٹر! میری ماں بہت بیمار ہے، خدا ان سے ناراض ہے، آپ ان کے لیے دعا کریں۔“

”خدا تمہاری ماں سے راضی ہو۔“

”مس میری ماں کو خدا کی مہربانی چاہیے، آپ دعا کریں۔“

”خدا تمہاری ماں پر مہربان ہو۔“

”سر! ماں کو خدا دوست بنانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ آپ دعا کریں خدا ماں کا دوست بن جائے۔“

”خدا تمہاری ماں کو دوست رکھے۔“

کچھ لوگوں نے اس کے گالوں پر ہار کیا اور۔۔۔ کچھ لوگوں نے اس سے باقی کی تفصیل پوچھنی چاہی۔

کچھ نے اس کی ماں کو گالیاں دیں جو ایک بچی سے یہ کام لے رہی تھی۔ دو گھنٹے بعد ماں اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر لے آئی اور اسے کھانے کے لیے اس کی پسند کا کیک دیا۔

چھ سال بعد وہ پھر سے اسے وہی سب کرنے کے لیے کہہ رہی تھی۔

”میں انکار کرتی ہوں، اب آپ مجھ سے مزید نہیں کھیل سکتیں۔“

”میں نے سنا ہے کہ خدا کے بندے بھی بدل کر

انسانوں میں چلتے پھرتے ہیں، خدا ان کی دعائیں رو نہیں کرتا۔“

”کیا آپ خدا کا بندہ نہیں ہیں؟“

”بندہ تو ہوں، لیکن پیارا نہیں۔“

”میں انکار کرتی ہوں، صاف انکار۔“ وہ کہہ کر چلی گئی۔ وہ کب تک اپنی ماں کے ہاتھ میں کھلونا بن سکتی تھی۔ اس کی ماں تو کہیں بس ہی نہیں کر رہی تھی۔ اگر اس کا کوئی دوست اسے دیکھ لیتا تو؟ کتنی قابل شرم بات تھی کہ وہ سڑک پر راہ گیروں کو روک روک کر یہ کہے کہ وہ اس کی گناہ گار ماں کی بخشش کے لیے دعا کریں۔ وہ اپنا تماشا بنوائے اس سے بہتر ہے، وہ دریا میں چھلانگ لگا دے۔

خاموشی عدینہ کو دیمک بن کر کھوکھلا کرنے لگی۔ اس نے کھانا پینا تقریباً ”ترک کر دیا۔ ایک دن وہ اسکول سے آئی تو اس نے اسے مردہ لوگوں کی طرح بے حس و حرکت پایا۔ وہ ماں کی اس حالت پر بلبلا اٹھی۔

”کیسا خدا ہے ماں آپ کا؟ وہ آپ کو اتنی تکلیف میں دیکھ رہا ہے؟“

”کیسی تکلیف؟ مجھے تو کبھی کوئی تکلیف نہیں ملی۔ جب سے میں امریکا آئی ہوں میں کسی بھی مسئلے سے دوچار نہیں ہوئی۔ کیا تم نہیں جانتی ہو کہ میں کبھی بیمار نہیں ہوئی۔ لوگ حیران ہوتے ہیں جب میں انہیں یہ بتاتی ہوں۔ مجھے اچھی سے اچھی جاب ملی ہے۔ کبھی میرے پاس پیسے ختم نہیں ہوئے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مجھے ٹھنڈ لگی ہو، فلو ہوا ہو، میرے سر میں درد ہی ہوا ہو۔ مجھے تو امریکا کی نیشنلسٹی بھی آرام سے مل گئی۔ مجھ پر کوئی تو مصیبت آئے کہ مجھے معلوم ہو کہ مجھ پر آزمائش آئی ہے۔ دیکھا تم نے اب میں آزمائش کے قابل بھی نہیں ہوں۔“

”آپ خدا کو بھول کیوں نہیں جانتیں؟“

”بھول ہی تو گئی تھی میں۔ اب وہ میرے دل پر ایسے قابض ہو گیا ہے کہ مجھے کسی پل چین نہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں خدا سے اتنی محبت کرنے لگوں گی۔ وہ میرے لیے اتنا خاص ہو جائے گا۔ مجھے کیا

معلوم تھا کہ اسے کیا پسند ہے اور کیا ناپسند ہے۔ مجھے اس کی اتنی پرواہ ہو جائے گی، مجھے پتا ہوتا تو میں سب کچھ کر لیتی بس ایک اسے ناراض نہ کرتی۔ دیکھو خدا کی محبت مجھ پر کب آشکار ہوئی، جب میں محبت کرنے والوں کے دائرے سے ہی نکل گئی۔ جب میں خالی ہاتھ ہو گئی۔ کیا تم میرا کام کرنے کے لیے تیار ہو؟“

”نہیں۔ ہرگز نہیں۔“

پہلے تو ماں نے درخواست گزار انداز سے میبل کو دیکھا، پھر وہ اٹھی اور کرسی پر بیٹھی میبل کے پاس آئی اور اس کے قدموں میں بیٹھ گئی اور اپنا سر میبل کے قدموں میں رکھ دیا۔ ”مجھے معافی دلو اور میبل۔ میرے لیے کوئی خدا کا بندہ ڈھونڈ لاؤ۔ مجھے کوئی خدا کا پیارا تلاش کر دو جس کی بات خدا رد نہ کرے۔ میرے لیے اسے ڈھونڈ لاؤ، سیبل۔ میرے لیے وہ دعا کرو اور جسے مقبول نہ کیا جائے۔ میرے لیے کوئی عیسیٰ جیسا لے آؤ کہ وہ میرے زخم مندمل کر دے، کوئی موسیٰ جو خدا سے میرے لیے کلام کرے، میرے لیے درخواست کرے۔“

کھڑکیاں کھل گئیں، میری کی آخری سانسوں سے معمور ہوا سیبل کے کانوں سے دہن میں گھس گئی۔ اس کی ماں کا سر اتنا وزن ہو گا اسے اندازہ نہیں تھا۔ اس کی ماں کے آنسو اتنے طاقتور ہوں گے اسے معلوم نہیں تھا۔ ”خدا کا پیارا؟ عیسیٰ، موسیٰ؟“ اس کا دل بو جھل ہو گیا۔ وہ تیزی سے گھر سے باہر بھاگی اور دور بہت دور تک بھاگتی رہی۔ تھک گئی تو سڑک کے کنارے بیٹھ کر ہانپنے لگی۔

”کیا تم ٹھیک ہو؟“ ایک بوڑھا جھک کر اس سے پوچھ رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

”میں ٹھیک نہیں ہوں۔ میری ماں بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ماں چاہتی ہے کہ اس کے لیے دعا کی جائے۔ وہ چاہتی ہے کہ اسے خدا سے معافی دلوادی جائے، آپ میری ماں کے لیے دعا کریں۔“

”خدا تمہاری ماں پر رحم کرے۔“

اس نے خود کو کھڑا کیا اور اپنے قدموں کو چلنے پر

نہیں کرے گا۔ جو خدا سے دعا کرے گا۔ جو خدا سے کلام کرے گا۔

”مجھ پر مہربانی کیجئے“ میرے ساتھ میرے گھر آئیں، میری ماں کو صبح موت دلواد دیجئے۔“

”تمہیں اور تمہاری ماں کو ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔“

”خدا آپ پر مہربان ہو، میری ماں پر مہربانی کی دعا کیجئے۔“

”دیر ہو چکی ہے ہم سب نے خدا کو ناراض کر دیا ہے۔“

”آپ کا چہرہ جس سکون سے منور ہے میری ماں اس سکون کے لیے ترستی ہے۔ دعا کیجئے اس کا چہرہ بھی ایسا ہی روشن ہو جائے۔“

”خدا تمہاری ماں کو بھی ایسا ہی سکون عطا کرے۔“

”کیا آپ وہ ہیں جن کی دعا رو نہیں ہوتی، میری ماں کے لیے ایک ”مقدس“ دعا کر دیں۔“

دن رخصت ہوا شام رات کی میزبان ہوئی۔

”کیا آپ خدا کے بندے ہیں؟“

”کیا آپ خدا کے پیارے ہیں؟“

”کیا خدا آپ کی دعا میں قبول کرتا ہے؟“

”کیا آپ اصحاب الیچین ہیں؟“

شام خرقہ پوش ہو چکی۔۔۔ رات ”محب رب“ رہی۔

آخری وقت تک وہ تھک کر وہ چور ہو چکی تھی۔

لیکن وہ بس نہیں کر رہی تھی، وہ سارے شہر میں،

ساری دنیا میں خدا کا بندہ ڈھونڈ نکالنا چاہتی تھی۔ لوگوں

کی بھیڑ میں اس نے ایک ایک کو الگ الگ کہا۔ اونچی

پنچی عمارتیں اس کی اس تلاش کی گواہ تھیں۔

اندھیرے کو روشن کرتی روشنیاں اس کی ادا پر فدا

تھیں۔ سڑکوں اور فٹپاٹھوں کی مٹی اس پر نثار تھی۔

اگلی صبح اس کی آنکھ کھلی تو اسے یاد آیا کہ وہ تیوراکر

کہیں گر گئی تھی۔ جہاں وہ گری تھی اگلے دن وہ وہیں

پائی گئی تھی۔ وہ اپنے گھر سے بہت دور آچکی تھی۔ راہ

گیر سے مانگ کر اس نے پانی پیا اور گرتی پڑتی گھر واپس

مجبور۔

”میری ماں بہت تکلیف میں ہے، اس نے جوانی میں اپنے شوہر اور دو بچوں کو چھوڑ دیا تھا، وہ گھر سے بھاگ آئی تھی، اپنے گناہوں پر اسے خدا سے شرم آتی ہے، اس کا ماننا ہے کہ اسے معافی نہیں ملے گی، آپ خدا سے اس کے لیے دعا کر دیں۔“

”خدا اسے معاف کرے۔۔۔“

وہ روتی جا رہی تھی اور اپنی آنکھیں پونچھے بنا جو جو ملتا جا رہا تھا اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی تھی۔

”سرپلیز، ایک منٹ میری بات سنیں۔“ میری ماں

کا کہنا ہے کہ اللہ کے پیارے بھیس بدل کر ہم انسانوں

میں گھومتے ہیں، اگر آپ وہ پیارے ہیں تو پلیز میرے

گھر چلیں، میری ماں کا ہاتھ پکڑ کر اور دعا کے لیے ہاتھ

اٹھا کر اسے خدا کا پیار دلوادیں۔“

”کون خدا، میں کسی خدا کو نہیں جانتا، میں دعا نہیں

کرتا، دفعتاً ہو جاؤ۔“

”مس! میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی، میری

ماں کا نام عدینہ ہے، وہ میرے باپ سے محبت کرتی

تھیں اور اس محبت میں انہوں نے سب چھوڑ دیا، اب

انہیں لگتا ہے کہ خدا نے انہیں چھوڑ دیا، انہیں اب

خدا واپس چاہیے، دعا کیجئے خدا انہیں واپس مل

جائے۔“

”کیا تم پیاگل ہو، جاؤ کسی پادری کے پاس۔۔۔“

”میری ماں کا ماننا ہے کہ اس پر عرصے سے کوئی

مصیبت نازل نہیں ہوئی، اس کی آزمائش نہیں کی گئی،

دعا کیجئے کہ اس پر کوئی آزمائش آجائے، وہ اس کے لیے

بھی تیار ہے کہ اسے کینسر ہو جائے اور وہ ایڑیاں رگڑ

رگڑ کر مرجائے۔ آپ دعا کیجئے۔“

”تم اپنے حواسوں میں نہیں ہو۔“

دن بر گزیدہ ہو گیا۔۔۔ شام اعتکاف سے نکل آئی۔

بروکلین کی سڑکوں کو اپنے قدموں سے روند کر وہ

پیچھے چھوڑ بی رہی۔ اس نے ان سڑکوں پر چلنے والا ایک

راہ گیر بھی نہیں چھوڑا۔ اس نے سب کو روکا۔ وہ آج

خدا کا وہ بندہ ڈھونڈ کر ہی رہے گی جس کی بات خدا رو

آئی۔ اپنے پیٹ میں جلدی سے کچھ اندھیلنے کے بعد وہ اوپر ماں کے کمرے کی طرف بھاگی۔ اس کی ماں اسی انداز میں بیڈ پر موجود تھی جس حالت میں وہ اسے چھوڑ کر گئی تھی۔ اسے ماں کے انداز پر حیرت ہوئی۔ کیا اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ رات بھر گھر نہیں آئی اور اس کے لیے بروکلین کی شاہراؤں پر خدا کا پیارا ڈھونڈتی رہی ہے۔

”میں نے خدا کے کئی پیارے ڈھونڈے لیے ماں! انہوں نے آپ کے لیے دعا کی۔“ وہ چلا اٹھی۔
عدینہ بیڈ سے اچھل کر کھڑی ہو گئی ”کب؟“
”میں بہت سارے لوگوں سے ملی، انہوں نے آپ کے لیے دعا کی۔ میں نے کسی کو نہیں چھوڑا۔ خوش ہو جائیں اب۔“

”تم سچ بول رہی ہو؟“
”آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں رات بھر گھر نہیں آئی؟“
”رات؟ رات آئی تھی؟ رات گزر بھی گئی؟“
”ماں اب ٹھیک ہو جاؤ۔ بس اب ٹھیک ہو جاؤ۔“
وہ اپنی ماں کے پیروں میں بیٹھتی چلی گئی۔
”مجھ سے اپنی اولاد ہونے کا اتنا زیادہ خراج نہ لو۔ جس خدا نے تمہیں چھوڑ دیا ہے مجھے اس خدا کو چھوڑ دینے پر مجبور نہ کرو۔“



وہ اللہ کا کوئی پیارا نہیں ڈھونڈ سکی تھی۔ بروکلین کے بازاروں اور فٹ پاتھوں پر بھیس میں چھپا اسے کوئی نہیں ملا تھا۔ اگر ڈھونڈ لیا ہوتا تو سب ٹھیک ہو چکا ہوتا۔ اس کے کچھ دوستوں نے اسے دیکھ لیا تھا اور وہ کلاس میں مل کر اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ انجیلین کلاس کو باقاعدہ پر فارم کر کے دکھا رہی تھی کہ وہ اونچی عمارتوں کے سائے میں چلتی کیسے لوگوں کو روک روک ان کی منت کر رہی تھی۔ وہ قلم کی نوک سے اپنی انگلیاں ادھیڑنے لگی۔
پرنسپل نے اسے آفس میں بلایا۔ وہ دیر تک اس

سے کئی طرح کے سوالات کرتے رہے لیکن اس نے کسی ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ تھک کر انہوں نے اسے اسکول کے ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا۔ ڈاکٹر نے بھی اس سے ہزار طرح کے سوالات کیے لیکن وہ خاموش رہی۔

”تم تعاون نہیں کر رہیں ایسے پھر تمہارے مسئلہ کیسے معلوم ہو گا۔“

”مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“
”کیا تم جانتیں نہیں اسکول میں کیا بات ہو رہی ہے؟“

”وہ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔“
”تمہاری تصویریں اور ویڈیو بھی جھوٹ بول رہی ہیں؟“

”میں اپنی ذاتی زندگی میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ مجھ سے پوچھ بڑا مال نہ کریں۔“

”کیا تمہاری ماں کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے؟ تم رپورٹ کر سکتی ہو اگر وہ ذہنی طور پر۔“
”وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ میری ماں کو پاگل نہ کہیں۔ اگر آپ کو اسکول کی رپورٹیشن کی فکر ہے تو مجھے اسکول سے نکال دیں۔“

اسے اسکول سے نکالا تو نہیں گیا لیکن اسکول میں ہی رکھ کر عجوبہ بنا دیا گیا۔ وہ چلتی پھرتی باتیں کرتی خاموش رہتی تو بھی سب اسے تشویش سے دیکھتے۔ وہ سر جھکا کر کوئی کتاب پڑھتی تو کوئی نہ کوئی ضرور جھک کر دیکھتا کہ وہ کون سی کتاب پڑھ رہی ہے وہ گھر سے باہر ہوتی تو کوئی نہ کوئی اس کا چھپ کر پیچھا کرتا ہاتھ میں موبائل آن رکھتا۔ اس کے جو چند ایک دوست تھے وہ بھی اس سے دور دور رہنے لگے تھے۔ پھر وہ خود ہی ان سے دور ہو گئی۔

”آپ نے مجھے تنہا کر دیا۔“ وہ گھر آکر ماں پر چلانے لگی۔

”ہم سب تنہا ہیں مہبل۔“
”کیا حاصل ہوا آپ کو مجھ سے یہ سب کروا کر؟“
”کاش تم سمجھ سکتیں۔“

”مل گئی آپ کو معافی؟ آگیا آپ کو سکون؟ اب دوبارہ مجھ سے کسی کو ڈھونڈ کر لانے کے لیے مت کہہیے گا۔ آپ مجھے خود کشی پر مجبور کر رہی ہیں۔“

عدینہ کتنی ہی دیر اسے دیکھتی رہی۔ ”میں اب تم سے کچھ نہیں کہوں گی۔ دوبارہ خود کشی کا نام نہ لینا۔“

”مہربانی ہو گی آپ کی۔ اگر آپ میری اچھی سرپرست نہیں بن سکتیں تو مجھے فوسٹر ہوم میں رکھوا دیں۔ آپ کو زیادہ محنت کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔ آپ کو بس اپنا ذہنی معائنہ کروانا ہو گا اور وہ مجھے رکھ لیں گے۔“

اس دن کے بعد سے سب ٹھیک ہو گیا۔ جب تک سیبیل گھر ہوتی عدینہ گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی، اسے کھانا دیتی، اس سے چند ضروری باتیں کرتی۔ سیبیل نہیں جانتی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں وہ کیا کرتی ہے۔ کس سے ملتی ہے، کس سے کیا کیا کہتی ہے۔ موم بتی لے کر گھر کے کتنے چکر لگاتی ہے، تمہ خانے میں بیٹھ کر کس کا انتظار کرتی ہے، جاب پر جاتے، شاپنگ کرتے، سفر کرتے وہ کتنے لوگوں کو اس سے دیکھتی ہے۔ اس لیے کہ کوئی خدا کا بندہ اس کے پاس آئے گا اور کہے گا۔ ”ڈرو نہیں، اللہ تمہیں معاف کر چکا ہے۔“

اللہ کا یہ بندہ کبھی اس کی زندگی میں نہیں آیا۔ اس نے جتنی۔۔۔ آس سے اس بندے کا انتظار کیا۔ جتنی بھی دعا میں اس بندے کے آنے کے لیے مانگیں۔ ضرورت کے علاوہ وہ اپنے کپڑے، جوتے اور دوسری استعمال کی چیزیں خیرات کر دیتی اور پھر بھی رات کو کمرہ بند کر کے روٹی یا گھر کے اطراف موجود درختوں کے سایوں میں کھڑے ہو کر راز و نیاز کرتی۔ وقت ایسے گزرنے لگا جیسے دواجنسی لوگ ٹرین کے ایک ہی ڈبے میں بیٹھے سفر کر رہے ہوں اور جن میں سے ایک اندھا اور دوسرا گونگا ہو۔ اندھی سیبیل بھی گونگی عدینہ ہو گئی تھی۔



سیبیل کالج جانے لگی تھی۔ وہاں اس کے پرانے

اسکول فیلوز نہیں تھے اور وہ چند دوست بنانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ وہ ان کے ساتھ گھومتی، پھرتی، مزے کرتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان سب کو یہ بھٹک بھی پڑے کہ وہ ان جیسی نارمل زندگی نہیں گزارتی رہی ہے۔ وہ ایک سے ایک نیا فیشن کرنے لگی۔ نت نئے انداز سے بال کٹواتی اور رنگوا لی۔ وہ جاب کرتی تھی اور اپنے سارے پیسے وہ اپنے کپڑوں، جوتوں، میک اپ، پرفیومز پر لگا دیتی تھی کسی کو یہ معلوم نہیں ہوتا چاہیے کہ ساری زندگی اس نے کس عذاب میں گزارتی ہے۔ نارمل نظر آنے کی تک وہ دو میں وہ اور اپنا رمل ہونے لگی۔

ایک دن کالج میں اس کا اپنے اسکول فیلو سے سامنا ہو گیا۔ وہ اسے سر سے پیر تک دیکھنے لگا۔

”یہ تم ہو سیبیل؟“

”تم کون ہو؟“ سیبیل نے بے گم چہلاتے ہوئے پوچھا، جبکہ وہ اسے پہچان چکی تھی۔

”میں۔۔۔؟“ اسے سیبیل کا انداز برے سے زیادہ ہٹک آمیز لگا۔

چند دنوں بعد اس کے نئے دوستوں نے اسے ایک ویڈیو دکھائی۔ ”یہ تم ہی ہو نا سیبیل۔۔۔؟“

”پلیز، میری ماں کے لیے دعا کریں، وہ ایک گناہ گار اور بھٹکی ہوئی عورت ہے۔ وہ اب سیدھا راستہ چاہتی ہے۔“

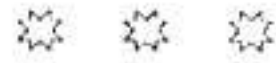
سیبیل نے اپنی ہتھیلی کو اس سختی سے بند کیا کہ اس کے لمبے ناخن اس کی زندگی کی لکیر میں پیوست ہونے لگے۔

”میرے ساتھ گھر چلیں، ایک بار صرف ایک بار، جھوٹ ہی سہی، اس سے کہہ دیں کہ اسے معاف کیا جا چکا ہے۔“

”کیا ہوا تھا تمہیں؟ یقین نہیں آتا کہ یہ تم ہو؟ کیا ہے یہ سب؟“ اس کے دوست پوچھ رہے تھے۔

سیبیل خاموشی سے اٹھ گئی اور پھر وہ پرانے دوست بچا سکی، نہ نئے دوست بنا سکی۔ سب ختم۔ وہ نئے انداز سے ماں سے نفرت کرنے پر مجبور ہو گئی۔ لیکن پھر

ایک اور بار محبت اپنے سب عہد گم کر کے نفرت کے
بجھیس میں التجائیہ آئی۔ اس بار آخری بار۔



مرگی کے مریض کی طرح عدینہ زمین پر بے دم ہو کر
بڑی ہونی تھی۔ ماں کو دیکھتے ہی وہ بری طرح سے ڈر
گئی۔ جلدی سے آگے بڑھ کر اس نے اس کے حلق
میں چند قطرے پانی کے ڈالے اور اسے اٹھا کر صوفے
پر ڈالا۔ عدینہ نے میبل کا ہاتھ پکڑ لیا اور میبل نے باڑ
کے اطراف لگے درختوں کی فاقی و مقتول سے متعلق
سرگوشیاں سن لیں۔ وہ کانپ کر رہ گئی۔ وہ اب اپنی ماں
کی کوئی فرمائش پوری نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ہاتھ
چھڑالینا چاہتی تھی وہ اوپر اپنے کمرے میں بھاگ جانا
چاہتی تھی۔ وہ ماں کو ہی چھوڑ جانا چاہتی تھی۔

”میں نے آج اپنی ایک رشتے دار خاتون کو دیکھا، وہ
ہمارے پڑوس میں رہتی تھی۔ ہمت کر کے میں نے
اس سے احمت اور احد کے بارے میں پوچھا۔ احمت
نے ابھی تک شادی نہیں کی، وہ کسی بھی عورت کو
اپنے گھر میں گھسنے نہیں دیتا۔ احد بھی شادی کرنے کے
لیے تیار نہیں۔ وہ دونوں۔۔۔ میرے بیٹھے۔“

میبل بھاگ کر اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ خود کو
بند کر لیا اور سر پر تکیہ رکھ کر سو گئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو
رات ابھی تک باقی تھی۔ اتنی لمبی رات۔۔۔ اتنی لمبی
زندگی۔ اتنی لمبی آزمائش۔ اس نے پھر سونے کی
کوشش کی، لیکن رات ختم ہونے میں نہیں آ رہی
تھی۔ وہ جانتی تھی اب اس کی ماں اس سے کیا چاہتی
ہے۔ وہ اپنے بچوں سے ملاقات چاہتی تھی۔

صبح اٹھ کر وہ نیچے آئی تو اسے یہ اندازہ لگانے میں
وقت نہیں لگا کہ ماں رات بھر اپنی جگہ سے ایک انچ
نہیں ہلی تھی۔

”میں آپ کے گھر نہیں جاؤں گی۔“ اس نے چلا کر
کہا، ماں نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔
”میں خود جا رہی ہوں، واپس آگئی تو ٹھیک، ورنہ

سمجھ لینا مر گئی۔“

دو دن بعد وہ اپنا سامان پیک کر کے چلی گئی اور وہ دون
بعد ہی واپس آگئی۔

”میں سارا دن اور رات گھر کے آس پاس بھٹکتی
رہی اور اندر جانے کی ہمت نہیں کر سکی۔“ میبل کو
دیکھتے ہی وہ زار و قطار رونے لگی۔

”میں نے ان دونوں کو گھر سے نکلتے دیکھا اور میں
نے ڈر کر اپنا رخ پھیر لیا۔“ وہ میبل کو بھیچے کر رہی
تھی۔

”میبل۔۔۔ میری میبل۔۔۔ میری پیاری
میبل۔۔۔“

حکم رائج الوقت رہا۔۔۔ میبل کے کانوں میں شائیں
شائیں ہونے لگی۔ وہ یک ٹک اپنی ماں کو دیکھنے لگی۔
اس کی سماعت ماں کی گویائی پر درد کنناں ہوئی۔ وہ
جانتی تھی کیا کہا جانے والا ہے۔

”میبل! مجھے معافی لاؤ۔۔۔ میبل! اپنی ماں کا ایک
آخری کام کرو۔“

”ہرگز نہیں۔“ میبل نے انکار بھی کیا اور گھر
چھوڑ کر بھی چلی گئی۔ اس بار وہ اپنی ماں کے ہاتھ آتا
نہیں چاہتی تھی۔ ایک ہفتہ گھر سے دور رہنے کے بعد
وہ گھر آئی تو اپنی ماں کو پہلی بات دہراتے ہی سنا۔

”میبل۔۔۔ میری میبل۔۔۔ صرف آخری بار
میبل۔۔۔ ایک آخری بار۔۔۔ وہ میری شکل دیکھتے ہی
مجھے گھر سے دھکے دے کر نکال دیں گے۔ تم انہیں
سب بتانا۔ ان سے معافی مانگنا، پھر میں ان کے پاس
جاؤں گی۔“

”مجھے اور کتنا ذلیل کروانا چاہتی ہو ماں؟“

”تم مجھے اور کتنی تکلیف میں دیکھ سکتی ہو میبل؟
میں فیصلہ تم پر چھوڑتی ہوں۔ اس بار میں تمہارے
قدموں میں اپنا سر نہیں اپنی تکلیف رکھتی ہوں۔“

تکلیف اس کی ماں کے سر سے کہیں زیادہ وزنی
نکلی۔ ”ماں! اس سے بہتر تھا، تم مجھے پیدا ہوتے ہی مار
دیتیں۔“

”اس سے بھی اچھا ہوتا کہ میری ماں ایسا کر دیتی۔“

اس نے کہا اور وہ میبل کے سینے سے لگ کر سکنے لگی۔

وہ دونوں ایک دن پہلے لبنان کے شہر بیروت آچکی تھیں اور اب میبل اس سڑک پر کھڑی تھی جس کے کنارے اس کی ماں کے پہلے شوہر کا گھر تھا اور جہاں اس کے دو بیٹے رہتے تھے۔

”وہ تمہیں کچھ بھی کہیں، تم اپنی بات پوری کر کے آنا۔ وعدہ کرو مجھ سے تم میرے لیے معافی لے کر آؤ گی۔“ ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر منت سے کہا۔

”وعدہ کرتی ہوں ماں! یہ آخری کام میں اپنی ساری جان لگا کر کروں گی۔ پھر میں مرجاؤں گی یا تمہیں مرنا ہوگا۔“

اسے گھر کے اندر بٹھا دیا گیا تھا۔ خوشیاں گھر میں تھیں اور خاموشی راست بانسہ دیواریں ایک عرصہ ماتم کنارے رہنے کے بعد اب خود میت بن چکی تھیں۔ دو شکستہ چہرے اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ ان پر بڑھاپا آئے ایک زمانہ بیت چکا تھا۔ اس نے اپنے تعارف میں یہ کہا تھا کہ ”وہ امریکہ سے آئی ہے۔ ان کے والد کے دوست کی بیٹی ہے اور ان سے کچھ بات کرنا چاہتی ہے۔“

چائے پینے کے دوران وہ بار بار ذہن میں اپنے تیار کردہ فقرے دہراتی رہی۔

”اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو معاف کر دیتے ہیں۔“ اس نے کہا۔ اہمت نے چونک کر اسے دیکھا وہ پہلے ہی اسے جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”وہ ہمیشہ آپ کو یاد کرتی رہیں۔ آج بھی کرتی ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ آپ کے لیے نیک خواہشات رکھیں، وہ آپ کو یاد کر کے روتی ہیں۔ انہیں معاف کر دیں، اپنی ماں سمجھ کر نہیں تو ایک انسان سمجھ کر، جیسے خیرات میں فقیر کی جھولی بھر دی جاتی ہے، انہیں بھی ایسا ہی جان کر ان کی جھولی میں معافی کے سکے ڈال دیں۔ سنگین غلطیوں پر معاف کرنے والا کا بڑا درجہ ہوتا

ہے۔ اپنے درجے بڑھالیں۔“

اس کے کندھوں پر احد کا ہاتھ آیا اور جھٹکے سے اسے اٹھا کر کھڑا کیا۔ ”کون ہو تم؟“

”وہ ماں ہے آپ کی۔ اس نے رات دن اپنے گناہ کی فصل کاٹی ہے۔ اب اسے اطمینان کا پھل دے دیں۔“ احد کے ہاتھ کی درشتی کی پروانہ کرتے ہوئے وہ بولتی چلی گئی۔

اسے بری طرح سے جھنجھوڑا گیا۔ ”بکو اس بند کرو اپنی کیا کرنے آئی ہو یہاں۔ نکلو یہاں سے۔“

”میں معافی لینے آئی ہوں۔ معاف کر دیں اسے“ اس نے اجالوں کو سیاہ کیا ”اللہ کو اور آپ کو تڑپ تڑپ کر یاد کیا۔“

”اس ذلیل عورت کا نام میرے باپ کے گھر میں لینے کی جرات کیسے کی تم نے۔“ اہمت نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھسیٹ کر کمرے سے باہر دھکا دیا۔ ”وہ آپ کے قدموں میں گرنے کے لیے تیار ہے۔ وہ قبروں پر سر رکھنے کے لیے بھی تیار ہے۔“ دھکا کھا کر وہ پھر واپس ان کی طرف پلٹی۔ ”وہ اپنا سر قلم کروانے کے لیے تیار ہو تو بھی۔“ احد چلایا۔

”آپ بیٹے ہیں ان کے، وہ ماں ہے آپ کی۔“ میبل نے منت سے ہاتھ جوڑ دیے۔

”ہم یعقوب عابدہ کے بیٹے ہیں، کسی فاحشہ کے نہیں۔“

”وہ محبت میں اندھے ہو چکی تھیں۔“ ”ہم نفرت میں اندھے ہیں اور سرے بھی۔“ احد کا سخت ہاتھ اس کی طرف آیا اور اسے بیرونی دروازے کی طرف لے جانا چاہا۔

”اگر آپ اللہ کے ہی بندے ہیں تو اللہ کے لیے۔ صرف اللہ کے لیے۔“ اس نے دروازے کی دہلیز پکڑ لی۔

”جاؤ۔ پھر اللہ سے ہی معافی لو اس کے لیے۔ نکلو یہاں سے۔“

”وہ روتی ہے، چلاتی ہے۔“ روتی ہوئی میبل نے

آگے بڑھ کر احمیت کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ہم روئے بھی، چلائے بھی اور ذلیل بھی ہوئے۔“ احمیت نے اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ جھٹکے سے چھڑوایا۔

”گناہ کیسا بھی ہو، ایک دن اس کی سزا ختم ہو ہی جاتی ہے۔“

”اگر ہماری نہیں ہوئی تو اس کی کیسے ہوگی۔“ احمیت نے چلا کر کہا اور دھکا دے کر اسے دروازے سے باہر پھینکا۔

”اگر میں اپنی ماں کی تکلیف بر تڑپ سکتی ہوں تو کیسی اولاد ہو تم دونوں۔“ اس کی تکلیف کا کچھ تو خیال کر۔۔۔ ”سڑک پر گری وہ پوری قوت سے چلائی اور دکھ سے رو بھی دی۔ دروازہ بند کرتے احمیت کے ہاتھ رک گئے اور پھر وہ تیزی سے باہر نکل آیا۔

”تم یا میں کی اولاد ہو؟“ اس نے اتنی سختی سے پوچھا کہ سیبل کے دانت سختی سے بھینچ گئے۔

”تم اس کتے کی اولاد ہو؟“ وہ اس کے سر پر کھڑا پورا زور لگا کر دھاڑا۔

سیبل سہم کر زمین سے جڑ کر رہ گئی۔ ماں نے کہا تھا کہ وہ انہیں نہ بتائے کہ وہ اس کی بیٹی ہے۔ ”تو اسی کینے کا خون ہے جو میرے باپ کے گھر میں تیری ماں سے ملنے آتا تھا۔“ سڑک پر گری سیبل کے سر پر اس نے پوری قوت سے اپنا پاؤں وزن جوتے سمیت مارا۔

آگ کی نمائندگی کرتا سورج سارا کا سارا سیبل پر اڑ آیا۔ اب وہ اس کے منہ پر پھینٹا رہا تھا اس کا گلا دیوچ رہا تھا اسے گھسیٹ رہا تھا اس پر لعنت بھیج رہا تھا اس کا خون پی جانا چاہتا تھا۔ سڑک پر لوگوں کا مجمع اکٹھا ہو گیا۔

”کینے باپ، بد چلن ماں۔۔۔ اولاد تمہاری جرات کیسے ہوئی ہمارے پاس آنے کی۔“ کینے باپ اور بد چلن ماں کا سارا بدلہ وہ اس سے لے لیتا چاہتا تھا۔

”اللہ کی خوشنودی کے لیے انہیں معاف کر دیں۔“

”اپنی گندی زبان سے اللہ کا نام لینا بند کرو۔ تم جیہڑوں کے لیے ہی اللہ نے جہنم تیار کر رکھی ہے۔“ جب وہ اپنی جان چھڑا کر بھاگی تب بھی سورج نار لیے اس کے پیچھے بھاگا دنیا میں ہر شخص صرف اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ صرف اسی کا تماشا لگا تھا۔ صرف اسی کے ساتھ یہ ہوا تھا۔ بھاگتے بھاگتے جب وہ تھک گئی تو زمین پر گر گئی۔

”سیبل۔۔۔ میری سیبل۔۔۔“ اسے اپنی ماں کی روتی ہوئی آواز اپنے قریب سنائی دی۔ اس نے نفرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”کیا چاہتی ہو اب؟“ وہ پوری قوت سے چلائی۔ جتنے لوگ سڑک پر چل رہے تھے وہ رک کر اسے دیکھنے لگے۔

”تمہارے ہر گناہ کی سزا میں نے بھگتی ہے۔ کیا چاہتی ہو اب مجھ سے؟“ سڑک پر بیٹھے ہوئے وہ پوچھ رہی تھی۔ جو جہاں تھا وہیں کھڑا ہو گیا۔

”آؤ واپس چلیں!“ ماں نے اس کے سر پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے اور ان پر اپنا سر نکال لیا۔

”کہاں؟ تمہارے ساتھ جہنم میں؟“ وہ پہلے سے زیادہ اونچی آواز میں چلائی۔ لوگ سمٹ کر ان کے قریب آ گئے۔

”جہنم تمہارے لیے نہیں۔“ ”اگر تمہیں اللہ اتنا ہی پیارا تھا تو تم نے یہ سب کیوں کیا؟“

”مجھے معاف کرو سیبل!“ لوگوں کے مجمع میں ماں نے ہاتھ جوڑ دیے۔

”معاف؟“ وہ کھڑی ہو گئی اور جتنے لوگ کھڑے تھے ان کی طرف اٹھ کر بڑھی۔

”اب یہ عورت مجھ سے معافی مانگ رہی ہے۔ اس کے سگے بیٹے اسے فاکتے ہیں اور مجھے حرامی اور یہ معافی مانگ رہی ہے۔“

”سیبل!“ ماں سک کر اس کے قریب آئی اور وہ جلدی سے پرے ہو گئی۔

”مجھ سے تمہیں معافی نہیں ملے گی ماں! جیسے

تمہیں اپنے باپ سے نہیں ملی۔ جیسے تمہیں اللہ سے نہیں ملی۔ مجھ سے بھی نہیں ملے گی۔“

”میری سیبیل۔ پیاری سیبیل۔ آؤ چلیں۔“
”چھوڑو مجھے ماں! جیسے تم نے اپنے باپ کو شوہر کو، بچوں کو چھوڑا تھا۔ مجھے بھی چھوڑ دو۔“
”مجھے معاف کر دو سیبیل!“

”کس کس سے معافی مانگو گی؟ کس کس گناہ کی؟ تم کس معافی کی بات کرتی ہو؟ کس معافی کی؟ بھول جاؤ معافی کو۔ بھول جاؤ خدا کو۔ جیسے وہ تمہیں بھول چکا ہے۔ بھول جاؤ اسے۔ وہ تمہیں تکلیف میں دیکھ رہا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ مجھے بھی تکلیف دے رہا ہے پھر بھی تمہیں وہ چاہیے۔“

”وہ ہم سب کو چاہیے۔ وہ خدا ہے میرا۔“
”کیسا خدا ہے ماں تمہارا۔ کیسا خدا ہے ماں۔“
وہ سڑک پر بیٹھ کر رونے لگی۔ زار و قطار رونے لگی۔
”سیبیل۔ ایسے۔“ ماں اس کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔

”وہ تمہیں معاف کرنے کے لیے تیار نہیں۔“
کیسا خدا ہے ماں تمہارا۔“
”وہ تمہارا بھی خدا ہے سیبیل۔“
”اگر خدا ایسا ہے تو وہ میرا نہیں ہے۔ میرا خدا نہیں ہے وہ۔“



مرنے سے پہلے اس کی ماں نے جس کی سب سے زیادہ پروا کی وہ اس سے سب سے زیادہ لا پروا ہو گئی۔
خدا سے۔

بیروت سے آنے کے کچھ ہی ہفتوں بعد ماں اسی خدا کو پیاری ہو گئی جسے وہ کبھی پیاری نہیں رہی تھی۔
ماں کے مرنے پر اس نے سکھ کا سانس لیا۔ گھر میں اس نے دوپے انگ گیسٹ لڑکیاں رکھ لی تھیں۔ جو یو کرائن سے تھیں اور جنہیں میری سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کچھ ماں کی بچت تھی جو اسے مل گئی تھی۔ اسے فی الحال اپنے گزر اوقات کی کوئی

پریشانی نہیں تھی۔ البتہ آسیب زندہ گھر میں میری کے ساتھ اب عدینہ بھی رہنے لگی تھی۔ کبھی کبھی سوتے ہوئے اسے اپنے اوپر کوئی جھکا ہوا محسوس ہوتا۔ وہ اس کی ماں ہوتی جو موم بتی ہاتھ میں لیے اس پر جھکی ہوتی۔
”مر کر بھی مجھے چین نہیں لینے دو گی۔“ وہ نیند میں چلا اٹھتی۔

”تم بھٹک رہی ہو سیبیل؟“ وہ اپنے کان میں سنسناہٹ محسوس کرتی۔
”میں بھٹک رہی ہوں تو بھی میں تمہاری طرح بھٹکتی ہوئی نہیں پھروں گی۔ مجھے معافی چاہیے نہ خدا۔“ وہ اپنی مری ہوئی ماں سے بھی بحث میں باز نہ آتی۔

وہ باقاعدگی سے کالج جانے لگی، ڈانس کلاسز لینے لگی، ویک اینڈ گھومنے پھرنے میں گزارتی۔ پھر بھی اگر وقت بچ جاتا تو مٹی گوندھ کر اس کا ایک بڑا سا بت بناتی، اس پر بھورے بالوں کی وگ رکھتی، ٹھوڑی کے نیچے تل لگاتی، دل کی جگہ ایک دو تین کتنے ہی سوراخ بناتی اور سرخ نیل پالش سے دو آنسو بناتی جو بہہ کر دل کے سوراخوں تک آتے۔ چند دن یہ بت اس کے کمرے میں رہتا، پھر وہ کوڑے کے ڈھیر میں پھینک آتی۔

فریڈرک کے ملنے کے بعد اتنا ضرور ہوا کہ اس نے یہ بت بنانے کم کر دیے تھے۔ وہ زیادہ وقت اسی کے ساتھ ہوتی تھی۔ فریڈرک کے ساتھ میل جول کی وجہ سے کئی کالج فیلوز اسے اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے، لیکن اسے ان کی پروا نہیں تھی۔ وہ دنیا میں ایک خود کو جانتی تھی، ایک فریڈرک کو اور بس۔ تیسرا کوئی دنیا میں تھا نہ اسے چاہیے تھا۔ پہلے یہ ہی کالج فیلوز تھے جو مزے لے لے کر اس کی ویڈیو دیکھتے تھے۔ اسے خبطی اور پاگل سمجھتے تھے۔ دنیا کا کیا ہے، برا کہنے کے لیے اسے تو بہا چاہیے۔ سیبیل دنیا کو یہ بہانے مہیا کرنے کے لیے تیار تھی اور رضامند بھی۔ اگر اس کی ماں تھوڑی دیر اور زندہ رہنے کا تردد کرتی تو اس بار وہ اسے سکھاتی کہ زندہ کیسے رہا جاتا ہے۔



زندہ رہنا اس کے لیے اتنا بھی بھی ضروری نہیں تھا کہ وہ موسیٰ جیسے انسان کی منت کرتی۔ اس نے سوچ لیا تھا اگر وہ بچ کر نہ نکل سکی تو موسیٰ کے بھی کسی کام کی نہیں رہے گی۔ وہ خود کو ختم کر لے گی۔ موسیٰ چاہے بھی تو یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ وہ کس حد تک جاسکتی ہے۔

ام ہانی کھانا لے کر آئی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ ”بائیں ہاتھ سے نوالہ نہ کھاتے ہیں نہ کھلاتے ہیں یہ رزق کے احترام کے لیے کہا گیا ہے۔ اب یا تم بائیں ہاتھ سے نوالہ کھا لو یا تم میرے دائیں ہاتھ کی پانچویں انگلی چھوڑ دو۔ میرے لیے گھر کے کام کاج مشکل ہو جائیں گے۔“

مسیبل کو اس عورت کی ہمت پر رشک آگیا۔ وہ بھی اسی اطمینان کی مالک تھی جس کا موسیٰ نظر آتا تھا۔ مسیبل یہ ہی سکون تباہ کرنا چاہتی تھی۔ اس نے آنکھوں اور سر سے اشارہ کیا کہ وہ بے فکر ہو کر اسے کھانا کھلائے۔ اس کا ایسا تسلی بخش اشارہ پا کر وہ نوالے بنا بنا کر اس کے منہ میں ڈالنے لگی۔ آخری نوالے پر جب مسیبل اس کی پانچویں انگلی کو بھی چبا ڈالنا چاہتی تھی اس خیال سے کہ اگر واقعی اس کا ہاتھ بے کار ہو گیا تو اس کے لیے کھانا کون بنائے گا وہ رک گئی۔ جب کبھی بھی وہ مرنا چاہتی تھی کم سے کم بھوک سے نہیں چاہتی تھی۔

ام ہانی ٹرے اٹھا کر جانے لگی تو رک کر مسیبل کو دیکھنے لگی۔

”جب ہم دو سروں پر مہربانی کرتے ہیں تو دراصل ہم خود پر مہربانی کرتے ہیں جیسا کہ جب ہم دو سروں پر ظلم کرتے ہیں تو دراصل خود اپنے لیے ظلم بنتے ہیں۔“ ”سب کو وعظ کا خط ہے۔“ مسیبل نے دل میں سوچا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی۔ دن کے وقت کمرے میں دہلیز سے روشنی کی بہت سی ہلکی سی روشن لکیر آ جاتی تھی رات کو یہ بھی نہیں آتی تھی۔ اسے اندھیرے سے ڈر نہیں لگتا تھا بس اسے اندھیرے میں ہاں کی موجودگی سے کوفت ہوتی تھی۔

فریڈرک نے سارا البنان اپنے سر پر اٹھا رکھا ہو گا۔ اہمبھسی اس وقت اسے تلاش کر رہی ہو گی۔ موسیٰ جیسا معمولی آدمی کب تک اسے یہاں چھپا کر رکھ سکتا ہے۔ اس کی بہن اسے بوریوں کے ڈھیر میں چھپا دے یا بھوسے کے پولیس کے کتے اس کی بو یالیں گے۔ پولیس سے پہلے فریڈرک موسیٰ کی کھوپڑی کو کھول کر رکھ دے گا۔

شام ڈھلنے لگی تو دروازہ کھول کر موسیٰ اندر آیا پیچھے ام ہانی بھی تھی۔

”تم نے آج میری بہن پر بہت رحم کیا۔ اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟“ موسیٰ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کا منہ بند تھا وہ کیا کہتی۔

”یعنی تم ٹھیک ہو رہی ہو؟ اور موسیٰ نے کہا تو اس کے دل کا شک مضبوط ہو گیا کہ وہ شدت پسند اسے سیدھے راستے کی طرف لانا چاہتا ہے۔ وہ اس کا استاد بنا ہوا ہے اور یوں منہ ہاتھ باندھ کر اسے اپنا شاگرد بنالیا ہے۔“

”میری بہن تم سے خوش ہے اس کا کہنا ہے کہ تم ایک اچھی لڑکی ہو۔“ وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا اور اسے دیکھ بھی رہا تھا جس کے چہرے کے تاثرات صاف صاف یہ بتا رہے تھے کہ میرے ہاتھ کھولو میں تمہیں بتاتی ہوں کہ میں کتنی اچھی لڑکی ہوں۔

”غصہ اسی لیے حرام ہے کیونکہ یہ انسان کی عقل کو اندھا کر دیتا ہے۔ جبکہ عقل وہ کل ہے جو انسان کی محافظ ہے۔ سو چوڑا اگر محافظ ہی اندھے ہو جائیں گے تو حفاظت کون کرے گا؟“

مسیبل کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو گیا۔ گہری سرمئی پتلیاں تیر میں کمان کی طرح موسیٰ کی طرف نشانہ بند ہو گئیں۔

ام ہانی جا کر واپس آئی اور جھک کر اس کے سامنے کھانا رکھا اور چلی گئی۔

”یہ تمہارا آج آخری کھانا ہے۔ میری بہن نے آج کافی دل لگا کر تمہارے لیے اس کا اہتمام کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تمہارے ہاتھ پیر کھول دوں تاکہ وہ

تمہیں مہمان کی طرح تھوڑی دیر اپنے پاس رکھ سکے۔ وہ تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہے۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ تمہیں ہماری باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ جو چیز اچھی نہ لگے وہ تکلیف دیتی ہے۔ میں تمہیں تھوڑی سی تکلیف دوں گا پر زیادہ نہیں۔ تمہارے ہاتھ میں کھول دوں گا، لیکن پہلے میری کچھ باتیں سن لو۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا، پھر قدرے توقف سے بولا۔

”تمہارا دوست فریڈرک ڈرگ ڈیلر ہے۔“

مسیبل طنز سے ہنس دی کہ وہ جانتی ہے کہ فریڈرک کیا ہے۔ وہ ایسی خوف ناک اطلاع اسے سنا کر چونکا نہیں سکتا۔

”صیام فہمی دوسرا بڑا ڈیلر ہے۔ اس علاقے میں وہ کافی جانا جاتا ہے، بلکہ یہ سارا علاقہ اسی کے قبضے میں ہے۔ تمہارا دوست اسی سے لین دین کے لیے آیا تھا۔ اب تک جو تھوڑی بہت بات معلوم ہو سکی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے لین دین میں کوئی کمی بیشی ہونی تھی۔ سنا ہے کہ ان دونوں میں تکرار بھی ہوئی تھی اور صیام فہمی نے فریڈرک کو مارا بھی تھا۔ تمہارے دوست کے پاس مطلوبہ رقم کی کمی تھی اور اسے ہر صورت میں مطلوبہ ڈرگ ساتھ لے کر جانی تھی۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ لین دین میں کمی بیشی ہو گئی تھی اور اس کی کوپورا کرنے کے لیے اس نے ”تمہارا دین“ کر دیا۔ اس لیے وہ تمہیں یہاں چھوڑ کر جا رہا تھا۔“

موسی نے مسیبل کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ابھی بھی طنزیہ تاثرات ہی تھے۔

”ہوٹل کا مالک اچھا آدمی ہے، لیکن وہ صیام فہمی سے ڈرتا بھی ہے۔ اسے صیام فہمی کا فون آیا تھا کہ ”وہ تمہیں کھانے میں بڑی مقدار میں نیند کی دوا دے اور اس کے آدمی کے آنے سے پہلے تم پر نظر رکھے اور تمہیں کہیں جانے نہ دے۔“ اس نے تمہیں کھانے میں نیند کی دوا دے دی، کیونکہ اسے اپنی جان اور اپنا ہوٹل دونوں پیارے تھے، لیکن وہ اللہ کو منہ بھی دکھانا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے اور چند لوگوں کو بتا دیا۔ میں اور ہوٹل کا ہی ایک آدمی مل کر تمہیں یہاں چھوڑ گئے۔“

ایک یہ ہی ٹھکانا ایسا تھا جہاں میں تمہیں رکھ سکتا تھا۔ یہ گاؤں کزائیہ سے زیادہ دور بھی نہیں تھا اور ہم صیام کے آدمی کے آنے سے پہلے وہاں واپس پہنچ بھی سکتے تھے۔“

مسیبل کی آنکھوں میں تمسخر گہرے سے گہرا ہوتا گیا۔ موسیٰ اس تمسخر کو آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔

”یہ پہاڑی علاقہ ہے، اس گاؤں سے ایک ہی سڑک شہر جاتی ہے جس پر آسانی سے نظر رکھی جاسکتی تھی۔ تم فی الحال یہاں سے بچ کر کہیں نہیں جاسکتی تھیں۔ شہر بھی نہیں۔ پولیس ان کافی الحال کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ میں تمہیں احمبیسی چھوڑ آنا چاہتا تھا، لیکن یہ ناممکن رہا۔ تمہارا دوست صیام کے آدمیوں کے ساتھ خود آیا تھا تمہیں ہوٹل سے لینے۔ تم نہیں ملیں تو انہوں نے یہ سمجھا کہ اس نے ہی تمہیں پہلے اطلاع دے کر وہاں سے نکال دیا۔ تمہارا دوست ہوٹل کے مالک پر شک کر رہا تھا۔ اس نے ہوٹل کے مالک کو زخمی کر دیا اور صیام کے آدمیوں نے تمہارے دوست کو وہ بھاگ گیا تو ان کا شک یقین میں بدل گیا ہے کہ اس نے تمہیں پہلے ہی مطلع کر کے نکال دیا ہے۔ فی الحال وہ اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ اب میں تمہیں یہاں سے لے جا رہا ہوں۔“

اس نے اس کا منہ کھول دیا اور پانی کا گلاس اس کے منہ سے لگایا۔

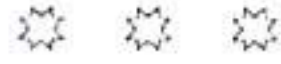
”میرے ہاتھ بھی کھولو۔“ اس نے نرمی سے کہا۔ اس نے ہاتھ بھی کھول دیے اور ہاتھ کے کھلتے ہی اس نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

”یہ جھوٹی کہانی کسی اور کو سنانا۔ تو یہ تھی تمہاری اصلیت۔ یہ چاہتے تھے تم یہاں مجھے بند کر کے اپنا مقصد پورا کرنا۔ میرا لین دین کتنے میں کیا ہے تم نے؟ کس کے ہاتھ بیچا ہے تم نے؟ تمہیں لگتا ہے میں تمہاری باتوں میں آجاؤں گی۔“ اس نے زور زور سے چلاتا شروع کر دیا اور دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

ام ہالی بھاگتی ہوئی اندر آئی۔ ”موسیٰ! یہ کیا ہو رہا ہے۔ بچے جاگ جائیں گے۔ انہیں خبر ہو گئی تو وہ باہر

سب کو بتادیں گے۔“ پیچھے ہی ایک ہاتھ سے معذور مرد بھی آیا۔ وہ تشویش سے دونوں کو دیکھنے لگا۔
”تم سب ملے ہوئے ہو۔ میں تم سب کی رپورٹ کروں گی پولیس میں۔ امریکن ہوں میں۔“ سمجھے۔

موسیٰ نے انہیں باہر جانے کے لیے کہا اور اس کے ہاتھ باندھ دیے، منہ میں کپڑا ڈھونسل دیا۔



”دیکھو اب تم اپنے فائدے پر کیسے داویلا کر رہی ہو۔ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں، اللہ پر اعتبار نہیں۔ ام بانی سے میں نے کہا تھا کہ رات اور دن میں وہ تمہیں ایک وقت کا کھانا دے، تاکہ تمہاری قوت کمزور ہو جائے۔ تاکہ تم کسی شدت کا مظاہرہ نہ کر سکو۔ تمہارے بڑے فائدے۔“ تمہاری جان اور آبرو کے لیے مجھے تمہیں چھوٹی تکلیف دینی پڑی۔ تمہیں بھوکا پیاسا رکھنا پڑا۔ بڑے فائدوں کے لیے کبھی کبھی چھوٹی تکلیفیں دینی ہوتی ہیں۔ اسی طرح کبھی کبھی ہمارے فائدے کے لیے اللہ کو ہمیں بھوکا پیاسا رکھنا پڑتا ہے۔ ہاتھ پیر باندھنے پڑتے ہیں۔ گونگا کرنا پڑتا ہے۔ بے بس کرنا پڑتا ہے، تاکہ ہم خود کچھ نہ کر سکیں صرف خدا ہی سب کرے۔ ہر انسان پر پیاس کا دورانیہ آتا ہے۔ ہر اس انسان پر جسے فائدہ دینا ہو۔ جسے نقصان سے بچانا ہو۔ تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم نے میری کسی بھی بات کا یقین نہیں کیا۔ تمہیں مجھ پر یقین کرنا ہی نہیں تھا۔ ورنہ میں تمہیں پہلے ہی دن بتا دیتا اور تم کم سے کم سکون سے یہاں رہتیں، لیکن میں جانتا تھا تمہیں بتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تم میری بہن کو قتل کر دیتیں اور یہاں سے بھاگ جاتیں۔ میں تمہارا منہ پھر سے کھول رہا ہوں، لیکن چلانا نہیں۔“ موسیٰ نے پھر سے اس کا منہ کھول دیا۔

”رات تارک الدنیا ہے۔ آگاہی بارگاہ پروردگار۔“

”میرا ایمان جگانے کے لیے تم نے یہ سب کیا۔ تم اس حد تک جاسکتے ہو، کس لیے، کیوں۔؟“
”میں کون ہوتا ہوں ایمان جگانے والا۔“
”تم نے کہا تھا، تم میرے استاد بننا پسند کرو گے۔“
”یہ میں نے دعا کی تھی، تمہیں دھمکی نہیں دی تھی، اللہ کو یہ پسند نہیں۔“

”اس اللہ کو؟ جس نے میری ماں کو دو حرنی معافی نامہ نہیں بھیجا۔ وہ اللہ جس نے میری ماں کو اس کے گناہوں کی پوری پوری سزا دی۔ وہ اللہ کا ایک بندہ ڈھونڈتی رہی اور۔“

”وہ کیوں اللہ کا بندہ ڈھونڈتی رہیں؟ وہ خدا کو کیوں نہیں ڈھونڈتی رہیں؟ وہ معافی کے لیے کیوں چلاتی رہیں، وہ اس کی محبت کی طلب گار کیوں نہیں رہیں۔“
”اللہ میری ماں سے محبت کیسے کرتا، وہ تو بد چلن تھی، وہ تو مومنوں سے محبت کرتا ہے۔“
”اگر وہ صرف مومنوں سے محبت کرے گا تو وہ رحیم نہیں رہے گا۔“

”اللہ اللہ کرنا بند کرو۔ مجھے کچھ نہیں سننا۔“
”تم اللہ سے ناراض ہو۔ تم اللہ سے ناراض ہو سکتی ہو، اس سے جدا نہیں۔ کسی بھی انسان کے پاس اللہ سے الگ ہونے کا اختیار نہیں، اس نے یہ اختیار کسی کو دیا ہی نہیں۔ ہم سب اس کے ہیں اور اسی کے ہیں۔ تم بھی اس کی ہو۔ مہیبل۔۔۔ لوٹ جاؤ واپس۔“

”الفاظ پاک ہیں۔ ادائیگی پاک تر۔“
”تمہاری آنکھیں، تمہاری آواز، تمہارا انداز اس تکلیف سے معمور ہیں جسے تم چھپائے پھرتی ہو۔ تم نے اللہ کو چھوڑ دیا اور یہ جدائی تم پر گراں ہے۔ تمہیں اللہ سے نکھڑ جانے کا دکھ ہے۔ تمہیں مجھ جیسے ہر انسان پر غصہ ہے جو اللہ کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ تمہیں غصہ ہے کہ اللہ نے تمہیں خود سے دور ہو جانے دیا، تم مجھ سے حاسد ہو۔“

”بند کرو اپنی نصیحتیں، ایسا کچھ نہیں ہے۔“ وہ چلائی۔

”ایسا نہیں ہوگا“ لیکن اس سے الگ بھی نہیں ہوگا۔ جب انسان ایک لمبے عرصے تک دکھ سہتا ہے تو وہ تلخ ہو جاتا ہے۔ جب وہ بار بار اللہ کو بلاتا ہے، جب وہ بار بار اللہ سے مانگتا ہے تو وہ بے صبرا ہو جاتا ہے۔ مصائب انسان کو کمزور کرتے چلے جاتے ہیں اور ایک دن وہ ٹوٹ کر گر جاتا ہے۔ جو گر گرا ٹھتا ہے، درجہ اسی کا بلند ہوتا ہے۔ سب راستے اللہ کی طرف جاتے ہیں۔ ہر انسان کا ایک الگ راستہ ہوتا ہے۔ اللہ کو پانے کا۔ ہر راستے کی اپنی مشکلیں اور رکاوٹیں ہوتی ہیں۔ کچھ دکھ سہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں، کچھ دکھ سہ کر پیچھے پلٹ آتے ہیں۔ کچھ ان رکاوٹوں سے خائف ہو جاتے ہیں، کچھ ان رکاوٹوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ تم بھی خائف ہو چکی ہو۔“

”میں کھانا کھانا چاہتی ہوں۔“ اس نے کہا تو موسیٰ نے اٹھ کر اس کے ہاتھ کھول دیے۔ وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔ کمرے میں خاموشی پیام امن کی طرح پھیل گئی۔ ناکافی روشنی ”کیفیت“ کے زیر اثر تھی۔ موسیٰ سر جھکا کر بیٹھا موم بتی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کھانا کھا چکی تو اس نے موم بتی کی روشنی گل کر دی۔

”تم دیکھ سکتی ہو کہ کس قدر اندھیرا ہو گیا ہے۔ جب انسان بھٹک جاتا ہے تو وہ خود کو ایسے ہی اندھیرے کے سرد کردیتا ہے۔ ایمان کمزور ہو جائے تو یہ اندھیرا چار اطراف سے گھیر لیتا ہے۔ پھر کچھ دکھائی نہیں دیتا، کچھ بچھائی نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ انسان خود کو بھی نہیں دیکھ سکتا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ کسی بھی چیز سے الجھ کر گر جاؤ گی، کسی گڑھے میں خود کو پھنسا لو گی۔ اس اندھیرے کا سراسر نقصان صرف تمہیں ہی ہوگا۔“

موسیٰ نے موم بتی کو روشن کر دیا۔

”دیکھو روشنی کتنی ہی مددگار ہے وہ اندھیرے کو شکست دیتی ہے۔ تم جتنی روشنی برہماتی جاؤ گی اتنی ہی تمہاری بینائی کام کرتی جائے گی۔ ایمان روشنی ہوتا ہے۔ مسیح یہ ہم پر ہر حقیقت واضح کرتا ہے۔ میں شدت پسند ہوں نہ میرا تبلیغ کا ارادہ تھا۔ میں نے اتنا ضرور کیا

کہ تمہارے ہوش میں آنے پر تمہیں فریڈرک کے بارے میں یہ سب فوراً نہیں بتا دیا۔ تمہیں یقین آتا نہ آتا مجھے بتا دینا چاہیے تھا۔ میرا خیال تھا کہ تم حالات کو اپنے لیے جتنا سنگین سمجھ لو گی، ان کی حقیقت کھانے پر تم اتنا ہی سکون محسوس کرو گی۔ آئندہ تم شکوک و شبہات کا شکار ہونے سے پہلے حقیقت کو جاننے یا حقیقت کے کھل جانے کا انتظار کرو گی۔ تم واویلہ نہیں کرو گی۔ متنفر نہیں ہو گی۔ مجھے حق تو نہیں لیکن یہ میری تمہارے لیے حکمت عملی تھی۔ جو کچھ میں اب تک کہہ چکا ہوں وہ سب سچ ہے۔“ گڈ ریلے کے سے حلیمہ والا موسیٰ نظریں جھکائے کہہ رہا تھا۔

”اگر تمہارا وعظ ختم ہو گیا ہے تو تم یہاں سے جاسکتے ہو۔ اگر یہ سب سچ ہوا تو بھی تمہاری مدد لینے سے بہتر میں مرنا پسند کرتی۔“

”تم نے میری مدد نہیں لی۔ خدا نے تمہاری مدد کی ہے۔“

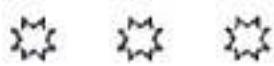
”میں دیکھنا چاہوں گی تمہاری حقیقت کیا ہے۔“

”ہماری حقیقت یہ ہے مسیح! کہ ہم خدا کے بندے ہیں۔ اچھے یا برے، مومن یا کافر۔ ہر حال میں اس کے ہیں۔ وہ ”رب البشر“ ہے اور ہم صرف بشر۔ وہ ہمارا مالک ہے اور ہم اس مالک کے۔ یہ ہی حقیقت ہے، ہمیں اس حقیقت کی فرماں برداری کرنی چاہیے۔“

”مجھے خاموشی چاہیے۔“

”رات گہری ہونے پر تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔ میں اپنی بہن کے گھر انہیں نہیں بلا سکتا تھا۔ اس علاقے میں ان کے آنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلے گی۔“

”جن کے آنے کی؟“



”ہیٹاڑوں اور درختوں پر مسلط رات اصحاب الیمین کی عبادت کی گواہ تھی۔“

موسیٰ گاڑی چلا رہا تھا اور اس کے ساتھ آگے ایک

اور آدمی بیٹھا تھا جسے وہ ہوٹل میں دیکھ چکی تھی۔ انہوں نے ایک بار پھر سے میبل پر کچھ کبل ڈال دیے تھے اور اس پر کچھ سامان رکھ دیا تھا جس کے نیچے وہ دبی ہوئی تھی۔

”بڑے مصائب سے بچانے کے لیے کبھی چھوٹے مصائب سے گزارا جاتا ہے۔ پہاڑ نہ آگرے، اس لیے مٹی کے ڈھیلوں کو سربراٹھانا پڑتا ہے۔“

جب گاڑی رکی تو اسے جلدی سے باہر نکال کر دوسری گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ موسیٰ بھی آگے آکر بیٹھ گیا تھا۔ گاڑی میں امریکی سفارت خانے کے لوگ تھے۔ ایک آفیسر نے موسیٰ کا بیان لینا شروع کر دیا۔ پھر اس نے موسیٰ کی تصویر بنائی۔ راستے میں وہ گاڑی سے اتر گیا۔

”تم میری انگلیاں چبانا چاہتی تھیں، میری گردن دوچٹنا چاہتی تھیں۔“ گاڑی سے اترنے سے پہلے اس نے پیچھے گردن موڑ کر میبل سے کہا۔ میبل نے منہ پھیر لیا اور وہ گاڑی سے اتر گیا۔

سامان کے نام پر اس کے پاس ام ہانی کا دیا ایک سوٹ تھا۔ سفارت خانے کی رہائش گاہ کے واش روم میں اس نے کافی وقت لگایا اور ام ہانی کا دیا سوٹ پہن لیا۔ سفارت خانے نے ضروری کارروائی کی اور ایک ہفتے کے اندر اندر اسے واپس بھیج دیا۔ موسیٰ اس کے کاغذات انہیں دے گیا تھا۔ امریکہ میں اس کے لیے نسبتاً محفوظ رہائش کا بندوبست کر دیا گیا تھا، کچھ عرصہ اسے وہیں رہنا تھا۔ فریڈرک امریکہ آیا ہی نہیں تھا۔ وہ اب پولیس کی ہٹ لسٹ پر تھا۔ وہ جتنا کچھ فریڈرک کے بارے میں جانتی تھی، اس نے سب متعلقہ اداروں کو بتا دیا تھا۔ اس نے اپنے اور اس کے تعلق کے بارے میں کچھ نہیں چھپایا تھا۔ چند مہینے وہ ان مسائل میں گھری رہی، پھر حالات ٹھیک ہونے لگے۔

کچھ عرصے بعد اس نے واپس اپنے گھر جانا چاہا اور متعلقہ ادارے نے اسے اجازت دے دی۔ اس نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ یوکرائی لڑکیاں چلی گئیں تو اس نے کسی اور کو کرایہ دار نہیں رکھا۔ وہ

گھر کو ویسا ہی دیکھنا چاہتی تھی جیسا وہ پہلے تھا۔ اس نے گھر کی دیواروں کو پھر سے پہلے جیسا کرنا شروع کر دیا۔ ہفتے کے اختتام پر وہ ان دیواروں پر سفید پینٹ کرتی۔ کبھی کبھی وہ رات کو گھر کی روشنیاں گل کر کے صرف ایک موم بتی روشن کر کے بیٹھ جاتی، وہ ماں کا انتظار کرتی۔ گھر کے اطراف چل قدمی کرتی اور ان درختوں کے پاس خاموش کھڑی ہو جاتی جن سے کبھی ماں نے راز و نیاز کئے تھے۔ مٹی کے بت بنانے اس نے چھوڑ دیے تھے۔ کبھی کبھار رات کو وہ مسنیاں ہیکمی کے پاس چلی جاتی، ان سے باتیں کرتی، وہ اسے کھانا ساتھ کھانے کی دعوت دیتیں۔ دونوں مل کرٹی وی دیکھتیں۔ ان کے بیٹے کے ساتھ وہ ویڈیو گیم کھیل لیتی۔ فارغ وقت میں اس نے کتابیں پڑھنی شروع کر دی تھیں۔ پبلک لائبریری میں اس کے کچھ نئے دوست بن گئے تھے۔ کبھی کبھی وہ قبرستان ماں کے پاس جانے لگی تھی۔ ماں نے بھی موم بتی لے کر بدروح بن کر آنا چھوڑ دیا تھا۔

”موسم بہار آگیا۔“

اس نے احمیت اور احد کے نام دو الگ الگ خط لکھے، جس میں اس نے ماں کے بارے میں سب لکھ دیا۔ پھر اس نے اپنی ویڈیو ریکارڈنگ کی اور انہیں بھجوا دی۔ اس نے پھر سے ان سے ماں کے لیے معافی مانگی تھی۔ اس نے ان سے ایک اور ملاقات کی درخواست کی تھی۔

”ایک گناہ گار کو معافی اتنی شدت سے مطلوب ہے تو خدا کو معاف کروینے کی قدرت رکھنے والے کی نیکی کس قدر عزیز ہوگی۔ ماں کے گناہ کو معاف کرنے کا اختیار آپ کے پاس ہے تو اس کا اجرا اللہ کے پاس ہے۔ اللہ کے اجر کو سمیٹ لیں۔“

اس نے خط کے آخر میں لکھا اور ویڈیو کے آخر میں کہا۔

دیوار کی کیل سے لٹکتی ماں کی نشانی (جو اس نے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی) کو ایک بار اس نے اپنے ہاتھ میں لیا اور ہونٹوں سے چوم کر آنکھوں سے لگا لیا۔ اس حالت میں اس نے کئی گھنٹے گزار دیے اور پھر وہ پھوٹ

پھوٹ کر رونے لگی۔

”ماں۔۔۔ میری ماں۔۔۔ پیاری ماں۔۔۔“

ماں کے مرنے پر وہ اب رونی تھی۔ تین دن سوگ کا اہتمام اس نے اب کیا تھا۔ صبح سے شام تک وہ گھر میں جگہ بدل بدل کر رونی رہی۔ اس میز پر اس نے اپنا سر رکھ لیا، جس پر ماں اپنی آخری سانسیں لے چکی تھی۔

”وہ دعائیں مجھے ہی مانگنی تھیں ماں۔۔۔۔۔ بار بار مانگتی تھیں۔۔۔ مجھ پر فرض تھا اور تمہارا حق تھا۔“ اسی میز کے ساتھ بیٹھ کر وہ ہاتھ اٹھا کر ماں کے لیے دعا کرتی۔

”ایسا ہو نہیں سکتا کہ اللہ سے توبہ کی جائے اور وہ معاف نہ کرے۔ ایسا بھی نہیں ہو سکتا کہ گناہ پر شرمندہ ہوا جائے اور گناہ پھر بھی اپنی جگہ اسی حالت میں موجود رہے۔“

”موسم بہار نے موسم خزاں کے لیے نشست خالی کر دی۔“

اس نے احمیت اور احد کو پھر سے خط لکھے۔

”جتنا برا ماں نے کیا اس سے کہیں زیادہ برا انہوں نے بھگت لیا۔ ماں اپنے پیاروں کے ساتھ نامہربان ہوئی تو وہ خود کے ساتھ تبھی مہربان نہیں رہ سکی۔ پیار بھی اپنی جگہ سے سرک کر رونی کے گالے بن کر اڑ جائیں گے۔ پھر توبہ کرنے پر گناہ کیسے قائم رہ سکیں گے؟ سمندر گناہوں سے سیاہ ہو جائیں تو بھی توبہ کے دھارے میں بہہ کر نور ہو جائیں گے۔“

جو چند نئے دوست اس نے بنائے وہ ان کے گھر جانے لگی، انہیں اپنے گھر بلانے لگی۔ انہیں ماں کے بارے میں بتاتی۔ ماں سے سنی کچھ باتیں انہیں سناتی۔ ”جب تک ہم خیر کے دائرے میں رہتے ہیں، ہم ہر چیز سے برکت حاصل کر سکتے ہیں۔ جیسے ہی ہم دائرے سے نکلتے ہیں، ہر چیز بے برکتی کر دیتے ہیں۔“

ایک چیز جو اس گھر میں موجود نہیں تھی وہ تھی ماں کی تصویر۔ ماں نے کبھی تصویر نہیں بنوائی تھی۔ وہ تو شیشے میں اپنی شکل بھی نہیں دیکھتی تھی۔

”میرے ماں باپ میرے خواب میں آنا پسند نہیں کرتے، گھر سے بھاگتے ہوئے ان کی تصویر ساتھ لانا میں نے پسند نہیں کیا۔ تم اپنی ماں کو اچھی طرح سے دیکھ لو سہیل! ہو سکتا ہے پھر تم تو مجھے دیکھنا چاہو، لیکن میں تمہیں کہیں نظر نہ آؤں۔“

مرنے سے چند دن پہلے ماں نے اس کے کمرے میں آکر کہا تھا اور اس نے ماں کو کمرے سے نکل جانے کے لیے کہا تھا۔ اب وہ مسز پیام ہیگمی کے پاس گئی۔ چند سال پہلے کریس پارلی پر ان کے بیٹے نے اتفاقہ ایک تصویر بنائی تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد مسز پیام ہیگمی اسے وہ تصویر دکھانے لائی تھیں، لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ وہ ان کے پاس گئی اور ان سے تصویر کو دیکھنے کی درخواست کی۔ جب وہ تصویر اس کے ہاتھ میں آئی تو وہ اس پر ہاتھ پھیرتی رہی۔

”ماں۔۔۔ میری ماں۔۔۔“

عقیدت روپوشی سے نکل آئی اور ماں پر جھک جھک گئی۔ محبت کو ہر نگار ہوئی اور ”ماں“ پر نثار ہوئی۔ ماں کو سینے سے لگا کر اس پر سر رکھ کر وہ دیر تک راز و نیاز کرتی رہی۔

”اپنے تہارہ جانے کے احساس نے مجھے تکلیف کے ان بیابانوں سے روشناس کروا دیا ہے، جس میں تم بھٹکتی رہی تھیں ماں۔۔۔“

ایک دن وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی کہ دیوار پر تنگی ماں کی تسبیح ملنے لگی۔ ہوائیں بارش کی آمد کا پیام ارسال کرنے لگیں۔ آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ آسمان نے قاصد بننا پسند کیا اور بوندوں کے سپرد الہام کیا۔ وہ رونے لگی، حق الیقین۔۔۔ بھگنے لگا۔ وہ زار و قطار رونے لگی۔

”ہاں۔۔۔! میرا دل ٹوٹ گیا تھا کہ تکلیف میں مجھے خدا نے اکیلا چھوڑ دیا۔ خدا نے مجھے دور ہو جانے دیا۔ خدا نے مجھے نکھڑ جانے دیا۔“

اشک آسمان کے سینے سے جا لگے۔

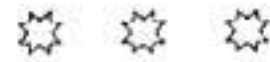
”جو بھٹک جاتا ہے، وہ اپنی روشنی بھجھاتا ہے۔“

ایک دن یونیورسٹی میں وہ گھاس پر بیٹھی کچھ نوٹس

پر کام کر رہی تھی کہ اس کا قلم رک گیا اور کانغز اس کے گھٹنوں پر پھڑپھڑانے لگے اور وہ گھٹنوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

”ہاں موسیٰ! مجھے ہر اس انسان پر غصہ تھا جو اللہ کو سینے سے لگائے ہوئے تھا، کیونکہ وہ انسان میں نہیں تھی۔“

خزاں رخصت ہو گئی۔



اس نے نوکری شروع کر دی تھی۔ وہ کافی مصروف رہنے لگی تھی۔ یونیورسٹی سے وہ نوکری کے لیے چلی جاتی تھی۔ ہفتے کے اختتام پر کسی نہ کسی دوست کے ساتھ چلی جاتی یا انہیں بلا لیتی تھی۔ اس نے اپنے دوستوں کو اپنے ماضی کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا تھا۔ وہ انہیں گزائیہ گاؤں میں ہونے والے واقعات کے بارے میں بھی بتا چکی تھی۔ اسے اب تکلیف دہ چیزوں سے بھاگنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ ڈرتی بھی تھی تب بھی صاف گوئی کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اگر وہ سچ نہیں بول سکتی تھی تو وہ جھوٹ بھی نہیں بولتی تھی۔ وہ خاموش ہو جاتی تھی۔ اس کی زندگی مختلف طریقے سے شروع ہوئی تھی، بہت سارے لوگوں کی ہوتی ہوگی، بہتر تو یہ ہی تھا کہ وہ ابتدا کو ہی انجام نہ مان لے۔ ماں جن لوگوں کو اکثر گھر بلا لیتی تھی ان میں سے کئی لوگوں کو وہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے ان لوگوں کو ماں کی طرح ہی گھر بلا کر ان کی میزبانی کی اور انہیں ماں کی موت کے بارے میں بتایا۔ ماں جن اسکالرز کے پاس اکثر جایا کرتی تھی وہ بھی ان کے پاس جانے لگی۔ ایک دن ہمت کر کے اس نے اجمت کے گھر فون کیا۔ فون کسی عورت نے اٹھایا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اجمت کی بیوی ہے۔

”اللہ آپ کے نکاح کو بابرکت رکھے اور دونوں کے تعلق کو محبت کی فراخی نصیب کرے۔ آمین۔“

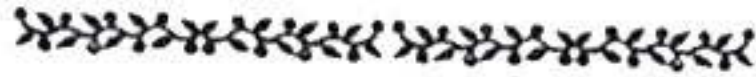
کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ ایک دن وہ اپنے لیے ناشتا بنا رہی تھی کہ اس کی شہادت کی انگلی جل گئی اور

مشہور و مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین

آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش



قیمت

کتاب کا نام

450/-	آوارہ گرد کی ڈائری	سفر نامہ
450/-	دنیا گول ہے	سفر نامہ
450/-	ابن بطوطہ کے تعاقب میں	سفر نامہ
275/-	چلتے ہو تو چین کو چلیے	سفر نامہ
225/-	مکرمی مکریم پھر مسافر	سفر نامہ
225/-	خمار گندم	طہر و مزاح
225/-	اُردو کی آخری کتاب	طہر و مزاح
300/-	اس ہستی کے کوچے میں	مجموعہ کلام
225/-	چاند مگر	مجموعہ کلام
225/-	دل وحشی	مجموعہ کلام
200/-	اندھا کنواں	ایڈ گرائلین پو / ابن انشاء
120/-	لاکھوں کا شہر	اد ہنری / ابن انشاء
400/-	باتیں انشاء جی کی	طہر و مزاح
400/-	آپ سے کیا پردہ	طہر و مزاح

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

تکلیف کی شدت سے اس کی چیخ نکل گئی۔ بھاگ کر اس نے ٹوٹھ پیٹ اپنی انگلی پر لگایا۔ پھر کتنی ہی دیر وہ اپنی انگلی کو دیکھتی رہی۔ سر کھڑکی سے باہر نکال کر اس نے کھلے آسمان کو دیکھا اور کہا۔

”جب ہم دوسروں پر ظلم کرتے ہیں تو دراصل خود اپنے لیے ظلم بنتے ہیں۔“ اس کی آنکھیں بھیک گئیں۔ ”میں اللہ سے اپنے ظلم کی معافی چاہتی ہوں۔“

اس موسم بہار کو رخصت ہونے سے بھی کوئی نہیں روک سکا اور اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ اس کا متبرک سکون پردہ پوش ہو جاتا اور اس کی رومانی بینائی ریور کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتی۔ دنیا دھواں ہو جاتی، بروکلین جنگل ہو جاتا۔ ٹھنڈی ہوا میں اس کے دل پر قابض ہو گئیں اور وہ اپنا سینہ مسلنے لگتی۔ رات کو وہ نیند سے اٹھ کر ————— اندھیرے کمرے میں موم بتی جلا کر بیٹھ جاتی۔ کھانا کھاتے وہ نوالہ اپنے منہ تک لے جاتا بھول جاتی۔ بس میں بیٹھ کر وہ اترتا بھول جاتی۔ کئی کئی دن تک اسے کپڑے بدلنے کا خیال نہ آتا۔ وہ راتوں کو جاگ کر گزار دیتی اور دن کو مصروف رہ کر۔ کتنی ہی بار دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی اور پھر رونے لگتی۔ پھر بھی خزاں ویسے ہی قائم رہی۔ مسکراہٹیں خوابیدہ رہیں۔

”دھوپ کی قزح پر قوس کا ہر رنگ بے رنگ تھا۔ پھول پتے سب کے سب خزاں کی فرماں برداری میں مصروف تھے۔“

ایک دن وہ ایک اسکول کے باہر آئی۔ اس کے ہاتھ میں بہت سے غبارے تھے۔ اس نے چھٹی کے وقت نکلنے والے کئی بچوں کو روک کر اپنے پاس کھڑا کر لیا۔ ”کیا تم میرے لیے دعا کر سکتے ہو؟“ اس نے غبارہ دے کر ایک بچے سے کہا۔

”ہاں! لیکن پھر میں دو غبارے لوں گا۔“

”دعا کرو میری یاد اسے ایسے آئے کہ وہ فراموش نہ کر سکے۔“ اس نے تین غبارے آگے کر دیے۔

”کون ہے وہ؟“

”دعا کرو بھول جانے کے لیے ہی سہی اسے میرا نام یاد کرنا پڑے۔“

”کیا نام ہے اس کا؟“

”دعا کرو جو اچھا ہے، وہ مجھ بری کو بھی پسند کرنے لگے۔“

”آپ بری ہیں کیا؟“

”مجھ سے ملاقات کا خیال اس کے دل میں آئے اور وہ اس سے غافل نہ ہو سکے۔“

”کس سے؟“

”دعا کرو۔ آخری بار ہی سہی۔ موسیٰ، سیبل کے پاس آجائے۔“

کتنی ہی بار غبارے لے کر وہ بچوں کے پاس گئی۔ ایک بار اس خیال سے وہ رونے لگی کہ وہ شادی کر چکا ہو گا اور اپنے بچے کو ہوا میں اچھالتا ہو گا۔ اس خیال نے اس پر بڑا ظلم کیا اور وہ تکلیف سے کراہنے لگی۔ وہ لبنان جاسکتی تھی ہوٹل سے اس کے بارے میں پوچھ سکتی تھی، لیکن وہ ایسا نہیں کر سکی۔ یہ خیال اس کے دل پر کندہ ہونے لگا کہ خدا کے پارے موسیٰ کو سیبل یاد نہیں ہو سکتی۔ وہ اسے پسند نہیں کر سکتا۔ اس یقین نے اسے اتنا زخم خورہ کر دیا کہ اندھیری راتوں میں اسے دن کے اجالے کی تمنا نہ رہی۔



روشنی فانوس تھی جو دھوپ میں جلوہ نما تھی۔ جب یونیورسٹی سے نکلتے اس نے اپنے پیچھے موسیٰ کی آواز سنی۔

”السلام علیکم۔ میں تم پر سلامتی بھیجتا ہوں سیبل۔!“

ہاتھ میں پکڑی کتابیں یکدم ہی اس کے ہاتھ سے پھسل گئیں۔ وہ ایکدم سے اس کے پاس آکر انہیں اٹھانے لگا۔

”وعلیکم السلام۔ میں تمہاری سلامتی کا جواب سلامتی سے دیتی ہوں۔“

اس کی کتابیں ہاتھ میں لے کر وہ اس کے سامنے

نام کو فراموش کرنے کے۔ تم سے ملنے سے خود کو روکنے کے لیے میں نے خود کو کسی درخت سے باندھ لینا چاہا، کسی غار میں چھپ جانا چاہا اور پھر بھی بے اختیار رہا۔

مسیبیل نے اس کے ہاتھ سے اپنی کتابیں لے لیں۔ اسے اپنے ساتھ بیچ پر لے کر بیٹھ گئی۔

”میں نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ میرے لیے دعا کرے کہ میں ایسے شخص کو بھولنے میں کامیاب ہو جاؤں جو مجھے پسند نہیں کرتا۔ جسے یہ گوارا نہیں ہو گا کہ دعاؤں میں موسیٰ اس کا نام لیتا ہے۔ میں نے ام ہانی سے کہا۔ اپنے دونوں بھائیوں سے کہا۔ ان بھائیوں کے بچوں سے کہا۔ میں اپنے استاد کے پاس گیا ان سے دعا کی گزارش کی۔ پھر ایک ایک کر میں نے اپنے سب دوستوں سے کہنا شروع کر دیا۔ اور پھر کزائیہ گاؤں میں کوئی ایسا آدمی نہیں بچا جس نے میرے لیے دعا نہ کی ہو۔ میں نے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر خدا کو پکارنا چاہا، میں نے اس کے سامنے تمہارا نام لینا چاہا۔“

”کیا تم نے اللہ کے سامنے میرا نام لیا؟“

”ہاں لیا۔ مسیبیل کیا تم نے مجھے کوئی بد دعا دی تھی؟“

”ہاں دی تھی لیکن اس سے پہلے میری ماں نے مجھے ایک بد دعا دی تھی۔“

”کیا؟“ موسیٰ نے اس سوال کا جواب حاصل کرنا چاہا۔

”اللہ مسیبیل کو اپنے پیاروں میں رکھے۔ اللہ مسیبیل کو اپنا پیارا عطا کرے۔“ مسیبیل نے جواب دیا۔



کھڑا تھا۔ مسیبیل ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

”میں تمہارے گھر گیا تھا۔ سفارت خانے والوں نے تمہارا پتا مجھے دے دیا تھا۔ خوش قسمتی سے وہی آفسر مجھے مل گئے تھے جو تمہیں وہاں سے لے کر آئے تھے۔ میں کافی دیر تک تمہارے گھر کے باہر تمہارا انتظار کرتا رہا لیکن تم آئی نہیں۔ تمہارے گھر کے ساتھ والے گھر سے ایک خاتون باہر آئیں اور وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئیں۔ انہوں نے ہی مجھے بتایا کہ تم اس وقت یونیورسٹی میں ہوتی ہو۔ رات کو بھی دیر سے واپس آئی ہو۔ انہوں نے یونیورسٹی کا نام اور پتا لکھ کر مجھے دے دیا کہ میں تم سے جا کر مل سکتا ہوں۔ یہ دیکھو یہی ہے نا؟ اس نے یونیورسٹی کے نام اور جگہ کے نام والا کاغذ اس کے سامنے کیا۔

مسیبیل مسکرا دی۔ ”تم یونیورسٹی کے سامنے کھڑے ہو۔ یعنی یہ ایڈریس درست ہے۔“

”اوہ! وہ گھبرا رہا تھا۔ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کی رکوع پذیر بھنوں سے دعائیہ کلام کی لہریں ورد بناتی نکلیں۔

مسیبیل کسی تاثر کے بغیر اسے دیکھ رہی تھی اور وہ ہاتھ میں پکڑی اس کی کتابوں کو دیکھنے پر مجبور ہو رہا تھا۔

”تم مجھے ڈھونڈ رہے تھے؟“

”تمہیں ڈھونڈنے کے لیے تمہیں گم کرنا ضروری تھا۔“

”پھر مجھے تم سے یہ پوچھنا چاہیے کہ تم یہاں کیوں آئے ہو موسیٰ؟“

”شاید تم میری کچھ مدد کر سکو۔ میں نے بہت کوشش کی کہ میں خود کو یہاں آنے سے روک سکوں۔ میں جانتا ہوں تم مجھے پسند نہیں کرتیں لیکن میں آخری بار ہی سہی تمہیں دیکھنے کی خواہش سے خود کو نہیں روک سکا۔“

زمین کی تہوں کی ساری کشش مسیبیل کے قدموں میں آکر جاملے ہو گئی۔

”جتنا میں نے تمہیں بھولنے کی کوشش کی اتنا ہی تمہارا نام مجھے یاد ہوتا چلا گیا۔ تمہارے نام نے مجھ میں ایسے قیام کیا کہ ہر چیز پر میرا اختیار قائم رہا سوائے اس



کو ایک دوبار چھوٹی پھوپھی سے اس کے بارے میں بات کرتے سن چکی تھی کہ کس طرح اس کے والدین بنگلہ دیش میں پھنسے رہ گئے ہیں اور وہ بیچارہ بن ماں باپ کے یہاں اپنی رشتے کی خالہ کے ہاں رہتا ہے۔

”تم دیکھو کہ یہاں اسے کسی قسم کی کوئی روک ٹوک نہیں مگر بیچارہ بچہ حد سے زیادہ ہی بھوکا ہو جاتا ہے تب ہی آتا ہے۔ سارا دن خالہ اس سے کیا کیا کام نہیں کروا تیں مگر مجال ہے جو کبھی شکایت بھی کی ہو۔ میں پیسے دیتی ہوں وہ بھی نہیں لیتا۔ بس اللہ اس کی مشکل آسان کرے۔ ماں باپ جلد آجائیں۔“

امی اس کی تعریف کرتے کرتے نہ تھکتیں۔ یہ سن لینے کے بعد ہی سے میں نے اس کو عزت دینی شروع کر دی تھی۔ مگر پھر بھی میں اس وقت ایک بچی ہی تھی لہذا اکثر اس کے آنے جانے کی مجھے خبر تک نہ ہوتی۔ وہ ہمارے گھر جب بھی آتا کوئی نہ کوئی کام کرنے میں لگ جاتا۔ امی کے لان میں پودوں کو امی ہی سی محبت اور دلجوئی سے پانی دیتا۔ دادا ابابا کی کمر میں تیل کی مالش کرتا۔ لو چلتی دوپہر میں بھی بڑی باجی جو بھی منگواتیں وہ لا کر دیتا اور امی کے ساتھ ساتھ کچن میں سبزی کاٹتا یا برتن وغیرہ تک دھو دیتا۔ اس کا ہر کام میں یوں پیش پیش رہتا ہی وجیہ بھائی کے لیے ایک نیا مذاق بنا تھا۔ ایک دن میں امی کو سنانے کے لیے علامہ اقبال کی نظم ”ہمدردی“ زور و شور سے اور لہک لہک کر پڑھ رہی تھی وجیہ بھائی۔ بڑی پھوپھی کے بیٹے تھے اور کیونکہ ان کا کلج ہمارے گھر کے قریب تھا تو اکثر ہی

وہ گیلی گھاس پر مسکین سا بیٹھا، بکھرے ہوئے کباب سمیٹ رہا تھا۔ چائے کا کپ بھی ایک طرف الٹا پڑا تھا۔ جبکہ وجیہ بھائی کسی ولن کی طرح قہقہہ لگاتے جارہے تھے۔ میں جو تھوڑی ہی دیر پہلے اپنی بلی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے لان تک آئی تھی پوری واردات کی چشم دید گواہ بن کر حیران کھڑی رہ گئی تھی۔ وجیہ بھائی سے تو ویسے بھی مجھے جڑ تھی۔ ہر وقت کسی نہ کسی کو مذاق کا نشانہ بناتے رہتے تھے۔ خاندان میں ہر کسی کا نام رکھا ہوا تھا۔ میں ناشتے میں زیادہ تر ڈبل روٹی کھاتی تھی جس کے باعث وہ مجھے کالی انگریز پکارتے۔ مگر آج تو انہوں نے حد ہی کر دی۔ امی نے ان کو شامی کباب اور چائے کا کپ ٹرے میں رکھ کر اس کو لان میں لے جا کر دینے کا کہا تھا۔ وجیہ بھائی نے پہلے تو ٹرے اس کے سامنے لہرائی۔ وہ ایک پودے کی مٹی کھودتا ہوا جھٹ سے ہاتھ جھاڑتا کھڑا ہوا اور جیسے ہی اس نے ہاتھ برہا کر ٹرے لینا چاہی وجیہ بھائی نے ٹرے نیچے گرا دی۔ گرم اور خستہ کباب اب گیلی گھاس پر کچھ مر بنے پڑے تھے اور چائے کا کپ بھی لڑھک کر دور چلا گیا تھا۔ اسی اثناء میں وجیہ بھائی قہقہہ لگاتے کہنے لگے۔

”لے تو تو ہے ہی کیرا۔ یار اٹھا کر کھالے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔“

پتا نہیں کیوں وجیہ بھائی نے اس کو کیرا کہنا شروع کر دیا تھا۔ شاید یہ میری ہی غلطی تھی۔ میں گو کے اس کے بارے میں کچھ خاص تو نہیں جانتی تھی مگر امی

کر دیتی۔ اسی دوران وہ بچن سے چھلے ہوئے سڑ ایک
بڑے سے پالے میں لے کر نکلا۔ اور امی کے پاس
آکر یہ پوچھنے کے لیے کھڑا تھا کہ اب اس سڑ کو کہاں
رکھنا ہے کہ ایک دم وجہ بھائی نے اس کی طرف
دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بٹھ سے کہا۔

”اف کالی انگریز۔ ایسے سمجھو کے جیسے یہ جگنو
ہے اور گویا بیچارہ ذرا سا کیرا ہے مگر ہر کام میں پیش پیش
رہتا ہے۔ تو بس یہی یاد رکھو۔ جگنو۔ کیرا۔
جگنو۔ کیرا۔ کیا سمجھیں؟“

کالج سے ہمارے گھر آجاتے تھے۔ وہ بھی میز پر اپنی
کچھ کتابیں جمائے پڑھنے میں مصروف تھے۔ میں بار
بار کچھ مصرعوں پر اٹک رہی تھی۔ ”سن کر بلبل کی آہ و
زاری۔“

جگنو کوئی پاس ہی سے بولا۔

حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے۔

کیرا ہوں اگرچہ میں ذرا سا۔

اب کچھ یوں تھا کہ آہ و زاری پر میری زبان لڑکھڑا
جاتی جبکہ جگنو اور کیرے کی جگہ میں الٹ پلٹ



امی نے غصے سے وجیہ بھائی کو گھورا تو وہ نظریں جھکا کر بیٹھ گئے مگر جیسے میرے حلق میں کچھ پھنس گیا تھا۔ مجھے ایک دم اس کی کم مائیگی کا جو احساس ہوا تو میری آنکھ بھر آئی۔ اور اسی لمحے میری اور اس کی نظریں شاید پہلی بار ملیں۔ میں نے خود کو سمیٹا اور سر جھٹک کر کچھ اور دیکھنے کی کوشش میں اس کی نیکر سے باہر نکلتی ہوئی پتلی پتلی کالی ٹانگوں پر نظر پڑی تو دل پر بوجھ بڑھ گیا۔ امی ابھی شاید سمجھ گئی تھیں اسی لیے میرے کچھ کہے بغیر وہاں سے ہٹ جانے پر ان کی طرف سے کوئی باز پرس نہیں ہوئی۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں جو بھی کام امی نے اس کو دیے تھے۔ ختم کر کے چلا گیا مگر پھر وجیہ بھائی نے اس کا نام ”ذرا سا کیرا“ ہی رکھ دیا اور اس حد تک اس کو کیرا کہہ کر پکارا کہ چند دن میں باقی سب بھی اس کو کیرا پکارے جانے کے عادی ہو گئے۔

اس کو ہمارے گھر پر بابا جانی ہی لے کر آئے تھے کیونکہ بابا جانی اس کے والد کے اسکول دوست تھے اور جیسے ہی ان کو پتا چلا کہ وہ کسی نہ کسی طرح بارڈر کر اس کر کے پاکستان آ گیا ہے اس کی تلاش میں سرگرم ہو گئے تھے اور بڑی تگ و دو کے بعد آخر کار اس کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ اس کے بعد وہ اکثر ہی ہمارے گھر آتا مگر بقول امی کے صرف اس وقت جب حد سے زیادہ بھوکا ہوتا۔ امی اس سے کوئی کام کروانا نہیں چاہتی تھیں مگر وہ خود ہی ہر کام میں ایسا پیش پیش رہتا کہ کام کر کے ہی دم لیتا۔ آخر میں کھانا کھا کر وہ احسان مند ہو کر چلا جاتا۔ وجیہ بھائی سے تو سب ہی عاجز تھے، دادا ابا بھی ان کو خوب ڈانٹ ڈپٹ کرتے رہتے مگر آج ان کی اس حرکت کے بعد تو میرے دل میں ان سے باقاعدہ نفرت نے جڑ پکڑ لی تھی۔

میں جھٹ دور سے ہی چلائی۔ ”شیم آن یو“ وجیہ بھائی! وہ ایک جھٹکے سے مڑے اور دو ایک لمحے کے لیے انہوں نے مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ پھر ان کا قہقہہ اور بلند ہو گیا۔

”لو جی ابھی کیرے سے نمٹے نہیں تھے کہ کالی انگریز تشریف لے آئیں۔“

وجیہ بھائی نے قہقہے کے دوران بات مکمل کی۔ میں کچن کی طرف بھاگی کہ وجیہ بھائی کی اس کریمہ حرکت کے بارے میں امی کو بتا سکوں اور جب تک امی کو لے کر لان میں پہنچی نہ وجیہ بھائی تھے نہ ہی اس کا کچھ پتا تھا۔ وجیہ بھائی کو تو خیر بعد میں چھوٹی پھوپھی۔ دادا ابا اور امی نے خوب سنایا تھا مگر امی اس کے لیے بڑی اداس ہو گئی تھیں۔ آخر کار چھ مہینوں بعد جب بابا جانی آئے تو امی نے سارا معاملہ ان کے گوش گزار کیا۔ بابا جانی بھی وجیہ بھائی کو خوب سنا کر ان کو لے کر اس کی خالہ کے گھر اس کو منانے گئے تو معلوم ہوا کہ اس کے والدین آچکے ہیں اور ایک چھوٹے سے گھر میں رہائش پذیر ہیں۔ بابا جانی نے گھر کا پتہ معلوم کیا اور پھر ایک دن امی کے ساتھ اپنے دوست سے ملنے گئے۔ اور پھر بابا جانی جب بھی پاکستان آتے ان لوگوں سے ملنے ضرور جاتے۔ مجھے امی کی ہی بات چیت سے معلوم ہوتا رہا تھا کہ وہ پڑھنے میں بڑا مگن رہتا ہے اور کسی گارمنٹ فیکٹری میں بھی شام کو کام کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ کبھی ہمارے گھر نہیں آیا۔ آیا بھی تو۔۔۔ جب۔۔۔



”دنیا میں ہر غم کی۔۔۔ ہر دکھ کی تعزیت ہے۔۔۔ افسوس تو بس یہی ہے کہ دل جیسے نازک آئینے کے ٹوٹنے کی کوئی تعزیت نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس اذیت سے بچائے۔ خوش رہیں!“ میں گاڑی میں پیچھے دھن بنی بیٹھی تھی۔ اس کی ڈیوٹی مجھے بیوٹی پارلر سے لے کر شادی ہال چھوڑنے کی تھی۔ ساتھ میں منجھلے بھیا تھے جو کہ راستے میں اتر کر ایک پھول والے سے ہار پھول لے رہے تھے اور اسی تنہائی میں اس نے بس اتنا ہی کہا تھا۔ میں سر سے لے کر پاؤں تک کانپ گئی تھی۔ اور پھر نکاح نامے پر دستخط کرنے تک میرے حواس پر صرف اور صرف یہی الفاظ سوار رہے تھے۔ ہمارے گھر میں اب وہ انسانوں کی بھیڑ کہاں رہی تھی۔ میری شادی تک تو آدھے سے زیادہ لوگ

بیرون ملک سدھار چکے تھے اور سب ہی مہمان بن کر میری شادی میں تشریف لائے تھے۔ ایک دن امی نے اس کو فون کر کے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ کیا وہ اب بھی ناراض ہے۔ کیا اب جب اس کی واقعی ضرورت ہے تو وہ ہمیں سہارا نہیں دے گا۔ اس کے دوسرے دن سے ہی اس نے باقاعدہ شادی کے تمام انتظامات سنبھال لیے تھے۔ سارا دن بھاگ دوڑ کرتا رہتا۔ میں اپنے کمرے سے اکثر اس کی امی سے گفتگو سنتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی دل میں خواہش ہوتی کہ ایک نظر اس کو دیکھ تو لوں۔ آواز میں تو خوب بھاری پن آگیا تھا۔ اور بات کرنے کا انداز بھی رعب دار تھا۔ رات گئے جب وہ لان میں کھڑا کسی مزدور یا ملازم کو ہدایات دے رہا ہوتا تو اس کی گھبراہٹ اور آواز دور تک گونجتی محسوس ہوتی۔ اور مجھے اس کا وہی بچپن کا لمبا دبلا سا ذیل ڈول یاد آ جاتا۔ وہ نیکر سے نکلتی ہوئی پتلی پتلی کالی ٹانگیں۔ پیچرا ذرا سا کیرا۔ نہیں۔ کیرا نہیں۔ جگنو۔ میں نے دل ہی دل میں اس کا نام دھیرے سے پکارا۔



زندگی ہمیں کیسے کیسے راستوں سے گزار کر کہاں کہاں لے جاتی ہے۔ مجھے اپنے سسرال میں چند ایک روز رہ کر ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ امی بری طرح دھوکا کھا گئی ہیں۔ یہ لوگ وہ نہیں جو نظر آرہے تھے۔ گھر میں ایک طوفان بد تمیزی برپا تو رہتا ہی تھا ایک دوسرے سے ہاتھ پائی بھی خوب زور دار قسم کی، کسی بھی وقت ظہور پذیر ہو جاتی تھی۔ میں اس حد تک ڈر گئی تھی کہ امی کے ہاں جانے سے کترانے لگی تھی کہ کہیں میرے منہ سے کچھ نکل نہ جائے۔ ایک دوبار جو میری بڑی نند اور بھانج نے آستینیں چڑھا کر آنکھیں نکال نکال کر باتیں کیں تو مجھے اپنا آپ کہیں دفن ہوتا محسوس ہونے لگا۔ اور تھوڑے ہی دنوں کے اس طرح کے رویے نے مجھے بزدل بنا دیا۔ میں میکے جانے کے نام سے کانپنے لگتی۔ امی اگر فون کر کے

خیریت معلوم کرتیں تو ان کو بھی گول مول جواب دے کر فون جلد از جلد بند کر دیتی کہ میری ساس اور گھر کے باقی لوگ ہر ایک حرکت پر نظر رکھتے۔ شوہر صاحب کے کام کا اب تک پتا نہیں چلا تھا۔ وہ اکثر ہی رات کو خوب دیر سے تشریف لاتے اور آتے کے ساتھ ہی ایک سیشن سب خاندان والوں سے لڑائی اور ہاتھ پائی کا ہوتا اور پھر کھانا کھا کر پڑ کر سو جاتے۔ مجھے اب تک ان کے کاروبار کی نوعیت ہی سمجھ نہیں آ سکی تھی۔ شادی کو چھ مہینے ہو چکے تھے۔ اور ان چھ مہینوں میں ہی انہوں نے مجھے گھر کی ملازمہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ مزے کی بات تو یہ تھی کہ جب بھی میرے میکے سے کوئی آتا سب ان کے سامنے ایسے بچھ جاتے اور کچھ یوں مجھ سے عزت سے پیش آنے لگتے کہ میں حیران ہی رہ جاتی تھی۔ بات کرتی بھی تو کس سے کرتی۔ ایک منٹ کی بھی تنہائی نہ ملتی۔ میں یوں بھی ان لوگوں کی ہاتھ پائی کی عادت سے ایسی ڈری ہوئی تھی کہ ہر وقت بھیگی پٹی بنی رہتی کہ کہیں کسی دن طیش میں آکر سب مجھے ہی نہ پینے لگیں۔ ایک دن حسب معمول میں صبح دودھ لینے باہر نکلی تو ایک کالی بڑی سی گاڑی چند قدموں کے فاصلوں پر نظر آئی۔ میں نے اب تک محلے میں رات کو گھروں کے باہر پارک ہونے والی گاڑیوں کو پہچان لیا تھا۔ اس علاقے کے مکینوں کے پاس اس قدر اعلا معیار کی گاڑی ہونا بھی انوکھی بات تھی۔ لہذا اس نئی گاڑی کو دیکھ کر تھوڑی حیرت ہوئی۔ اور پھر دو تین دن تک مسلسل وہی گاڑی ہمارے گھر کے تھوڑے فاصلے پر صبح کو نظر آنے لگی۔ ایک دن تو میں حد سے زیادہ خوف زدہ ہو گئی جب دودھ والے نے رازدارانہ کجے میں مجھے بتایا کہ کل گوالا دودھ دے کے جا رہا تھا تو اسی کالی گاڑی سے ایک صاحب نے اس سے میرے بارے میں پوچھا تھا کہ میں کون ہوں اور یہاں کس حیثیت سے رہتی ہوں۔ ایک تو سسرال والوں سے ویسے ہی ڈر لگا رہتا تھا، اوپر سے یہ نئی افتاد۔ صبح سب کے سب سو رہے ہوتے تھے، کسی اور سے بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ دودھ

لے لے۔ اور پھر اپنے باہر نہ نکلنے کی وجہ کیا بتاؤں؟
اب تو میں جو دوپیر یا شام میں کبھی سبزی یا گھر کا کوئی سودا
سلف لینے نکلتی تھی ڈر سے وہ بھی نکلنا بند ہو گیا تھا۔
مگر پھر چند روز بعد ہی کالی گاڑی غائب ہو گئی۔ دو تین
دن تک تو میں کسی انہونی کا انتظار کرتی رہی مگر جب
سب کچھ ویسا ہی رہا تو میں پھر سے اپنی زندگی پر غور و فکر
میں لگ گئی۔

اور پھر وہی ہوا جس سے میں ڈرتی آئی تھی۔ چھٹی
کا دن تھا اور گھر کے کام دیر سے شروع ہوئے تھے۔
آدھے سے زیادہ لوگ تو ابھی بھی اپنے اپنے کمروں میں
سوئے ہوئے تھے۔ میں کیونکہ چھٹی کے روز ہی
کپڑے دھلواتی تھی تو ملازمہ کو صبح جلدی بلا لیا کرتی
تھی اور ابھی اس کو میلے کپڑے دھونے کے لیے دے
کر کچن میں جانے کا سوچ ہی رہی تھی۔ کہ میری
ساس صاحبہ غیض و غضب دکھاتی مجھ سے آن
نکرا میں۔ اور باتیں سنانے لگیں کہ ابھی تک ان کو
چائے کیوں نہیں دی۔ میں ابھی ان کو وضاحت دے
ہی رہی تھی کہ میری بڑی مند اپنے ہی بچے کا بلا اٹھا
لا میں اور ساس صاحبہ کو پکڑا یا اور ان کو اکسایا کہ اب
اس کی دھنائی کا وقت آگیا ہے یہ ایسے قابو میں نہیں
آئے گی۔ میں حد سے زیادہ ڈر گئی۔ اور باقاعدہ ہاتھ
جوڑ کر ان سے معافی مانگنے لگی۔ مگر ساس صاحبہ کو
طیش آچکا تھا۔ انہوں نے بلا خوب کس کر مجھے مارنے
کے لیے اٹھایا ہی تھا کہ اچانک غسل خانے سے کپڑے
دھوتی ملازمہ باہر نکل آئی۔ اس نے میرا ہاتھ تھاما اور
تقریباً ”گھسیٹتی ہوئی مجھے گھر سے باہر لے جانے لگی۔
ملازمہ نئی تھی۔ ابھی چند دن پہلے ہی پرانی والی اس کو
اپنی جگہ رکھوا گئی تھی۔ ساس صاحبہ ہکا بکا اپنی جگہ
کھڑی رہ گئیں جبکہ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ
یہ مجھے کہاں گھسیٹ کر لے جا رہی ہے۔ دروازے
تک پہنچتے پہنچتے میں نے اس سے کچھ پوچھنا ہی چاہا تھا
کہ میں نے دیکھا کہ ہمارا دروازہ پہلے ہی سے بھاڑ سا
کھلا ہوا تھا اور سامنے ہی وہ کالی بڑی گاڑی دھوپ میں
چمچائی کھڑی تھی۔ میں ایک لمحے کے لیے سن سی ہوئی

مگر مجھے دیر ہو چکی تھی۔ گاڑی کا دروازہ کھلا اور ملازمہ
نے دھکا دے کر مجھے گاڑی کے اندر دھکیل دیا۔
چند لمحوں تک ایک عجیب وحشت اور ڈر طاری رہا
اس کے بعد میں نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ میرے برابر
میں ہی ملازمہ بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں ہمت ہی کرتی
رہ گئی کہ اس سے کچھ پوچھوں۔ مگر اس کے چہرے پر
ایسی کرخشگی تھی کہ میں چاہ کر بھی منہ نہ کھول سکی اور
چند منٹوں میں ہی مجھے امی کے گھر کے سامنے اتار کر کالی
گاڑی تیزی سے پھر غائب ہو گئی۔ میں دیکھ کر حیران
رہ گئی کہ ہمارے گھر کے دروازے پر جیسے میرے ہی
منتظر امی اور دادا ابا کھڑے تھے۔ امی نے آگے بڑھ کر
مجھے گلے سے لگالیا۔ اور ہم خاموشی سے گھر کے اندر
آگئے۔

امی نے میرے حواس بحال ہونے پر بتایا کہ میرے
سرال پر اس وقت ایف آئی اے نے چھپایا مارا ہے۔
اور ابھی تک میرے شوہر سمیت گھر کے بانی مردوں اور
عورتوں کو بھی حراست میں لے لیا ہو گا۔ میں حیران رہ
گئی جب مجھے بتایا کہ میرے شوہر صاحب اور ان کے
گھر والے ایک منظم اغوا برائے تاوان کا گروہ ہے اور
دکھانے کو ان لوگوں نے ساٹھ ایریا میں فیکٹری لگا
رکھی ہے۔ امی نے یہ بھی بتایا کہ مجھے وہاں سے
نکالنے میں جس کی محنت تھی وہ سی ایس ایس کا امتحان
دے کر اب پولیس میں ایس پی کی نوکری کر رہا تھا اور
ایف آئی اے کے لیے اس نے ہی اس سارے کیس
میں بھاگ دوڑ کی تھی اور چھاپے سے چند دن پہلے ہی وہ
امی کے پاس آکر میرے بارے میں پوچھ کر گیا تھا۔
اس نے مجھے چھاپے سے پہلے وہاں سے نکالنے کی تدبیر
کی اور وہ بھی کچھ یوں کہ نہ تو میرے سرال میں کسی کو
خبر ہو اور نہ ہی ایف آئی اے والوں کو کچھ پتا چل
سکے۔ کیونکہ چھاپے کے دوران اگر میں بھی وہاں
ہوتی تو گرفتار کر لی جاتی پھر یہ بعد کی بات تھی کہ میری
بے گناہی ثابت ہوئی یا نہیں۔ اور اسی سلسلے میں وہ
ملازمہ آنے لگی تھی جس نے گھر کے تمام حالات نوٹ
کر کے اسے بتائے تھے۔ اس نے یہ سب کچھ اس

طریقے سے کیا تھا کہ چھاپہ پڑنے سے صرف چند لمحوں پہلے اس نے ملازمہ کو ہدایات دیں کہ مجھے لے کر نکل پڑے۔ کیونکہ اس کے ڈپارٹمنٹ میں بھی کسی کو اس بارے میں علم نہیں تھا لہذا اگر ملازمہ کو ذرا بھی دیر ہوتی یا ہم یوں بھاگتے ہوئے پکڑے جاتے تو اس کی نوکری بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ مجھے چند ہی دنوں میں شوہر صاحب کی طرف سے طلاق نامہ بھی موصول ہو گیا جو کہ انہوں نے جیل سے ہی روانہ کیا تھا اور یقیناً اس میں بھی اس کا ہی ہاتھ تھا۔ ورنہ یوں اتنی آسانی سے تو شوہر صاحب مجھے چھوڑنے والے تھے نہیں۔ میں ایک بہت بڑے حادثے سے بچ تو گئی تھی مگر پھر بھی طوفان کو اتنے قریب سے دیکھ کر بھنور میں چکر کھا کر کنارے پر تھکے ہارے گرنے پر۔ مجھ میں سب کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اور میں سارا دن سوگوار سی کمرے میں پڑی رہتی۔

عدت کے بعد میری کچھ بچی بچی دوستوں نے باہر ملنے کا پروگرام بنایا گو میرا دل تو نہیں تھا مگر ایک دوست زبردستی مجھے گھسیٹ کر لے گئی۔ سڑکوں پر بھاگتی دوڑتی گاڑیاں اور بازاروں میں کندھے سے کندھا ٹکراتے رش نے جیسے میرے اندر کے ارتعاش کو تقویت دے دی۔ میں اور بھی وحشت زدہ سی ہو گئی۔ دنیا میں سب کی زندگی کا مقصد ہے ایک میں ہی بیکار ہوں۔ میں ہی ناکام۔ تالاق۔ تفرقہ ہے مجھ پر۔ میں دوستوں کے اصرار کے باوجود محفل کو بیچ میں ہی چھوڑ کر خود اکیلی ہی گھر واپس آ گئی۔ اور بتا چلا کہ امی کے ساتھ کوئی ڈرائنگ روم میں بیٹھا اپنی گھبیہ اور بارعب آواز میں باتیں بنا رہا ہے۔ ساتھ میں وجیہ بھائی کے قہقہے بھی وقفے وقفے سے سنائی دے رہے تھے۔ وجیہ بھائی اب شادی شدہ ہو کر دو بچوں کے ابا بن جانے کے باوجود ہمارے گھر باقاعدگی سے آتے تھے۔ اس بارعب اور گھبیہ آواز کو سن کر دل اور بھی بو جھل ہو گیا تھا اور میں شام گئے تک اپنے کمرے کی تنہائی میں آنسو بہاتی رہی۔ شکر تھا کہ امی آج مصروف تھیں ورنہ مجھے اس طرح دیکھ کر ان کو

بھی تکلیف ہوتی۔ رات کے کھانے پر مجھے جانا ہی پڑا کہ امی رات کے کھانے کا ناغہ بالکل بھی برداشت نہیں کرتی تھیں۔ مجھے اور بھی وحشت ہونے لگی جب بات بات پر وجیہ بھائی قہقہہ لگاتے جاتے۔ اچانک انہوں نے امی سے کہا۔

”ممائی جان۔۔۔ اس ”ذرا سے کیڑے“ کی تو کیا پلیٹ ہی ہو گئی۔ کہاں وہ پتلا مدقوق کیرا اور کہاں یہ بارعب پولیس انسپکٹر۔ ہیں جی۔۔۔ میں تو حیران ہی رہ گیا۔“ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

خلاف معمول امی خوش دلی سے بولیں۔ ”اب اس کو کیرا کہاں تو حوالات کی سیر کرا دے گا تم کو ذرا سنبھل کر رہنا۔“ وجیہ بھائی پھر قہقہہ لگانے لگے۔

”ویسے ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ آخر میں کیا کہہ رہا تھا۔ مجھے تو لگا کوئی کوڈ ورڈز میں اس نے کسی کو خاص پیغام بھیجا ہے۔ ویسے یہ کالی انگریز بڑی خاموش ہے۔ اس سے ہی پوچھتا ہوں۔ کیوں کالی انگریز۔؟“

میں آج کسی بھی قسم کے جھگڑے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی لہذا اسی طرح منہ نیچے کیے پلیٹ میں پڑے چاولوں کو چمچے سے کرید رہی تھی۔ وجیہ بھائی پھر گویا ہوئے۔

”سن رہی ہو نا۔۔۔ وہ کہہ گیا ہے کہ بلبل اندھیری رات سے پریشان نہ ہو۔ کیرا راہ دکھانے کو حاضر ہے۔“

پلیٹ بردائیں بائیں چلتا میرا چمچہ ایک دم رک گیا۔ میں نے نظریں اٹھا کر امی کی طرف دیکھا جو مسلسل مسکراتی مجھے ہی دیکھ رہی تھیں۔ وجیہ بھائی ایک لحظہ کو خاموش ہو کر پھر سے قہقہہ لگانے لگے۔

”اوہو! میں تو بھول ہی گیا۔ اب وہ بیچارہ ذرا سا کیرا کہاں رہا۔ اب تو وہ جگنو بن گیا ہے۔“



Downloaded From

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

www.pdfbooksfree.pk



سائہ رضا
حیاتِ سچ کا تہم

مکمل ناول

عبدالعزیز اور ان کی بیگم کے لیے یہ خبر ایک دھچکا تھی کہ عبدالعزیز کی رشتہ کی بہن پھوپھی بھولی نے پروفیسر اللہ دتا ریاض کا میرا سے رشتہ توڑ دیا ہے اور اس کی جگہ حمیرا کے لیے رشتہ دے دیا ہے۔
میرا کا رشتہ اللہ دتا ریاض عرف اے ڈی ریاض سے بچپن سے طے تھا۔
میرا عبدالعزیز کی بیٹی اور حمیرا ان کی بیٹی تھیں۔ عبدالعزیز کے چھوٹے بھائی عبدالمجید کو پڑھائی لکھائی سے کوئی دلچسپی نہ تھی، اسے صرف گھومنے پھرنے کا شوق تھا۔ اس نے اپنے اس شوق کی خاطر ڈرائیوری کا پیشہ منتخب کیا۔ عبدالعزیز کو یہ بات پسند نہ تھی لیکن وہ خاموش ہو گئے۔ عبدالمجید نے ایک لڑکی صفیہ کو پسند کیا۔ عبدالعزیز رشتہ لے کر گئے تو لڑکی والوں



Downloaded From
PUBLIC VIRTUAL LIBRARY
WWW.PDFBOOKSFREE.PK

LIBRARY
free.pk

نے صاف انکار کر دیا۔ لیکن عبد المجید نے اس بات کو تسلیم نہ کیا اس نے صفیہ سے بات کی۔ صفیہ نے اس کی خاطر اپنا گھر چھوڑ دیا اور گھر والوں کی مرضی کے خلاف عبد المجید سے شادی کر لی۔

عبد العزیز کو یہ بات پتا چلی تو وہ سخت ناراض ہوئے اور عبد المجید کو گھر چھوڑنے کے لیے کہہ دیا۔

عبد المجید اپنا حصہ لے کر چلا گیا اور کرائے پر گھر لے کر صفیہ کے ساتھ اپنی دنیا بسالی۔

حمیرا دس سال کی تھی جب عبد المجید ایک حادثے میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ صفیہ کے گھر والے اسے قبول کرنے پر تیار نہ تھے۔ صفیہ بے سہارا تھی۔ گھر بھی کرائے کا تھا۔ ایسے میں عبد العزیز نے بھانج اور بھینجی کے سر پر ہاتھ رکھا اور انہیں اپنے گھر لے آئے۔ صفیہ کو اپنی بیٹی کے مستقبل کی فکر تھی کہ لوگ اسے ماں کے طعنے دیں گے۔

عبد العزیز نے ان کے اطمینان کی خاطر اپنے بیٹے معید سے حمیرا کا رشتہ طے کر دیا۔

صفیہ کو عبد العزیز کی بیوی ناہید اور بیٹی سمیرا کے غیر معمولی حسن سے شدید حسد محسوس ہوتا تھا لیکن انہوں نے اسے چھپائے رکھا تھا۔ یہ حسد نکالنے کا موقع اس وقت ملا جب ناہید نے انہیں پھوپھی بھولی کے پاس سمیرا کی شادی کے لیے عنذیہ لینے بھیجا۔ صفیہ نے وسمیرا اور ناہید کی برائیاں کر کے پھوپھی بھولی کو شدید بدظن کر دیا۔

حمیرا بہت سادہ مزاج اور محبت کرنے والی طبیعت کی مالک تھی لیکن وہ ذہین بھی بہت تھی۔ اے ڈی ریاض نے اس کی ذہانت کو بھانپ کر اس کی پڑھائی میں مدد کی اور اس نے ایم اے کر کے جاب کر لی۔ اس کی اعلا پوزیشن اور بھاری تنخواہ نے پھوپھی بھولی کا ذہن بھی بدل دیا۔

پھوپھی بھولی اس وقت بیوہ ہوئی جب اس کی چار بیٹیاں اور ایک بیٹا بہت چھوٹی عمر کے تھے۔ پھوپھی بھولی کا اکلوتا بیٹا اے ڈی ریاض بہت ذہین اور پڑھائی میں اچھا تھا۔ گاؤں کے ماسٹر نے مشورہ دیا کہ پھوپھی بھولی شہر میں شفٹ ہو جائے اور اللہ دتا ریاض کو تعلیم دلائے۔ پھوپھی بھولی نے عبد العزیز سے مدد لی۔ عبد العزیز نے انہیں اپنے گھر کے برابر میں گھر دلایا۔

پھوپھی بھولی نے سلائی کڑھائی کر کے اے ڈی ریاض کو تعلیم دلائی۔

سمیرا اور اے ڈی ریاض بچپن سے اپنے رشتے سے واقف تھے اور دونوں کے درمیان خاموش محبت کا رشتہ بھی استوار تھا

حمیرا اور معید بھی اپنے رشتے سے واقف تھے۔ حمیرا معید کے لیے گہرے جذبات رکھتی تھی۔ لیکن معید کے ساتھ پیش آنے والے ایک حادثے نے حالات کا رخ یکسر بدل دیا۔

دوسری اور آخری قسط

کرتے جہان۔ وہ بھی یہی سوچا کرتا تھا، مگر اب اس موضوع پر بات کرنا بھی کس قدر تکلیف دہ تھا۔

”وہ دیکھیں“ آموں پر بور آنے لگا ہے، کچھ دن بعد آپ اچار بنانے کے لیے گھر کس لیں گی۔“

اس نے ہاتھ کے اشارے سے آموں کے باغ کی سمت اشارہ کیا۔ اس کا لہجہ شگفتہ تھا، مگر ناہید کی نگاہیں دو سرے جہاز پر تھیں۔ یہ نظر آیا۔ سر سے گزرا۔

نوں مل مل اور غائب۔

”بادلوں کو چیر دینے والے انسان۔ میں چاہتی تھی تمہیں ہواؤں میں اڑنے والا بنا دوں۔“ ناہید کسی

”میں نے سوچا تھا تمہیں پائلٹ بناؤں گی۔“ ناہید کی نگاہیں آسمان پہ اڑتے جنگی جہاز کے ساتھ ساتھ سفر کر رہی تھیں۔ وہ آج بیٹے کے ساتھ ٹہلنے آئی تھیں۔

ابو کو کسی ضروری کام سے صبح صبح نکلنا تھا۔ اس نے تو باپ سے کہا تھا کہ وہ اکیلا چلا جائے گا یا پھر نہیں جاتا، مگر ابو اور امی دونوں ہی اس کا ناغہ نہیں چاہتے تھے۔ سو ناہید چادر لپیٹ کر اس کے ہمراہ آگئیں۔

”میں نے جواب نہیں دیا۔“ جہاز کا شور کم ہوا تو ناہید نے بیٹے کو دیکھا۔ وہ دوسری جانب دیکھ رہا تھا۔ کچھ بل جاتے جب دوسرا جہاز نمودار ہو جاتا۔ جنگلی مشقیں

پسند کرنے والی سمیرا نے کچھ شوخ لباس معمولات میں شامل کر لیے تھے۔

اور اس وقت اسے ڈی کے سر پہنے پر اس نے بے ساختہ گردن جھکا کر خود کو دیکھا۔

”تم پر یہ رنگ بہت سچ رہا ہے۔“

ہلدی رنگ کے پلین سوٹ پر سیاہ ہلکی شال۔ سیاہ پمپ شوز۔ قمیص کے گلے اور آستین پر سیاہ کڑھائی اور ننھے شیشے کے تھے۔ اس کے ہاتھ کی گھڑی کا پٹا زرد تھا۔ اسے اپنے آپ پر پیار آیا۔ صبح آئینے نے بھی یہی کہا تھا۔ وہ سچ رہی تھی۔ اسکول میں کتنے ہی کو لیگز نے سراہا۔ مگر دل میں وہی خوشی نہ ابھری جیسی کہ ابھی۔

”صرف یہی رنگ۔۔۔؟“ اس کے لہجے میں مان

آگیا۔

”نہیں سارے رنگ۔“

خاص دھیان میں چلی گئی تھیں۔ اس کا موضوع بدلنا بے سود ثابت ہوا۔ ”تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو ان شاء اللہ۔“

”میں زمین پر چلنے کے قابل نہیں رہا۔ آپ ہوا میں اڑانے کی بات کرتی ہیں۔“ وہ اسے ملا متنی نگاہ سے دیکھ رہی تھیں۔

”کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا ہے کہ۔۔۔ میں آپ لوگوں کے لیے صرف دکھ کا باعث ہوں۔“ اس نے دل کی بات کہی۔ چھوٹی سی بات مگر کہتے ہوئے جو جبر خود پر کیا اور جو قہر ماں پر ڈھایا۔ آف خدا۔

ہاں وہ اس کے لیے دکھی تھیں۔ ساری دنیا سے زیادہ۔ مگر وہ خود بھی تو اپنے لیے دکھی تھا۔ ہاں اظہار بہت کم کرتا تھا۔ انہیں لگا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں گی۔

”میری طرف سے کوئی خوشی نہیں ملی آپ کو۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

”کیسی باتیں کرتے ہو میرے چاند۔!“ ناہید نے اس کے چہرے کو ہاتھوں میں تھام لیا۔ ”نہیں اڑیاں اٹھانی بڑی تھیں۔ ان کا اونچا لہبا بیٹا۔ مگر۔۔۔ سسکی کو دبانا کتنا مشکل کام ہوتا ہے۔ آہ۔۔۔ کو۔۔۔ ہا ہا ہا سے بدلنا۔“

”تم تو میرا جشن ہو جسے میں ہر روز مناؤں تب بھی دل سیر نہ ہو۔ میرے پیارے بیٹھے۔!“ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگالیا۔

”اوہو۔ ہوا۔ کیا کرتی ہیں۔ ہم روڈ پر کھڑے ہیں۔“ اس نے سٹپا کر چاروں طرف دیکھا۔ دور مسجد کے گنبد تھے۔ آموں کا باغ۔ اور کھیت۔۔۔ دور چلتا ٹریکٹر۔ اسکول کو جاتی ننھی بچیوں نے حیرت سے اس منظر کو دیکھا تھا۔ اور جو نہیں دیکھ پائی تھیں انہیں اشارے سے بتایا تھا دیکھو یہ کیا ہو رہا ہے۔



سمیرا کو سجنے سنور نے کا شوق تھا۔ اور سردیوں کا یہ موسم اس شوق کو جلا بخشنے کا خوب موقع فراہم کرتا تھا۔ ابھی موسم کی پہلی ہوا ہی چلی تھی۔ اور ہلکے رنگوں کو

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

لیکھی شال

رخسانہ نگار عدنان

مکمل ناول کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے



قیمت - 500/- روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر:

32735021

37، اندو بازار، کراچی

”بھئی کہا تو نہیں۔“

”ابھی کہہ رہا ہوں ناں۔“

”آپ کو نہیں لگتا۔ بڑی دیر کی مہربان آتے آتے۔“

وہ دونوں بہت آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آرہے تھے۔ وہ جواب کے لیے بیچ راستے رک گئی۔ اے ڈی کو بھی رکنا پڑا۔ یہ سمیرا کا اسکول تھا۔ وسیع رقبے پر پھیلی عمارت اور میدان اور عمارت سے مین گیٹ تک پارکنگ کے لیے پیدل آنا پڑتا تھا۔

اس وقت رش نہیں تھا۔ مگر پھر بھی چیدہ چیدہ آتے جاتے لوگ۔ سمیرا کے لبوں کی شریر مسکان۔ یہ اس کی اپنی گلی تھی۔ یہاں وہ شیر تھی۔ ٹھیک ہے ایسے تو پھر ایسے ہی سہی۔

”دیر لگی آنے میں ہم کو۔ شکر مگر ہم آئے تو۔“

اے ڈی ریاض نے شعر کو اپنے مرضی کی شکل میں ڈھالا۔

سمیرا ہنس پڑی، کتنی ہی نفرتی گھنٹیاں بجنے کا گماں ہونے لگا تھا۔

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”شکر ہے آپ منیر نیازی کے پیروکار نہیں نکلے۔“

اس نے ذمہ معنی بات کی۔

”ہاں!“ اے ڈی ریاض نے بلند قہقہہ لگایا۔ ”ہمیشہ

دیر کر دیتا ہوں میں۔“

”جی۔“ وہ شعر بوجھ لینے پر شگفتگی سے مسکرائی۔

ہوا سے اڑتے بالوں کو بار بار جمانا پڑتا تھا۔ اس نے سر پر شال کو اچھی طرح جمایا اور قدم بڑھائے۔

اے ڈی ایک قدم پیچھے تھا اس نے سر اٹھا کر آسمان

سے ہم کلام پیڑوں کو دیکھا، ہوا شاخوں کو جھولے دے

رہی تھی۔ ہاں ذرا اور زور سے۔ بس اتنا کہ شال

دوبارہ ڈھلک جائے اور وہ صبح چہرے پر زلفوں کی

اٹھکھیلیوں سے نبرد آزما ہوتا اسے دیکھ سکے اور

پھر اپنی خدمات پیش کر دے۔ انہیں سمیٹ دے بار

بار۔ کئی بار۔

”آپ رک کیوں گئے۔“ سمیرا نے پلٹ کر اسے

پکارا تھا۔

”آں۔۔۔ نہیں آرہا ہوں۔“ اے ڈی جست بھر

کے اس کے ہم قدم ہو گیا۔

”آج ادھر کیسے؟“ وہ دوبارہ ہم قدم تھے۔

”بس یوں ہی ادھر کسی کام سے آیا تھا۔ سوچا،

تمہیں دیکھ لوں تو ساتھ چلیں گے۔“ وہ ہمیشہ یہی کہتا

تھا۔ سمیرا نے مسکراہٹ کو قابو میں کیا۔

”ایک بات کہوں۔“

”ہوں۔“

”برا تو نہیں مانیں گے۔“ اس نے پیش بندی چاہی،

نجانے کیا پوچھنا تھا۔

”بالکل نہیں۔“ وہ اس کی بات کا برا کیسے مان سکتا

تھا۔

”آپ صاف بات کیوں نہیں کر لیتے۔“

”صاف بات کون سی؟“ اے ڈی واقعی نہیں سمجھا

تھا۔

”یہی کہ آپ ساتھ چلنے کی خواہش کو بہانے میں

چھپا کے لے آئے ہیں۔“

”سمیرا“ اب کی بار اے ڈی ریاض بیچ راستے میں

رک گیا تھا۔

”سب کچھ جانتے بوجھتے بھی سوال پوچھنے والے

لوگوں کو قیامت کے دن سخت گناہ ہوگا۔“ اے ڈی

نے اپنی بلا کی پرکشش آنکھوں میں شکوہ بھر کے اسے

دیکھا۔ سمیرا کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ صاف بات کیا کریں

کہ۔“ سمیرا کا لہجہ متبسم تھا۔ مگر بیچ میں اٹک گئی۔ یہ

کیسے کہتی کہ پندرہ دن سے زیادہ آپ مجھے دیکھے بغیر رہ

ہی نہیں سکتے۔

”ہاں ہاں۔۔۔ بات پوری کرو“ وہ شرارت کے موڈ

میں آگیا تھا۔

”نہیں، بس اتنی ہی تھی۔“

”ناں بات پوری کرو۔ ورنہ میں یہیں کھڑا ہوں۔“

اس نے دھمکی دی۔

”میں چلی جاؤں گی۔“ اس پر دھمکی کارگر نہ ہوئی۔

”میں کل صبح تمہیں یہیں ملوں گا۔ اسی طرح

کھڑا۔“

”مشکل ہے۔“ اس نے بیگ کو اپنے کندھے پر

جھاتے ہوئے کہا۔ ”پچھلی بھولی نے سارے شہر کو دوڑا

دینا ہے۔ کہ میرا اے ڈی پتر کہاں رہ گیا ہائے لو کو

ڈھونڈو۔“ اسے ہنسی آرہی تھی۔

”نہیں۔۔۔ وہ ڈھونڈنے کا نہیں کہیں گی۔ سیدھی

یہاں آکر رکھیں گی۔ انہیں پتا ہے کہاں جا کر میٹا پتھر کا

ہو جاتا ہے۔ راستہ بھول جاتا ہے۔“

”پچھلی کی ایک دھاڑ سے پتھر پکھل جائے گا سر جھکا

کر ان کے پیچھے۔“ وہ اے ڈی کو اس کی فرماں برداری

یاد کروا رہی تھی۔

”ان کے پیچھے تو مجھے ہمیشہ سر جھکا کر ہی چلنا ہے

سمیرا!“ اے ڈی کا چہرہ متبسم تھا اس پر ماں کے لیے

محبت و احترام کا جذبہ ابھر آیا تھا۔ ”کیونکہ انہوں نے

مجھے چلنا سکھایا ہے۔ وہ میری ماں ہیں۔ اور وہ یہ جانتی

ہیں۔ میں قدم سے قدم ملا کر کس کے ساتھ چلنا چاہتا

ہوں۔“

سمیرا نے اے ڈی کے جملے کی گہرائی کو دل سے

محسوس کیا۔ بڑی گہری بات کہہ دی تھی اے ڈی نے

اور اس سے زیادہ گہرائی سے وہ اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

”انہوں نے آپ کے کان پکڑ لینے ہیں۔ ہائے اللہ

دہ کلج کے منڈوں کو کڑیوں کے اسکول کلج کے

پھیرے لگاتے دیکھا تھا۔ تو اتنا ڈا پرو فیسر ہو کر یہ کام

کرتا ہے۔ ہائے ہائے ساتھ ساتھ وہ ہاتھ بھی ملتی

جائیں گی۔“

”میں تمہیں پک کرنے آیا تھا۔ کہاں بس کے

دھکے کھائیں۔“

”میں دین میں آتی ہوں۔“ اس نے بتایا۔

”رہنے دو یہاں نیکی کرنا یعنی گناہ کرنا۔ میں تمہارا

بھلا چاہ رہا تھا۔ دین میں اتنا رش ہوتا ہے۔“

”آپ صاف بات کیوں نہیں کر لیتے اے ڈی!“ وہ

وہیں آکر اٹک گئی۔

”ٹھیک ہے۔“ اے ڈی نے گھڑی میں وقت

دیکھا۔

”سامنے بیٹھ جاؤ۔ وہاں بیٹھ پر۔ میں آج تمہیں

صاف صاف بات بتا ہی دیتا ہوں۔“

”پلیز۔“ اس کی ساری طراری اڑن چھو

ہو گئی۔ ”ہائے اس کا اسکول۔ کوئی دیکھے گا تو

۔۔۔ اف!“ اس نے دو قدم سرکتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ

دیے۔

”بس اتنی ہمت تھی۔“ وہ حتمی ہاتھ۔

”ہاں اتنی ہی تھی۔“ اس نے پارمانی لی۔ اے ڈی

ہنس دیا۔ ہر اسماں ہو کر وہ اور پیاری لگی تھی۔



ای کو منانے کے لیے اس نے سچ مچ جان ماری

تھی۔ صحن میں جھاڑو بھی دی گھس گھس کر پونچھا

لگایا۔۔۔ سارے گھر کی جھاڑ پونچھ بھی کر دی۔ دوپہر کے

کھانے میں امی کو دکھا کر سلاڈ کا پیالہ کھالیا۔ شام کو

چائے کے ساتھ پائے کھاتے ہوئے دل کی حالت وہ

جانتی تھی۔ مگر بھوک کی نقاہت چہرے سے بھی عیاں

ہونے لگی۔

ماں تو پھر ماں ہوتی ہے۔ صفیہ خود انھیں آلو گوشت

کے سالن سے تری ہٹا کر ایک نرم پھلکا بھی بنا لائیں۔

”رہنے دیں سارے دن کی محنت برباد ہو جائے گی۔

میں گزارا کر لوں گی۔“ اس نے پاپے کی ٹھیلی سے ایک

پاپا اور نکالا۔

حمیرا کھانے سے منہ موڑے بیٹھی تھی۔ صفیہ کے

دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔ وہ ماں تھیں اس کا برا تو نہیں

چاہتی تھیں۔

”تم نے صفیہ! بلا وجہ ہی بچی کو اتنا سنا دیا۔ جتنا وہ کل

میرے ساتھ بازار میں گھومی پھری۔ ساری انرجی تو

خرچ ہو گئی۔ اس ایک شوارے یا کولڈ ڈرنک سے کیا

فرق پڑتا تھا۔“ بڑی امی نے کہا۔

”بھئی“ آج کل لی وی میں یہی تو بتاتے ہیں ناں۔

کیلوریز خرچ کرنا پھر اس حساب سے کھانا۔ جسم پر

نہیں لگتا۔“ انہوں نے وضاحت دی۔ ”یہ بھی لی وی

والے ہی بتاتے ہیں۔ کہ سونے سے تین چار گھنٹے پہلے رات کا کھانا کھالینا چاہیے۔ ہمارا تو مذہب بھی مغرب کے بعد کھانا کھالینے کی ترغیب دیتا ہے۔ عشاء پڑھیں گے تو سب ہضم۔ وزن کبھی نہیں بڑھے گا۔ اسے کھانا ہی تھا تو کم از کم رات نو تک کھا لیتی۔

”یہ تو آپ اب کہہ رہی ہیں۔ میں اگر نو بجے کھانے لگتی۔ تو آپ کوئی دوسری تقریر کرتیں۔“

”اور چھپ کر کیوں کھایا؟“ صفیہ کو یہ بات بھی پسند نہیں تھی۔

”دکھا کر کھاتی تو آپ چھین کے پھینک دیتیں۔“ حمیرا کے شکوہ بھرے جواب پر صفیہ نے نظریں چرا لیں۔ وہ ایک بار اس کے ہاتھ سے سمو سے چھین چکی تھیں۔

”کھانا کھالو۔“ صفیہ کھڑی ہو گئیں۔ ”اسے کھلا دیں بھابھی! میری تو یہ سنے گی نہیں۔“ اس کا منہ ہنوز پھولا ہوا تھا۔ صفیہ کو جیٹھانی سے کہنا پڑا۔

”میں نے کہا تھا ناں تمہاری ماں کو پتا لگ گیا تو ناراض ہوگی۔“

”آپ کو تو کچھ نہیں کہا۔ مجھے ہی سنائیں ساری۔“ وہ لقمہ بناتے ہوئے بولی۔ کیا خوشبو اٹھ رہی تھی آلو گوشت کے سالن سے۔

”یہی تو بات ہے وہ مجھے کچھ نہیں کہتی۔ ایک بات بتاؤ تمہاری ماں کیا ہمیشہ ایسی ہی تول تول کر بولنے والی ہے۔“ انہوں نے کئی بار کا کیا ہوا سوال دہرایا۔

”کوئی نہیں۔“ حمیرا کا سرنفی میں ہلا۔ ”باتیں کرتی تو ہیں۔ بلکہ ایسے اپنے پوائنٹ مارتی ہیں کہ بندے کے پاس کوئی جواب ہی نہیں رہتا۔“

”ہاں۔ تم سے تو کرنی ہے باتیں وہ۔ مگر دیکھو ناں کتنے سال ہو گئے اسے یہاں آکر رہتے ہوئے مگر ہم بس ضروری بات چیت ہی کر رہے ہیں کوئی ناراضی بھی نہیں۔ کبھی کوئی جھگڑا بھی نہیں ہوا۔ مگر اس نے اپنے گرد ایک دائرہ سا کھینچ رکھا ہے۔“

ان کا لہجہ دلگھڑ سا ہو گیا۔ ایک ہی گھر میں رہتے افراد کے درمیان ان دیکھے فاصلے بہت تکلیف دہ

ہوتے ہیں۔ صفیہ کا اول روز سے بہت نیا تلاء انداز تھا۔ شروع میں اس رویے کو جھجک کہہ کر نظر انداز کیا گیا۔ لیکن! تھوڑا وقت اور گزر رات بئی چیز بتا لگی۔ صفیہ محلہ پڑوس اور خاندان میں بہت ملنسار اور بے تکلف نظر آنے لگیں۔ وہ دکھ درد بھی سنتیں۔ خوشی غمی میں جایا کرتیں، مشورے بھی دیتیں، مددگار بھی نظر آتیں۔ مگر بس جیٹھانی سے ایک حد فاصلہ برقرار رکھا۔

”رہنے دیں بڑی امی! آپ کو اس دائرے کے اندر آکر کرنا بھی کیا ہے۔ کچھ نہیں رکھا اندر۔“ حمیرا انگلیاں چاٹ رہی تھی۔ ”میں رہتی ہوں ناں اس دائرے کے اندر۔ اورو۔“ اس نے جیسے پناہ مانگی۔ ”یہ کرس۔ وہ نہ کرس۔ یہ اچھا ہے وہ برا ہے۔ یہ کھاؤ اور یہ بالکل مت کھاؤ ایسے چلو۔ ایسے بولو کوجی کیا میں نے ایف ایم میں کام کرنا ہے۔ یا کیٹ واک کرنی ہے۔ ہر وقت کی روک ٹوک۔“

بڑی امی ہنستی رہیں۔

”ماں کو ناراض نہیں کرتے۔“

”تو جی میں نے کب کیا۔ بلکہ راضی کرنے کے لیے کتنے کشت اٹھائے۔ آپ تو گواہ ہیں بڑی امی۔“ اس کا اشارہ صبح سے اب تک کیے جانے والے اپنے کاموں کی طرف تھا۔

”تمہاری ماں نے مجھ سے کہا ہے۔ ماسی کو چھٹی دے دوں۔ تم سے کراؤں سارے گھر کے کام خصوصاً ”جھاڑو بوجھا“ آٹا گوندھنا وغیرہ۔“

”اتنے پر ہی اکتفا کیوں۔ گلی کے دو چار گھر اور بھی لے دیں صفائی کے ساتھ کپڑے بھی دھو دوں گی۔ اچھا ہے میں بھی چھٹیوں میں چار پیسے کمالوں گی۔“ اس کی تو جان جل کر خاک ہو گئی۔ گوشت آلو کا مزا کر رہا ہو گیا۔

”اللہ نہ کرے تم کو ماسی ہو۔“

”پر امی تو چاہتی ہیں ناں۔ انہیں میں موٹی بطن لگتی ہوں۔ کہتی ہیں آواز جی بطن جیسی ہے۔“ وہ آزرہ نظر آنے لگی۔ (بڑی اداکاری۔ اسے اپنے آپ سے بڑا پیار تھا۔ اپنی ہر چیز اچھی لگتی تھی۔)

”کیا میں واقعی ایسی ہوں جیسا امی کہتی ہیں۔“ اس

نے گال پھلا کر منہ اونچا کیا۔

”بٹخ جیسی۔“ بڑی امی کو زور سے ہنسی آگئی۔ مگر حمیرا سنجیدہ اور رنجیدہ نظر آئی تھی۔ جواب دینا لازمی تھا۔

”غلط کہتی ہے صفیہ۔ تم چڑیا ہو۔ گدگدی سی چڑیا جو ذرا سے پر پھیلا کر بیٹھتی ہو۔ اور آواز بھی چڑیا جیسی ہے۔“

”سچ۔“ اس نے فوراً یقین کر لیا۔ خوشی سے تالی پٹی اور کھڑی ہو گئی۔

”اب کہاں جا رہی ہو۔ ایسا کوئی کام نہ کرنا جس سے ماں ناراض ہو۔“

”نہیں نہیں۔“ اس نے قطعیت سے انکار کیا۔ ”میں تو کہانی لکھ رہی ہوں۔“

”کہانی؟ وہ کس لیے؟“

”کس لیے کیا مطلب۔ کہانی کس لیے لکھتے ہیں؟ پڑھنے کے لیے۔“

”مطلب۔“ ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ یعنی پہلے لکھو گی پھر پڑھو گی؟

تو اتنی مشکل میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ اتنی ڈھیر کتابیں سمیرا نے اکٹھی کر رکھی ہیں انہیں پڑھو۔ کوئی مصیبت پڑی ہے کہ پہلے لکھنے میں سر کھپاؤ گی پھر پڑھنے بھی خود بیٹھ جاؤ گی۔

”اوہ بڑی امی۔“ اس نے تاسف سے سر رہا تھا مارا۔ ”مجھے تو پڑھنا پڑے گا ناں۔ میں خود اپنے لکھے کو دسھکٹ نہیں دوں گی تو کسی اور سے کیا امید۔“



”سمجھ میں نہیں آرہا۔ ہیروئن کے سوٹ کا رنگ کیا رکھوں اور کون سا کٹ ہو۔“ قلم کی نوک ہونٹوں میں دبائے وہ واقعی مصنفہ لگ رہی تھی۔ پر سوچ چہرہ خلا میں نکلی نگاہیں سنجیدگی کمال کی۔ سمیرا بھی سوچ میں پڑ گئی۔

”فریج کٹ لکھ دو۔“ معید کی بلند آواز اندر تک آئی۔

”فریج کٹ۔۔۔ کس چیز کا؟“ اس نے بھی ہانک لگائی۔

”داڑھی کا۔“

”داڑھی۔!“ اس کے منہ سے قلم پھسل گیا۔ ”میں ہیروئن کی بات کر رہی ہوں معید! اس کے ڈریس کا کٹ۔“

”اووو۔!“ کھڑکی میں اس کا مسکراتا چہرہ نمودار ہوا۔ ”میں سمجھا ہیرو ہے۔“ ”میرا ہیرو کوئی فریج کٹ وٹ نہیں رکھے گا۔“

”کوئی زبردستی ہے۔“ معید نے کہنی چوکھٹ پر نکالی موضوع دلچسپ تھا۔ ”ہو سکتا ہو وہ رکھنا چاہتا ہو اسٹائل ہے ناں ہار۔“

”خوا مخواہ اسٹائل ہے میں شیو کروں گی منٹ کے اندر۔“ وہ زمین پر جھک کر قلم اٹھا رہی تھی۔ ”قلم سے“

سمیرا کو ان دونوں کو دیکھ کر ہنسی آنے لگی۔

”پاگل ہو دونوں۔“ اس نے فیصلہ دیا۔

”سمیرا کی نگاہیں سمیرا کے سر آپے پر ٹک گئیں۔“

”لو خوا مخواہ کی مصیبت پانے کی کیا ضرورت ہے۔“ اس نے تیزی سے قلم اٹھایا۔ ”گہرا جامنی پرنٹڈ دوپٹا قمیص۔ بسکٹی اسٹین اور بسکٹی باجامہ پیروں میں دوپٹی۔

نفاست سے تراشے ناخن۔۔۔ اوہ۔“ اس نے جھک کر سمیرا کے پردیکھے اس وقت نیل پالش نہیں لگا تھا۔ اس نے وہ بھی لکھ دیا۔ مطمئن ہو گئی۔ ”مجھے کیا ضرورت ہے داغ کھپانے کی۔ تم جو کپڑے روز روز بد لوگی بس میں وہی لکھتی رہوں گی۔“ اس نے چٹکی بجائی۔

”بات سنو۔ تم نے ہیروئن کیسی بنائی ہے۔ پیاری تو ہے ناں؟“ سمیرا نے پوچھا۔

”مجھے بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ بنی بنائی مل گئی۔“ اس نے ماؤں والے انداز میں سمیرا کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ گھمایا۔

”ہا میں!“ سمیرا پیچھے کھسکی۔ ”مطلب؟“

”مطلب بی بی یہ ہے کہ مجھے بنانے اور ڈھونڈنے کی ضرورت ہی نہ پڑی سیدھی سیدھی سمیرا کی تشریح

لکھ دی۔ سنہری آنکھیں گلابی رنگ۔ پیارے بال
پیارے ہاتھ۔ پیارا چہرہ۔ پیارا۔
”بہت اچھے۔!“ معید نے ہاتھ جھاڑے ساتھ
ہی بہن کے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھا تو چپ سا
ہو گیا۔ وہ واقعی اتنی پیاری تھی کہ اسے ہیروئن بنایا
جاتا۔

”اور ہیرو۔“ سمیرا نے لگے ہاتھوں یہ بھی جانتا بہتر
سمجھا۔

”ہاں۔“ سمیرا کا چہرہ اترا۔ ”وہ نہیں ملا۔“
”کمال ہے۔“ معید کی بلند خفا آواز ابھری۔
”تمہیں میں نظر نہیں آیا۔“

”تم۔!“ وہ رجسٹر رکھ کے دھاڑی۔ شہادت کی انگلی
اٹھائی ”تم اور ہیرو۔“

”میں ایک ہٹ ناول لکھنے والی ہوں سمجھے تم نے
ایسا سوچا بھی کیسے معید۔؟“ معید کا چہرہ پھیکا پڑا مگر
اس نے خود پر قابو پا کر کہا۔

”ہاں ہٹ ناول جسے ایڈیٹر اپنے پیر کی ہٹ سے دفتر
سے باہر اڑا دے گی۔“

”کیا؟“ وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ ”تم یہ میرے
ناول کے بارے میں کہہ رہے ہو۔“

”نکلے۔ فوراً“ نکلو ادھر سے۔ اسے نکالو سمیرا اپنے
کمرے سے۔“

اسے تو گویا پٹنگے لگ گئے تھے۔ سمیرا نے جڑے
بھینچے اسے زور کی ہنسی آرہی تھی۔

”میں تو کہیں نہیں جانے والا۔ میری بہن کا کمرہ
ہے۔“

”اچھا۔!“ اس نے اپنا منہ کھڑکی سے باہر نکالا۔
”تایا ابو۔۔۔ تایا ابو! اس معید کو بلائیں یہ لڑکیوں میں
گھس کر بیٹھا ہے۔ تنگ کرتا ہے ہمیں بلا میں اسے۔“

”نگاتی رہو آوازیں ابو گھر پر نہیں ہیں۔“ معید
بے فکر تھا۔

”میں گھر آچکا ہوں صاحبزادے۔ باہر آ جاؤ۔“ تایا
ابو کی آواز پر سمیرا نے خوشی سے تالی پٹی اور آگے بڑھ
کر دروازہ کھول دیا۔ کہ باہر نکل جاؤ۔

”کیوں کیا برائی ہے ان میں؟“ سمیرا کو بھی غصہ
آیا۔

”معید۔!“ ابو نے دوسری آواز لگائی۔

”تم سے میں آکر نہبتا ہوں۔“ وہ دھمکا تا نکلا۔

”ہو جاؤ شروع۔“ اس نے کاغذ قلم سنبھالا۔

”میں کیا بتاؤں۔“ سمیرا گڑبڑائی۔

”ایسا کرو۔ وہ تمام کو الٹین بتاتی جاؤ جو ایک ہیرو میں
ہونی چاہئیں اگر مجھے مناسب لگیں تو لکھ لوں گی۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ سمیرا کو یہ کام ذرا آسان لگا۔

اس نے ہونٹ پر شہادت کی انگلی نکالی۔ سوچنے کا
حسین انداز۔ سمیرا نے اس ادا کو نوٹ کیا۔ لکھ لیا۔

”سانولے رنگ پر گھنی سیاہ مونچھیں۔ لبوں پر مدہم
مہرمان مسکراہٹ۔“ جسے تو آنکھیں بھی مسکرائیں۔

سیاہ گھنے بالوں کا ایک گچھا ساماتھے پر ڈھلک ڈھلک
آئے جیسے وہ تہذیب سے دوبارہ جمالے۔ ”سمیرا کو ہیرو
جیسے صاف صاف دکھائی دے رہا تھا۔“

”تد لباب۔ کم از کم چھ فٹ سے اوپر۔“

”سات فٹ لکھ دوں۔“ سمیرا کا قلم رکا۔ اسے شاید
حلیہ پسند نہیں آ رہا تھا۔ ”میں نے ہیرو بنانا ہے یا واپڑا
کی سیڑھی۔“ وہ قلم چھوڑ پڑتال والا کلرک بن گئی۔

”بھئی کہانی میں ایسے ہی ہیرو کو ڈسکرائب کیا جاتا
ہے۔“ سمیرا سائلوں سے کہانیاں پڑھتی رہی تھی۔

”سمیرا نے ان سنی کرتے ہوئے اپنے لکھے کو با آواز
بلند دہرانا شروع کر دیا آواز باہر تک جانے لگی ”یہ حلیہ
تو کچھ جانا پہچانا سالگ رہا ہے۔“ اس نے مشکوک نگاہ
سے دیکھا۔

سمیرا نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر اس سے
پہلے سمیرا کے لہرے نے اس کا منہ بند کر دیا۔

”یہ تو بھائی ریاض کا حلیہ ہے۔ پورا کا پورا پروفیسر
اے ڈی ریاض۔“ اس نے کاغذ قلم پٹا اور گال بھی
پھیلائے اور دونوں ہاتھ کمر پر جمالیے سمیرا نے ہونٹ
کا کونا دانتوں میں دبایا۔ سمیرا کو اور غصہ آیا۔

”بھائی ریاض تمہارے ہیرو ہوں گے۔ میرے
نہیں ہو سکتے آئی سمجھ۔“

”کیوں کیا برائی ہے ان میں؟“ سمیرا کو بھی غصہ
آیا۔

”سمیرا نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر اس سے
پہلے سمیرا کے لہرے نے اس کا منہ بند کر دیا۔“

”یہ تو بھائی ریاض کا حلیہ ہے۔ پورا کا پورا پروفیسر
اے ڈی ریاض۔“ اس نے کاغذ قلم پٹا اور گال بھی
پھیلائے اور دونوں ہاتھ کمر پر جمالیے سمیرا نے ہونٹ
کا کونا دانتوں میں دبایا۔ سمیرا کو اور غصہ آیا۔

”بھائی ریاض تمہارے ہیرو ہوں گے۔ میرے
نہیں ہو سکتے آئی سمجھ۔“

”کیوں کیا برائی ہے ان میں؟“ سمیرا کو بھی غصہ
آیا۔

”سمیرا نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر اس سے
پہلے سمیرا کے لہرے نے اس کا منہ بند کر دیا۔“

”یہ تو بھائی ریاض کا حلیہ ہے۔ پورا کا پورا پروفیسر
اے ڈی ریاض۔“ اس نے کاغذ قلم پٹا اور گال بھی
پھیلائے اور دونوں ہاتھ کمر پر جمالیے سمیرا نے ہونٹ
کا کونا دانتوں میں دبایا۔ سمیرا کو اور غصہ آیا۔

”بھائی ریاض تمہارے ہیرو ہوں گے۔ میرے
نہیں ہو سکتے آئی سمجھ۔“

”کیوں کیا برائی ہے ان میں؟“ سمیرا کو بھی غصہ
آیا۔

”سمیرا نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر اس سے
پہلے سمیرا کے لہرے نے اس کا منہ بند کر دیا۔“

”یہ تو بھائی ریاض کا حلیہ ہے۔ پورا کا پورا پروفیسر
اے ڈی ریاض۔“ اس نے کاغذ قلم پٹا اور گال بھی
پھیلائے اور دونوں ہاتھ کمر پر جمالیے سمیرا نے ہونٹ
کا کونا دانتوں میں دبایا۔ سمیرا کو اور غصہ آیا۔

”بھائی ریاض تمہارے ہیرو ہوں گے۔ میرے
نہیں ہو سکتے آئی سمجھ۔“

”کیوں کیا برائی ہے ان میں؟“ سمیرا کو بھی غصہ
آیا۔

”سمیرا نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر اس سے
پہلے سمیرا کے لہرے نے اس کا منہ بند کر دیا۔“

”یہ تو بھائی ریاض کا حلیہ ہے۔ پورا کا پورا پروفیسر
اے ڈی ریاض۔“ اس نے کاغذ قلم پٹا اور گال بھی
پھیلائے اور دونوں ہاتھ کمر پر جمالیے سمیرا نے ہونٹ
کا کونا دانتوں میں دبایا۔ سمیرا کو اور غصہ آیا۔

”بھائی ریاض تمہارے ہیرو ہوں گے۔ میرے
نہیں ہو سکتے آئی سمجھ۔“

”کیوں کیا برائی ہے ان میں؟“ سمیرا کو بھی غصہ
آیا۔

”سمیرا نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر اس سے
پہلے سمیرا کے لہرے نے اس کا منہ بند کر دیا۔“

”اچھائی کیا ہے۔“ حمیرا نے ہاتھ نہچایا ”سب سے پہلے تو ان کا نام ہی ہیرو والا نہیں ہے۔“

”اے ڈی ریاض۔۔۔ یعنی ہیرو اللہ دتہ ریاض۔۔۔“ (سب سے بڑا اعتراض)

”اچھا!“ حمیرا کے ہاتھ۔۔۔ کمر پر ٹکے۔ ”تو خیر سے اپنے ہیرو کے بارے میں بھی بتاؤ۔“

”میرا ہیرو۔!“ حمیرا نے گردن شاہانہ انداز سے اٹھائی۔ ”وہ تو جب تم دیکھو گی۔ تو پتا لگے گا۔ ویسے بائی واوے تمہیں بھائی ریاض واقعی اچھے لگتے ہیں۔ یا پھر بچپن کی بات طے ہے تو اس لیے مجبوری میں۔“

”مجبوری کیوں؟ وہ اچھے ہیں۔“

”کتنے؟“ حمیرا کو مزا آنے لگا۔ صفائی دینے کے چکر میں حال دل معلوم ہو رہا تھا۔

”بہت زیادہ۔“

”کتنے زیادہ؟“

”ساری دنیا سے زیادہ۔“

”اوہو۔۔۔ کیسے اگلا لیا۔“ حمیرا کی ہنسی بے ساختہ تھی۔ ”ورنہ تو ایسی پاکیزہ محبت ہے۔ پرانے زمانے والی۔ مجال ہے جو ذرا چوری پکڑی جاسکے۔“

”جی نہیں۔ وہ ہیں ہی اتنے مثین اور بڑبڑا لیے چھپچھورے کام نہیں کرتے۔“

”بات یہ نہیں ہے۔“ حمیرا نے تالی کے انداز سے ہاتھ مارے۔

”وہ جس ماں کے بیٹے ہیں ناں وہ انہیں کسی بھی کام سے باز رکھ سکتی ہیں محبت سے بھی۔“

”خوا مخواہ۔“ حمیرا انکاری تھی۔

”مان لو سمیرا! پروفیسر اللہ دتہ ریاض محبت بھی اپنی امی سے پوچھ کر کرنے والوں میں سے ہیں۔“

”پھپھئی پہلے ہی مجھ سے پیار کرتی ہیں۔“ سمیرا کا لہجہ طمانیت سے بھرپور تھا۔

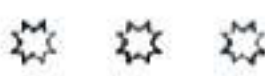
”تم بتاؤ اپنا ہیرو۔“ سمیرا نے مصنوعی خفگی سے دھمکایا۔

”بتاؤں کیوں؟ میرے پاس بھی ہے ہیرو۔“ اس کے لہجے میں زعم تھا۔

”ہم سے چھپاؤ گی۔“ سمیرا نے مان سے کہا۔

”جی ہاں۔“ اس نے رخ پھیرا۔ وہ شاید اب خود سے لکھنے لگی تھی۔ سمیرا نے دیکھنے کی کوشش کی تو اس نے بالکل جھک کر چھپا لیا۔ دونوں میں چھینا جھپٹی شروع ہو گئی۔ ہنسی بھی آنے لگی۔ سارے گھر میں گونجنے لگی۔ حمیرا کی تایا ابو کی شکایتی پکاروں پر بڑی امی کچن سے اٹھ کر آگئی تھیں۔ وجہ تو پتا چلے۔ کیا ہوا۔ دروازہ بند تھا۔ وہ بجاتے ہوئے رک سی گئیں موضوع دلچسپ تھا۔ ہنستی مسکراتی شوخیاں جملے۔۔۔ مگر بات ختم ہونے تک سوچ کے دروازے کھول گیا۔

سنجیدگی، فکر۔۔۔ بیٹی کے حال دل کی کچھ خبر تو تھی۔ مگر بات اتنی آگے چنچ چکی تھی کہ فقط نام لینے سے لہجے میں چاشنی گھل جائے۔ آواز میں کھنک آجائے۔ نہیں معلوم تھا اور اب جبکہ اپنے کانوں سے سن لیا تو فکر دوبارہ جاگ گئی جیسے پٹاری میں بیٹھا سانپ سر اٹھائے۔ پر سوچ ذہن۔ اور کھٹکے قدموں سے واپس پلٹی تھیں۔ دونوں کے ہنسنے کی آواز بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔



”آپ بھولی آیا سے بات کریں گے یا میں خود کہہ دوں؟“ لڑکیوں کے کمرے سے بڑی امی اٹھ کر سیدھا عبدالعزیز کے سر ہو گئیں۔

”تم بیٹی کی ماں ہو۔ اپنے منہ سے کہتی اچھی لگو گی کیا؟“

”میں اپنے اچھے برے منہ کو دیکھوں۔ یا بیٹی کا مستقبل سوچوں۔ پہلے ہی دیر ہو چکی ہمارے اپنے مسائل۔ آپ میری بات سن رہے ہیں ناں۔“

عبدالعزیز اپنے چشمنے کی ڈنڈی درست کر رہے تھے۔ ہاتھ روک کر پوری طرح بیوی کی جانب متوجہ ہو گئے۔

”مجھے تو آج تک وہ لمحہ نہیں بھولتا۔ جب پہلی

ملاقات کی پہلی نگاہ میں بھولی کے منہ سے وہ بے ڈھنگا جملہ نکلا۔

انہیں سب یاد تھا بھولی اپنی چار بیٹیوں اور بیٹے اللہ دتا ریاض کے ہمراہ ان کے گھر آئی تھی۔ وہ گاؤں سے شہر شفٹ ہو گئی تھی۔ عبدالعزیز نے اپنی ہی گلی میں سامنے سے دو گھر چھوڑ کر مکان کا بندوبست کر دیا تھا۔ وہ خود بھی خوش تھیں۔ دور کا ہی سہی ایک رشتہ دار قریب آکر رہنے لگے گا۔ سودھ سکھ خود ان کے میکے کے آدھے لوگ جہلم اور باقی ماندہ کشمیر میں رہتے تھے۔ خوشی غمی میں ہی ملنے کا آسرا ہوتا تھا۔ سسرال میں ایک دیور تھا وہ الگ کہانی۔ بھولی کا نام سن رکھا تھا۔ ایک آدھ بار کی سرسری ملاقات تھی۔

وہ اپنے حیران آنکھوں والے بچوں کے منہ میں نوالے دے رہی تھی۔ جب سمیرا اسکول سے لوٹی تھی۔ سنہری آنکھوں اور سنہرے بالوں والی بچی۔ دھوپ سے آئی تھی کشمیری سیب سے گال قدھاری اتار بنے ہوئے تھے۔ سب کی نگاہیں اس پر ٹک گئیں۔ بھولی نے تیزی دکھائی اسے اپنی طرف کھینٹا۔ چناٹ گل چوے اپنی حیران آنکھیں کیے بیٹھی بیٹیوں کو دیکھا۔ سلونی بھولی بھالی بچیاں۔ اور ساتھ بیٹھا اللہ دتا ریاض جو ٹٹکلی باندھے بس اسے دیکھے ہی جاتا تھا۔ سمیرا کچھ شرمائی سی۔

”تنی سوہنی بیٹی عبدالعزیز۔ اسے تو بس اپنے اللہ دتہ کے لیے لوں گی۔ کیوں اللہ دتا کیسی ہے؟“ بھولی نے فیصلہ سنایا تھا اور رائے اپنے بیٹے سے مانگی۔ عبدالعزیز خفیف ہو گئے۔

ہاں وہ گاؤں کی سادہ دل سادہ مزاج عورت تھیں۔ سادگی آمیز بے اختیاری۔ لیکن سمیرا کی امی کو شدید ترین جھٹکا لگا تھا یہ کوئی طریقہ تھا۔ بات کہنے کا۔ ”جاؤ سمیرا، کپڑے بدل کر آؤ۔ پھر کھانا کھانے بیٹھنا۔“ ان کے چہرے پر تناؤ آگیا۔

”ہاں ہاں جاؤ بیٹی۔“ بھولی نے تائید کی۔ سمیرا کمرے سے نکل گئی۔ وہ پیچھے گئیں۔ ”کپڑے بدل لو تو ہمیں کچن میں کھانا کھا لینا۔“

کمرے میں مت آنا دوبارہ۔“

سمیرا کی آنکھوں میں حیرت پھیلی۔ پر اس نے تابع داری کا مظاہرہ کیا۔ بیٹی کو تو محدود کرنا مگر خود ایک اچھا میزبان ہونے کا ثبوت دینے کے لیے برہ چڑھ کر مہمان داری میں پیش پیش رہیں لیکن وہ جو ایک طیش کی لہر ابھری تھی۔ وہ ماتھے پر سلوٹ بن کر مٹھ گئی۔ پھپھی بھولی کا نام بھولی ہی تھا۔ مگر وہ کوئی سچ سچ کی بھولی تھوڑی تھی۔

”لگتا ہے بھابھی کو میری بات بری لگ گئی۔“ وہ عبدالعزیز سے مخاطب ہوئی۔

”ارے نہیں بھولی آیا!“

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بھولی آیا۔“ مجھے واقعی برا لگا۔ اتنے چھوٹے بچوں کے سامنے اس طرح کی باتیں کرنا مناسب نہیں ہوگا۔“ ان کے لہجے میں بھی ناراضی عود کر آئی تھی۔

”ہاہاہاہ!“ بھولی نے قہقہہ لگایا۔ ”یہ شہری باتیں۔ ہو ہو ہو۔ میری سیکنہ مہینہ کی منگنیاں طے ہیں اور ان کو پتا بھی ہے۔ کیوں سیکنہ! بتا اپنی مامی کو تو کس کی مانگی ہوتی ہے۔“

”اپنی خالہ کے وڈے بیٹے خورشید سے۔“ ترنت جواب آیا۔ بچی سلیقے سے نوالے لے رہی تھی۔ چہرے پر پھیلی بے نیازی اور سکون۔ وہ ششدر رہ گئیں۔

”تو بھی بتادے مہینہ!“ بھولی نے دوسری کو اشارہ کیا۔ ان کو عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی۔ ہاتھ اٹھا کر روک دیا ”رہنے دو بیٹا کھانا کھاؤ۔ بچے ایسی باتیں نہیں کرتے۔“ بچی سر جھکا کر کھانے لگی۔

”وہاں گاؤں میں ایسا ماحول ہو گا آپا۔ مگر ادھر شہر میں۔۔۔ پلیز آپ دوبارہ یہ بات زبان پر مت لائیے گا۔ ایسی باتیں اپنے وقت پر ہی اچھی لگتی ہیں۔ آپ بھی کچھ کیسے تھیں۔“ انہوں نے مدد کے لیے شوہر کو نکارا۔ یہ کس قسم کی احمقانہ گفتگو پہلی یا باضابطہ ملاقات کے دوسرے ہی گھنٹے میں شروع ہو گئی تھی۔

”ٹھیک کہہ رہی ہے سمیرا کی ماں آپا۔ یہاں شہر

میں یہ بچوں کے بڑھنے لکھنے کا وقت ہو ہے۔ ایسی باتیں بری سمجھی جاتی ہیں لوگ مذاق بناتے ہیں اور ویسے بھی ابھی تو آپ آئی ہیں۔ بڑا وقت پڑا ہے ایسی باتوں اور کاموں میں۔“

شوہر کے مختصر مگر بامعنی جواب سے ان کی ہمت بڑھی چہرے پر سکون آگیا۔

”اب آپ شہر آگئی ہیں آپا۔ شہری انداز سے رہنا ہو گا۔ نئے ڈھنگ سے۔“

”اوئے“ ان کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ وہ بری طرح چونک بلکہ ذرا سہم کر پیچھے کو سرکیں۔ بھولی نے ہرھک مارتے ہوئے ہاتھ سر سے اوپر کی طرف اٹھادیا تھا پھر ہاتھ نیچے آیا تو شہادت کی انگلی کھڑی تھی اور چہرے کی طرح گئی میں دائیں باتیں ہلتی تھی۔

”بھولی نہیں ہے وہ عورت جس پر شہر کا رنگ چڑھے گا۔ میں اپنے اصولوں سے پیچھے ہٹنے والی کبھی نہیں۔ میں نے جو کرنا ہے وہی کرنا ہے۔ اب تمہارے ساتھ ہوں بھابھی! دیکھ لیتا بیس سال بعد بھی جو بھولی ذرا بد لے۔“

اور پھر وقت نے واقعی بتا دیا تھا۔ بھولی نہیں بدلی۔ وہ ویسی کی ویسی رہی۔ وہی اس کے اپنے اصول۔ اور اپنی من مانی۔

ان کے صاف منع کر دینے کے باوجود نجانے کیسے یہ بات زبان زد عام ہو گئی۔ کہ یہ جو بھائی عبدالعزیز کی وڈی بہن گاؤں سے ادھر شفٹ ہوئی ہے۔ وہ ہی کل کو سہ ماہی بن گئی۔ سب کی آنکھوں میں شدید حیرت ابھر آئی۔

عبدالعزیز کی مکھن ملائی بیٹی۔؟؟ بھولی کا سوکھا سا سانولا بیٹا۔۔۔ جو زیادہ گھٹا ملتا نہیں تھا۔ ہر وقت کتابوں کے ڈھیر میں غرق۔۔۔ اور بھولی جو سوئی سے شوہر کے مرنے کے بعد پیدا ہو جانے والے شگاف بھرنے کی کوشش میں دن رات ایک کرتی تھی۔ نو عمر بچیوں کو بھی ساتھ لگا لیا تھا۔

”بھائی عبدالعزیز کیا پاگل ہو گیا ہے جو اکلوتی بیٹی کو ایسے گھر میں دے گا۔“ کلی کی عورتیں واقعی حیرت زدہ

تھیں اپنی حیرت ان کے آگے آکر بیان کر دی۔ اور وہ ہکا بکا رہ گئیں۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ جو بات انہوں نے خود سے بھی نہیں دہرائی تھی کہ اس قدر بھونڈی بات کا سوچنا بھی بے وقوفی ہے۔ وہ ایسے سوال بنا کر ان کے منہ پر ماری جا رہی تھی۔

”بھولی کا دماغ خراب ہے۔“ وہ پھٹ پڑیں۔ یہ اتنی لمبی سالوں پرانی منگنیاں انہیں سخت ناپسند تھیں۔ لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ بھولی اس وقت تو خاموش ہو گئی تھی۔ مگر بعد میں اپنی خواہش ہر آئے گئے کے آگے بیان ضرور کر دی تھی۔

یہاں تک کہ وہ دن آگیا جب اللہ داتا ریاض نے میٹرک میں پورے صوبے میں پہلا نمبر لے کر اپنی ماں کو بھی حیران کر دیا اور سمیرا کی ماں کو بھی۔

”وہ واقعی اتنا جینیس تھا؟“ بڑی امی ہکا بکا تھیں۔ وزیر اعلیٰ نے اسے گولڈ میڈل دیا تھا اور آگے پڑھائی کا سارا خرچا حکومت اٹھائے گی چاہے تو ملک سے باہر جا کر پڑھ لے۔

”ہائے!“ پھپھی بھولی گولڈ میڈل کو ہاتھ میں لے کر تولتی پائی گئی (چلو جی اسے بخو کر سیکھنے کے لیے جھمکے بنوائے گی ایک لڑکی کے کان تو ڈھکے گئے واہ جی واہ بعد میں وقت نے اس چیز کو ثابت بھی کیا۔ اے ڈی ریاض کے پاس صرف یادگاری تصاویر نہیں یا وہ فیتہ جس میں میڈل پرویا گیا تھا۔ سونا پھپھی نے ٹائم سے ہی سنبھال لیا تھا وہی چار لڑکیوں کے کان، ناک، گلا، بازو۔ اللہ داتا میڈل لا تارہا۔ پھپھی بھولی کے ارادے بڑھتے گئے)

عبدالعزیز مٹھالی کے ڈبے، پھولوں کے ہار اور تحائف کے ساتھ مبارکباد کے لیے پہنچے سمیرا بھی ساتھ تھی صفیہ اور حمیرا بھی۔

پھپھی نے موقع شناسی کا مظاہرہ کیا۔ دو سال پرانا سوال ایک بار پھر دہرایا بڑی امی کے حساب سے اب بھی ایسی باتوں کا وقت نہیں تھا مگر پھپھی اپنی ہی سنار ہی تھیں۔

”دیکھ بھائی عزیز! تم دونوں صرف دو بھائی۔ ایک اللہ کو پیارا ہو گیا پیچھے چھوڑی بیٹی۔ ادھر تیرے

سورہ (سرال) میں بھی تیری بیوی سب سے بڑی بیٹی تھی تو اس کے بھانجے بھتیجے، سیرا سے کتنے کتنے سال چھوٹے ہیں صاف نظر آتا ہے جب تو نے بیٹی بیاہنے کھڑا ہوتا ہے تو باہر والوں کا ہی منہ دیکھنا ہے یا پھر خاندان برداری کو پھولے گا (چھانٹا) تو یہ بہتر نہیں ہے میرے اللہ دنا پر ہاتھ رکھ دے۔ اب بیٹا میرا بھی پڑھا لکھا ہے (میسٹرک فرسٹ ڈویژن گولڈ میڈل) تیری لڑکی بھی پڑھتی ہے تو کیوں نہ ہم دونوں کر لیں ان کا رشتہ آپس میں۔ منہ زبانی ہی۔ شادی کے ٹیم (ٹائم) ڈھول و بجے کر لیں گے۔ ویسے بھی میرا حق سب سے زیادہ ہے۔ تم دونوں بھائیوں کے کلمے کلمے (اکلوتے) تائے کی کھلی کھلی نشانی میں ہی تو ہوں۔ ایک ہی گھر کے جم پل (پیدائش پرورش) ہیں ہم۔ تم دونوں پیدا ہوئے تو میں گھر گھر جا کرتا ہی تھی۔ میرے بھائی پیدا ہوئے ہیں اپنے ہاتھوں تم دونوں کو ہی اللہ بخشنے عبدالمجید کو۔ نہلاتی تھی۔ دھلاتی تھی تیل سرمانگا کر تیار کر کے سارے دن کچھڑ لپے (کمر پر ٹکائے) پھرتی تھی۔ منہ سرچوم کے رکھتی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے نوالے بنا کر ڈالے میں تمہارے منہ میں۔ تو پھر مجھ سے زیادہ حق کس کا ہے بتاؤ۔

وہ حق دق رہ گئیں۔ احسان جتاتے سنا تھا، مگر یہ انداز اور بدل میں کیا مانگ رہی تھیں۔ ان کی نظریں اللہ دنا ریاض پر ٹک گئیں۔ سانولا پر کشش دہلا پتلا لڑکا جس کی آنکھوں میں ذہانت کی گہری چمک تھی، مگر ایک لوجو بہت مدہم تھی وہ سیرا پر نظر پڑنے سے جھلملاتی تھی۔

”اوہ۔“ انہوں نے لمبا سانس لیا، ماں اور بیٹا، ہم خیال تھے ان کی نگاہ سیرا پر اٹھ گئی۔ وہ اسی محفل کا حصہ تھی، مگر ذرا پرے ہو کر اس گولڈ میڈل کو دیکھ رہی تھی جو اللہ دنا ریاض لایا تھا۔

وہ اللہ دنا کی بہنوں اور حمیرا کے ساتھ محو گفتگو تھی۔ بچوں کا دھیان نہیں تھا ہاں، مگر وہ اللہ دنا کے آنکھوں کی جھلملاتی روشنی۔ اور بھولی کالج جت آمیز انداز۔ وہ باقاعدہ جھولی پھیلا چکی تھی۔ صغیہ کا چہرہ

سنجیدہ تھا۔ ان کے اعصاب تن گئے۔ عبد العزیز نے بھولی کی جھولی کو سمیٹ دیا اور بندھے ہاتھوں کو نرمی و احترام سے کھولتے ہوئے کچھ کہہ رہے تھے۔

”ابھی ان باتوں کا وقت نہیں ہے، بھولی آیا۔ بچوں سے بھی پوچھنا پڑتا ہے اور پھر۔“

”لو پوچھنے کا کیا مطلب میرا اللہ دنا راضی ہے کیوں اللہ دنا؟“ بھولی نے اللہ دنا کا ہاتھ جھپٹ کر جھنجھوڑ دیا۔

”جی۔ جی۔ ماں۔!“ وہ گڑبڑایا اور اثبات میں سر ہلا دیا اب پتا نہیں ماں کی پکار کا جواب دیا تھا یا ہاں کہی تھی۔ بڑی امی نے سر ہاتھ پر گرالیا۔ بھولی نے ذرا توجہ نہ دی (وہ بھائی سے مانگ رہی تھی، بھابھی کا کیا ہے؟ بڑی آلی شہرن)

ادھر عبد العزیز انکاری نہیں تھے ان کے انداز کی لچک سے پتا چل رہا تھا، مگر وہ مان کے بھی نہیں دیتے تھے۔

”چھاپل ٹھیک ہے۔“ بھولی نے ہاتھ اٹھا دیے۔

”تو باقاعدہ اعلان نہ کر، مگر یہ کہہ دے کہ تیری بیٹی پر پہلا حق میرا ہے۔“

”میں کیسے؟ کیا مطلب؟“ عبد العزیز نے بیوی اور بھانج کو دیکھا۔

”جب بھی تو بیٹی بیانے لگے گا، پہلے مجھ سے پوچھے گا۔“

”اوہ۔!“ بڑی امی کا چہرہ پر سکون ہو گیا۔ بھولی سے اتنی عقل مندی کی امید نہیں تھی۔ تھوڑا سا متوازن رویہ۔ درمیانی راستہ شکر۔ اور ان کے چہرے پر پھیلا سکون شوہر کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہا۔

”ٹھیک ہے۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا دیئے۔ ”مگر ایک شرط ہے۔“

”وہ کیا؟“ سب ہی چونک اٹھے۔

”جب وقت آئے گا تب کے حالات، بچوں کی پسند و نونوں کا ایک دوسرے کے لیے مناسب ہونا، سب چیزیں دیکھتے ہوئے بات کی جائے گی۔“

”ہاں جی اس میں شرط کی کیا بات ہے۔“ بھولی نے

سیاہ گہری آنکھوں کی چمک نے ایک درز بنا دی ذرا سا روزن۔ روزن شگاف بن جاتے ہیں۔

اور بات اگر دل کی ہو تو۔۔۔ درزیں۔۔۔ دروازے ہو جاتی ہیں اور دروازے شاہراہ بن جاتے ہیں جہاں محبت شان سے چہل قدمی کرتی ہے۔ محبت کی شاہراہ کے دونوں اطراف گھنے درخت آگ آتے ہیں اور جن پر انوکھے رنگوں کے پھول کھلتے ہیں، انجانی تمسور کن خوشبو میں اٹھتی ہیں قدموں کے نیچے پھول بچھ جانے کا گمان ہوتا ہے، ناخدا نگاہ رنگ۔۔۔ چہما ہٹیں، گنگنا ہٹیں۔۔۔

اور یہی سب سمیرا کے ساتھ بھی ہوا۔۔۔ کب ہوا۔ پتا ہی نہ چلا، لیکن ماں کے خیالاً، تربیت ماحول، مزاج کا حصہ بن گئے تھے۔ اظہار بھی نہیں ہوا نہ کوئی چوک۔۔۔ مگر اک نگاہ کی چوری۔۔۔ ایک مسکراہٹ دہلی دہلی سی۔۔۔ ایک خوشی جو دل میں یوں پھوٹتی تھی جسے برسات میں بھی۔۔۔ خود رو ہوتی۔۔۔ جگنو کا لپکا۔۔۔ پل پھر کو۔

اتنا سب ہو گیا۔ سمیرا کو پتا ہی نہ چلا۔ دل کی دھڑکن۔ اے ڈی ریاض کے نام کی محتاج ہو گئی۔ ہائے۔۔۔ خدادا دشمن کو بھی اس تکلیف سے دور رکھے وہ سوچتی تھی، پیروں، گھنٹوں۔۔۔ راتوں کو جب نیند دور کھڑے ہو کر لپچاتی تھی۔

اور بڑی امی۔۔۔ وہ ماں تھیں، بیٹی کی آنکھ کا رنگ نہ پہچانتیں تو کس بات کی ماں۔۔۔

اور کتنا وقت گزر گیا تھا ان سب باتوں کو۔۔۔ اب تو وہ وقت بھی گزر گیا تھا جو عبدالعزیز نے طے کیا تھا۔ پسندیدگی مناسبت۔۔۔ حالات وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے یوں مناسب تھے جیسے سرخ کے ساتھ سنہرا رنگ پسندیدگی ایسی تھی جیسے چاند کے گرد چکوری۔۔۔ برسات کے لیے مورنی کی دیوانگی جیسی۔۔۔ ہاں۔۔۔ مگر۔۔۔ حالات۔۔۔ حالات پہلے جیسے نہیں رہے تھے۔ لیکن حالات کا رونا ان کی طرف سے تو تھا پر پھپھی بھولی کی طرف تو نہیں تھا۔

ان کا بیٹا ان کے گمان کی حد سے زیادہ قابل و

لمحوں میں مان لیا۔ سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا، مگر اس کا کیا کرتے کہ بھولی نے اگلی صبح ہی اس بات کو سارے خاندان محلہ جان پہچان والوں سب میں پھیلا دیا۔ شرط بھی بتادی اور یہ بھی کہہ دیا میرا بیٹا اتنا قابل ہے وہ مامے کی ساری شرطوں پر پورا اتر جائے گا اور یہ کہ ”میرے اللہ داتا کو ناپسند کر کون سکتا ہے۔ شہزادہ ہے میرا پتر۔۔۔ اور قابل اتنا کہ حکومت پیسے خود گھر بھیج رہی ہے۔“

وہ شوہر کو دیکھ کر رہ گئیں۔ دیگ کا ایک دانہ چکھتے ہیں دو ڈھائی سالوں میں انہیں اللہ داتا ویسے بھی اچھا لگا تھا۔ سلجھا ہوا، تمیز دار لڑکا جسے صرف اپنی پڑھائی اور ماں کی تابعداری سے مطلب تھا۔ وہ یا تو پڑھتا لکھتا پایا جاتا یا پھر ماں بہنوں کے بنائے کڑھائی بنائی کے نمونوں کو سائیکل پر مطلوبہ جگہ تک پہنچا کر آتا (پھپھی بھولی کو بوتھک سے آرڈر ملنے لگے تھے شہر آکر ان کے ہنر کو چار چاند لگ گئے تھے گاؤں کے ماسٹر جی نے بالکل درست مشورہ دیا تھا)

مگر ایسے کیسے چوہ پندرہ برس کی لڑکی جو کھیل تماشوں سے نکل کر اب پڑھائی لکھائی میں داخل ہو رہی تھی۔ اسے ایک نئے رشتے سے متعارف کروا دیا جاتا جبکہ ان کے سمیرا کے حوالے سے بہت سے خواب تھے، اعلیٰ تعلیم، خود مختار ہو بلکہ ملازمت بھی کرے، اپنے پیروں پر کھڑی ہو اور ایسے میں اگر دماغ میں پہلے ہی خناس بھر جائے تو۔۔۔

انہوں نے شعوری کوشش سے اسے ہمیشہ یہ باور کروایا کہ یہ ایک بات ہے اسے سر پر سوار کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں، دل میں لانے کا تو سوال ہی کیا؟ اور سمیرا کا ٹارگٹ۔۔۔ صرف اپنی تعلیم ہونا چاہیے اور ہر چیز اپنے وقت پر اچھی لگتی ہے اور۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ سمیرا ماں کے خیالات و نظریات سے واقف تھی۔

خود اس کے اپنے دل میں بھی بہت سارا پڑھنے اور قابلیت حاصل کرنے کا شوق تھا۔ (وہ پڑھائی میں اچھی تھی اور کچھ خاص پڑھنا چاہتی تھی، نام گمانا چاہتی تھی) مگر پڑھائی کے شائق دل کے اندر سانولے چہرے اور

عبدالعزیز نے حقیقت پسندی سے کام لیا۔



کتنی بڑی خوشی کا دن تھا ناہید کے لیے۔ ان کا بیٹا آج کالج کے لیے نکل رہا تھا اتنی خوشی تو اس دن بھی نہیں ہوئی تھی جس دن اسے پہلی بار نرسری کلاس کے لیے تیار کیا تھا جتنی کہ آج۔ ایکسپلنٹ کے بعد زندگی کی امید نہیں تھی۔ زندگی کے بعد بحالی کی اور بحالی کے بعد دوبارہ فعال ہو جانا تو اس وقت دیوانے کا خواب لگتا تھا کیا وہ دوبارہ زندگی کو جی سکے گا۔ ویسے جیسے کہ زندگی کو جینے کا حق ہے یا طریقہ ہے اور آج اس خواب کی طرف اس کا پہلا قدم تھا۔

ہاں وہ ہم اپنے عمروں سے ہم جماعتوں سے پیچھے رہ گیا تھا، لیکن کوئی بات نہیں۔ زندگی شرط ہے۔ نمبروں کا کیا ہے آگے پیچھے ہوتے رہتے ہیں۔

وہ اس کے لیے ڈھیر سارے ناشتے کے لوازمات سجائے بیٹھی تھیں اور وہ کتنا پیارا لگ رہا تھا شہزادہ؟ لیکن نہیں شہزادے عام شکل و صورت کے بھی تو ہوتے ہیں۔ ان کا بیٹا یوسف ثانی لگ رہا تھا۔ ہاں ٹھیک ہے، یہ ان کے دل کی گواہی تھی۔

بس ایک بار جسم پر بوٹی چڑھ جائے۔ وہ اب بھی بہت دبلا سوکھا تھا، لیکن پیلا پن ختم ہو گیا تھا چار سال کی بیماری۔ لاچاری۔ میٹرک کا رزلٹ نکلا تھا وہ خوشی میں دوستوں کے ساتھ بائیک لے کر نکل گیا تھا اور کبھی بھی وہ چھپھورا نہیں تھا، مگر نجانے کیسے موٹر سائیکل کی اسپید زیادہ ہو گئی اور اور۔ اس کے بعد بائیک ایسے پچلی ملی تھی جیسے کانغ کی پنی تھی اور کسی نے کانغ کو ہاتھوں سے پھوڑ دیا ہو اور سوار۔ اوہ خدا۔۔۔ ناہید نے جھرجھری لی۔

مگر آج ان کا بیٹا دوبارہ سے عملی زندگی میں قدم رکھ رہا تھا۔ قدرے ست رفتار سسی، مگر جیت بھی تو بھی کچھوے کو ملی تھی تو طے ہوا برق رفتاری اتنی بھی بڑی خوبی نہیں۔

”میں جہاز تو نہیں اڑا سکا امی!“ وہ دروازے تک

کامیاب نکلا تھا۔ سارے دلدار دور۔ وہ بیٹیوں کو بالخصوص ایسے ڈی سے پھوٹی والی سیکنہ مہینہ کو پہلے بیاہنا چاہتی تھی۔ آج انہیں اپنے گھروں کا ہوئے ہوئے بھی سالوں کی گنتی ہونے لگی تھی۔

بڑی امی کو بھی چار کنواری نندوں کے سر پر بیٹی نہیں بھیننی تھی۔ اچھا ہوا وہ صبح وقت پر عزت سے اپنے گھروں کی ہو گئیں۔

لیکن اب تو بھولی نے نمبر تین والی ذکیہ کی دن تاریخ بھی رکھ دی تھی اور عطیہ کی بات بھی طے ہو گئی تھی تو۔۔۔ اللہ دنا ریاض کب تک۔۔۔ اب بھولی کے لیے کیا امر مانع تھا۔

وہ خود تو کیا۔۔۔ عزیز رشتے دار بھی ان سے اور بھولی سے پوچھنے لگے تھے پر بھولی چپ تھی انہوں نے بہت دیر سے سہی، مگر نوٹ کرنا شروع کر دیا تھا بھولی کے انداز کی محبت تو پہلے جیسی ہی تھی، مگر۔۔۔ وہ رشتے کے حوالے سے بات نہیں کرتی تھی شاید۔ عبدالعزیز کی تنبیہ یاد ہو۔

”وقت آنے پر۔۔۔“

مگر پہلے تو وہ وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی انداز سے کوئی جملہ ایسا کہہ دیتی تھی جو ”رشتے“ کو نمایاں کرتا تھا۔ لیکن۔۔۔

اور یہ سب اس وقت بھی شوہر سے کہنے کے بعد وہ چاہتی تھیں وہ خود بھولی سے بات کریں کہ کب۔۔۔ کوئی اشارہ کوئی پیغام۔

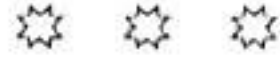
”وہ کہہ رہی تھیں گھر بنانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔“
”تو یہ اچھی بات ہے۔“ ان کا دل مضبوط ہوا۔
لیکن مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ ان کے لہجے کی بے ساختگی اور سادگی میں سچائی نہیں لگی۔
”تمہیں ہمیشہ سے ان کے انداز پر اعتراض رہے ہیں۔“

”وہ اپنی جگہ درست ہے۔ خیر۔ گھر والی بات بھی درست ہے، مگر یہ گھر کب تک بنے گا؟“ انہوں نے خود کو انتظار کے لیے تیار کیا۔

”بن جائے گا، گھر بنانا کوئی آسان کام ہے۔“

اسے خدا حافظ کہنے آئی تھیں۔ آج پہلے دن ابونے پک اینڈ ڈراپ کی اسپیشل سروس فراہم کی تھی۔
”لیکن جہازوں کو زمین پر سے کنٹرول کرنے والا افسر ضرور بن کر دکھاؤں گا۔“
”سچ۔!“ ناہید کی آنکھیں چمکیں۔

”سچ۔!“ اس نے اپنے ہونٹ ماں کی پیشانی سے چپکا دیے۔



”کتنی دنوں بعد سورج نے شکل دکھائی ہے۔ ورنہ زندگی ایک رضائی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔“ اتنی گہری بات حمیرا مجید کے علاوہ اور کون کہہ سکتا تھا۔
شدید دھند نے ساری زمین کو اپنے قبضے میں کر رکھا تھا۔ سڑی کے کیا کہنے۔ سارا شہر سی سی ہی ہو ہو گیا تھا پر اب جو یہ سورج نکلا نرم گرم سی دھوپ۔ اتنے دنوں سے چبھتی ہوا میں بھی اب شرارت کے موڈ میں تھیں وہ دونوں موسم کی اس نئی ترنگ سے لطف اٹھانے کے لیے چھت پر چلی آئی تھیں ساتھ میں کنوؤں کی ٹوکری بھی لائی تھیں۔ پیچھے پیچھے دونوں کی امیاں بھی آگئیں اور وہ کوئی اکیلی نہیں تھیں۔ تقریباً ہر گھر کی چھت پر عورتیں موجود تھیں۔ دھوپ سینی جاری تھی سبزی بن رہی تھی۔ ہر چھت کی منڈیر پر لحاف ڈال دیے گئے تھے بستر بھی دھوپ مانگنے لگے۔

”او خدا۔!“ حمیرا نے دونوں ہاتھ آپس میں بھینچ کر جیسے سورج کی بلا میں لیں صین اس کے سامنے یہ بڑا روشنی کا منبع۔ پیروں سے موزے اتار کر وہ ننگے پیر سورج کی سمت منڈیر تک آگئی۔

”کہاں تھے تم اتنے دنوں سے۔؟ ہر روز اس امید پر چھت پر آتی تھی کہ تم ملو گے مگر تم نہیں ملے۔ دھند سے ڈر کر ایسا بھاگے۔ مئی جون میں تو بڑی مردانگی جھاڑتے ہو۔ دسمبر جنوری میں کیا بزدل ہو جاتے ہو میرے آفتاب۔“

وہ سورج سے ہم کلام تھی۔ دونوں بائیں ٹانگیں ہر دوں انداز میں وا کر لی تھیں۔ چہرہ سورج کی طرف کیے وہ

روٹھی محبوبہ کی طرح شکوہ کنایاں تھی۔
صفیہ نے سر پر ہاتھ مارا۔ اگر کوئی سن لے تو کیا کہے صفیہ کی بیٹی کا کس آفتاب سے چکر ہے جسے وہ ایسے ایسے طریقے سے پکارتی ہے کہ سر شرم سے جھک جائے۔

بڑی امی کھلے منہ سے سن رہی تھیں وہ ایک گدا لیے نیچے بیٹھی تھیں ڈورے ڈالنے تھے۔ سمیرا نے پلیٹ بھر کے کنو چھیل لیے تھے۔ وہ حمیرا کے پاس چلی گئی پر حمیرا نے دھیان نہ دیا۔ وہ ہم کلام ہونے کے اس مرحلے میں تھی جہاں سے ہم کو خود ہماری خبر نہیں آتی۔

”اس سے یہ بھی کہو اس کے ہجر نے ہمیں سوکھی لکڑی کی طرح چٹھا دیا تھا۔ سارا روپ رتن کھو گیا؟“
سمیرا نے پھانک منہ میں رکھی اور اپنے ہاتھ کی جلد دکھائی لاکھ احتیاط کے باوجود سخت سردی نے ساری نمی چھین لی تھی۔

”ہاں۔“ حمیرا نے سن لیا، مگر گردن نہ موڑی۔
”سارے سر میں خشکی بھی ہو گئی۔“
”بالکل ٹھیک۔“ سمیرا نے سراہا۔

”میں سورج مکھی ہو گئی تھی میرے ندیم۔ نہ تم نکلے نہ میں۔ نکلی میرا مطلب ہے کھلی۔“
”بھی تو تم آفتاب کہہ رہی تھیں۔“ سمیرا نے ٹوکا۔

”ہاں ہاں میرے آفتاب۔“

”اسے یاد کرو دو بائیں والے بڑوسی کا نام ندیم ہے۔ ابھی اس کی بیوی دندنا تھی ہوئی چنچ جائے گی اور دائیں والے کے دادا کا نام چوہدری آفتاب ہے۔ کہیں وہ خود ہی گر تا پڑتا نہ آجائے کہ دھیوں مینوں کئے سوبا۔“
(بیٹیوں مجھے کس نے بلایا۔)

سمیرا کے منہ سے کینو کے بیج پھو کر کے نکلے اس نے بمشکل خود کو اچھو لگنے سے بچایا تھا اپنی امی سے ایسی ہڈیہ منجھی کی امید نہیں تھی۔

جبکہ صفیہ کے صبر کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ ذرا جھک کر اپنے پیر سے جوتی اتاری۔ ٹھاٹھ۔ دو سری ٹھاٹھ۔ اور

ساتھ ہی حمیرا کی ہا۔ اور پھر ہائے ہائے۔ ماں نے مغرب کی طرف سے جوتا برسایا تھا اور نشانہ کیا خوب تھا سیدھا کمر پر۔

”کوئی اپنی بیٹی کو ایسے مارتا ہے لے کر میری ریڑھ کی ہڈی ہلا دی ہائے میری کمر۔“

”کمر نہیں کمر۔ بلکہ پورا ایک کلمہ (ایکڑ)۔“ صفیہ کی جان جل کر خاک ہو چکی تھی۔ حمیرا کی پشت اس کے سامنے تھی۔ سمیرا اس کے پیچھے ذرا سا جھکی قمیص میں ہاتھ ڈال کر شانے والی جگہ کو سہلارہی تھی۔ اس کی لمبی چوٹی آگے آکر گر گئی۔ اس کی نازک کمریا۔ ایک بالشت سے کیا زیادہ ہوگی اور وہ۔

”حمیرا۔“ صفیہ نے دانت پیسے۔ حمیرا قطعی موٹی نہیں تھی مگر سمیرا کے آگے لگتی تھی اور سمیرا اللہ کے بنائے ان چند لوگوں میں سے تھی جس کے آگے باقی سب بس منظر میں چلے جاتے ہیں۔

”امی کا بس چلے تو مجھے چھری لے کر چھیلنا شروع کر دیں۔ یہاں سے کم یہاں سے زیادہ۔“ حمیرا نے لمبی چھوڑی۔

”تو اپنے آپ کو تم نے دیکھا ہے۔ خمیری روٹی کی طرح پھولتی جا رہی ہو۔“

”آپ مجھے برا بھی کہہ سکتی تھیں۔“

”اس سے کیا ہو گا؟“ صفیہ کی ناراضی کے پیش نظر سمیرا نے گھورا حالانکہ متبسم چہرہ گدگدی کی ترجمانی کر رہا تھا۔

”تھوڑی ماڈرن لک آجاتی یا۔!“ اس بار تو بڑی امی کی ہنسی بھی نکل گئی پھر صفیہ کی سنجیدگی کو دیکھ کر فوراً گدے پر جھک گئیں۔

”اچھا جسم سنبھال لو حمیرا۔“ صفیہ کی دھمکی فیصلہ کن تھی۔

”رہنے دو صفیہ۔! اتنا مت ٹوکو۔ اس عمر میں بچیاں ایسی ہی ہوتی ہیں دو چار سال گزریں گے تو خود بخود مناسب ہو جائے گی۔ کالج کی پڑھائی محنت سب کھایا پیا جلا دیتی ہے۔“

بڑی امی کا تجزیہ و تبصرہ بالکل درست تھا صفیہ کہاں

کسی کی سنتی تھیں۔

”بس ہو گیا فیصلہ۔ تم کل صبح سے واک پر جاؤ گی۔“

”ٹھیک ہے چلی جاؤں گی۔“ حمیرا نے سر ہلایا۔

”سامنے والے پارک میں نہیں۔“ صفیہ کی نگاہیں اپنی حد نظر پر جمی تھیں۔

”تو پھر کہاں؟“ حمیرا چونکی۔

”وہ۔ وہ جو سامنے درخت نظر آ رہا ہے۔“

”سامنے؟“ حمیرا نے چونک کر سر اٹھایا۔ سامنے تو کوئی درخت نہیں تھا۔ سامنے آسمان پر سورج تھا یا پھر کھیت۔۔۔ دراصل یہ ان کے گھر کا پچھلا حصہ تھا چوڑی گلی اور پھر پانڈری والی جو کھیت اور رہائشی علاقے کو الگ کرتی تھی۔ یہاں تو کوئی درخت نہیں تھا۔ کیاس اتاری جا چکی تھی۔ کھیت میں جگہ جگہ کیاس کے سوکھے پودوں کو کاٹ کر جلانے کے لیے گٹھڑ کی صورت جمع کیا گیا تھا۔ کہیں کہیں جانوروں کے لیے پٹھے (گانے بھنسنوں کی خوراک) لگے تھے یا پھر سرسوں کے پودے۔ درخت کہاں تھا۔ حمیرا نے ماں کی انگلی دیکھی۔ پھر اشارے والی جگہ پر۔ یعنی کس۔ وہ ایسے۔ ایسے اور درخت ہائے اس کے دل پر ہاتھ پڑائے یقینی سے ماں کی صورت دیکھی سمیرا بھی ہنس رہی تھی۔ اسے درخت نظر آ گیا تھا۔

”جو درخت مجھے نظر اتنی مشکل سے آ رہا ہے میں اس تک جاؤں گی کیسے۔“ اس نے دہائی دی۔

”ہائے۔“ اسے غش آ گیا۔ سمیرا کے کندھے پر جاگری۔ اب ہائے کرنے کی باری سمیرا کی تھی۔

”اتنی دور کیوں بھیج رہی ہیں پارک ٹھیک ہے نا۔“ سمیرا نے صفیہ کو دیکھا۔

”وہاں جا کر یہ بیچ پر بیٹھ کر آجاتی ہے۔ یہاں سے میں اسے مسلسل دیکھوں گی۔“

”اوہ!“ حمیرا کے ڈیلے باہر کو ابلے۔ کیا امر کی تھنک ٹینک سوچتے ہوں گے جیسی دور کی کوڑی صفیہ لائی تھیں۔

”اتنی ٹینشن مت لیں صفیہ چچی۔ اسے میرے

ساتھ صبح واک پر بھیج دیں میں اسے کہیں بیٹھنے نہیں دوں گا۔“ اوپر آتے معید نے تھوڑی بہت گفتگو سن لی تھی، اپنی خدمات پیش کر دیں۔

حمیرا کے چہرے کا رنگ واپس لوٹا۔ فوراً جا کر اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

”یہ ٹھیک ہے۔ میں معید کے ساتھ چلی جایا کروں گی۔“

بڑی امی اور سمیرا نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ کیسے فوری مان رہی تھی وہ۔

”ہمیں۔۔۔ صفیہ کی آواز ابھری۔“ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”میں روز جاتا ہوں۔۔۔ یہ بھی چلی چلے۔“ معید نے وضاحت کی۔

”میں نے کہنا یہ نہیں جائے گی۔“ حمیرا نے آنکھیں چندی کر کے ماں کو دیکھا۔ ایسے کیوں بولی تھیں وہ۔۔۔ حرج ہی کیا تھا جب کہ بڑی امی اور سمیرا کا

چہرہ پھیکا پڑا تھا۔ معید کے چہرے کے رنگ کو اڑتا دیکھ کر۔



وہ شرم سار سا ماں کے سامنے بیٹھا تھا۔ ابھی کچھ روز پہلے تک ہی تو ان کی آنکھوں میں کچھ خواب بو کر آیا تھا۔ اب کس منہ سے کہتا زمین بنجر نکلی یا تھور زدہ۔ وہ پائلٹ نہیں بن سکتا تھا، لیکن کچھ اور ایسا تو بن ہی جاتا کہ ماں کو اپنا خواب پورا ہوتا نظر آ جاتا۔

لیکن کیا کیا جائے کہ عزم جو ان رہا جسم جواب دے گیا۔ چار سال کے علاج و رز شیں کھانے پینے کے بعد وہ بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آنے لگا تھا، مگر یہ سر کی چوٹ تھی جس نے کہیں اندر جا کر جگہ بنالی تھی جیسے کھوہ میں ناگ۔ اسے سوال سمجھنے مشکل لگ رہے تھے۔ آنکھوں کے آگے دائرے سے ناچتے لکھنے لگتا تو نظر لہرا جاتی۔ سر چکرانے لگتا۔ شدید درد ہونے لگتا، چار سال میں پہلی بار وہ خود اکیلا ڈاکٹر کے پاس گیا۔

اور ڈاکٹر نے اپنا خدشہ جو اسے پہلے دن سے تھا اس کے بہت زور دینے پر بتا دیا۔ وہ سخت دماغی محنت والا کام کبھی نہیں کر سکے گا، اس کا دماغ اتنی مشقت برداشت نہیں کر سکتا اس لیے بہتر ہے کہ وہ دماغی کاموں سے دور رہے۔

”تو کیا دل کی سنوں ڈاکٹر صاحب؟“ وہ مسکرایا۔

”اور دل یہ کہتا ہے ماں باپ کے سارے خواب پورے کرو، میں تو دور رہے پر آگیا جناب۔۔۔!“

وہ دکھی تھا پر شوخ ہو رہا تھا۔ ایسا ظالم بھی کوئی ہوتا ہے اذیت پسندی کہتے ہیں اسے عرف عام میں۔

اور وہ ماں باپ کو اندھیرے میں رکھ کر ان پر ظلم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے انہیں سب کچھ بتا دیا، ابو مسکراتے رہے۔ گیلی آنکھوں والی مسکراہٹ۔ بے بس مسکراہٹ۔

”تو یہ پڑھے گا نہیں تو کیا کرے گا؟“ ناہید نے اپنے آنسو اندر اتار لیے تھے ایک ماتم سب سے چھپ کر۔ ایک نوحہ بس زیر لب، ایک گلہ صرف اللہ سے۔ اور آخری حد شکر کہ بیٹا جیتا جاگتا سامنے موجود تھا۔

”میں سوچ چکا ہوں امی! یہ بھی۔۔۔“ اس کی آواز صاف اور لہجہ پر عزم دونوں میاں بیوی چونکے۔

”میں ایک بک اسٹور بناؤں گا۔ شہر کا سب سے بڑا بک اسٹور۔۔۔ جہاں دنیا کی ہر کتاب میسر ہوگی۔۔۔ جہاں۔۔۔ جہاں۔۔۔ جہاں۔۔۔“

اس نے خوابوں کی سلاخیوں پر خواہش کے نئے ڈورے ڈالے۔ منفرد بنائی، اچھوتا ڈیزائن۔ خوش رنگ۔ جیسے قوس قزح۔ ماں باپ کی دنیا پھر جگمگانے لگی۔



”سرمہ کے لحاف سا۔۔۔ اس کا ہم قافیہ بتاؤ۔“ حمیرا کاغذ قلم لیے بیٹھی تھی۔

”کیوں اس کا کیا کرنا ہے؟“ سمیرا اپنے پیر کے ناخن سجا رہی تھی۔

”کچھ نہیں اس سے تحریر میں خوب صورتی آتی ہے۔“ حمیرا نے پین کا سراوانتوں میں دبایا۔
”تم نے دیکھا ہے نا سمیرا حمید کتنی خوب صورت قافیہ آرائی کرتی ہے۔“

”سمیرا حمید۔؟“ سمیرا عزیز چونکی۔ ”سمیرا حمید کا تم سے کیا مقابلہ۔۔۔“

”کیوں نہیں بھئی۔“ حمیرا نے پین رکھ کر جارحانہ انداز بنایا۔ ”میرا اس کا مقابلہ کیوں نہیں ہو سکتا؟ جب کہ اس کے اور میرے نام کا قافیہ بھی ایک ہے۔ وہ سمیرا حمید۔ میں حمیرا حمید۔۔۔“

”سرماء کے لحاف سا، سرماء کے لحاف سا سرماء کے تکیے کے غلاف سا۔“ سمیرا کے منہ سے یک دم نکلا۔

”ان دو باتوں کا آپس میں کیا تعلق۔۔۔“ حمیرا نے ہیرو کی صفات لکھنی تھیں اب ہیرو لحاف تو ہو سکتا ہے مگر کیا غلاف بھی (وہ بھی تکیے کا) اونہوں۔“

”کیوں نہیں ہے تعلق۔؟“ سمیرا نے اپنا کام چھوڑ کر اسے اپنی پوری توجہ سے نوازا۔ ”سرماء میں لحاف ضروری ہے تو تکیے کا غلاف بھی ضروری ہے۔ بلکہ امی کہتی ہیں عورت کا سلیقہ ان ہی چیزوں سے پتا چلتا ہے۔“

”سمیرا کی بچی میں ناول لکھنا چاہتی ہوں۔ ہیرو کو تکیے سے ملاؤں تمہارا دماغ ہے کہاں؟“ حمیرا کو اپنا ہیرو یاد آنے لگا۔ ہیرو تکیہ۔

”اولی بی۔!“ سمیرا نے ہاتھ نہچایا ”تم تکیے کو اتنا ہلکا بھی نہ لو تکیہ بھی ادب کا حصہ ہے۔“

”جن پہ تکیہ تھا وہی تپتے ہو ادینے لگے۔“

”تو اس ذرا سی بات پر تکیہ ادب کا حصہ ہو جائے گا؟“ اس کا دل انکاری تھا۔ یا شاید تکیے کی اتنی عزت افزائی پسند نہیں آئی۔ اس کے ہونٹ کھلے منہ سے پرے سمیرا اپنی ہی کہہ رہی تھی۔

”تکیوں پر شعر کڑھائی کیے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے شعرا نے اپنے تکیوں کا ذکر کیا ہے۔“

سمیرا نے طنزیہ نگاہوں سے اسے گھورا۔ ”کون سا شعر۔؟“ حمیرا کو کچھ یاد نہیں تھا۔

”وہی۔۔۔“

سرماء نے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

”اس میں تکیہ کہاں ہے؟“ حمیرا کے منہ سے نکلا۔

”میر کے سر کے نیچے۔“ سمیرا نے ترنت کہا۔

”ہیں واقعی؟“ اس کی آنکھیں آخری حد تک کھل گئیں۔ واقعی سمیرا کی معلومات حیران کن تھیں۔

سمیرا نے اپنی ہنسی کا گلا گھونٹا اور بے حد سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

”ویسے بانی داوے اگر تم کو تکیے پر شعر کاڑھنے کے لیے دیا جاتا تو تم کیا لکھتیں۔“

حمیرا کو سوال بہت پسند آیا تھا۔

”اوں۔۔۔“ وہ ٹھوڑی کے نیچے مٹھی ٹکا کر سوچنے لگی۔

”آں ہاں۔۔۔“ اس کا چہرہ جوش سے سرخ ہو گیا۔

دھیرے دھیرے آبادل دھیرے دھیرے

میرا بلبل سورہا ہے شور نہ مچا

”اس میں تکیہ کہاں ہے۔“ سمیرا چلا اٹھی۔

”اس پر بلبل نے سر رکھا ہوا ہے نا۔ یہ گہرائی کی باتیں ہیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔“ اس نے

سمیرا کو کہا اور بے نیازی سے کانڈ پر کچھ لکھا۔

سارے صوبے کے انٹر کے لڑکے لڑکیاں امتحان

دینے کے بعد فارغ تھے پاگل صرف یہی ایک ہوئی

تھی جس کی بوریت کا علاج نہ تھا۔

حمیرا نے پھولے منہ کے ساتھ کانڈ قلم پھراٹھالیا

اور رخ بھی پھیر لیا۔ وہ خود ہی قافیہ جوڑے گی۔ بڑی

اہل علم بنتی ہے لے کر ساری کہانی بھلا دی۔

”ویسے تم نے اچانک رائٹر بننے کا سوچا کیوں؟“

”بس میں کچھ کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے مڑے

بغیر جواب دیا۔

”گھر کے کام کر لیا کرو وہ بھی بہت ہے۔“

”تم چاہتی ہو میں ماسی بن جاؤں۔“

”گھر کے کام کرنے سے کوئی ماسی نہیں بنتا۔ موٹی

ہو رہی ہو، ست الوجہ۔“

”کیا۔۔۔“ وہ کرٹ لکھا کر گھومی۔ ”اب تم میرے نوالے گنو گی۔“

”نوالے۔۔۔“ سمیرا نے کہا۔ ”نوالے نہیں روٹیاں۔ بلکہ پلیٹیں پر اتمیں۔“

”سمیرا!“ وہ دھاڑی۔

”سمیرا!“ اس نے بھی یہی انداز اپنایا۔

”تم چلی جاؤ یہاں سے سمیرا۔ اور اپنا یہ سامان بھی لے جاؤ۔“ اس کا ضبط جواب دے گیا۔

”ٹھیک ہے۔“ سمیرا نے تابعداری سے کہا۔

”مجھے بھی مغز خالی کرنے کا شوق نہیں۔“

”اے سی بھی چلا دے۔“ اس کی آواز بھی ناراض تھی۔

”اے سی۔۔۔؟“ سمیرا نے دہرایا۔

”ہاں اے سی۔۔۔ ادب پیدا کرنے کے لیے پرسکون ماحول درکار ہوتا ہے، مگر یہ بات تمہیں کہاں پتا ہوگی۔“

”پرسکون ماحول۔۔۔“ سمیرا نے دانت کچکپائے۔

”پہلے اپنے اندر تو ادب پیدا کر لو۔“ سمیرا کو غصہ آئی گیا۔ دھپ سے دروازہ کھولتی کھٹ سے بند کرتی باہر نکل گئی۔

”کوئی بات نہیں سمیرا کی بچی۔“ اس نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ ”میں تمہیں اب خود ہی ناول لکھ کر دکھا دوں گی، سمجھیں۔“

اس نے ایک نئے جوش و جذبے سے کانڈ قلم اپنے سامنے کیے۔

”ہیرو کی صفات۔۔۔ سرا کے لحاف سا۔۔۔ اس سے آگے۔ اس سے آگے تو کیا لکھ دوں تکیے کے غلاف سا۔۔۔“ بے چاری عجب مشکل میں پڑ گئی۔ ”اچھا لکھ دیتی ہوں۔ اگر غلط ہو گا تو ایڈیٹر خود ہی کاٹ دے گی۔

آخر اسے بھی تو کچھ کرنا چاہیے نا؟ سخاوت کس بات کی ملتی ہے۔ ویسے بھی ایڈیٹر کو کچھ نہ کچھ تو کاٹنے کے لیے ملنا چاہیے ورنہ اسے ایڈیٹر کون کہے گا۔“

”چلو جی۔۔۔!“ اس نے لکھ کر قلم کو یوں لڑکھڑایا جیسے قلم توڑ دیا۔

”اتنے حسین الفاظ واہ جی واہ۔“

ایسا غرور اور بے نیازی تو فیض نے نسخہ ہائے وفا لکھ کر بھی نہ دکھائی ہوگی۔ دیکھنے والے اش اش کراٹھتے، مگر اس وقت کوئی دیکھ نہیں رہا تھا۔ ہاں دو گھنٹے بعد جب سمیرا کسی کام سے اندر آئی تو کڑیج کی آواز پر بدک کر پیچھے ہٹی۔

”اوہ!“ اس کے پیروں کے نیچے آکر پین ٹوٹ چکا تھا۔

”اور کانڈ۔۔۔؟“ سمیرا کی متلاشی نگاہیں سمیرا پر جا کر رکیں جو اوندھی سو رہی تھی۔ گال بیڈ کے سرے پر ٹکا تھا لہذا ہاتھ نیچے تک لٹک رہا تھا۔

”او خدا۔۔۔!“ سمیرا نے سر پر ہاتھ مارا۔ ”ڈھیر سارے لکھے کانڈ۔۔۔ مگر محترمہ اپنے لکھے پر چڑھ کر بے سدھ سو رہی تھیں۔

کانڈ کچر مچوٹ گیا تھا۔

”اب کیا ایڈیٹر۔۔۔ پہلے کانڈ کو استری بھی کرتی۔“

سمیرا مجید جیسے رائٹر ہوں تو ایڈیٹر کے کمرے میں کانڈ قلم اور قینچی کے ساتھ استری بھی رکھنی پڑ جائے۔ قسم سے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

www.pdfbooksfree.pk

”کہاں کی تیاری ہے؟“ سمیرا نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ صاف کپڑے پہنے تھے، چوٹی کا انداز ہی بتاتا تھا۔ صفیہ کے ہاتھ لگے ہیں۔ یہ بڑا ماتھا۔ کھنچی کورین آنکھیں۔

”پچھپی بھولی کے گھر جا رہی ہوں اور اپنے نصیب کہاں۔“ وہ زور دے کر دکھائی دینے لگی جبکہ سمیرا بری طرح چونکی۔

”کیوں۔۔۔؟“

”ذکیہ عطیہ سے فلیپرک پینٹنگ سیکھوں گی۔“

”فلیپرک پینٹنگ؟“ سمیرا نے دہرایا۔ ”اوہ۔۔۔ تو کیا بناؤ گی؟“ اسے دلچسپی پیدا ہوئی۔

”اے جینز کی بیڈ شیٹس، کیشن کور، تکیہ کور، صوف کور۔۔۔ پنکھا کور، گوم کور۔۔۔ میز پوش، دسترخوان۔۔۔“

”با۔۔۔ بس۔۔۔“ سمیرا کی آنکھیں پھیلیں۔
”اتنے سارے کورے اور یہ جینز بیچ میں کہاں سے
آگیا؟“

”فیبرک میں مہارت کے بعد میں مشینی کڑھائی
سیکھوں گی۔“ حمیرا رٹوٹوٹے کی طرح شروع ہو گئی
تھی۔ ”اس کے بعد کروشیا کا سیٹ بنے گا۔ میں ہی
بناؤں گی۔ اس کے بعد چار سو تین ٹانگا لازمی ہے کہ امی کو
پسند ہے اور اس کے بعد سندھی ٹانگا اس کے۔۔۔
بلوچی اور اس کے بعد۔۔۔“

”تمہارا گھر ہو گا یا کلچر ہاؤس آل پاکستان ٹانگا
ورائٹی؟“ سمیرا کا سوال فطری تھا۔

”کلچرل ہاؤس۔ ایک کونے میں بیٹھ کر چرخا کاتی
میں بھی کہیں نظر آجایا کروں گی۔“

”کمال ہے۔ صفیہ چچی کو کیا ہوا؟“

”میں نے بھی یہی پوچھا تھا امی آپ کو کیا ہو گیا
ہے۔ بولیں۔“ ”چپ“ تم کو سوال کرنے کو کس نے کہا
ہے۔“

”لیکن ان ہنگامی فیصلوں کی وجہ؟“

”وہی۔۔۔ میری فراغت۔“

”مگر تم تو کہانی لکھ رہی تھیں ناں۔۔۔ وہ کیا ہوئی؟“

”اُدھوری رہ گئی۔ امی کہتی ہیں یہ کیسا فضول کام چنا
ہے۔ کرسی پر گھنٹوں کے لیے بیٹھ جاؤ۔ اور مولیٰ ہو جاؤ
گی۔“

”تم فکر مند نہ ہو۔“ اس نے ہاتھ پکڑ کر حمیرا کو
اپنے ساتھ بٹھالیا۔ ”جاؤ سیکھ لو فیبرک پینٹنگ۔۔۔
کپڑے بنائیں گے۔ پیاری پیاری قمیص کرتے۔۔۔
دوپٹے۔ بیڈ شیٹس کو مارو گولا۔“

”ہنس۔!“ حمیرا نے ہاتھ چھڑایا۔ ”کتنے کرتے
بنالیں گے۔ ایک یا دو۔ یا دس۔۔۔ آخر ہر چیز کی ایک
لحٹ ہوتی ہے۔ فیبرک پینٹنگ کو فیس پینٹنگ میں
بدل دوں گی۔ سارے دن گھر میں جو کرین کر گھوموں گی
یا پھر شہر کی ساری دیواروں کا ٹھیکہ لے لیتی ہوں۔
کپڑے رنگ لوں گی۔ منہ رنگ لوں گی۔ پھر سارا شہر
رنگ دوں گی۔“

وہ جل بھن کر خاک ہو رہی تھی۔ باہر سے گزرتے
معید کے کانوں میں آخری جملے بڑے آس نے اندر
جھانکا۔ ترس آمیز انداز لیے سمیرا نمٹنگلی سے پھولا منہ
حمیرا۔۔۔ اس نے اندر قدم رکھے۔

”لوگ تمہارا نام بسنتی رکھ دیں گے جگہ جگہ سے
پکار پڑے گی۔“ رنگ دے بسنتی! موہے رنگ دے
بسنتی!“

اس نے بھنگڑا انداز سے ٹانگ اٹھائی اور بازو لہرائے
۔۔۔ جوش سا تھا۔ لڑکھڑا گیا۔ سمیرا چلائی۔

”آرام سے۔۔۔ ادھر کرسی پر بیٹھو۔“ اسے بھائی کی
برجستگی پر زور کی ہنسی آرہی تھی۔

”ہاں ہاں!“ وہ بیٹھا۔ ”کیا مسئلہ ہے؟“

حمیرا نے دونوں بہن بھائیوں کو دیکھا۔ ایک
دوسرے کی کاپی تھے۔ تیکھی کھڑی ناک۔ ایک جیسی
آنکھیں۔۔۔ رنگ و روپ بھی مگر سمیرا کے اندر گلابیت
زیادہ تھی۔

اور ایک وہ خود جو پہلے ہی کسی جلاپانی کا بچہ لگتی تھی۔
اوپر سے ماں نے بال جمی ایسے کمال کے بنا دیے تھے
اور اگر وہ واقعی خدا نخواستہ مولیٰ ہو گئی تو۔۔۔ تب تو سو مو
پہلوان لگے گی۔ ہائے اللہ نہ کرے۔ لیکن یہ
کڑھائی بھی تو بیٹھ کر کرنی ہوگی گھنٹوں۔ اب میں ٹہل
ٹہل کر تو ٹانگے بھرنے سے رہی۔ پتا نہیں امی کے
دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ انہیں خود بھی شاید نہیں پتا کہ
وہ کیا چاہتی ہیں۔ اور میں کوئی بری تو نہیں ہوں اتنی
پیاری معصوم سی ہوں مگر بس یہ بال اسٹائل میں
آجائیں۔۔۔ تھوڑی توجہ دوں تو ماڈلز والی لک ہے
میری۔ مگر توجہ کیسے دوں۔ امی نے ہی نچا ڈالا
ہے۔ چار چھٹیاں ہی تو تھیں۔۔۔ دو آرزو میں کٹ
جائیں دو انتظار میں۔۔۔ مگر امی کو کون سمجھائے۔



صفیہ مطمئن ہوئیں تو حمیرا سمیت باقی گھر والوں
نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ ورنہ فراغت تو مصیبت بن
کر حمیرا پر ٹوٹی تھی جیسے۔

”اچھا ہے ہنر سیکھ لے گی خالی ذہن شیطان کا۔۔۔“
صفیہ نے جھٹھالی سے کہا۔

”کیا سیکھ لے گی وہ بھولی آپا سے۔۔۔ سو طرح کے اور طریقے تھے مصروفیت ڈھونڈنے کے تم نے خواہ مخواہ بچی کے ہاتھ میں سوئی دھاگا پکڑا دیا۔“

”سوئی دھاگے میں کوئی برائی ہے بھابھی؟“ صفیہ کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔

”کوئی برائی نہیں ہے۔۔۔ مگر وہ لہنگو تاج کورس کرنا چاہ رہی تھی۔۔۔ کمپیوٹر کورس وغیرہ۔۔۔ تم نے اسے پچاس سال پیچھے دھکیل دیا۔“

”چھوڑیں بھابھی۔۔۔ پڑھائی اس کا شوق ہے اور پھر عمر کم ہے ورنہ میرا واحد مقصد اس کا بیاہ ہے۔۔۔ کوئی اچھا سا بردیکھ کر ہاتھ پیلے کر دوں۔“ صفیہ کے انداز میں بے زاری تھی۔

”یہ تو ہر ماں کا خواب ہوتا ہے صفیہ۔! اس سے کسے انکار ہے مگر ٹھیک ہے۔ تم بھی صحیح ہو۔“

صفیہ نے رائے محفوظ رکھی۔ وہ ہمیشہ سے جب دل چاہتا تھا۔۔۔ بات شروع کر دیتی تھیں اور جب دل چاہتا بغیر وجہ کے چپ سا دھپکتی تھیں۔

سمیرا اسکول گئی ہوئی تھی۔۔۔ حمیرا فریم پکڑ کے بھولی کے گھر۔۔۔ معید کالج اور تایا ابو کام پر۔۔۔ دونوں دیورانی جیٹھانی صبح کی فراغت کو کسی ڈرائے سے بہلا رہی تھیں۔۔۔ صفیہ کے انداز و اطوار سے جیٹھانی نے بہت عرصہ پہلے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ وہ ایسے ہی مزاج کی تھیں۔

حمیرا کا بھی جیسے برا وقت گزر گیا تھا۔ اس نے ماں کو بھی خوش کر دیا تھا اور خود بھی خوش ہو گئی تھی بلکہ صاف دیکھا جاتا تو زیادہ خوش تھی۔ صفیہ نے اسے چار پانچ نئے جوڑے بنوا دیے۔ نازک پھیل بھی لے کر دیں (یہ اور بات ہے وہ انہیں پہننا بھول کر صرف گیارہ ممبر والا پسندیدہ جوتا پہنتی) صاف ستھرا رہنے کی تاکید بھی زوروں پر تھی اور حمیرا کو عمل یوں کرنا پڑ رہا تھا۔ کہ دھمکی دی تھی انہوں نے وہ گندا دیکھنے پر ڈنڈے سے پیٹیں گی اور خود نہلانے دھلانے لگیں

گی۔

وہ روز اپنے بنائے نمونے ماں کو لا کر دکھاتی تو صفیہ خوش ہو جاتیں۔ پھپھی بھولی بھی تعریف کرتی۔ وہ ذہین تھی بہت جلد سیکھ جاتی تھی۔ ہاتھ تیز چلتا تھا اور جتنی لا پروا مشہور تھی۔ کڑھالی بنانی اور خاص طور پر پینٹنگ میں تو مہارت حاصل کر لی دنوں میں۔۔۔ سب کو خوش کر دیا۔

پھپھی بھولی کے گھر میں سیکھنے والی ڈھیروں لڑکیاں صبح نو سے ایک بجے تک آتی تھیں۔ صفیہ نے حمیرا کو دوپہر تین سے رات گئے تک کا وقت دیا۔ صبح وہ اس سے صفائیاں کرواتی تھیں۔ حمیرا نے لاکھ سرچنا۔

”سب تو صبح میں آتی ہیں۔ میں اکیلی کیوں بیٹھوں؟“

”اکیلی کہاں ڈکیہ عطیہ بھی تو ہوتی ہیں ناں۔ ویسے بھی وہ سب تو شاگرد ہیں۔ تم تو بیٹی جی ہو۔“

”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔“ وہ قائل ہو گئی۔
صفیہ کا دل مطمئن ہو گیا جو کچھ وہ سوچتی تھی جو کچھ دماغ میں چلتا تھا۔ ایک مدہم سا خیال۔ ایک خواہش۔ ایک کسک۔ ایک فتح بس یوں ہی۔ ابھی کچھ واضح نہیں تھا۔ دماغ کا حجم ہر انسان کا ایک برابر ہوتا ہے۔ لیکن خیال اور سوچیں اس کے چھوٹے پن یا بڑے پن کو ظاہر کرتی ہیں۔ خیال حالات پیدا کرتے ہیں۔ اور سوچیں تربیت سے چلتی ہیں یا پھر۔۔۔ ظرف کی حد سے۔

صفیہ کے دماغ سے پرے حمیرا بھی خوش تھی اور وجہ بالکل الگ تھی۔ اس کے ہاتھ میں سوئی ہوتی۔۔۔ پھول بوٹے بناتی۔۔۔ ذکیہ اور عطیہ بھی کم گو تھیں۔۔۔ پھپھی بھولی کو اپنی سنانے کی عادت تھی۔۔۔ مگر صبح سے بول بول کر شام ڈھلے ان کے سیل بھی ویک ہو جاتے۔ عطیہ ذکیہ سے گفتگو میں مزا نہیں آتا تھا۔ بھرپور دلچسپی تو لیتی تھیں۔ مگر ان کے خود کے پاس بات برہانے کے لیے موضوعات نہیں ہوتے تھے۔ پھپھی نے انہیں سلیقے کی تربیت کے ساتھ ساتھ ایک بہترین سامع بھی بنادیا تھا۔ یوں بھی ان کی

دنیا کا دائرہ محدود تھا۔۔۔ ہاں بھائی ریاض۔۔۔ یعنی پروفیسر اللہ دتا ریاض۔

حمیرا کی ان سے بننے لگی۔ اسے معصوم شوخ سی حمیرا بہت اچھی لگتی۔ جس کے اندر دنیا کو جاننے کی طلب تھی۔ وہ بھولی بلی کی طرح ان کی علمیت سے بھرپور باتیں آنکھیں کھول کر سنتی۔ گھر میں تایا ابو اسے پیار کرتے تھے۔ معید سے دوستی تھی۔ مگر ایک ناصح استاد جیسا دوستانہ رویہ نہیں تھا۔ صفیہ زیادہ تر ایک خفاں کا کردار نبھاتی تھیں۔ حمیرا اپنی دنیا میں بہت مگن۔ بڑی امی بس ایک ماں تھیں۔ لاڈ پیار کرنے والی ناز اٹھانے والی۔ ان کی اور بھی ذمہ داریاں اور فکریں تھیں۔ ایسے میں بھائی ریاض اور اس کے تعلقات دن بدن مضبوط ہوتے چلے گئے۔ اس کی گفتگو میں ہر بات کے اندر بھائی ریاض کا نام آنے لگا۔ بھائی ریاض نے یہ کہا۔ بھائی ریاض یوں بولے۔ بھائی ریاض یہ اور بھائی ریاض وہ۔ معید تک ریاض نامہ سے تنگ آگیا۔

بڑی امی اس کے قصے سننے کی شروع دن سے عادی تھیں۔ اپنی رائے بھی دیتی تھیں۔ مگر اس کا موقع کم آتا۔ حمیرا دراصل ریڈیو بنتی جا رہی تھی دن بدن۔ لاکھ بٹن مزوڑو ایک چینل بند ہوتا تو دوسرا کھل جاتا۔

”بے ناں بڑی امی؟“ ذرا سی بھی بے توجہی محسوس کر کے وہ انہیں پکارتی۔

”ہاں ہاں کہتی رہو میں سن رہی ہوں۔“ اس کی نسبت سمیرا بغور سنتی بھی تھی اور سوال بھی کرتی تھی۔ بلکہ وہ ایک بے حد دلچسپی لینے والا سامع بن چکی تھی۔

ان سب سے پرے صفیہ بہت خوش تھی۔ بیٹی سلیقہ بھی سیکھ رہی تھی یعنی پچھپی بھولی کی نظروں میں مقام بن رہا تھا۔ اور دوسری جانب اے ڈی ریاض کی حمیرا کی جانب بھرپور توجہ۔ اور حمیرا کا جوابی رد عمل۔ ہاں اب وہ پچھپی بھولی کو کرید سکتی ہیں اپنی مرضی کی راہ پر ڈال سکتی ہیں۔ وہ دکھا سکتی ہیں جو خود

دیکھنے والے عکس کی طرح نظر آتا تھا اب وضاحت ہوئی تھی۔

صفیہ ان دنوں بڑی خوش نظر آتی تھیں۔ جٹھانی سے بات چیت کے طویل دور بھی چلنے لگے تھے۔ سمیرا معید اور حمیرا کے ساتھ بیٹھ کر لڈو کی بازی بھی لگالی۔ ایک دو ڈرامے پیمیلی ڈرامے بن گئے۔ سارے اکٹھے بیٹھ کر دیکھتے۔ لیکن خوابوں کا محل مسار ہو گیا۔

اے ڈی ریاض اور حمیرا کی دوستی نے گل کھلا دیا۔ صفیہ بھی آنکھوں سے دیکھتی تھیں پر یہ تو نہیں سوچا تھا۔ سب کچھ تو ویسے ہی ہو رہا تھا۔ جیسے کہ وہ سوچ رہی تھیں پھر اتنی بڑی چوک کیسے ہو گئی۔ یہ نہیں سوچا تھا۔ سوچا تو کچھ اور تھا۔ اور کمال ہے پچھپی بھولی بھی تو وہیں موجود تھیں۔ عطیہ ذکیہ بھی۔

وہ تو بیٹی کو دھاگے، شیشے، تکیے کے کوردے کر بیٹھی تھیں۔ ہر بھرواں پھول۔ جیسے خوابوں میں رنگ بھرتا تھا۔

اور اتنی بھیانک تعبیر۔ ”او خدا!“ وہ سر پکڑے بیٹھی تھیں۔ کسی کو کیا الزام دیتی شاید غلطی خود ان ہی کی تھی۔ حمیرا جیسی پر بھروسا کر لیا۔ اپنی بیٹی کو کیا جانتی ہیں تھیں۔ پچھپی بھولی بے چاری کا بھی کیا قصور۔ انہیں ان کے پھول بوٹے پورے مل رہے تھے۔ باقی جائے بھاڑ میں۔ ہائے ایک بار دیکھ ہی لیتیں۔

پروفیسر اے ڈی ریاض۔ اور حمیرا مجید کرتے کیا تھے۔



حمیرا کی تیاریاں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس نے زندگی میں شاید پہلی بار خود پر اتنی توجہ دی۔ سر سے پیر تک (جو تی تک) ٹک سب سے درست وہ بیگ تیار کیے اے ڈی ریاض کے ساتھ بائیک پر بیٹھ کر یہ جاوہ جا۔ صفیہ دروازے پر کھڑی کی کھڑی رہ گئیں کسی نے اعتراض نہیں کیا جبکہ سب ہی صفیہ کے خیالات سے واقف تھے۔ کہ وہ حمیرا کے حوالے سے

کیا ارادے باندھے ہوئے ہیں۔

”تم ماں ہو کر بیٹی کے مزاج سے واقف نہیں ہو سکیں چھوٹی بھابھی! عبدالعزیز اندر چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انہیں دھیمی چال سے اندر آتے دیکھا تو مخاطب کر لیا۔ صفیہ نے جیٹھ کو دیکھا پھر جٹھانی کو۔ معبد بھی وہیں تھا اور ان سب کے خیالات ایک ہیں یہ ان کے چہروں سے عیاں تھا۔

”وہ شروع دن سے پڑھنے لکھنے کی شوقین رہی ہے۔ تم زبردستی اسے دھاگے کڑھائی میں الجھانے لگیں۔ اچھا ہے“ اے ڈی نے اسے صحیح راہ پر ڈال دیا۔ بیٹی کا بھلا ہر ماں چاہتی ہے۔ کمال ہے تمہیں اس کے دل کی خبر نہیں ہے۔“

صفیہ کے پاس بہت سارے جواب تھے مگر وہی بات کہ وہ بولتی کم تھیں۔

دراصل معاملہ بہت واضح تھا۔ پڑھائی کے شوقین لائق فائق اے ڈی ریاض نے خود تو جو چاہا پڑھ لیا۔ (بلکہ وہ ہر وقت پڑھتا ہی دکھائی دیتا تھا) پچھپی بھولی کی اس معاملے میں ایک نہ چلی مگر جہاں اے ڈی نے بہنوں کی پڑھائی کی بات کی وہاں یہی آہنی دیوار بن کر حائل ہو گئی۔ دو بڑی میٹرک تک بڑی منتوں کے بعد پہنچیں۔ درمیان والی کار چٹان پڑھنے میں کم اور ماں کے ساتھ کام میں زیادہ لگتا تھا۔ لیکن سب سے چھوٹی والی کو شوق بھی تھا اور وہ قابل بھی تھی۔ ذرا سی توجہ سے اے ڈی کی اصلی بہن لگتی۔ مگر پچھپی نے اے ڈی کی تعلیم کو مان لیا تھا۔ یہی بہت بڑا احسان کیا تھا۔

چھوٹی کے بڑے رونے دھونے پر کالج بھیجا تو وہ بھی دو سال بعد انٹر کی شرط پر۔ چھوٹی نے نمایاں کامیابی حاصل کی اسے یقین تھا بھائی اس کے ساتھ ہے۔ مگر پچھپی پر کسی دلیل کا زور نہ چلا۔ بارہ جماعت بہت ہے ایسے ہی خرچا۔ ہاتھ میں ہنر ہونا چاہیے۔“

”پڑھائی بھی ہنر ہے اماں!“ اے ڈی نے سر پیٹا۔ ”ہاں ہے مگر اس میں بڑا ٹیم لگتا ہے اور پھر نوکری ملے نہ ملے وہ خود کسی پروفیسر سے زیادہ کماتی ہے۔“

بچیوں کو بے ہنر نہیں رہنے دی گی۔ ”لو جی قصہ ختم۔ اے ڈی خاموش ہو گیا۔ مگر تب ہی اسے حمیرا عبدالجید مل گئی ذہین قابل پڑھنے کی شائق۔ کچھ منے کی خواہاں۔ اسے بس کسی صحیح رہنما کی ضرورت تھی وہ خام سونا تھی اور اے ڈی اس معاملے میں ایک جوہری ثابت ہوا۔ اس نے حمیرا کے خوابوں کی تعبیر کے لیے راستہ ہموار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ صفیہ یہ سمجھ کر خوش ہوتی رہیں کہ حمیرا پچھپی بھولی کے دل میں جگہ بنا رہی ہے۔ پچھپی کی مرضی کے سانچے میں ڈھل کر جبکہ حمیرا تو اے ڈی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے من پسند راستے پر دوڑنے کی تیاری کر رہی تھی۔

عقدہ تو تب کھلا جب اس نے اپنے ہاتھوں کی تیار شدہ بیڈ شیٹس کورز نمونے صفیہ کے ہاتھ میں رکھے۔

”لے ماں! جینز کی پٹی میں سنبھال کر رکھ دے۔ میں نے تیرا شوق پورا کر دیا اور اب میں جاتی ہوں پڑھنے۔ بہت سارا پڑھنے۔“

اور جانا کہ ہریونیورسٹی۔ آنرز کے لیے۔ یونیورسٹی کتنی دور۔ دوسرے شہر میں ڈیڑھ گھنٹے کا راستہ۔ وہ پہلے آنرز کرے گی پھر ماسٹرز۔ وہ بھی ریاضی جیسے مشکل مضمون میں۔

صفیہ ہکا بکارہ گئیں۔ عبدالعزیز نے سراہا اور کہا کہ وہ تمام اخراجات برداشت کریں گے۔ بڑی امی ہم خیال تھیں۔ سمیرا اے ڈی کی رائے سے اختلاف کر ہی نہیں سکتی (وہی محبت کا اصول۔)

رہا معبد۔ وہ ہستارہ صفیہ کی حالت پر۔ اور یہ کہ اے ڈی ریاض نے بے چاری کو ریاضی میں الجھا دیا۔ صفیہ کے وابلا کرنے پر سب سمجھانے لگے۔ کیوں اتنی تنگ نظری کا ثبوت دے رہی ہیں۔ اے ڈی ریاض خود سمجھانے پہنچا۔

”میں ذمہ داری لے رہا ہوں ناں مامی۔ آپ کی لڑکی کو کسی قابل بنا کر چھوڑوں گا۔“ اے ڈی پر یقین تھا۔

صفیہ چونکیں۔ ہاں وہ یہی تو چاہتی تھیں کہ حمیرا

اے ڈی کی نظروں میں رہے۔ تو یہ تو زیادہ آسان تھا۔ پہلے ان کا گمان تھا کہ حمیرا کو پھپھی بھولی کے دل میں (جگہ بنانی چاہیے اس نے بنائی سارے ٹانگے سیکھ لئے) بھلے سے وہ بھانپ چکی تھیں کہ اصل کردار و اختیار بھولی ہے حرف آخر۔ لیکن یہ تو اور بھی اچھا ہے کہ حمیرا اے ڈی کے بھی نزدیک ہو جائے تو سارا مسئلہ ہی حل ہو جائے اور اے ڈی کتنی تعریف کر رہا تھا حمیرا کی۔ وہ لا پرواہ فطرت رکھتی ہے۔ مگر بلا کی ذہانت کے ساتھ۔ شوخ و شنگ ہے مگر حساسیت کے ساتھ۔ اور اے ڈی اسے ایک کامیاب انسان بننا دیکھ رہا ہے۔

اور مشکل کس چیز کی؟ اے ڈی ہے نا اس کے ساتھ، وہ ہر بل پر مقام پر اس کا ساتھ دے گا۔ صفیہ کی آنکھیں چمکیں۔ ہر بل۔ ہر مقام۔ صفیہ نے مقام کی حد بھی طے کر لی۔

یہ نہیں دیکھا۔ وہ جملے حمیرا کے لیے کہہ رہا تھا۔ نگاہیں سمیرا پر جمی تھیں۔ وہ مامی کو ساری رات اور اگلے پورے دن بھی سمجھانے کے لیے بیٹھ سکتا تھا (بشرطیکہ سمیرا اسی طرح چینی گھول گھول کر چائے پیش کرتی رہے)

حمیرا کو یہ سارے ڈرامے سمجھ میں آرہے تھے مگر وہ کھسیانی بنی ہر دلیل پر سر ہلاتی تھی۔ بس اس کی ماں کسی طرح قائل ہو جائے۔

(بعد میں سمیرا اور اے ڈی دونوں کو جتا بھی دیا کہ اسے سب نظر آتا ہے اور میں بھی)

سمیرا نے انکار کرتے ہوئے تکیہ اٹھا کر مارا جبکہ اے ڈی نے کھنکھار کر تادیب کی ”بری بات۔ بچے ایسی باتیں نہیں کرتے۔“

حمیرا ہستی رہی۔ ”بچے جو دیکھتے ہیں وہی باتیں کرتے ہیں۔ تنبیہ کی ضرورت برہوں کو ہے۔“

اے ڈی ہنس دیا۔ اسے اپنی معصوم سی کزن پیاری لگی تھی۔ اپنی بے حد مصروف زندگی میں اس نے کبھی نہیں جانا تھا کہ وہ دراصل ہے کیسی۔ اور جب اندازہ لگایا تو سوچا کہ ایسی ذہانت و شوق کو ضائع

ہونے دینا ظلم ہے۔ سو وہ ٹھونک بجا کر آگے آگیا۔ صفیہ کو قائل کرنا کوئی آسان تھا؟ اور صفیہ۔ وہ بالآخر مان گئیں۔

یوں اچانک مان گئیں۔ تو۔ شاید انہیں عقل آگئی تھی۔ سب نے سوچا۔ مگر صفیہ نے کچھ اور سوچا تھا۔

ان کی سوچ اور پلاننگ کی انتہا ایک ہی تھی۔ ایسے نہ سہی ویسے سہی۔ دراصل صفیہ۔



ہماری محبت کی شادی ہے۔ میرے گھر والے تو راضی نہیں تھے مگر جیت محبت کی ہوئی (وہی ناکہ والدین نے اپنی عزت رکھنے کے لیے نکاح کروادیا۔ اور ساتھ ہی زندگی بھر کی لا تعلق کا اعلان بھی۔)

صفیہ ہر ایک کو فخر سے یہ بات بتاتی تھی۔ اس کے گرد پیش کی ہم عمر عورتیں کھسیانی جانتیں۔ ان سب نے تو بس والدین کے کہے پر سر جھکایا تھا۔ شادی کی تھی۔ پھر محبت بھی ہو گئی ہوگی۔ عبد المجید خوش شکل آدمی تھا۔ صفیہ قبول صورت۔

سب اسے رشک آمیز حسد سے دیکھتیں۔ عبد المجید واقعی عاشق جانثار تھا۔ چھوٹی سی جنت تھی صفیہ کی دنیا۔ پھر اللہ نے پیاری بیٹی حمیرا دے دی۔ محبت کی نشانی۔ بڑی خوب صورت زندگی لیکن۔

صفیہ نے محسوس کرنا شروع کیا۔ وہ محلے والیاں جو اس سے اس کی لومیرج کے قصے سنا کرتیں چٹخارے لے کر۔ کہ کیسے دونوں کی ملاقات ہوئی۔ پھر ملاقاتیں۔ باتیں اور۔ محبت وہ کہاں کہاں ملتے تھے چوری چوری اور کیسے؟ پھر مخالفت پر اس کا احتجاج، گوش اور جیت۔

صفیہ سچ میں اتنی رنگ آمیزی کر دیتی تھی کہ لگتا کسی رومانٹک فلم کا اسکرپٹ سنا رہی ہے۔ ایک سے بڑھ ایک پچویشن۔ سننے والیاں آنکھیں منکاتی اور لطف اٹھاتیں پھر رات گئے جب تھکے ہارے شوہر

آتے تو انہیں سارا قصہ مزید نمک مرچ سے سنا کر طعنہ دیتیں۔ ”بھائی مجید اب تک صفیہ کے لیے گجرے لاتا ہے۔ اپنے ہاتھ سے منہ میں نوالے دیتا ہے۔“ بعض مرد دلچسپی سے سنے جاتے۔ مگر بعض الرٹ بھی ہوئے۔

ایسی رنگین قصے سنانے والی عورت کی سنگت صحیح نہیں۔ بس سلام دعا رکھو۔ اسی طرح کچھ بڑی بوڑھیوں کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔ بیٹیوں کو تو چھوڑو انہیں بہوؤں کے بگڑنے کا بھی خدشہ لاحق ہو گیا۔ دوسری طرف کچھ حاسد عورتیں۔ صفیہ کی لومیرج کا ٹھٹھا اڑانے لگیں۔ یہ نئی عجیب اور ناقابل قبول صورت حال تھی۔

لو میرج ایک ایسا کارنامہ تھی جو اسے دوسری عورتوں سے ممتاز کرتا تھا۔ مگر یہ کیا؟ اس نے اپنے کانوں سے سنا۔ نو عمر لڑکیوں کو اس سے قصداً ایک فاصلے پر رہنے کی تاکید کی جا رہی تھی اور۔۔۔ یہ کیا ہوا اس نے خود ہی بیٹھ کر اپنی غلطیوں کو سوچا۔ اور شعوری کوشش سے لومیرج والی بات کو چھپانے لگی۔

کل کو اس کی بیٹی کے کانوں میں بھی یہ قصے پڑیں گے تو وہ کیا سوچے گی۔ اور اگر اس نے بھی ماں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اسے نہیں۔ وہ کیکپا کر رہ گئی۔ لیکن سوچ کی سوئی اٹک گئی تھی۔ اسے ذمہ دار ماں کا کردار نبھانا ہو گا۔ اور کتنی بڑی بے وقوفی کر دی۔ محبت مل گئی تھی یہ کافی تھا۔ اس کا اتنا رچا کر کہ استہار بن کر پہچان بن جائے۔ غلطی ہو گئی تھی۔ اندازہ ہی نہ ہوا کہ جس چیز کو وہ فخر سے تمنے کی طرح سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ وہ کل کو داغ محسوس ہونے لگے گی۔

اور پھر عبد المجید فوت ہو گیا۔ اپنے سلجھے ہوئے مالک مکان میاں بیوی کی وجہ سے وہ بہت سی مشکلات سے بچی رہی۔ ورنہ لوگوں نے کیا کیا باتیں نہ کیں۔ کیسے کیسے قیاس۔ وہ الگ کہانی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ انجام بگڑتا اسے عبد العزیز اپنے ہمراہ لے آئے۔ عزت محبت مرتبے کے ساتھ۔ مگر اس کا

کیا کرتی، خراب قسمت۔

یہاں اس کا واحد تعارف یہی تھا۔ ”یہ صفیہ ہے جس نے عبد المجید سے پسند کی شادی کی۔ ماں باپ تو راضی تھے نہیں بس اپنی عزت بچانے کے لیے۔“

اوہ خدا۔۔۔ وہ سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔ محبت داغ بن گئی تھی۔ اور کسی ڈٹرجنٹ میں وہ طاقت کہاں کہ۔۔۔ دوسری طرف۔۔۔ جٹھانی کی عزت مقام۔ اختیار و مرتبہ۔ وہ ایسے چبھتا تھا جیسے ایری کا کاٹنا۔ زبان کا چھالا۔۔۔ آنکھ کا تنکا اور شکل۔۔۔؟

وہ رات ساڑھے گیارہ بجے عبد العزیز کے ہمراہ یہاں پہنچی تھی۔ دروازہ جٹھانی نے کھولا علاقے میں لائٹ نہیں تھی۔ موم بتی کی مدہم روشنی میں نیند سے بو جھل آنکھوں کے ساتھ۔ وہ کھانے کا پوچھ کر اور بستر بچھے ہوئے کا بتا کر چلی گئی۔ صفیہ کی آنکھوں سے اس رات نیند دور رہی۔ مگر یہ رت جگا، طمانیت انگیز تھا۔ وہ خود دل کے اس سکون پر حیران تھی۔ صبح مدہم گفتگو پر اس کے کان کھڑے ہوئے۔

”عبد المجید تو اپنا حصہ آپ سے لے چکا تھا اور پھر آپ کہتے ہیں اس گھر میں اس کا حصہ ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا میں بھول گئی کہ آپ آبائی مکان بیچنا نہیں چاہتے تھے اور وہ بھند تھا۔ تب میں نے اپنا زیور بیچ کر اسے حصے کی رقم دی بلکہ ہم مقروض بھی ہو گئے تھے اور آج آپ انہیں یہ کہہ کر لائے ہیں کہ۔۔۔ اس گھر پر ان کا بھی اتنا ہی حق ہے۔ وہ اپنا حصہ لے چکا ہے سمیرا کے ابو۔۔۔“

صفیہ نے ذرا آڑ میں ہو کر جھانکا۔ جٹھانی کا چہرہ سامنے تھا۔ ان کے لہجے کی تلخی اور باز پرس کا انداز بے حد چبھتا ہوا تھا۔ مگر صفیہ تو اس حسن باکمال کو تنکے جا رہی تھی جو جٹھانی کے نام پر پورے کمرے میں پھیلا ہوا تھا۔

عبد العزیز بہت مدہم مسکراہٹ کے ساتھ بیوی کو جواب دے رہے تھے۔

صفیہ جواب کو نظر انداز کیے ساکت تھی۔ اتنی حسین عورت۔ اس نے اپنے دل میں حسد کی کوئیل

کو پھوٹے دیکھا۔ اور اتنے سالوں میں اس نے کسی باغبان کی طرح اس کی آبیاری کر کے اسے تناور درخت بنادیا عبدالعزیز کے گھر آکر وہ مالی اور ذہنی طور پر پرسکون ہو گئی تھی۔

میاں بیوی کی باہم گفتگو سے قطع نظر اتنے سالوں میں کبھی ان ماں بیٹی کو احساس تک نہ ہونے دیا کہ ان کی آمد پر جٹھانی کی طرف سے کچھ سوالات اٹھے تھے۔ اور عبدالعزیز نے سمجھانے بجھانے کے بجائے۔ دو جملوں میں سارا معاملہ سلجھا دیا۔ سوال ختم کر دیے تھے جواب دے دیے تھے۔ جواز ڈھونڈ لیے تھے۔

صفیہ مختلف محاذوں پر اپنے اندر چھری جنگ سے نیرو آزار ہیں۔

جٹھ جٹھانی میں محبت و لگاؤ کے مظاہرے نہیں تھے۔ مگر احترام محبت و مان کی جھلک دکھانا ضرور تھا۔ وہ خود کو اس گھر میں دوسرے درجے کا شہری سمجھتی تھیں (یہ سراسر ان کی اپنی سوچ تھی) اور بیٹی بھی سمیرا اور معید سے کم تر دکھائی دیتی۔ صفیہ کو ہر وقت یہ خوف لاحق رہتا کہیں خاندان میں سے کوئی حمیرا کے سامنے لومیرج کا بھانڈا نہ پھوڑ دے۔ محبت جرم لگنے لگی تھی۔ حمیرا ماں باپ کے بارے میں کیا سوچے گی۔ اگر وہ بھی محبت کا پٹا گلے میں ڈال کر گھسنے لگی تو وہ کیسے اسے باز رکھ پائیں گی۔ اور یہ بھی تو ضروری نہیں کہ وہ درست انتخاب کرے۔ اور پھر لوگ کہیں گے جیسی ماں ویسی بیٹی۔ تو بس ٹھیک ہے وہ اسے جلد از جلد بیاہ دیں گی۔

اس سے پہلے کہ وہ دنیا کو اپنی آنکھ سے دیکھے۔ وہ اسے رہٹ کے نیل کی طرح نظر باندھ کر جکڑ دیں گی کہ لوپچی! یہ ہے تمہارا دائرہ تمہاری دنیا۔

محبت، ایثار، خلوص کا مظاہرہ صرف عبدالعزیز کی طرف سے نہیں تھا۔ ان کے دونوں بچوں نے بھی ان دونوں کو اپنی زندگی میں یوں شامل کیا تھا۔ جیسے وہ ہمیشہ سے ان کا حصہ ہوں۔ عبدالعزیز نے خوف خدا کے تحت یتیم بھتیجی اور بیوہ بھانج کو گھر میں جگہ نہیں

دی تھی۔ دل میں بھی بسالیا تھا۔ وہ سب کے کانوں میں یہ بات ڈال چکے تھے۔ کہ حمیرا مجید کل کو حمیرا معید ہوگی۔ اور اس اعلان پر صفیہ پہلی بار چونکی تھیں۔

جٹھ کا بیٹا۔۔۔ معید۔۔۔ ہاں ایسے تو وہ ساری فکروں سے نجات پا جائیں گی۔ صفیہ نے جٹھانی کا چہرہ ٹٹولا وہ مسکرا رہی تھیں۔ گویا تائید کر رہی تھیں۔ کیا واقعی یہاں صرف خلوص تھا۔ عبدالعزیز خود اپنے اس آئیڈیے پر خوشی سے نہال نظر آتے تھے اور سمیرا بھی۔ وہ بھی مسکرا رہی تھی۔

”اور سمیرا!“ صفیہ فیصلہ نہیں کر پاتی تھیں۔ انہیں جٹھانی کا حسن زیادہ کاٹتا ہے یا جٹھانی کی بیٹی کا۔ وہ اپنا موازنہ جٹھانی سے کرتی تھیں اور حمیرا کا موازنہ سمیرا سے۔ دونوں کی عمروں میں فرق تھا۔ شکل و صورت و مزاج بھی ایک دوسرے کا الٹ۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ صفیہ ہمیشہ سمیرا کے مقابلے میں حمیرا کو دیکھتیں۔۔۔ پر کھتیں اور قیل کرویتیں۔

اور پھر جب اے ڈی سے اس کا رشتہ ہو گیا۔ تو حسد نئے سرے سے عود کر آیا۔ معید کسی طور کم نہیں تھا اے ڈی سے۔ وقت آگے بڑھتا تو وہ بھی قابلیت و کامیابی کے سارے درجے عبور کر لیتا۔ مگر بات تو وہیں آکر اٹکتی تھی ناں کہ دل کو شکر کی عادت نہیں تھی۔ اور نظر پر حسد کا غلبہ تھا۔ کڑھنا۔۔۔ جلنا۔۔۔ حسد۔۔۔ انسان کی طمانیت کو کھا جاتا ہے۔

حسد ظالم ہوتا ہے۔ خود پر بھی ظلم ڈھاتا ہے۔ اور دوسروں پر بھی۔

حمیرا کو معید مل رہا ہے تو ٹھیک ہے۔ مگر سمیرا کو اے ڈی کیوں ملنا ہے کسی کو بھی مل جائے بس سمیرا کو نہ ملے اور پھر حالات نے پلٹا کھایا۔

وہ ٹٹل ٹٹل کر سوچتیں۔۔۔ دراصل حسد یا گل ہو جاتا ہے۔ مگر افسوس ان کے لیے حکومت پاگل خانہ نہیں بنواتی۔ (یہ حکومت بھی ناں)

حسد کفران نعمت کی راہ پر ڈال دیتا ہے اور نعمتوں

سے منہ موڑنے پر بعض اوقات اللہ خفا بھی ہو جاتا ہے ہیں جب ہی تو۔۔۔



یہ تو سچ ہے رات ہولاتی ہے۔۔۔ خدشات کی ماں۔۔۔ وہم کا باعث۔۔۔ کالی شکل والی کالی رات جو وحشت میں مبتلا کرتی تھی۔ اور یہ صبح۔۔۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ۔۔۔ اجالے کی کرنیں۔۔۔ پھولوں پتیوں پر نلکے شبنم کے قطرے ہوا میں بھی ایک سرمستی تھی۔۔۔ خوشبو۔۔۔ تو یہ صبح کی کرامات تھیں اور روشنی کی طاقت۔۔۔ سارے خوف و اوہام کہیں دور بھاگ گئے تھے۔

اتنے بڑے سفر کو اس نے ایک رات میں یاد کر لیا۔ اسے اپنا وجود ہلکا پھلکا لگ رہا تھا۔ بشاشت لوٹ آئی تھی۔ اسے ایک تازگی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک نیا پن ایک ارادہ ہمت خیال اور فیصلہ۔۔۔ چیزیں بگڑ جاتی ہیں۔۔۔ مگر انہیں سدھارا بھی جاتا ہے۔ اصل بات اور اک کی ہے۔ احساس کی ہے۔ وہ کشتی ہی دیر کرسی پر بیٹھی اجالے کو پھیلتا دیکھتی رہی تھی۔ تایا ابو کے پورشن سے برتنوں کے کھٹکھٹانے کی آواز آرہی تھی۔ بھلا کون ہو گا سمیرا۔۔۔ یا تایا ابو۔۔۔ بڑی امی کی تو طبیعت ناساز تھی۔

اور یہ امی کہاں چلی گئیں۔۔۔ وہ سارے گھر میں انہیں ڈھونڈنے لگی۔ باہری دروازے کا پٹ وا تھا۔ اسے اچنبھا ہوا۔ ذرا سا سر نکال کر جھانکا۔۔۔ تو رات کو ماں بیٹے واپس آگئے اور امی اتنی صبح ان کے گھر چلی گئیں۔ اسے ناگوار گزرا۔ اوہ پھپھی بھولی کا دروازہ کھلا تھا۔ اور کیوں چلی گئیں۔ ہاں مجھے پتا کرنا چاہیے۔ اس نے ٹکٹا پلو سر پر انکایا۔ آج آفس نہیں جاؤں گی۔ اس معاملے کو حل کرو گی پہلے۔ اس کا ہاتھ دروازہ پر تھا اور قیاس درست۔

صفیہ کی آواز آرہی تھی۔ وہ بھی آہستہ آواز۔۔۔ بے ضرر لہجہ۔۔۔ (ضرر تو جملوں میں ہوتا ہے نا۔۔۔) اسے ماں کے سارے خیالات یاد آئے۔ دل نئے سرے سے دکھا۔ تو یعنی امی باز نہیں آئیں۔ اور یہ

پھپھی اتنا بڑھ بڑھ کر کیا بولے۔۔۔ جاتی ہیں۔ پھپھی بھولی کی پاٹ دار آواز سماعت سے ٹکرالی تو اس کے قدم رک گئے۔ یہ پھپھی بھولی کانٹے انداز سے بنا گھر تھا۔ داخلی دروازے سے اندر داخل ہوں تو گیلری سی تھی۔ پھر ایک دوسرے دروازے سے اندر جانے پر سارا گھر سامنے آتا تھا۔ وسیع آنگن برآمدے کمرے۔ پھپھی نے ساتھ کا پلاٹ بھی خرید کر گھر کو خوب بڑا کر لیا تھا۔ وہ گیلری میں کھڑی تھی۔ نیم دا دروازے کے آگے پردہ لگا تھا۔ ذرا پتا تو لگے چل کیا رہا ہے۔ اس نے کان لگائے۔

”میرے قابل بیٹے کے لیے کوئی رشتوں کی کمی ہے۔۔۔ لوگ تو گھر آکر نام لیتے ہیں۔ مگر مجھے کیا پتا تھا۔۔۔ بھابھی نے میرے اندر اتنے کٹرے نکالنے ہیں۔ اسے میری عادتیں پسند نہیں۔۔۔ میرا مزاج پسند نہیں۔۔۔ ہاں بس میرا بیٹا پسند ہے۔ تو جاؤ جی میں بیٹا بھی نہیں دیتی۔ میں اپنے حساب کی عورت ہوں صفیہ۔ ساری زندگی بریک (باریک) سوئی سے موتی ٹانگے گن گن کر مجھے غلطیاں کرنے کی عادت نہیں۔ اور اس سمیرا میں شکل کے علاوہ ہے کیا؟ بیوہ ہو کر زندگی گزار رہی ہنر تھا میرے ہاتھوں میں۔۔۔“ بھولی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دکھائے۔ ”سمیرا کے پاس کیا ہے“ تعلیم کے نام پر کوئی کام کی ڈگری نہیں۔

(اوہ تو اے ڈی کی ماں ہونے کا یہ فائدہ ہوا پھپھی کو ڈگریوں کا پتلا لگ گیا کامیابی بے کار)

اچھا خاصا پڑھ رہی تھی تو پڑھتی رہتی۔ پر ناجی تعلیم ادھ وچ کار چھڈ کے (ادھوری تعلیم چھوڑ کے) سکولے پڑھان لگ گئی۔ اور اسکول بھی کون سا۔۔۔ معذروں والا۔۔۔ جو خیرات پر چلتا ہے خیراتی اب تنخواہ کیا دیں گے کوئی پروا نہیں۔

بس روز صبح اٹھے منہ ہاتھ رگڑے۔ باپ کی کمائی سے لشکرے کپڑے چڑھائے اور پہنچ گئی نوکری کرنے اور نوکری کیا گونگے سروں کو پڑھانا ہے۔

ایک میرا اپنا پتر۔ بس سوال ہی یاد کرنے جوگی ذہانت تھی اس کی نوراجو دنیا ورتانے کی مت ہوتی۔

(دنیا نبھانے کی عقل) بھی جب تو اتنا قابل تھا تو کوئی ڈاکٹر انجینئر والی پڑھائی پڑھتا لے کر ماسٹر بن گیا۔ آگے نوں (ہو) بھی میں استانی لے آؤں۔ کیوں جی مجھے کوئی کتے نے وڈیا ہے۔ تلہم تلہم کا سیبا ڈال دیا۔ تعلیم کے بھی طریقے ہوتے ہیں اگر جو مجھے اللہ دتا کی پڑھائی کے زمانے میں خبر ہوتی کہ پڑھتا کیا ہے وہ تو سیدھا سیدھا اچھی والی پڑھائی کروا لی۔ کبھی ماسٹر نہ بنے دیتی۔ بے وقوف نکلا میرا پتر۔“ پھپھی نے باقاعدہ ہاتھ ملے۔

”وہ بہت بڑی یونیورسٹی کا پروفیسر ہے بھولی آپا!“
صفیہ کا لہجہ دھیماتا تھا۔

”ہاں۔۔۔ وہی ماسٹر صاحب۔۔۔!“ پھپھی کے لمحے میں اپنے بیٹے کے لیے اتنا استہزاء تھا تو وہ کسی اور کیسے بخشتی۔

”دیکھ صفیہ۔۔۔!“ پھپھی بھولی نے صفیہ کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑا۔ ”تو بھی میری طرح بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی، مگر تجھے مل گیا عبدالعزیز کا سہارا۔۔۔ مجھے کون ملا؟“ جی چھوڑ کر مرا تھا تیرا بھائی، میں اگر ہنروالی نہ ہوتی تو بچے فاقوں سے مر جاتے اس سمیرا کے ہاتھوں میں کیا ہے؟ تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ کوئی ڈاکٹر واکٹر بن جاتی چلو استانی ہی بن جاتی، مگر گورنمنٹ اسکول کی بنتی تھی۔ مرنے تک پشن بھی ملتی رہتی ہے۔ اس نے پڑھائی چھوڑی رستے میں۔ اور خیراتی اسکول میں اللہ کے نام پر گونگے بہروں کو پڑھانے لگی۔ کل کو کوئی مصیبت پڑے تو میں کیا سارے شہر کے ہتھ پیر ٹوٹ جانے کی دعائیں مانگنے لگوں کہ جی میرا اسکول چلے بول بتا ذرا۔۔۔ ہنر ایسا ہو جو کام آئے۔“

پھپھی بھولی کی بات میں اس کا تجربہ بول رہا تھا۔ جو اس پر بتی جیسے اس نے زندگی گزار لی، مگر بات کے اختتام پر وہ جو فلسفہ بیان کر رہی تھی جو خدشات وہ اس کی اپنی سوچ کا مظہر تھے۔ وہ جیسے دنیا کو دیکھتی تھی سمجھتی تھی۔

حمیرا کا دل دکھا۔ یا پھر یہ کہ حالات کی تلخیاں اور مشکلیں سہ سہ کر بھولی حقیقت پسند ہو گئی تھی، لیکن

حقیقت پسندی کا یہ مطلب تو نہیں۔ بندہ اپنے ہاتھوں سے اپنا کلیجہ نوچنے کی بات کرے۔ اپنے اکلوتے بیٹے کے مرجانے کا گمان پال لے اور اس کی اولاد کی روٹی کی فکر مندی میں ہونے والی بہو کو بے ہنر قرار دے کر مسترد کر دے۔ کمال تھی پھپھی اور کمال تھا اس کا نظریہ۔۔۔

”اور یہ بات جانے بھی دوں۔ چلو اللہ سبب بنا دیتا ہے، مگر میرے کس کام کی ایسی نزاکتوں والی کڑی۔۔۔ جب رشتہ مانگا تھا تو سو لڑکیوں جیسی ایک لڑکی تھی۔ پڑھنے لکھنے والی، قابل۔۔۔ مگر یہ تو بعد میں کھلا کہ ماں نے کوئی سلیقہ طریقہ سمجھایا ہی نہیں۔ سارا وقت بس منہ ہاتھ رگڑتی رہی۔ استری کر کے سوہنے کپڑے چڑھانے منہ کی کریم الگ، ہاتھوں کی الگ۔۔۔ پیروں کی الگ، گز گز کا تو اس نے ناخن رکھا ہوا ہے اور اس پر سارا وقت رنگ لگایا۔ پتا نہیں نماز بھی پڑھتی ہے کہ نہیں۔ جتنی دیر میں اس نے پیپرن (اپیرن) لگانا ہے میں نے ادھے ٹبر کی روٹیاں بنا بھی گئی ہیں۔“

پھپھی کی آواز اور لہجہ تیز ہو گیا تھا۔ صفیہ کی ہنسی باہر تک آئی اور حمیرا کا دل چھلنی کر گئی۔ یہاں صفیہ کے مکالمے تو کچھ اور ہونے چاہیے تھے نا۔
”دگر نہ“ کہ نہیں بھولی آپا۔ ناخن رکھنا اس کا شوق ہے، نیل پالش خریدنے سے پہلے وہ رہمور خریدتی ہے صبح آٹھ بجے سے دو بجے تک کا شوق۔ دوپہر کی نماز تو اس نے کبھی قضا کی ہی نہیں۔“

مگر صفیہ کے مکالمے کیسے درست ہوتے، جب انہوں نے اپنا کردار ہی بدل لیا تھا۔ ایک نیا کردار۔ مار آستین کا کردار۔

وہ پھپھی کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں، واقعی سمیرا کے عیب بے شمار۔ بھول گئیں ساری زندگی حمیرا کو سمیرا کی مثال دے دے کر فقط منہ دھونے پر راضی کرنے کے لیے وہ سر پیٹ لیتی تھیں، کل کی مثال۔۔۔ آج کا عیب۔ واہ امی۔ آپ کتنے مزے سے حساب سے چل رہی تھیں۔

”اور تو بھی یاد رکھ صفیہ۔ اللہ دتا کے لیے اب

تھا۔

صنفیہ اور چغل خوری، حمیرا کو یہی دونوں عنوان موزوں لگے تو صنفیہ نے یہ کام بھی کیا تھا اور اگر یہ سب بڑی امی سن لیں تو۔۔۔ کتنا دل دکھے گا ان کا۔۔۔ اے ڈی اور سمیرا کے رشتے والی بات سے بھی زیادہ۔۔۔ صنفیہ نے بھروسے کا خون کیا تھا۔

”سچی بات تو یہ صنفیہ۔۔۔ مجھے خود بھی پتا نہیں تھا۔ اللہ ونا اتنا لائق فوق (لائق فائق) منڈا ہے۔ ماسٹر صاحب کے کہنے پر پڑھنے ڈال دیا تھا۔“ پھپھی بھولی صنفیہ کے نزدیک ہو کر جیسے راز کی بات بتانے لگی۔ ”پھر جب ادھر شہر آئی تو کون مجھے جانتا تھا۔ کوئی نہیں۔ بس ایک عبدالعزیز کا آسرا تھا۔ کل کو مجھے منڈا بپا ہنا بھی تھا کہ نہیں۔ میں نے سوچا کہ جب وہ پڑھ لکھ جائے گا تو کڑی بھی پڑھی لکھی مانگے گا تو میں کہاں ڈھونڈنے جاؤں گی، چلو اس سمیرا کا نام ہی پکا کروں۔ مجھے کیا پتا تھا میرے پتر نے اتنا قابل لکھنا ہے کہ بڑے بڑے لوگ اپنے منہ سے رشتہ ڈالیں گے۔ اللہ ونا کے کالج کے سب سے وڈے افسر نے اپنی بہن کے لیے خود مجھے کہا۔ ساتھ پڑھانے والی دو استانیاں بھی اسے تحفے شائع دیتی ہیں۔ سارا شہر مجھے اے ڈی کی ماں کے نام سے جانتا ہے۔ مجھے کوئی تھوڑ (کی) ہے کڑیوں کی۔“

صنفیہ سر ہلا رہی تھیں۔ حمیرا ہونق ہو گئی پھپھی بھولی کیا واقعی بھولی تھیں کہ بنا سوچے سمجھے کچھ بھی بول دیتی تھیں۔ انہیں اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس طرح کی باتیں کر کے وہ خود کو کتنا مطلب پرست، خود غرض، مفاد پرست اور۔۔۔ اور نجانے کیا کیا بنا کر پیش کر رہی تھیں اور صنفیہ کو ان کی ہاں میں ہاں ملائی چاہیے تھی یا آئینہ دکھانا چاہیے تھا۔ (مگر آئینہ کیسے دکھائیں جب دونوں ہی ایک دوسرے کی پرچھائی ہو گئیں تو۔۔۔)

اس کے صبر کی حد ختم ہو گئی۔ وہ ابھی اندر جا کر دونوں کا دماغ درست کرے گی اور یہ بھائی اللہ ونا ریاض کدھر تھا صبح سویرے۔۔۔ اگر وہ بھی ماں کا ہم

میں جس لڑکی پر ہاتھ رکھوں، وہ گھر چھوڑ کر جائیں، مگر میری محنتوں کی کمائی پر۔۔۔“ پھپھی نے گردن اٹھا کر اپنے گھر کو فخر سے دیکھا۔ ”کسی غیر کی لڑکی کیوں عیش کرے، عبدالعزیز بھی میرا بھائی۔۔۔ عبدالعزیز بھی۔۔۔ اور میری عادت ہے صاف بات کرنے کی۔۔۔ مجھے حمیرا جیسی نوں ہی چاہیے جو میری طرح روٹی پر اچار رکھ کے کھالے۔ میری طرح بغیر استری کے کپڑے پہن لے اور سب سے ضروری بات۔۔۔ ہاتھ میں ہنر ہو۔ کتنی تنخواہ ہے اس کی؟“

ایک کے بعد ایک خوبی بتاتے ہوئے پھپھی نے تصدیق کے لیے پوچھا۔

”انچاس ہزار پانچ سو۔“ صنفیہ کے لہجے میں غرور کا عنصر غالب آ گیا۔

”ہاں۔۔۔“ پھپھی نے اپنے گھٹنے پر زوردار ہاتھ مارا۔ ”یہ ہوئی نا بات۔۔۔ کل کو وقت پڑے تو کسی کام نہ تو نہ دیکھنا پڑے گا۔“

”اللہ نہ کرے آپا۔۔۔ خدا دونوں کو زندگی دے صحت دے۔“ صنفیہ کا جملہ بے ساختہ تھا۔ کیا اس لیے کہ بات اپنی بیٹی کی تھی اور یہ دونوں کون۔۔۔ حمیرا نے سوچا ایک تو حمیرا۔۔۔ تو دوسرا کون۔۔۔ اے ڈی ریاض۔۔۔

”واہ ماں، ایک کو دو میں بھی گن لیا۔ دونوں ں ں۔۔۔ اس کے ہاتھ دروازے پر سخت ہوئے۔

”اے ڈی مان جائے گا؟“ صنفیہ کی ساری گوٹیں نکل گئی تھیں۔ بس وہ ایک کو تین پھنسی تھی کو تین حمیرا مجید۔

”کیسے نہیں مانے گا۔“ پھپھی نے حسب عادت ہاتھ سر سے اور اٹھا کر دعو کیا۔ ”میرا بیٹا ہے وہ۔۔۔ جب اسے پتا لگے گا نا کہ کیسے ناہید نے مجھے ساری زندگی مذاق سمجھا، میرے خیالوں کا مذاق اڑایا۔ تو خود ہی پیچھے ہٹے گا، میں تو شکر کرتی ہوں صنفیہ۔۔۔ جو تو نے مجھے ناہید کے سارے خیال بتا دیے۔ میں اس کی خاموشی کو بیٹی کی ماں کی جھجک سمجھتی رہی اور وہ مجھ میں عیب نکالتی رہی۔“ پھپھی کے لہجے میں گہرا افسوس

خیال ہوا۔۔۔ تو ہوا کرے وہ اسے بھی ٹھیک کرنا جانتی ہے بلکہ ٹھیک ٹھاک۔۔۔ اس نے ایک زوردار آواز سے دروازہ کھولا تھا اور۔۔۔ پردے کے پیچھے یعنی درمیان میں بڑی امی کھڑی تھیں تو جو کچھ وہ سن رہی تھی۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ بھی سن رہی تھیں۔۔۔ بھیگا چہرہ۔۔۔ نجانے کب۔۔۔

اتنی ہی دکھی۔۔۔ بلکہ زیادہ۔۔۔ اتنی ہی غضب ناک۔۔۔ مگر شکستہ۔۔۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں اور کیا کیا نہیں تھا بڑی امی کی آنکھوں میں سب کچھ۔۔۔ بہت کچھ۔۔۔ دروازے کی آواز پر صفیہ اور بھولی بھی چونکی تھیں۔

”او کون ہے دروازہ پٹ مارنا ہے۔ (توڑ دینا) پورے باون ہزار کا دروازہ ہے۔ لکڑی تول کے (یعنی وزن مستند ہے۔) بڑی امی کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ پل بھر کو نمودار ہوئی ایسی سطحیت تو ناپسند تھی بھولی کی۔۔۔ صاف گوئی کو لوگ خوبی کہتے ہیں۔ ہوگی خوبی۔۔۔ جیسے بیٹھا اچھا لگتا ہے مگر حد سے بڑھ جائے تو بیماری۔

”او کون ہے دروازے پر؟“ پھپھی شاید اس طرف آرہی تھی۔ بڑی امی نے باہر کی طرف قدم اٹھائے۔ اب کیا بچا تھا وہ کس لیے رکتیں آئی تو تھیں کہ بھولی سے پوچھیں گی کیوں کس لیے۔۔۔ اب پتالگ گیا تھا۔۔۔ یوں۔۔۔ اور اس لیے۔۔۔ مگر راستے میں حائل تھی حمیرا عبد المجید۔ اس نے ان کا ہاتھ دبوچا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتیں اس نے دوسرے ہاتھ سے چوڑے پردے کو سرکا دیا۔۔۔ منظور واضح ہو گیا۔ دروازے کی جانب آتی پھپھی ٹھٹک کر رہی تھی۔ صفیہ کی منتظر نگاہوں کو بھی جھٹکا لگا اور حمیرا کا فیصلہ کن جارحانہ انداز۔۔۔ مرجائے گی یا مار دے گی، مگر کس کو۔۔۔ پھپھی بھولی نے چونک کر صفیہ کو دیکھا تھا۔



”کہاں سے کہانی شروع کروں اور کیا کیا بتاؤں۔

اور کیوں بتاؤں امی بتایا تو اسے جانتا ہے جو انجان ہو۔ آپ پر تو پھر بیتی تھی۔“

حمیرا کی آواز دکھ اور صدمے سے بو جھل تھی۔ بڑی امی کو اس نے سامنے کرسی پر بٹھا دیا تھا۔ وہ یوں اکڑی بیٹھی تھیں جیسے پھانسی والی الیکٹرک چیر بر بٹھائی گئی ہوں۔ ناک کی سیدھ میں دیکھتی قصداً ”انجان۔۔۔“ آپ میری تنخواہ کے انچاس ہزار کتنی ہیں پھپھی۔!“ وہ کب سے بول رہی تھی۔ مخاطب بھی ماں ہوتی کبھی پھپھی۔

”یہ معلوم ہے اس تنخواہ تک پہنچانے کے لیے تایا ابو نے کیسے پیٹ کاٹ کاٹ کر فہمیں بھریں اور پھپھی سے کیا گلہ امی۔ آپ نے کبھی اپنی کسی ضرورت کے لیے منہ سے کہا؟ انہوں نے بند لفافہ آپ کے کہنے سے پہلے آپ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اسے صلہ رحمی تو کہہ سکتے ہیں۔ فرض نہیں۔ جب کہ ابو پہلے ہی اپنا حصہ وصول کر چکے تھے اور یہ بات بڑی امی نے جب ان سے کہی تو ان کا جواب کیا تھا؟“

صفیہ نے سر اٹھایا۔ وہ ان ہی سے پوچھ رہی تھی۔ صفیہ کی نگاہیں بڑی امی پر جم گئیں۔ یہی سوال تو برا لگا تھا۔ کیوں پوچھا تھا انہوں نے شوہر سے۔۔۔ یعنی جھٹانی کو ان کی آمد ناگوار گزری تھی جب ہی تو سوال اٹھایا تھا اور یہ بات کل رات بھی صفیہ نے بیٹی کے سامنے دہرائی تھی جب وہ احسان گنوار ہی تھی اتنے سال پہلے کی وہ رات۔ اس سوال کی چھن آج تک باقی تھی۔ جیٹھ کا جواب سنا ہی نہیں (حالانکہ ایک بیوی کی حیثیت سے اپنی کسی بھی الجھن کا سوال کا جواب طلب کرنے کا حق محفوظ رکھتی تھیں)

”آپ تایا ابو کا جواب بھول گئیں امی! مگر میں نہیں۔“ اس کا لہجہ پکھلنے لگا۔

”اس گھر میں مجید کا کوئی حصہ نہیں میرا کہ ابو!“

”ہاں۔۔۔!“ عبدالعزیز نے تسلیم کیا، لیکن میرے دل میں تو اس کا حصہ ہے نا۔ وہ میں نے اسے کبھی نہیں دیا۔ وہ آج بھی وہیں رہتا ہے۔ گھر تو بہت بے کاری چیز ہے دولت جائیداد زر زمین میں سے حصہ دیا جاسکتا

ہے دل کی تقسیم نہیں کی جاسکتی۔

کمال ہے حمیرا کو من و عن سب یاد تھا حالانکہ یہ تو بہت پرانی بات تھی۔ بہت چھوٹی بچی تھی وہ اس وقت تو اس نے اس اتنی خاص لا جواب کر دینے والی بات کو یاد رکھا تھا اور اس کی اصل روح کو پہچانا تھا۔

”کمال ہے۔“ صفیہ چونکی تھیں۔ ہاں عبدالعزیز بیوی کو کچھ جواب دے تو رہے تھے مگر وہ ”سوال“ کی چیخ کے احساس میں ایسی کھوئیں کہ سناہی نہیں سمجھنا تو پھر دور کی بات ہے۔

”اور پچھپی آپ۔! آپ صرف نام کی بھولی نکلیں۔ ورنہ آپ کے حساب کتاب اور جوڑ توڑ سے تو صاف پتا چلتا آپ کا بھولپن سے دور کا بھی واسطہ نہیں رہا۔“

”کیسے طریقے سے آپ نے وقت گزارا۔ جس لڑکی کے مکھن ورگے ہتھ پیروں کو سراہتی تھیں ان میں آج کیا کیڑے پڑ گئے؟ کیسا درست استعمال کیا آپ نے انسانوں کا۔“

میں تو آپ کو بہت سیدھا سادا صاف گو حقیقت پسند انسان سمجھتی تھی۔ بڑی قدر تھی آپ کی میرے دل میں۔ مگر ایسی حقیقت پسندی۔ اس نے

جھجھری لی وہ نہ کبھی دیکھی نہ سنی کہ آپ خود اپنے بیٹے کے خدا نخواستہ مرجانے کا گمان کرتی ہیں۔ تو کل نہ سہی مامتا ہی سہی۔ مرنا تو خیر ہر ایک نے ہے ہی۔ مگر ایسی انوکھی بات نہ دیکھی نہ سنی کہ جی بہو باہنراں لیے لانی ہے کہ بیٹا مرجائے تو وہ گھر کو سنبھال لے۔ کس گمان میں جیتی ہیں آپ۔ ہر عورت بیوہ رہتی نہیں ہے کیونکہ ہر عورت بھولی یا صفیہ بھی نہیں ہوتی کہ ایک شخص کے نام کو حرفِ آخر سمجھ کر جیے۔ بیوہ راہ بدل بھی تو سکتی ہے بچے چھوڑ کر بھی چلی جاتی ہیں۔ نیا گھر بسا لیتی ہیں پچھپی۔ آپ کس خدشے میں جی رہی ہیں؟

وہ حقیقتاً ”شدید حیرت کا شکار پچھپی سے جواب کی منتظر تھی اور پچھپی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔“ ہاں یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ ”حمیرا کی تقریر سنی تو پل بھر

وہ حقیقتاً ”شدید حیرت کا شکار پچھپی سے جواب کی منتظر تھی اور پچھپی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔“ ہاں یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ ”حمیرا کی تقریر سنی تو پل بھر

اس نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ ”حمیرا کی تقریر سنی تو پل بھر

مخاورہ سب عورتیں بھی یاد آگئیں جو بیوگی کے چار چھ ماہ بعد بچے ادھر ادھر چھوڑ چھاڑ کر نئی دنیا بسا کر چلی گئیں، لیکن۔ اگر وہ اپنے حساب سے سوچتی تھی تو کوئی غلط تو نہیں تھا۔ اس نے کس مشکل سے بچوں کی روٹی پوری کی تھی۔ اگر بے ہنری ہوتی تو؟ اس نے سوئی سے سی تھیں روٹیاں۔ جب ہی تو بیٹیوں کو طاق کر کے اگلے گھر بھیجا تھا۔ وہ اپنی سوچ میں بالکل درست تھی، لیکن یہ جو حمیرا نے دوسری بات کی طرف دھیان کروایا تو

پچھپی کا رنگ پھیکا پڑنے لگا۔ وہ باز نہیں آسکتی تھی۔ اتنے مشکل تھے بیوگی کے سال کہ ہر چیز کا تاریک پہلو پہلے نظر آتا تھا۔

اس وقت بھی اسے یہ دکھائی دینے لگا۔ اللہ دتا مر گیا ہے اور بیوئی دنیا بسا کر یہ جاوہ جا۔ اور۔۔۔ وہ اس کے پوتے پوتیاں رلتے پھرتے

”ہائے۔۔۔“ پچھپی بھولی کے دل پر ہاتھ پڑا۔ آنکھ سے آنسو بہہ نکلے دل خراش منظر۔ یہ حمیرا نے کیا کہہ دیا تھا۔ کیا دکھا دیا تھا۔ پچھپی کی نگاہیں حمیرا کی جانب اٹھیں، مگر وہ متوجہ نہیں تھی وہ صفیہ سے کچھ کہہ رہی تھی۔

”آپ کو معید کے رشتے کے لیے منع کرنا تھا امی۔! تو آپ بس یہ کہہ دیتیں کہ آپ کو کرنا نہیں ہے۔“ اس کی آواز زندہ گئی۔ ”آپ نے معید کے لیے اتنے برے الفاظ استعمال کیے امی۔“ اسے اپنی تکلیف بیان کرنے کے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

”آپ نے کہا کہ معید وہ۔۔۔“ ”حمیرا۔۔۔“ بڑی امی نے تڑپ اٹھنے والے انداز میں اسے ٹوکا تھا۔ ”وہ سب مت دہرائنا۔“

”کیا۔ کیا سب۔؟“ وہ چونکی۔ صفیہ نے بھی سر اٹھایا تھا۔ وہ کس بات کو دہرانے سے منع کر رہی تھیں۔ انہیں کیا پتا حمیرا کیا کہنے والی ہے۔

”میں نے رات تم ماں بیٹی کی ساری باتیں سن لی تھیں۔“ ”اوہ۔“ صفیہ کے منہ سے سانس خارج ہوئی

بڑی امی نے وہ سب سب سن لیا تھا۔ وہ سب جیسے یاد کرنے سے بھی اسے تکلیف ہوتی تھی۔
اب وہ کیا بولے۔ صفائی دے، مگر کیسے۔ جھٹلا دے، مگر جھٹلا دینے سے کوئی حقیقت بدلتی ہے۔
”اوہ!“ اسے یک دم یاد آگیا جیسے جان واپس آگئی۔
ہاں اسے صفائی کی کیا ضرورت ہے۔
”اگر آپ نے رات ہم ماں بیٹی کی باتیں سن لی تھیں تو۔۔۔“ وہ قصداً ”رک“۔ ”تو پھر آپ نے میرے جواب بھی سن لیے ہوں گے۔“

بڑی امی نے چونک کر اسے دیکھا۔ ہاں اس کے جواب یعنی اس کی رائے۔۔۔
باتیں چھپ کر سنی تھیں سو سچائی پر انگلی نہیں اٹھا سکتی تھیں اگر ماں سچ بولی تھی تو بیٹی بھی۔ اور اس کی آنکھیں بھی اس وقت یہی بتا رہی تھیں کہ بڑی امی آپ نے میرا سچ بھی تو سن لیا تھا نا۔۔۔
حمیرا کا دل مضبوط ہو گیا، مگر یہ کیا بڑی امی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور کیا کہہ رہی تھیں۔ ان کی مخاطب صفیہ تھیں۔

”تم فکر مند نہ ہو صفیہ۔ تمہیں انکار کی ضرورت نہیں اور نہ جواز کی۔ حمیرا کے ابو چھ سال پہلے ہی اس رشتے کو نہ کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔“
”کون سا رشتہ؟“ حمیرا چونکی۔ حمیرا اور اے ڈی کا۔

”معید اور حمیرا کا رشتہ۔“ بڑی امی نے الجھن رفع کی۔ ایک نظر تینوں پر ڈالی۔ پھپھی تو سوچوں کے نئے جہان میں غرق ہو چکی تھیں۔ انہیں جیسے کچھ سنائی ہی نہ رہتا تھا جبکہ یہ ماں بیٹی۔ صفیہ فقط حیران تھیں یہ کب ہوا۔ انہیں تو نہیں معلوم۔
جبکہ حمیرا۔ اس کا رنگ لٹھے کی طرح سفید ہو چکا تھا۔

وہ بے یقینی سے بڑی امی کو دیکھ رہی تھی جو اپنی بات کہہ کر صحن عبور کر رہی تھیں۔

کیسا صدمہ بچا تھا۔ بھولی آپا کے انکار سے یا انکار سے زیادہ اس بات کا کہ ان کی بیٹی کو چھوڑ کر حمیرا کا رشتہ طلب کرنے کا۔ یا پھر صفیہ کے اقرار کا یا دھوکے کا تو دراصل یہ دکھ کی پوری سیریل تھی۔ ایک کے بعد ایک جھٹکا۔ تین دن سے رو رہی تھیں۔ باز پرس کا دل چاہتا تھا، مگر کیا پوچھتیں اور کس سے؟ دن کا قرار لٹ گیا اور رات کی نیند۔

حلق خشک ہوا تو پانی پینے باہر آئی تھیں پھر برآمدے میں نکل آئیں۔

ایک عالم محو خواب تھا، لیکن کوئی اور بھی جاگ رہا تھا۔ پر کون۔۔۔؟ باتوں کی آوازیں تھیں۔ عبدالعزیز تو ”اللہ مالک ہے“ کہہ کر گہری نیند میں چلے گئے اور وہ رشک سے انہیں دیکھتی رہ گئیں۔

سوئی ہوئی سیرا پر خود بھی آیات پھونک کر باہر آئی تھیں۔ تو کیا معید۔۔۔ لیکن باتوں کی آواز تو ادھر صفیہ کے پورشن سے آرہی تھی۔ وہ کسی ارادے کے بنا آگے تک چلی آئیں۔

حمیرا کی آواز بلند تھی اور صفیہ کے حسب عادت دھیمی۔ مگر رات کی خاموشی میں صاف سنائی دے رہی تھی۔

اور پھر یہ وہی باتیں تھیں جس کے بارے میں کہا جاتا ہے اس سے اچھا تھا۔ ہم بہرے ہوتے، مگر جو عذر صفیہ نے ڈھونڈے تھے۔ دل رات سے بھرا ہوا تھا ان باتوں کو سننے کے بعد تو گھر کی دہلیز پھلانگ گئیں اور پھر صبح صبح۔ وہ نجانے کیوں بھولی کے گھر کی طرف چلیں۔ پھر وہاں ان سے پہلے صفیہ موجود تھیں اور پھر حمیرا بھی آگئی اور پھر جو کچھ ہوا وہ کسی سے تو کہنا تھا۔ تو بہترین سامع بیٹی کے علاوہ اور کون ہوتا۔

اور حمیرا اس کی سوچی آنکھیں۔ وہ چھپ کر روتی تھی۔ صاف نظر آتا تھا، مگر اس وقت وہ فقط حیران تھی، بے یقین ماں سے وہ سب کچھ سن رہی تھی جو رات ماں نے سنا تھا صفیہ اور حمیرا کی یہ باتیں۔



”اتنے خاموش تو تم نہیں ہوتے؟“ عبدالعزیز
نجانے کب سے معبد پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔
”میں۔۔۔ خاموش۔۔۔؟ نہیں تو۔۔۔“ اس نے صاف
انکار کر دیا۔

”میں تو اخبار پڑھ رہا تھا۔“
”اتنا اخبار بھی تم کبھی نہیں پڑھتے؟“ وہ آخر اس
کے باپ تھے۔

”ہاں بس وہ۔۔۔“ اس نے اخبار کا صفحہ پلٹا پر مگر نظر
آ رہا تھا نجانے کس خبر کا بقیہ پڑھنے کی عجلت تھی۔
”اور۔۔۔؟“ عبدالعزیز اس کے سر پر پہنچ گئے۔
”الٹا اخبار تو تم کبھی بھی نہیں پڑھتے تھے۔ یہ ہنر
کب سے سیکھا۔“ وہ پوچھ رہے تھے۔

”اوہ اچھا تو یہ الٹا تھا۔۔۔“ اس نے پروں پر پانی نہ
پڑنے دیا۔ فوراً ”سیدھا کیا اور پڑھنے بھی لگا۔
”کیا چھپانا چاہ رہے ہو بیٹا۔۔۔؟“
”کیا پوچھنا چاہ رہے ہیں ابو۔۔۔؟“ اس نے اخبار
پلیٹ دیا۔

”صفیہ کے انکار سے دکھ ہوا ہے؟“
”آپ کو ہوا ہے۔۔۔؟“ اس نے پہلے ان کا حال دل
جاننا مناسب سمجھا۔

”نہیں۔۔۔“ وہ سچ کہہ رہے تھے۔
”تو پھر مجھے بھی نہیں ہوا۔“ وہ ہلکا پھلکا ہو گیا۔
”جواب دے۔ ختم ہوا۔ بڑا بن رہے تھے عبدالعزیز
”افتخار احمد۔۔۔ ہونہ!“

”بھی جھوٹ بولنے میں اتنی مہارت بھی حاصل
نہیں کی کہ اپنے باپ کو چلاؤ گے۔“

”اوہ۔۔۔!“ وہ پیارا سا مسکرایا۔ ”میں بھی آپ کے
بارے میں یہی کہنا چاہ رہا تھا۔“

”ہم یہاں مکالمہ بازی کرنے نہیں بیٹھے
معبد۔۔۔!“

”تو پھر آپ ہار مان لیجئے۔“
”یعنی تم نہیں بتاؤ گے کہ تم دکھی ہو۔“ سوال سے
زیادہ دکھ ان کے لہجے میں تھا۔

”آپ نہیں ہیں۔“ اس نے ہار مان لی۔ آنکھوں

سے شگستگی جھلکنے لگی تھی۔

”ہوں۔۔۔ باوجود اس کے کہ میں تو چھ برس پہلے ہی
اپنے خواب سے دستبردار ہو گیا تھا۔“ عبدالعزیز نے
بھی سچ کہا۔ اسی میں عافیت نظر آئی تھی۔

”تو پھر میرا بھی یہی جواب ہے ابو۔! چچی جان کا حق
ہے کہ وہ اپنی بیٹی کا بھلا چاہیں اور صرف وہ ہی کیوں؟ کیا
آپ نہیں چاہیں گے کہ اسے زندگی میں بہت خوشیاں
ملیں۔ اسے عم کی ہوا نہ لگے اسے۔“ وہ بولتا چلا گیا۔
خواہش یعنی وہ دعائیں جو وہ اس کے لیے کرتا تھا۔

”اسے۔۔۔؟ اس کا نام کیوں نہیں لیتے۔
حمیرا۔۔۔“ یاد دہانی کے لیے نام دہرایا۔ عبدالعزیز کو
”اسے“ کے مخاطب سے ظاہر ہوتی اجنبیت کھلی
تھی۔ معبد عبدالعزیز چونکا پھر مسکرا دیا۔

”تکلیف ہوتی ہے ابو۔ لگتا ہے کھو دیا۔ یہ
اجنبیت برقرار رہے استقامت کے لیے ضروری
ہے۔“ تو اس نے اپنا اندر کھول دیا تھا۔

”جب چھ برس پہلے فیصلے پر سر تسلیم خم کر دیا تھا تو
اس وقت ایسی باتیں کیوں؟“ عبدالعزیز کو اپنا بر بھلا
پہلی بار زیادہ محسوس ہوا یا اپنی بے بسی۔

”میں تو نہیں کر رہا۔ آپ اگلوآنے کی قسم کھا کر
آئے ہیں۔“ اس نے باپ کو گھورا۔

وہ ان کے قد سے کچھ اونچا تھا۔ عمر میں بہت
چھوٹا۔ مگر وہ اس پوری دنیا میں ایک دوسرے کے
اچھے دوست تھے۔ سب سے بڑے والے۔ ایسے
دوست جو دل کی باتیں ایک دوسرے سے کر سکتے تھے
بلکہ کیے بغیر بھی سمجھ سکتے تھے۔

دکھ صرف یہ ہے ”تکلیف اس چیز کی ہے کہ چچی اتنا
سب پلان نہ کرتیں۔ حمیرا کی جگہ حمیرا۔۔۔“

”اسے یہی بہتر لگا ہو گا حمیرا کے لیے۔“
”مگر یہ ہو نہیں سکتا۔“ معبد کا قطعی پن نمایاں
تھا۔

”کیا مطلب؟“ عبدالعزیز چونکے۔
”جتنا میں اسے ڈی بھائی کو جانتا ہوں وہ کبھی نہیں
مانیں گے۔“

”اور حمیرا بھی نہیں مانے گی۔“

”کیا؟“

”اے ڈی سے شادی۔ کسی سے بھی کرے گی مگر اس سے نہیں۔“ عبدالعزیز کیا اتنا بھی نہ جانتے حمیرا کو۔

”دعوے مت کریں ابو! پھر دکھی ہوں گے۔“

”کیا مطلب؟“

”کیا خبر وہ بھی چچی کی ہم خیال ہو۔ وہ اب صرف آپ کی پیاری بیٹی نہیں رہی اتنی بڑی افسر ہے۔ چار سال سے اے ڈی بھائی کے ساتھ ہے بلکہ آج جو کچھ ہے اس میں اے ڈی بھائی کی محنت و دلچسپی کا ہاتھ ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا ذہن بھی بن گیا ہو جب ہی پچیسویں بھولی نے اتنی بڑی بات کسی اور چچی نے جھٹ مان لی۔“

وہ اس پہلو پر بہت زیادہ سوچ چکا تھا۔ دونوں کا جوڑ بنتا تھا عمروں کا فرق ذرا زیادہ ہوتا مگر۔

”لیکن پھر۔۔۔ سمیرا کا کیا ہو گا؟“ عبدالعزیز کی نظریں بے ساختہ بیٹے کی جانب اٹھیں اور پھر ہار گئیں۔ وہاں بھی یہی سوال تھا۔

”ہم آپ کے لیے کوئی اور رشتہ تلاش کر لیں گے۔ وہ اتنی پیاری اتنی اچھی ہیں۔ کون منع کرے گا۔“ وہ خود کردے گی۔ ”عبدالعزیز کی آواز کسی کنوئیں سے برآمد ہوئی۔

”تمہیں نہیں معلوم اس نے بچپن سے اپنے نام کے ساتھ اے ڈی کا نام جڑا دیا ہے۔“

”نہیں اپنے دل کو سمجھانا ہو گا۔ حمیرا کے خوشی کے لیے۔“ معید نے بہن کے لیے کہا۔

”حمیرا کی خوشی کے لیے۔“

یہ غضب ناک پکار حمیرا کی تھی۔

”معید سے شادی۔!“ صفیہ نے کتنی دقت سے

یہ تین لفظ کہے تھے۔

”ہاں معید سے شادی۔“ حمیرا نے کتنی آسانی

سے ہاں کا اضافہ کر دیا تھا۔

”تمہارا دماغ چل گیا ہے حمیرا۔ تم خود کو دیکھو اور اسے دیکھو۔“

”کہاں تم اور کہاں وہی۔“ حیرت کی زیادتی سے صفیہ کی آنکھیں ابل رہی تھیں۔ تم کہتے ہوئے اس نے چھت کو دیکھا تھا اور ”وہ“ بتاتے ہوئے زمین کو۔ حقارت سے۔

”امی۔۔۔ آپ مجھے یہ بتائیے آپ مجھے کہاں دیکھ رہی ہیں۔ آسمان پر؟ مگر یہ کیوں بھولتی ہیں۔ آسمان کو دونوں ہاتھوں پر بھی اٹھالیں تب بھی پیر زمین پر ہی نکالنے پڑتے ہیں۔“

”مجھے سبق پڑھا رہی ہو۔ تم کیوں بھولیں زمین پیروں کے نیچے ہوتی ہے۔“ صفیہ نے اپنے تئیں اسے لاجواب کر دیا تھا اور وہ ہو گئی تھی لاجواب۔ ششدر۔

”امی۔۔۔ آپ یہ معید کے لیے کہہ رہی ہیں۔“

”ہاں۔!“ صفیہ نے ونگ لہجہ اپنایا۔ ”تمہارا اس کا جوڑ ہے کوئی۔ تمہارا معیار۔“

”ہاں امی! میرا معیار۔“ اس نے ہاتھ اٹھایا۔

”ڈرائیور عبدالجید کی یتیم بیٹی جسے گھر خالی کرنے کا نوٹس ملا تھا اور رات سر پر کھڑی تھی۔ میں بلبل تھی امی! جگنو کی آرزو مند۔ مجھے آسمان مل گیا امی! آپ بھول گئیں۔ پوری کہکشاں جس نے میری زندگی کو روشن کر دیا اتنا کہ مجھے کبھی رات بھی تاریک نہیں لگی اور آپ کہتی ہیں احسان نہیں کیا تھا۔ چچا! تایا یتیم بچوں کے سر پر ہاتھ ہیں۔ سر پر ہاتھ امی۔؟ ان سب نے مجھے دل میں جگہ دی تھی۔“ اس کے لہجے میں کوٹ کوٹ کر درد بھرا تھا۔

”ہاں تو اس احسان کے بدلے میں اپنی بیٹی ان کے زمانے بھر کے نکتے بیٹے کو تھما دوں۔ اس میں ہے کیا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ چلتے پھرتے بچتا ہے جیسے جھنجھنا۔“

حمیرا کی سانس کہیں اندر ٹھہر گئی۔ امی نے کیا کہا تھا یا اس نے کیا سنا تھا۔

”جھنجھنا؟ یہ آپ نے معید کے لیے کہا امی۔؟“

”ہاں کون سی ہڈی سلامت ہے اس کی۔ کوئی“

میں پلٹیں۔ ٹانگوں میں راڈ بٹانوں تک پر نٹ لگے ہیں۔ میں نہیں دے سکتی احسان کی اتنی بڑی قیمت۔ اور احسان بھی کیسا اپنے بھائی ہی کی تو اولاد بھی غیر تو نہیں۔

”جب تایا ابو نے رشتہ دیا، وہ ایسا نہیں تھا امی۔“ اس نے یاد دلایا۔

”مگر اب وہ ایسا ہی ہے جیسا میں بتا رہی ہوں۔“ اس نے زور دے کر کہا۔

”آپ کو پتا ہے، آپ کتنی بری باتیں کر رہی ہیں۔“

”یہ مت بولو حمیرا۔ تم نے اسے کیا غور سے دیکھا نہیں۔ لگتا ہے ہینگر پر کپڑے ٹنگے ہیں۔“ امی۔!

”ہڈیوں پر منڈھی کھال۔ اس سے زیادہ جسم تو کھیت میں کھڑے کان گڈے کا ہوتا ہے۔“

”امی جی۔!“ اس کے احتجاج کی شدت نے گردن کی رگیں پھلا دی تھیں۔

”ایک آنکھ سے وہ تجھے کیا دیکھے گا، کبھی سوچا۔“ صفیہ ہر چوٹ پچھلی سے کاری لگا رہی تھیں۔

”امی۔!“ وہ یک دم بے دم ہو گئی۔ (ہاں اس کی دونوں آنکھیں اپنی جگہ موجود تھیں۔ بولتی مسکراتی اور اب تو ان میں زندگی کے نئے رنگ خواب اور عزم بھی جھلکنے لگے تھے، مگر ایک لمحہ دکھائی دیتا تھا، مگر یہ عیب نظر تو نہیں آتا تھا۔

ہاں وہ دھلا پتلہ رہ گیا تھا، مگر نقش تو ویسے ہی دل میں اتر جانے والے تھے۔ ہاں وہ۔) ”اس کی تو ایک آنکھ گئی تھی امی۔ اور آپ نے اپنی دو آنکھوں سے اسے اتنا برا دیکھا۔“ وہ آگے بول نہ سکی دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو دی اور اس کا یونا بہت تکلیف دہ تھا۔ اس لیے کہ وہ روئی ہی نہیں تھی۔

”میری بچی۔!“ صفیہ اس کے ساتھ لگ گئیں۔ ”میں تیری ماں ہوں تیرا برا کیوں چاہوں گی۔ تیرا جوڑا اے ڈی یا پھر اس جیسے بندے کے ساتھ ہی بچے گا۔ میں کہہ دوں گی بھائی عزیز سے۔ اتنی بڑی قیمت نہ

وصولیں۔ اپنے بیٹے کے لیے انہیں اور بہت سی مل جائیں گی، میں اپنی بیٹی کو اس احسان کے بوجھ تلے دبے نہیں دوں گی۔“

وہ اس کے آنسو صاف کر رہی تھیں۔ پچکار رہی تھیں۔ ماں کا سب سے خوب صورت روپ۔

”نہیں۔“ اس نے صفیہ کے ہاتھ جھٹک دیے۔ ”آپ سے کس نے کہا مجھے احسان اتارنا ہے، میں اتار بھی سکتی ہوں بھلا۔“ مجھ روتی کو ہنسایا تھا امی ان سب

نے۔ ”اس کا لمبا ہاتھ عبدالعزیز کے پورشن کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔“ ہنسی کی قیمت کیسے ادا کروں؟ مجھے رشتے ملے تھے امی۔ خوشی ملی تھی، خوشی کا احسان اتاروں۔“

”ان سب چیزوں کو تو میں نے کبھی گنیا ہی نہیں کہ اس احسان کا بدلہ اتار ہی نہیں سکتی تھی۔ احسان

نہیں نیکی تھی جو تایا ابو نے ہم پر کی ہے۔ اور نیکی کا بدلہ اللہ دے گا نا کہ ہم جیسے گھٹیا انسان۔ اور آپ امی۔“

آپ کم بولتی تھیں، اچھا کرتی تھیں۔ آج زیادہ بول کر آپ نے کیا ستم ڈھایا۔ کوئی اپنوں کا ایسے مذاق اڑاتا ہے، اتنی بری باتیں تو غیروں کے لیے بھی نہیں کہتے۔

جھنجھنا اور ہینگر۔ آپ کی سوچ امی۔“

”تم اپنی ماں سے بد تمیزی کر رہی ہو حمیرا۔ اتنے علم نے یہ نہیں بتایا کہ ماں کو کیسے مخاطب کرتے ہیں۔“

”علم ہی نے تو زبان بند کر دی امی۔ ورنہ آپ کے خیالات کے انکشاف کے بعد کیا اس دل میں آیا تھا،

مگر میں آپ کی بات مان بھی نہیں سکتی۔ شادی تو مجھے معید عبدالعزیز سے ہی کرنی ہے۔“ اس کا جملہ دو ٹوک تھا۔

”کیوں۔؟“ صفیہ کی اتنی اونچی آواز ان درود یوار نے بھی پہلی بار سنی تھی اور اس کے ساتھ ہی برے

القابات و خطابات کا ایک نیا سلسلہ تھا جو کوہ ہندو کش کی پہاڑوں سے زیادہ پھیل گیا۔

اور خیال۔ تعفن زدہ۔ بھکے، تنگ اور جیسے گٹر کا ڈھکن کھل جائے۔

1972016

”تمہیں میری بات ماننا ہوگی حمیرا۔۔۔ اے ڈی نہ سہی کوئی اور سہی، مگر معید کبھی نہیں۔“
صفیہ خود ہی تھک کر بات ختم کرنے پر آگئیں۔
”اور یہ بات میں کبھی نہیں مانوں گی۔“ وہ بھی امی کے لہجے میں بولی تھی۔

دونوں ماہ بیٹی روبرو ایک دوسرے کو سکتی جاتی تھیں۔ ایسی خاموشی چھا گئی جیسے کمرے میں کوئی ہے ہی نہیں۔۔۔ پھر صفیہ ہی انھیں بستر درست کرنے لگیں جیسے اپنی بات ختم کر کے اب سکون کی نیند لینے کا ارادہ ہو۔

”مجھے اندازہ تھا ہمیشہ سے۔۔۔ مگر یقین آج ہو گیا۔“
صفیہ کے ہاتھ مل بھر کور کے۔ ”کس بات کا یقین؟“
”آپ حسد کا شکار ہیں امی!“

صفیہ نے تیزی سے پلکیں اٹھائیں۔ ”تم اپنی ماں کو کتہہ رہی ہو یہ۔“

”حسد گالی نہیں ہے۔ ایک کیفیت ہے جو صحیح غلط کی تمیز کو بھلا دیتی ہے۔ اندھا کر دیتی ہے۔“
”بلکو اس بند کرو۔“ صفیہ واقعی تلملا گئیں۔

”بلکو اس نہیں ہے امی، یہ سچ ہے۔“ وہ صفیہ کی حالت کے برعکس بہت پرسکون تھی۔ جیسے کسی نتیجے تک پہنچ گئی ہو۔

”بہت بچپن میں۔۔۔ جب ہم یہاں آگئے تھے۔ مجھے تب بھی یہ احساس ہوتا تھا مگر سمجھ نہیں پاتی تھی لیکن آج میں نتیجہ نکالنے کے قابل ہو چکی ہوں تو یاد آتا ہے۔ آپ نے کبھی سمیرا کو عید سیرات پر بھی پچکار کر یہ نہیں کہا۔“ ماشاء اللہ بڑی پیاری لگ رہی ہو۔“
میرے متوجہ کرنے پر بھی یا تو ان سنی کر دیتی تھیں۔ یا پھر اک سرسری نگاہ پر ڈال کر ہاں ہاں کہہ کر جان چھڑا لیتی تھیں اور میں سوچتی تھی۔

میرا ماتھا جس طرح بڑی امی چومتی ہیں آپ نے تو کبھی اس طرح سمیرا کو پیار نہیں کیا۔ معید کو آپ نے پھر بھی نظر بھر کے دیکھا شاید اس کی وجہ تایا ابو کی خواہش رہی ہو۔ مگر خیر بعد میں تو آپ نے اس کا صفحہ ہی پھاڑ دیا گویا۔

”بلا وجہ کے اندازے مت لگاؤ حمیرا۔“ صفیہ نے رعب سے کہا۔

مگر حمیرا کا دھیان نہیں تھا۔ وہ دیوار پر لکھا سبق پڑھ رہی تھی جیسے۔

آپ نے ہمیشہ مجھے سمیرا جیسا بننے کی ترغیب دی۔ مجھے گہرے شوخ رنگ پسند تھے۔ آپ میرے لیے زبردستی ہلکے رنگ لاتیں۔ اور پر زور اصرار سے پہنائی تھیں۔ میں بازار میں اپنی پسند کی چیز ہر ہاتھ رکھنا چاہتی تھی۔ اور آپ کن اکھیوں سے سمیرا کو دیکھتیں کہ وہ کیا لینا چاہتی ہے۔ وہ کیا کھاتی ہے۔ کیسے رہتی ہے۔ مولی ہے۔ پتلی ہے؟ اچھی ہے بری ہے۔ آپ نے ہمیشہ مجھے اس جیسا بنانا چاہا۔ یہ سوچے بناء کہ میں ایک الگ انسان ہوں۔ میری سوچ انداز روپے دوسرے انسان سے یقیناً ”الگ ہوں گے۔ آپ نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں خود سے کیا چاہتی ہوں۔ میری اپنی ایک شخصیت ہے۔ اور اپنی قسمت۔“

والدین اولاد کی خوشی کے لیے ہر حد پھلانگ جاتے ہیں۔ مگر یہ کیا کہ آپ سمیرا سے خوشیاں چھین کر میری جھولی میں ڈال دیں۔ اور صرف سمیرا کا رونا کیوں۔۔۔ آپ کو اندازہ ہے آپ کی بھائی ریاض والی بات اگر پوری ہو جائے یعنی میری اور بھائی ریاض کی شادی اس نے بدقت کہا۔ (جو بات کہنی اتنی مشکل ہو اس پر عمل کتنا مکٹھن ہوگا) تو تایا ابو کے دونوں بچے آزرہ ہوں گے۔ آپ دونوں سے ان کی خوشیاں چھین لینا چاہتی ہیں اور ان کو بھی چھوٹے۔ ان سے تو بلا جواز دشمنی نباہنا تھی۔ یہ بھی نہ سوچا کہ میں کتنی ناخوش ہوں گی۔“

”معید۔۔۔ تمہاری خوشی کب سے بن گیا۔“
صفیہ نے دانت پیسے تھے۔

”ہمیشہ سے امی۔“ اس کے لہجے کی تیزی نے صفیہ کو حیران کر دیا۔

”اس کا حال دیکھا ہے تم نے۔“
”ہاں کیا ہوا اسے؟“ وہ واقعی معصوم تھی یا۔۔۔ بے وقوف اندھی۔

”یہ نہیں ہو سکتا حمیرا۔“

”یہ ہو کر رہے گا امی۔“

اس میں کیا بچا ہے جسے سمیٹنے کے لیے اپنی عمر گھلائی ہے۔ ”صفیہ سر پیٹ لینا چاہتی تھی۔ ملبہ کھنڈر۔“

”ڈھانچہ رہ گیا ہے صرف۔“

”ملبے پر دوبارہ گھر کھڑا کر لیا جاتا ہے۔ کھنڈرات

بستیوں میں بدل جاتے ہیں۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ تم

معید کا نام لوگی اور وہ بھی اس طرح۔“ صفیہ کی حیرت

بجا تھی۔ لڑکیاں تو بڑے ہیرو ٹائپ کے آئیڈیل شریک

حیات کا خواب دیکھتی ہیں۔

”وہ مجھے اچھا لگتا ہے امی۔“

”اس حال میں۔“

”ہر حال میں امی۔“

”کیوں؟“ حمیرا کی نگاہیں بے ساختہ انھیں۔ چمکتی

آنکھیں۔ مسکرائیں۔

”ہاں یہ سوال آپ نے صحیح کیا۔ کیونکہ یہ میں نے

خود سے بھی کئی بار کیا ہے پر جواب نہیں ملا وہ ہمیشہ

سے اچھا لگتا ہے۔ اتنا کہ میں نے اس کے علاوہ کبھی

کسی اور کو سوچنا تو دور نظر بھر کے دیکھا بھی نہیں۔ اور

دیکھنے کو بھی چھوڑیں۔ نظر ہی نہیں اٹھی۔“

صفیہ کا منہ کھل گیا۔ کون بیٹی ہوگی جو ماں کے

سامنے اس طرح دل کھول دے مگر وہ حمیرا عبد الجید

تھی۔ جو سوچا کہہ دیا۔

”اے ڈی نہ سہی۔ مگر معید کبھی نہیں۔“ بہت

دیر بعد صفیہ بول سکیں۔ سیرا کے لیے اے ڈی جیسا

شوہر اور حمیرا کے لیے معید۔ ہاں ”صفیہ کے انداز

کی قطعیت اور بے رحمی خوفناک تھی وہ مسلسل

دامیں بائیں گردن ہلا رہی تھیں۔

سیرا کے لیے اتنا تشکیک آمیز انداز کیوں اپناتی ہیں

امی۔ کوئی فرق نہیں ہے سیرا اور حمیرا میں۔ یا پھر وہی

کہ وہ حسد جو برپا کر دینا سکھاتا ہے اور۔“ حمیرا حسد کو

مزید واضح کرنے لگی تھی۔ مگر۔

صفیہ کے ایک پھڑکنے اس کا منہ بند کر دیا۔ اس کا

ہاتھ۔ بے ساختہ گل پر ٹھہرا تھا۔ حیران نگاہیں ماں

کی جانب اٹھی تھیں جو غضب ناکی کی حد پر پہنچ کر بے

قابو ہو گئی تھیں۔

”خبردار جو دوبارہ میرے سامنے یہ حسد۔ حسد کی

بل کو اس کی۔ نہیں ہوں میں حاسد۔ بے کیا ان ماں

بیٹی میں جو میں ان سے حسد کروں گی۔ اور تمہیں شرم

تہیں آتی ماں کے لیے مسلسل یہ لفظ استعمال کرتے

ہوئے۔ تم جیسی اولاد۔“ صفیہ کی آواز یکدم گھٹی۔

بیٹی عجیب سی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”میں تو صرف سیرا کے نام سے حسد کا اندازہ

لگا رہی تھی۔ پر آپ تو ماں بیٹی کا لفظ استعمال کر رہی

ہیں۔ تو کیا بڑی امی سے بھی؟“

”حمیرا۔! صفیہ کے شانے جھک گئے۔

”میں کچی نہیں ہوں امی۔ میں نے تو بہت کم عمری

سے چیزوں کو سمجھنا شروع کر دیا تھا۔“

”میں حاسد نہیں ہوں۔ میں کسی سے حسد نہیں

کرتی۔“ صفیہ خود سے ہم کلام تھیں جیسے۔ مگر انداز

ایسا تھا جو دراصل قبول کرنے کا انداز ہوتا ہے۔

”امی۔! حمیرا اپنا گل کو سہلا کر ان کے نزدیک

سر کی صفیہ کے ہاتھ نرمی سے تھامے۔ صفیہ کی

آنکھوں میں استغاب تھا۔ ”لیکن۔ پھر اپنے ہاتھ

کھینچ لیے اور انہیں کسی قدر پیچھے ہٹاتے ہوئے

کمرے سے نکل گئی۔ وہ حیران رہ گئی۔

اور پھر ساری رات برآمدے کی جالی سے منہ

جوڑے وہ جو ہے ملی کا کھیل دیکھتے ہوئے ان القابات و

جملوں کو یاد کر کے روتی رہی جو صفیہ نے معید کے

لیے کہے تھے گھٹیا، بھنجنا، ملبہ، کھنڈر، ہینگر اور

ڈھانچہ اتنی ساری باتیں۔

اتنا تکبر اتنا غرور۔



”چچی کے دل میں کیا تھا اور کیوں تھا کو چھوڑیں۔

حمیرا ایسی نہیں ہے۔“ سارا قصہ سن کر سیرا کے لبوں

سے بے ساختہ گواہی نکلی۔

”لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ لاکھ چوبیس گے۔“
 گی۔ محبت کے دعوے کرے گی مگر تمہارے ابو کبھی
 نہیں مانیں گے۔“ بڑی امی شوہر کے مزاج اور فیصلوں
 سے واقف تھیں۔

”کیا نہیں مانیں گے؟“ سمیرا سمجھی نہیں۔

”یہی۔۔۔ حمیرا اور معہد کی شادی۔“

”اوہ۔۔۔“ سمیرا کو سب یاد آگیا۔

”جب وہ صفیہ اور حمیرا کو یہاں لائے۔ بہت دکھی
 تھے۔ بھائی کے لا ابالی پن۔۔۔ پڑھنے لکھنے سے عدم
 دلچسپی بگاڑیوں اور رسوں کے شوق میں بڑکروہ الگ ہی
 مزاج کا بن گیا تھا۔ اس کا حلقہ احباب بالکل الگ تھا۔
 باقی خاندان کے لوگوں کی نسبت۔۔۔ کچھ بڑے بزرگ تو
 اسے صاف آوارہ کہتے تھے۔ حالانکہ یہ آوارگی نہیں
 تھی بس وہ ذرا الگ مزاج کا تھا۔“

اور پھر جب اس نے صفیہ سے شادی کی۔ انہیں
 صفیہ پر اعتراض تھا۔ ایک اتنی ہٹ دھرم لڑکی اچھی
 بیوی ثابت نہیں ہوگی جو ماں باپ کے سامنے اکر
 جائے انہیں اتنا مجبور کر دے۔ تو اس سے کیا امید کی
 جاسکتی ہے۔ ہاں بعد میں۔۔۔ یعنی اب وہ صفیہ کی بہت
 عزت کرتے ہیں۔ اس نے واقعی عہد الجدید سے محبت
 کی تھی اور بیوہ ہونے کے بعد بھی باقی کی ساری زندگی
 جس عزت سے اس کا نام سنبھالتے ہوئے گزاری وہ
 قابل تحسین ہے۔

مگر اس وقت عہد الجدید کے انتقال کے بعد۔ وہ
 بھائی سے خفا تو تھے۔ مگر کوئی تعلق تھوڑی ختم ہوا تھا۔
 خون کا رشتہ تھا یہ۔۔۔

وہ اپنا حصہ لڑجھگڑ کر لے جا چکا تھا۔ یہ سارا گھرب
 تمہارے ابو کا تھا۔ مگر انہوں نے اگلی ہی صبح۔۔۔ مزدور
 بلوا کر گھر کے بیچ دونوں ماں بیٹی کے لیے باقاعدہ پورشن
 بنوا دیا۔ ساری ضروریات و سہولیات کو مد نظر رکھ کر۔
 کچن بنایا مگر ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ وہ چاہتے ہیں گھر
 میں ایک ہی دسترخوان لگے۔ اور ان سب چیزوں کو دیکھ
 کر صفیہ بے یقین رہتی تھی۔

لوگ رشتے دار آکر پوچھتے تھے۔ عہد الجدید تو اپنے

حصے سے بڑھ کر لے چکا تو اب یہ سب؟ تمہارے ابو
 اپنے دل پر ہاتھ رکھتے۔
 ”وہ نمٹن کا حصہ تھا۔ اور یہ میرے دل کا حصہ
 ہے۔“

صفیہ کی شادی کے لیے اٹھائے گئے قدم۔ حمیرا
 کی منزل کھولی کر سکتے تھے۔ بڑی کھوجتی نظروں سے دنیا
 حمیرا کو دیکھتی تھی۔ اس کی شوخیوں و شرارتوں کو آنے
 والے وقت میں ماں جیسی ہونے کے گمان میں
 جانچتے۔ تب تمہارے ابو نے اعلان کر دیا وہ حمیرا کو
 اپنی بہو بنائیں گے۔

اور تب ہی میں نے پہلی بار صفیہ کی آنکھوں میں
 حیرت کے ساتھ سکون بھی ابھرتا دیکھا تھا۔ اسے
 تمہارے ابو کی محبت و خلوص پر یقین آگیا تھا۔
 لیکن۔۔۔ ”بڑی امی خاموش ہو گئیں۔“

سمیرا بھی جانتی تھی۔ قصے کو کہاں آکر رک جانا تھا۔
 اسی لیکن پر۔۔۔

سمیرا نے قصیداً ”منہ پھیر لیا۔ ماں دو چار دن سے
 مسلسل رو رہی تھیں۔ مگر اب جو نمی آنکھوں میں تیر
 رہی تھی۔ اور بہہ جانے کو تھی۔ وہ بیٹے کے لیے تھی
 اور وہ اس کے حوالے سے کبھی نہیں روئی تھیں۔

بس ایک بار۔۔۔ بس ایک بار روئی تھیں۔ ویسے جیسے
 کہ ماؤں کو جوان بیٹوں کے مرنے پر رونا چاہیے۔

ابھی کچھ دن پہلے تو کالج میں داخلہ لیا تھا۔ ابھی ہفتہ
 پہلے تو اس کے سارے تنگ ہو جانے والے کپڑے
 نکال کر نئے سائز کے کپڑے جوتے بنوائے تھے۔

اتنا لمبا، تو مند، باڈی بلڈر جیسا لال سرخ گالوں،
 سنہرے بال اور اور چمکتی شریر آنکھوں والا بیٹا۔ اور
 لوگ کہتے ہیں وہ اب نہیں ہے۔

وہ حالت رکوع کی طرح جھکی تھیں اور اللہ پکارتی
 ہوئی سیدھی کھڑی ہوئی تھیں اور آسمان کو دیکھ کر روتی
 چلی گئی تھیں۔

مگر پھر جب انہیں پتا لگا۔ نہیں۔۔۔ ان کا بیٹا زندہ
 ہے۔ تب انہوں نے آنسو پونچھ لیے۔ اور پھر کبھی
 نہیں روئیں۔ جس اللہ نے اس حال میں زندہ رکھا

کے ذہن میں یہ بات ڈال دینا چاہتا ہوں کہ ضروری نہیں ہر خواب تعبیر پالے۔
 ”وہ ٹوٹ جائے گا۔“ وہ تھیں تو ایک ماں ہی۔
 ”نہیں۔“ وہ مسکرائے۔ ”میرا فیصلہ یہ اعلان۔
 اسے جڑنے میں مدد دے گا۔ تم دیکھ لیتا۔“

اور تھا تو معید عبدالعزیز بھی ان کا بیٹا۔ پھر ان جیسا کیسے نہ ہوتا۔ وقت گزرا۔ وہ جڑ گیا۔ ٹھیک ہو گیا۔

لیکن اس نے اپنے قدم خود بخود پیچھے کر لیے۔
 نظریں پھیر لیں۔ حمیرا کا حق تھا اسے اس جیسا قابل اور کامل شریک حیات ملے۔ وہ خود بہت اچھا تھا۔ بہت پیارا بھی۔ سامنے سے دیکھنے والا کوئی بھی شخص نہیں بتا سکتا تھا کہ جسم کتنی شکست رینخت کے بعد جڑا ہے۔

”ہاں یہ ضرور غلطی ہو گئی کہ ہم نے صفیہ کو نہیں بتایا۔ بتا دیتے تو شاید وہ ایسی منصوبہ بندیاں نہ کرتی۔
 لیکن سمیرا! اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود وہ اجنبی کی اجنبی ہی رہی۔ ہم اتنے سال ایک ساتھ ایک چھت کے نیچے رہے۔ مگر ہم نے کبھی ایک دوسرے سے دل کی باتیں نہیں کیں۔ نہ میں نے۔ نہ پاپھر میں کرنا بھی چاہتی تھی۔ پر وہ اپنے دائرے سے کبھی باہر نکلی ہی نہیں۔ پتا نہیں کیا وجہ تھی۔ میں نہیں سمجھ سکی۔“
 بڑی امی نے یہ الجھن بھی بیٹی کے آگے کھول دی۔
 سمیرا نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”اتنا مت سوچیں۔ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔“

”چھوڑو میری طبیعت کی خرابی کو۔“ وہ سخت بے زار و پریشان لہجے میں بولیں۔

”یہ جو اتنا سب کچھ خراب ہو گیا ہے۔ یہ کیسے ٹھیک ہو گا۔“

”کیا خراب ہو گیا؟“ وہ فوری طور پر سمجھ نہ سکی۔

”یہی سب۔“

”بھولی کا ذہن۔ صفیہ کی سوچ۔ اور وہ حمیرا۔“

اس نے جس بے یقینی اور صدمے سے تصدیق چاہی

تھا۔ وہ آگے بھی بچالے گا۔

مگر آج اتنے سالوں بعد آنکھوں میں آتی یہ بے بس نمی بیٹے کے لیے تھی۔ بیٹا معید عبدالعزیز۔
 کرچیاں دوبارہ نہیں جڑتیں۔ لیکن اگر اللہ جوڑے تو۔۔۔ اس سے کیا ناممکن ہے۔ کیا چیز ہے جو اس کے اختیار میں نہیں۔

جب انسان کے لیے دنیا میں سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ تب اللہ شروع ہوتا ہے۔ تو صرف اللہ۔ کیا اللہ۔۔۔ واہ اللہ۔

وہ۔۔۔ وہ معید عبدالعزیز نہیں رہا تھا۔ وہ شہزادوں جیسا۔

مگر شہزادہ۔۔۔ شہزادہ ہوتا ہے۔ لگنے کی کیا بات ہے۔ وہ بظاہر بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ ہاں دبلا پتلا تھا۔ پالٹ نہیں بن سکا تھا افسر بھی نہیں بنا۔

اور صفیہ۔۔۔ جب ناہید بیٹے کو سہم کر دیکھتی تھیں۔ ماں تھیں ناں۔۔۔ وہ کیا سے کیا ہو گیا تھا۔

تب صفیہ۔۔۔ بھی ماں تھیں ناں۔۔۔ بیٹی کی ماں۔ اور یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ عبدالعزیز جیسے حساس اور محبت کرنے والے انسان ایک ماں کی آنکھ کا خوف نہ پڑھتے۔

خدا شات۔ جو چیخ چیخ کر کہتے تھے۔ ”پیری بیٹی کے لیے کیا یہ معید عبدالعزیز؟“

اور تب ایک رات عبدالعزیز نے ناہید کو مخاطب کر کے کہا۔ وہ اپنے خواب سے دستبردار ہوتے ہیں۔

وہی خواب مرحوم بھائی کی بیٹی کو بہونا کر ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھنے کا خواب۔ وہ کیسے اتنے ظالم ہو سکتے ہیں کہ۔۔۔ اپنے بیٹے کی حالت کو نظر انداز کر دیں۔

”وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“ ناہید کا یقین پہاڑوں سے برہہ کر تھا۔

”لیکن اگر نہ ہوا تو۔؟“

”تو تب کی تب دیکھی جائے گی۔“ ناہید حقیقت

پسند بھی ہو چکی تھیں۔

”لیکن میں اپنے اور تمہارے اور بالخصوص معید

دل کو دھڑکا تو رہتا ہی ہے۔



وہ جھٹکے سے سنبھلی تو گھر لوٹی نہ تیا ابو تھے نہ تیا کا بیٹا۔ اتنی صبح کہاں ہوں گے۔ اس نے قیاس کے گھوڑے دوڑائے۔ گلی سے گزرتے چنگ چپ رکشے کی سائیڈ کرسی پر آدھا ادھورا ٹک کر مین بازار پہنچی۔ معید کا اسٹور صبح صبح ہی کھلتا تھا۔ مگر وہ گیارہ بجے کے قریب جایا کرتا تھا۔ ملازمین صبح کا کام دیکھتے تھے۔ مگر آج نہ وہ۔ معید کی چھوٹی آلتو باہر موجود تھی۔ اس نے دانت کچکچائے۔

بڑے سے گلاس ڈور سے اسٹور کا اندرونی منظر صاف دکھائی دیتا تھا وہ سامنے ہی براجمان کسی سے محو گفتگو تھا۔ پھر اس نے ”کسی“ کو بھی دیکھ لیا۔ وہ دونوں مجرم ایک ہی جگہ مل گئے تھے۔ دیش ویری گٹھ۔ دروازہ بے آواز تھا۔ وہ بھی سر پر پہنچ کر دھماکا کرنا چاہتی تھی۔ مگر اس سے پہلے خود بولنا شروع کرتی۔ کان خود سننے لگے۔

عبدالعزیز کچھ کہہ رہے تھے۔ بتا رہے تھے وہ حمیرا کو جانتے ہیں۔ وہ کسی سے بھی شادی کر لے گی مگر اے ڈی سے کبھی نہیں کرے گی۔

مگر جواب میں جو معید نے بولنا شروع کیا۔ وہ حیران کرنے کے بعد آگ لگانے والے اندازے تھے۔ کیسی بے فکری تھی اس کے انداز میں۔ اور اس نے سوچا بھی کیسے کہ وہ۔

”تم نے سوچا بھی کیسے کہ۔ میں سمیرا سے اے ڈی چھین لوں گی۔“ اس نے میز پر ہاتھ مارے تھے۔ ”آپ بیچ میں سے نکل جائیں تیا ابو۔! آپ سے میں بعد میں بات کروں گی۔“

وہ ہنوز معید کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ عبدالعزیز کو بھی دیکھے بغیر حکم جاری کیا۔ اس کے انداز کی قطعیت دیکھ کر عبدالعزیز نے باہر نکل جانے ہی میں عافیت سمجھی۔ اور وہ ان کے نکلنے ہی کی منتظر تھی۔ اس نے اسٹور کے گلاس ڈور کو لاک کر دیا۔ ساتھ ہی

تھی کہ اس کا رشتہ ختم کیا جا چکا ہے وہ بھی چھ سال پہلے اور اسے خبر بھی نہیں۔ اور تمہارا کیا ہو گا سمیرا۔ اگر اے ڈی بھی ماں کا ہم خیال نکال تو۔۔۔ سمیرا کے منہ سے ٹھنڈا سانس خارج ہوا تھا۔

کیا اے ڈی ماں کا ہم خیال ہو سکتا تھا؟ معید کے حادثے کے وقت وہ انٹر میں تھی۔ بہت خواب تھے اس کے مستقبل کے حوالے سے سب سے پہلے تو وہ اعلا تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اے ڈی کی طرح۔ وہ بھی استاد بننا چاہتی تھی۔

مگر معید کے حادثے کے بعد اس نے استادوں کی ایک نئی قسم کو دیکھا اپنا جی انسانوں کو زندگی جینا سکھانے والے استاد۔

اس کے دل نے کہا وہ یہ پیشہ چنے گی۔ تب اے ڈی ہی نے تو اسے سب سمجھایا تھا اس حوالے سے تعلیم اور پھر تربیت حاصل کرنا اور پھر عملی اقدام۔ بہت کم لوگ اس پیشے کو اپناتے تھے۔ یہاں خدمت خلق کا جذبہ لے کر جانا پڑتا تھا۔

اور آمدنی۔ اگر ایسا کوئی خیال تھا تو پھر آپ رہنے دیں۔

اور اے ڈی ان سب باتوں سے واقف تھا۔ اگر وہ مادیت پرست ہوتا تو وہ سمیرا کو کبھی اس شعبے میں جانے نہ دیتا۔

کوئی ایسا کام بتا تیا پڑھواتا جس کے بدلے میں اچھی تنخواہ اور فوائد حاصل ہو سکیں۔

(ہاں اس نے حمیرا کو اس کی دلچسپی کے پیش نظر ہی مہتھس پڑھوایا تھا۔ اور وہ اتنی قابل تھی کہ گولڈ میڈل حاصل کر کے آج ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ کی افسر بن گئی اور تنخواہ پوری انچاس ہزار پانچ سو) تو ثابت ہوا اے ڈی کی سوچ ماں جیسی نہیں ہے۔

اسے صرف سمیرا سے دلچسپی تھی۔ نہ کہ سمیرا کے ہنروں سے (سمیرا فی سبیل اللہ کام کرتی تھی) کیا اس کی سوچ بھی بدل گئی تھی۔ انسانوں کی سوچ بدلتے کتنی دیر لگتی ہے۔ محبتوں میں کتنا بھی یقین ہو،

وقفہ برائے نماز۔ کاپلاسٹک ٹیک لٹکا دیا۔

”اس وقت کون سی نماز ہوتی ہے؟“ معید کی آواز ابھری۔ وال کلاکت کلاس بجے تھے۔

”نماز جنازہ۔“ وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر اس کی سمت گھومی تھیں۔

”کس کی؟“ اس کا سوال عین فطری تھا۔

”تمہاری۔“ وہ تین قدموں میں اس کے سر پر پہنچی تھیں۔

”میری۔۔۔؟“ وہ واقعی دہل گیا۔ ”ایسی جوان عمر میں۔“

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ سے شادی سے انکار کرنے سے۔“

معید کی بولتی بند ہو گئی۔ اسے مزید آگ لگی۔

”اب بولتے کیوں نہیں چپ کیوں لگ گئی ہے؟“ اس نے لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ اس کے منہ کے سامنے کر کر کے پوچھا۔

”تو تم کو مجھ سے شادی کرنی تھی۔“ معید کے لہجے سے پتا لگتا تھا وہ ابھی تک حمیرا کے موڈ کا اندازہ لگا نہیں سکا۔

”جی ہاں۔“ حمیرا نے لباس اس اندر کھینچا گویا غصہ پیا۔ صبر کا گھونٹ پیا۔ ”کنیز ہی چاہتی تھی۔“

”تو پھر کنیز کو بھیج دو۔ تم کیوں کھڑی ہو۔“ شاہانہ لہجہ اختیار کیا۔

”کنیز کے بچے۔۔۔“ ضبط کی حد یہیں تک تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ معید کے شانے پر زور سے مارا۔ بے چارہ بمشکل سنبھلا۔ کرسی ہل گئی تھی۔

”تم نے میرے بارے میں اتنا غلط سوچا کہ میں اے ڈی بھائی سے اتنی گھٹیا بات۔“ اسے اس سوچ پر ہی گھن آئی تھی۔

”میں نے سوچا۔“ وہ غرائی ”تم میں اگر سوچنے کی صلاحیت ہوئی تو کسی مقام پر ہوتے اس اسٹور میں نہ بیٹھے ہوتے۔“

معید کے ہلکے پھلکے موڈ پر اس جملے کا اثر ہوا۔ اب کی بار اس نے نگاہ اٹھائی تھی۔ سنجیدہ دو ٹوک۔

قطعیت سے بھرپور۔

”بس یہی بات تھی۔ کہ مجھ میں واقعی کوئی صلاحیت نہ تھی ہوتی تو میں بھی کچھ اچھا سوچتا پھر میں نے یہی سوچا کہ میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ تم کسی بہت اچھے قابل مکمل انسان کو ڈیزرو کرتی ہو جو تمہارے لیول۔“

”تم ہوتے کون ہو میرا لیول طے کرنے والے۔ اور میں نے کب تم سے گزارش کی کہ تم میرے لیے قابل انسان ڈھونڈو وہ پھٹ پڑی۔“ میں اپنا اچھا برا سمجھتی ہوں۔“

”اور تمہیں اپنے لیے جو اچھا لگاؤ میں ہوں۔“ اس کے سوال کی کاٹ جان لیوا تھی۔ پر آگے بھی تو حمیرا عبد المجید تھی جس نے زور و شور سے سر ہلایا۔

”ہاں!“

”احسان اتارنے کا یہ اچھا طریقہ ہے۔“

”احسان؟“ وہ چونکی۔

”ہاں وہی احسان۔ جو ابو نے کیا۔ وہی سب باتیں جو چچی کہہ رہی تھیں قیمت۔ ان کا اپنا انداز تھا۔ تمہارا اپنا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ضرورت نہیں۔ وہ ابو کی اپنے مرحوم بھائی سے محبت تھی اور قرض بھی۔ تمہیں اس فکر میں گھلنے کی ضرورت نہیں۔ کہ تم ترس کھاؤ۔ اور میں تو حیران ہوں۔ تم ایسا رد عمل ظاہر کر رہی ہو۔ ہمارے درمیان تو کبھی بھی ایسا کچھ نہیں رہا۔“

وہ حمیرا کی پھٹی آنکھوں اور فق ہوتے رنگ سے بے پرواہ ہو کر اپنی کہہ رہا تھا۔

”یاد نہیں۔۔۔ جب ایک بار تمہیں کہانی لکھنے کا جنون ہوا تھا۔ میں تو کہانی میں بھی تمہارا ہیرو بننے کا اہل نہیں تھا۔ تم مجھے ریل ہیرو کہہ رہی ہو۔ کمال ہے یار۔“ اس نے بے پروائی سے بالوں میں ہاتھ چلایا اور مسکرایا بھی تھا۔ دوستانہ مسکراہٹ کتنے مزے سے۔ لا علم۔ کتنا سکون۔

وہ ہمیشہ سوچتی تھی۔ چنگیز خان کھوپڑیوں کے مینار کی بلندی دیکھ کر مسکراتا تھا۔ تو کتنا ظالم تھا جو ایسے عالم میں

مسکرا سکتا تھا؟ یہ سامنے بھی تو چنگیز خان ہی تھا، مارچ دو ہزار سولہ کا ہلا کو خان۔۔۔ تا تارا عظم۔
اسے مار رہا تھا۔۔۔ اور ہنس رہا تھا۔
اور سچ بھی کہہ رہا تھا۔ ان کے بیچ کب تھے وعدے وعید۔ نظر، حق، مسکان لیکن جب وہ کہہ رہی ہے اپنے منہ سے۔ تو مانتا کیوں نہیں۔
کوئی لڑکی کا دل ایسے توڑتا ہے۔ کہ لڑکی اس پر مرتی رہے اور وہ۔۔۔

اسے سب کچھ سنا کر دوبارہ اخبار بنی؟ کیا اپنی قبل از وقت وفات کی خبر مل گئی تھی۔

”ظالم کیسے!“ اس نے دانت کچکچائے۔ اور اگلے ہی لمحے میز پر پڑے سارے اخبار ٹوٹ بکس کتابیں اس پر برسادیں۔ پھر اسی پر بس نہیں کیا۔ اپنے سامنے والا ریک خالی کر دیا۔۔۔ پھر اس کے پیچھے والا۔ اس کی روزی روٹی پر لات مارنے والی بات تھی یہ۔۔۔

بے چارے کا بک اسٹور۔۔۔ رومی کی دکان بن جائے گا اگر اسے بروقت روکا نہ گیا۔ اور بھلے سے دروازہ اندر سے لاک تھا۔ مگر تھا تو شیشے کا۔ ابھی جم غفیر لگ جاتا۔ کاروبار کا خسارہ۔۔۔ اور عزت کا کچرا۔۔۔ نہیں بھئی۔ خود کو کتابوں، کاپیوں کے وار سے بچاتے اس نے بمشکل اس کے دونوں ہاتھ تھامے مگر کدھر جناب وہ حمیرا۔۔۔ اسے سنبھالنا اتنا آسان کہاں تھا۔ اس نے ہاتھ پکڑے ہوئے اسے گھما دیا۔ پشت سے کس لیا۔ تب وہ جکڑی گئی حرکت کی محتاج ہائے بے چاری۔ پھر پھر اکر رہ گئی۔

”چھوڑو مجھے۔“ وہ جھنجلائی۔

”مجھے چھوڑو معید۔“ وہ بہ وقت گردن پیچھے کر کے بولی۔

اس کی آنکھوں میں حزن کی کیفیت چھ برس سے مہر گئی تھی مگر ایک شوخی کا لپکا تر چھی نگاہ سے مخفی نہ رہ سکا۔ یہ دیکھ کسے رہا تھا۔ اور مسکرا کیسے رہا تھا۔ ایسے تو کبھی نہیں مسکرایا۔

”پ“ بھی تو اس بات پر قیامت برپا کر دی تھی کہ تمہیں چھوڑنے کی بات ہی کیوں کی اور اب کہتی ہو

”چھوڑو۔“ اس کا لہجہ بھی بدلا تھا۔
”وہ دوسرا چھوڑنا تھا۔“ اسے وضاحت کرنی مشکل لگی۔

”چھوڑنا۔۔۔ چھوڑنا ہی ہوتا ہے۔ تم طے کر لو۔ پکڑے رہو یا چھوڑ دو۔“ اتنے معنی خیز جملے۔۔۔ حمیرا کو قربت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ پوری جان سے کسمپاسی۔ مگر کہاں جی۔ ایسے ہی بڑی امی کہتی رہتی ہیں۔

”میرا کمزور بچہ۔۔۔ جان نہیں پکڑتا جسم۔ اب کیا کنگ کانگ ہو جائے۔“
”میں روپڑوں گی۔“
”برواہ نہیں۔۔۔“

”مجھے درد ہو رہا ہے معید۔“ اس کی آواز سے بھی عیاں ہوا۔

”اوہ!“ معید نے ٹکنبہ کھول دیا۔ وہ سرعت سے بلیٹی اب دونوں رو برو تھے۔ وہ مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ یہ گھور رہی تھی اور اپنے ہاتھ مسل رہی تھی۔
”زیادہ درد ہو رہا ہے۔“ وہ ایک قدم آگے آیا۔ وہ کچھ نہ بولی۔

”حمیرا!“ اس نے نرمی اور فکر مندی سے پکارا تھا۔

اس درد سے بہت کم جو لوگوں کے انکار سے ہوا۔“ معید بہت محتاط انداز سے اپنی شہادت کی انگلی سے ہاتھ کے سرخ نشان کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں جہاں صرف سچ کی تحریر تھی۔

”تم واقعی سچ کہہ رہی ہو؟“ وہ اس سے کیا سنتا چاہتا تھا۔ دکھائی تو صاف دے رہا تھا۔ پھر بھی اس نے سر ہلا دیا۔

”احسان۔۔۔ یا محبت۔۔۔؟“ اسے وضاحت درکار تھی۔

”محبت۔“ اب جب کہ بات صاف ہونے لگی تھی۔ تو پھر وہ کیوں رکتی۔

”کیا۔“

”محبت۔“ اس نے جواب دہرایا۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

”کس بات کا...؟“ حمیرا ابھی۔

”محبت کا۔ واقعی؟“ اس نے سینے پر ہاتھ لپیٹ کر اسے تسلی سے جانچا۔

وہ پہلی بار چونکی۔ تو حاصل کیا ہوا خسارہ۔ محبت بھی نہ ملی اور پندار بھی جاتا رہا۔

شکستگی کے احساس نے اسے لڑکھڑایا۔ اس نے کرسی کی پشت کو دونوں ہاتھوں سے تھاما پھر گھسیٹ کر بیٹھ بھی گئی۔ سر بھی جھکا دیا۔ تو یعنی ہار مان لی۔

اس کی آنکھیں بھرنے لگیں۔ یہ کنارے تک۔ پھر ہرہ پڑیں۔ گالوں سے بے آواز سیل رواں گزرنے لگا۔

اور یہ منظر دیکھنا دل گردے کا کام تھا۔

”حمیرا!۔“ وہ بھی کرسی کھسکا کر نزدیک آ بیٹھا۔ ”دنیا جینے نہیں دے گی۔“ اس نے بالآخر اصل خدشہ بتا دیا۔ ”جوڑ بھی تو دیکھو تم اور میں۔ اچھے لگیں گے کیا ساتھ ساتھ۔“

وہ چہرہ نیچے کیے اس کا چہرہ دیکھنے کی تک دو دو میں تھا۔ اس نے جھکے جھکے نظر اٹھائی اور معید عبدالعزیز کو دل پر آرے جلنے کا مطلب سمجھ میں آ گیا۔

”تمہیں بڑے لوگوں کو جواب دینے پڑیں گے۔“ وہ ہارنے لگا تھا۔ حمیرا نے سر اٹھا کر اسے بغور دیکھا۔

”دنیا مذاق اڑائے گی۔ اور تمہیں پاگل کہے گی۔“

یہ وقوف پکارے گی۔ تمہیں زیادہ سننا پڑے گا۔ ابھی تم پر جوش سوار ہے اور ہوش تب آئے گا جب وقت گزر چکا ہوگا۔ میں تمہیں عقل دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ اس نے اس کے سر پر ہاتھ سے دستک دی۔

”میں تم سے عقل مانگنے کب آئی تھی؟“ اس نے شاکی نگاہ سے اسے دیکھا۔

”مجھے کبھی بھی اندازہ نہیں تھا کہ تم مجھ سے ایسے سوال کرنے آؤ گی۔“

”اور میں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ تم صاف جواب دے دو گے۔“

”میں تمہارا اس بے وقوفی میں ساتھ نہیں دے

سکتا۔“ یہ وہی جانتا تھا اس نے کس دل سے یہ جملہ کہا تھا۔ ”اور کیا گارنٹی ہے کہ تم کبھی پچھتاؤ گی نہیں۔“

”کوئی محبت کے لیے بھی گارنٹی مانگتا ہے؟“ حمیرا نے اسے شرمندہ کر دیا تھا۔ ”گارنٹی تو میرے پاس اپنی زندگی کی بھی نہیں ہے۔“ اس نے حقیقت بتلائی۔

”ہا۔!“ معید نے لمبا سانس بھر کے اس کے چہرے پر نگاہیں جمائیں۔ ”تو پھر ٹھیک ہے۔“ وہ بہت پرسکون نظر آنے لگا تھا۔ ”مجھے قبول ہے۔“

”کیا؟“

”وہی جس کی تم قسم کھا کر آئی تھیں۔ مر جاؤ گی یا مار دوں گی۔ محبت یار!“

وہ بے فکری سے ہنسا۔ حمیرا نے چونک کر اسے دیکھا پر اس کی بات کی گہرائی کو جاننا۔ تو کیا اس نے؟

اس کی پُر شوق نگاہیں حمیرا کے چہرے پر ٹکی تھیں۔ پھر یہ کیا...؟ وہ تو بھلا بھلا کر کے رونے لگی تھی۔

اس کا تو خیال تھا وہ خوشی سے اچھل پڑے گی۔ اور وہ کتنا برا روئی تھی۔ معید اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور خود سے عہد باندھا۔ وہ زندگی بھر اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہیں آنے دے گا۔ قسم سے اتنی بری شکل۔



پھپھی بھولی معافی مانگنے آئی تھی۔ اپنی غلطی بھی تسلیم کر لی تھی۔ اور وہ بھی اپنے مخصوص انداز سے۔

”ساری زندگی پھول بوٹے بناتی رہی۔ رنگوں کو سجاتی رہی۔ لوگ لال کے ساتھ ہرے پتے بناتے تھے،

میں نے کالے پتے بنا کر بھی کپڑے سجادیے۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ اللہ داما میں نے میٹل منٹ کی۔ وہ جو عطیہ نے کہا تھا اماں کر لی ہیں۔“

”اماں۔ ایکسپر منٹ۔“ اے ڈی نے نرمی سے کہا۔

”ہاں وہی ایکسپریس منٹ۔“

سب نے ہنسی چھپائی۔

”مجھ بے وقوف کے ذہن میں خیال ہی نہ آیا کہ

اے ڈی کے ساتھ تو سمیرا نے ہی جتنا ہے۔ اب بھلا یہ حمیرا اتنی موٹی ناک والی لڑکی جھجکتی میرے اللہ دتا کے ساتھ۔ حمیرا پر ستم توڑا حمیرا ہی سے پوچھا۔
”کمال کر دیا پھپھی!“ معبد نے قہقہہ لگایا۔

”آپ سچ کہتی ہیں صرف ناک ہی کیوں؟ میرے جیسی آنکھوں والی لڑکی بھی آپ کے اللہ دتا کے ساتھ نہیں سبجی تھی۔“ حمیرا نے آنکھیں بھینگی کر کے دکھائیں۔

”لوئی۔!“ پھپھی یوں بدکیں جیسے کسی نے سوئی چھوئی ہو۔

باقی سب بھی ہنس دیے۔ رونے سے آنکھیں اور چہرہ پہلے ہی سو جا ہوا تھا۔ اس پر بھینگا پن۔ قیامت یعنی دو آتشید۔

”مجھے تو پتا ہے نا عبد العزیز! میرا ذہن چھوٹا بنایا اللہ نے۔ ساری زندگی وہی کام کیے جو ضروری تھے جن کے بغیر گزارا نہیں تھا۔ اے ہی سوچا جو سامنے نظر آیا۔

تم بھی مجھے معاف کر دینا ناہید۔ چھوٹی عورت سمجھ کر۔ میرا تو قد بھی تم سے کم ہے۔“ پھپھی کا لہجہ شرمسار تھا دلیل بھی خوبی۔
”بھولی آیا۔!“ ناہید نے پھپھی کو اپنے ساتھ لگالیا۔ ”اتنے قابل بیٹے کی ماں کا قد چھوٹا کیسے ہو سکتا ہے؟ اے ڈی کے کندھوں پر چڑھ کر دنیا دیکھیں آپ۔“

”تو مجھ سے ناراض تو نہیں۔!“ پھپھی کو اندازہ تھا زیادہ دل ناہید ہی کا دکھایا ہے اس نے۔

”نہیں۔ بلکہ آپ بتائیں۔ آپ تو مجھ سے ناراض نہیں۔ وہ سب خیال جو میں آپ کے بارے میں رکھتی تھی۔“

چائے کے گھونٹ خاموشی سے بھرتی صفیہ شب کے بیچ بیٹھے ہونے کے باوجود الگ محسوس ہو رہی تھیں۔

یہ معافی تو انہیں مانگنی تھی وہی تو تھیں جو ناہید کے خیالات کو توڑ مروڑ کر اپنی مرضی کا بنا کر بھولی کے آگے

پیش کرتی تھیں۔

اور پیش کش کی اہمیت سے کیے انکارے؟
”تم کچھ نہیں بول رہیں چھوٹی بھابھی۔؟“
عبد العزیز نے پکارا۔

”کیا بولوں۔؟“ وہ اظہار کی قوت کھو چکی تھیں کیا؟

”بھولی آیا سمیرا اور اے ڈی کی شادی کے لیے دن مانگ رہی ہیں۔ تم بھی کوئی مشورہ دو۔“

”جو آپ کو مناسب لگے۔“ صفیہ نے ناہید کی آڑ میں بیٹھی سمیرا کو دیکھا پھر اے ڈی کو۔ وہ کتنا سنجیدہ متین بن کر ریزرگوں کی محفل میں براجمان تھا۔ مودب و محتاط (ہاں محتاط۔ نگاہوں کی چوری کا کھیل اتنے لوگوں کے بیچ بیٹھ کر کھیلنے والے سے بڑا محتاط اور کون ہو گا۔

ایک نرم گرم نگاہ وہ ناہید کے پہلو پر ڈال ہی لیتا تھا) صفیہ دل سے اٹھتی صدا پر ایمان لے آئیں وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے تو پھر خواہ مخواہ انہوں نے اتنا کھڑاک کیوں ڈال دیا۔ وہ متاسف تھیں۔

سمیرا کے چہرے کے رنگ۔ وہ شرمیلیں مسکاتیں۔ پلکوں کا اٹھنا اور جھکنا۔ اور اے ڈی۔ وہ سنجیدہ تھا مگر اس جانب دیکھنے پر مجبور بھی لگتا تھا اک نظر جیسے فرض تھی۔

”اپنے ابو سے کہو لگے ہاتھوں میرے دن بھی مانگ لیں چھوٹی بھابھی۔!“ برتن اٹھا کر لے جانے کے بہانے حمیرا معبد کے پاس گزری۔

”تمہیں ذرا شرم نہیں آتی۔“ وہ بدبویا۔
”بے وقوف موقع سے فائدہ اٹھانا سیکھو۔“ وہ اسے سمجھا رہی تھی۔

”یہ تم دونوں کیا باتیں کر رہے ہو۔“ عبد العزیز کا دھیان ادھر ہوا۔

”کچھ نہیں بتایا ابو۔!“ وہ سیدھی ہو کر فوراً ”نیک پروین ہو گئی۔“ یہ معبد کچھ کہہ رہا تھا۔
”کیا کہہ رہا تھا۔ بولو بیٹا۔!“
”میں تو کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔“ وہ سٹپٹا۔

کے اشارے سے شوہر کو ”ابھی اس بات کو رہنے دیں“ کا کہا۔

حمیرا بڑے مزے سے عبدالعزیز کے ساتھ کرسی جوڑ کر دن تارخ طے کرنے کے لیے کیلنڈر اور قلم اٹھا لائی۔ اے ڈی نے اس موقع پر پھپھی بھولی کا بیٹا ہونے کا ثبوت دیا۔ شرم کا تقاضا تھا اس کی شادی کی بات ہو رہی تھی۔ اسے اٹھ جانا چاہیے تھا۔

وہ معذرت کرتے اٹھا۔ اسے اس تخت کے پاس سے گزر کر جانا تھا جہاں ناہید کے پہلو میں سمیرا براجمان تھی۔ سب کا دھیان کیلنڈر پر تھا، لیکن یہ کیا۔ سمیرا کی طرف دیکھ کر کوئی شوخ بات۔ یا شوخ اشارہ کرتا جبکہ وہ اس پر اک گہری گرم نگاہ ڈال کر نکلتا چلا گیا۔

”ایسے تو کبھی نہیں ہوا۔ کبھی بھی۔“ سمیرا کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے سب کو دیکھا۔ سب گم تھے۔

ایسا کیوں لگاؤ خفا تھا۔ اور اگر تھا تو کیوں؟
سمیرا حق دق تھی۔



”مجھے کسی کی بات سے غرض نہیں کہ اس نے یہ کہا اور اس نے وہ۔ میرا سوال صرف یہ ہے کہ تم نے میرے بارے میں یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ اور حمیرا۔۔۔“

اے ڈی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اسے جملہ مکمل کرنے سے بھی کراہت سی محسوس ہوئی تھی۔ حمیرا اسے اپنی چاروں بہنوں کی طرح پہاری تھی۔ ایسا خیال تو خواب میں بھی نہیں آیا تھا کہ وہ حمیرا سے شام۔ اونہوں۔

”میں نے سوچا نہیں تھا۔ پھپھی اور چچی نے بتایا تھا۔“ سمیرا کتنی بار وضاحت دے چکی تھی۔

”تو تم نے یقین کیوں کیا؟“ سوال ہنوز اٹکا ہوا تھا۔
سمیرا نے اپنی نم ہتھیلیاں آپس میں رگڑیں۔ وہ سب کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں آئی تھی۔ ناراضی کے وہم کو دور کرنے کے لیے اے ڈی کا نمبر ملا یا۔

”اب مگر کیوں رہے ہو؟ ابھی تو میرے کان کھارے تھے۔“ حمیرا مجبور نظر آئی۔

”حمیرا۔۔۔!“ اس نے دانت پیس کر اسے دیکھا۔
”تم ہی بتاؤ کیا کہہ رہا تھا۔“ عبدالعزیز نے حمیرا سے ہی پوچھ لینا مناسب سمجھا۔

”بتاؤں۔۔۔“ اس نے معید سے پوچھا پھر پلکیں ہٹھلاتے ہوئے لب کھولے ”کہہ رہا تھا۔ ابو سے کہتا ہوں صفیہ چچی سے حمیرا کے دن بھی لے لیتے ہیں۔“
”کیا۔۔۔؟“ معید کرسی سے اچھل پڑا۔

”میں نے کہا میں لڑکی ہو کر ایسی بات کیسے کر سکتی ہوں آئنر آل میں مشرقی لڑکی ہوں جو جان سے چلی جاتی ہے مگر آن نہیں جانے دیتی۔“

”یہ جھوٹ بول رہی ہے ابو۔ بکو اس کرتی ہے۔“
معید اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

”اب مجھے پریشاں کرنے کے لیے چلا رہا ہے۔ کیا یہ ساری زندگی مجھ پر ایسے ہی رعب بھاڑے گا۔“
تخت فکر مندی سے حاضرین کو دیکھا۔

دیکھنے کی چیز اس وقت پھپھی بھولی تھی۔ ناک پر انگلی ٹکا کر وہ سخت اچھٹے سے حمیرا کو سن رہی تھی۔
”اپنی شادی کی بات کوئی ایسے کرتا ہے سب کے پیچوں و بیچ منہ پھاڑ کر۔ اور چلو معید نے ایسا آئیڈیادے بھی دیا تھا تو لڑکے تو ایسی شوخیاں کرتے ہی ہیں۔ لڑکی ہی کو ”پی لینا“ چاہیے تھا۔“

پھر پھپھی نے جو کچھ سوچا وہ لی بی حمیرا سے کہہ بھی دیا۔ معید کے سینے میں ٹھنڈ پڑ گئی۔ وہ پرسکون ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

پھپھی بھولی دوبارہ اپنا سوال دہرا رہی تھی، مگر عبدالعزیز کا دھیان صفیہ کی خاموشی پر تھا۔ حمیرا نے اپنا معاملہ معید سے درست کروالیا تھا، مگر صفیہ کی مرضی کے بغیر۔ انہوں نے بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی یہی سوچ رہی تھیں۔ صفیہ گم صم تھیں۔ نجانے دھیان کا پنچھی کدھراڑان بھر گیا تھا۔

حمیرا کی اتنی قابل گرفت حرکات پر وہ ناگواری یا تنبیہ کا ہنکارا بھی نہ بھر سکی تھیں۔ ناہید نے آنکھ

پر یہ کیا...؟ کال وصول ہی نہیں کی جا رہی تھی۔ ابھی جب وہ یہاں سے گیا تھا تو فون اس کے ہاتھ میں ہی تھا۔ وہ مسلسل ملاتی رہی پھر پیغام لکھا۔

”یک دی فون اے ڈی۔“ جواب نہ دار۔۔۔
دل کی بے چینی حد سے سوا ہو گئی۔ پچھلے لگ گئے جب بالآخر جواب آیا۔ ”مجھے فون مت کرو۔ مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔“

وہ بھونچکی رہ گئی۔ اندر سارے بڑے دن طے کر رہے تھے اور وہ کہتا تھا۔

”مجھے کال مت کرو۔ مجھے بات نہیں کرنی۔“ مگر کیوں؟ تو اس کا خدشہ درست تھا۔ وہ ناراض تھا۔

شدید بے قراری کے عالم میں وہ گھر سے نکل آئی۔ اندر سب لوگ خوش گپیوں میں محو تھے اور سامنے پچھپی کے گھر کا دروازہ نیم وا تھا۔ اے ڈی کے اسٹڈی والے بڑے کمرے کی روشنی باہر آرہی تھی۔ وہ دروازے کی طرف پشت کیے کرسی پر بیٹھا تھا۔ سامنے میز پر فون پڑا تھا۔ اور اس پر مسند کال کی تعداد نمایاں تھی۔ میسجز کے سائن والا لفافہ بار بار جل بجھ ہوتا تھا۔

”تو وہ واقعی خفا تھا پر کیوں...؟“
اور جب سب بتایا (پچھپی بھولی نے پہلے جرم بیٹے کے سامنے قبول کیا تھا۔ سمیرا کے رونے کا بتایا تھا)

وہ پوچھ رہا تھا کہ وہ اس سے بدگمان کیوں ہوئی؟ وہ کوئی موم کا گڈا تھا جو سہرا لگا کر اندھا دھند نکل پڑتا۔ اس کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ ماں کیا سوچ رہی ہے اور کیوں۔۔۔

اور جب اسے ہالگاتب۔۔۔ اس نے ماں کو کچھ نہیں کہا کیونکہ وہ خود ہی اپنی غلطیوں کو مان رہی تھیں۔ ان کے پاس جواز تھے جو شاید خود ان کی حد تک درست تھے، مگر سمیرا نے کیوں؟ (بعد میں حمیرا سے ساری تفصیل بھی مل گئی تھی۔)

اے ڈی قطعاً ”ضدی نہیں تھا“ مگر سمیرا کیا کرتی کہ ”کیوں“ پر آکر اٹک گیا تھا۔

”سواری کر تو رہی ہوں۔“ وہ اس کی پشت کو دیکھتے

ہوئے بول رہی تھی جو کرسی سے اٹھ کر دیوار کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔

”اے ڈی۔!“ اس نے پکارا۔ کوئی جواب نہیں۔۔۔ سمیرا کا دل بھر آیا ساتھ ہی اسے احساس ہوا اگر پچھپی اوپر آجائیں تو۔۔۔

”کیا میری آواز سنائی نہیں دے رہی؟“ وہ ایک قدم آگے ہوئی اور ذرا اونچا بولی۔ اس کی محبت لٹائی نگاہیں اور سحرانگیز مسکراہٹ ہی دیکھی تھی۔

ایسی ناراضی۔۔۔ اور جب کہ وہ پکار رہی ہے تب بھی۔۔۔ تو ٹھیک ہے۔ مانگ تو لی معافی۔۔۔ کرلی غلطی تسلیم۔۔۔ اب اور کیا کرے۔ قدموں میں بیٹھنے سے تو رہی۔ محبت کی شرائط میں پہلی شق برابری کی ہونی چاہیے۔

اور یہ بھی کہ۔۔۔

ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں۔۔۔
یہ کیا کہ۔۔۔ وہ مجرم بنی کھڑی تھی اور تھک گئی تھی اور وہ بے حس بنامنہ موڑے کھڑا تھا۔

اور یہ بھی کہ وہ چل کر آئی تھی۔ اور اسے اس بات نے بھی نہیں پکھلایا تھا۔

”ٹھیک ہے یو فیسراے ڈی ریاض۔۔۔ تو پھر میں بھی آپ کی کلاس کی کوئی ٹالاق اسٹوڈنٹ نہیں ہوں جو مسلسل معافی مانگتی رہوں اور آپ مڑ کر بھی نہ دیکھیں۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتی۔ چلتی ہوں عزت افزائی کا شکریہ۔ خدا حافظ۔“

اور اسی پر بس نہیں۔ وہ حافظ کے ظ سے پہلے قدم بھی برہا چکی تھی۔

”اے اے۔۔۔ ارے سمیرا! رکو۔۔۔“

اے ڈی جست بھر کے اس تک آیا۔ کتنی اچھی لگ رہی تھی وہ معافی مانگتی۔ جی بھر کے دیکھنے کا ایسا موقع۔۔۔ دل تو اس کی آمد پر ہی باغ بلغ ہو گیا تھا، مگر بس یونہی۔۔۔

دراصل سمیرا کو خبر نہیں تھی دیوار پر لگے ایک آئینے میں وہ پوری کی پوری دکھائی دے رہی تھی اے ڈی کو۔ بس اسی لیے۔۔۔

پھر وہ تورکنے کو تیار ہی نہیں تھی۔ آنکھوں میں نمی لے کر مسلسل انکار۔ اے ڈی کو سچ بتانا پڑا۔ وہ بھڑک اٹھی۔

”آپ کو شرم نہیں آتی کسی کو چھپ چھپ کر دیکھتے ہوئے۔“

”اچھا۔۔۔“ اے ڈی نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہاں بیٹھ جاؤ میں تمہیں علی الاعلان دیکھ لیتا ہوں۔“ وہ خود بھی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ دیکھنا بھی شروع کر دیا۔

”لو خوا مخواہ۔“ وہ بدکی۔ دوپٹا درست کیا۔ ماتھے تک کھینچ لیا۔

اے ڈی دھیرے دھیرے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ سب جس کے بارے میں سمیرا کہتی تھی۔ صاف صاف بات کیا کریں نا۔

”وہ امی کے خیالات تھے جو حالات سے پیدا ہوئے۔ مجھے تم جیسی ہو جو ہو اسی طرح پیاری ہو۔“ اے ڈی کی نگاہیں اس کے سرخ چہرے پر پڑ گئیں۔ ”ہنر۔ بے ہنر۔ اونہوں۔ مجھے نہیں پروا۔۔۔ میرے گھر صرف محبت سیکھ کر آتا۔“

سمیرا کی نظریں بے ساختہ اٹھیں، مگر پھر جھک گئیں۔ اتنی ہمت نہیں تھی کہ تاب لے آتی۔

”خود کی بیٹی انہیں حاسد کہہ گئی تھی تو کیا وہ واقعی بھینس۔“

کیسا گالی کی طرح لگا تھا یہ لفظ۔ نہیں وہ نہیں بھینس۔ کبھی نہیں۔ وہ تو بس اپنی بیٹی کا بھلا چاہتی تھیں۔ اس کا حق تھا کہ وہ بحیثیت ماں بیٹی کے لیے اچھا برا سوچے اور کوشش کرے اور وہی اس نے کی تھی۔

لیکن یہ بھی تو سچ تھا نا۔ ناہید کو دیکھ کر دل میں طیش کی لہر اٹھتی تھی۔

اور سمیرا کے چہرے پر نظر پڑتی تو قدرت کی صنائی کو سراہنے کے بجائے وہ جھنجھلاہٹ کا شکار ہو جاتی تھیں۔

اور حمیرا نے کہا، یہی کیفیت تو حسد کہلاتی ہے۔ جب دل چاہے چہرہ بگاڑ دیا جائے۔ یہ اتنی اچھی ہے تو کیوں۔۔۔

اور یہ جو حسن ہے، یہ آخر کیسے ختم ہو سکتا ہے۔ ہاں شکر خدا کا، وہ اتنی منتقم نہ ہو میں عملی کوشش سے حسن کو ختم کرنے کا سبب ڈھونڈیں مگر۔

سارا خاندان ناہید کو اس پر فوقیت دیتا تھا۔ اس کی صورت اس کا طریقہ سلیقہ اس کا خاندان۔

اور مجھے من مانی کرنے والی بھگوڑی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ عزت دی ہی نہیں۔ میرے منہ پر کئی ایک نے کہا۔ ”کیا دیکھ کر عبد المجید نے عشق رچایا؟“ حالانکہ وہ عشق تھا تو میں نے وفا بھی تو نبھائی۔

چونتیس برس کی عمر میں بیوہ ہوئی تھی۔ گیارہ برس کی بچی تھی۔ پھینک جاتی اسے کہیں۔۔۔ دس لوگ مل جاتے ہاتھ تھا منے کو۔ اسے کسی نے نہ سراہا اور خیر میں نے یہ کام کسی تعریف کے لیے کیا بھی نہیں تھا، محبت تھی عبد المجید سے۔ آج بھی ہے۔ اور حمیرا کہتی ہے میں حاسد ہوں۔

انہیں حمیرا کے جملے یاد آنے لگے۔ ”یاد ہے کئی سال پہلے مجھے کہانی لکھنے کا شوق چڑھا تھا۔ پیاری سی شوخ محبت بھری کہانی۔

پیاری سی ایک لڑکی۔ اچھا سا ایک لڑکا۔ اور بہت ساری محبت۔ مگر مجھے جوڑ توڑ کرنا نہیں آیا۔ کہانی آگے بڑھ ہی نہ سکی۔ میں ”غلط“ لکھ ہی نہیں سکی۔ مجھے تو بس ”سب اچھا“ لکھنا آرہا تھا۔ مجھے پتا ہوتا کہ آپ کتنی مہارت سے منظر بدلنا جانتی ہیں تو آپ سے پوچھ لیتی۔ سیکھ لیتی امی۔۔۔ اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

ہاں وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں نے ناہید کے بھولی آپا پر کچھ اعتراضات کو کس طرح توڑ موڑ کر پیش کیا۔ بھولی کے دل میں میل بھرا اور سمیرا کی شخصیت مزاج کو بھی تو گھٹانے کی کوشش کی تھی۔ نسل پالش لگانے والی اور بھولی نے خامیوں کی فہرست میں بے نمازی لکھ لیا۔ حالانکہ میں گواہ تھی۔ وہ تہجد کے وقت اٹھ کر بھائی

کی صحت و تندرستی کے لیے ”گریہ“ کرتی تھی۔ ابھی تک تو اس کے وہ نقلی روزے پورے نہیں ہوئے جو اس نے معبد کو اسٹریچر پر دیکھ کر مان لیے تھے۔ اور اس کی طرف سے صدقہ جاریہ یہ تھا کہ اس نے اپنی زندگی ایسے لوگوں کے لیے وقف کر دی تھی جو اچانک حادثات میں گھر جاتے ہیں۔ ان کی ذہنی و جسمانی بحالی۔ انہیں دوبارہ زندگی کی طرف موڑنے کی کوشش اور اس کی نفیس مزاجی کو سستی و کاہلی کے زمرے میں ڈال دیا۔ بھولی نے ایک اور نمبر کاٹ دیا۔ اس کی نفاست پسندی کو ”ادا“ کہہ کر بھولی کے گھر کے لیے مس فٹ بھی تو میں نے ہی کیا تھا۔

تو پھر حمیرا ٹھیک کہتی ہے کہ۔ جس چیز کو بنانے اور سمجھانے کے لیے اور جس سے بچنے کے لیے اللہ نے پوری پوری دو سورتیں اتار دیں۔ سورۃ الناس اور سورۃ الفلق، حمیرا نے پہلے سورت پڑھی۔ پھر ترجمہ دہرایا۔ اس سے انکار کیسے کیا جاسکتا ہے؟

نفرت، محبت، بغض، عناد، غصہ، پیار اور بہت سی ایسی دوسری باتوں کی طرح حسد بھی انسانی فطرت کے اندر موجود ایک جذبہ ہے۔ یہ چیزیں انسان کے خمیر میں شامل ہیں۔ بس یہ ہے کہ۔ کون اس کی کتنی آبیاری کرتا ہے۔

”امی آپ کا معاملہ بس یہ ہے کہ آپ نے حسد کے اس عنصر کو اتنی محنت سے پروان چڑھایا کہ باقی سب جذبے پیچھے رہ گئے۔ اور حسد۔ اوسے ”اس نے جھر جھری لی تھی۔“ یہ تو زندگی سے بے ساختگی بر جستگی کو نوچ لیتا ہے یہ ادھیڑوں میں جُت جاتا ہے حاسد کی۔ نینداڑ جاتی ہے قرار لٹ جاتا ہے۔ نری بیماری۔“

(کہاں سے سیکھی تھیں اس نے یہ باتیں، صفیہ ششدر تھیں وہ تو گویا صفیہ کی کیفیت کا احوال بیان کر رہی تھی۔ ہاں وہ اتنے سال بالکل ایسی ہی بے چارگی اور مشکل سے جی تھیں)

اور پتا ہے اللہ کیا کرتا ہے بیماری دیتا ہے تو شفا بھی

بتا دیتا ہے۔ بس چاروں قل پڑھ کر خود پر پھونک لو۔ اس سے دوسروں کے حسد سے بھی بچ جاتے ہیں اور خود کرنے سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔

دل پھر بھی نہ مانے تو ان نعمتوں کو یاد کر لینا چاہیے جو میسر ہیں، چلتے پھرتے دل میں شکر بھرنے لگتا ہے۔ وہ تو مہتھس پڑھنے جاتی تھی۔ اس نے حسد کے موضوع پر پی ایچ ڈی کب کی۔ ہاں وہ کتنی بے خبر تھیں اپنی بیٹی کی صلاحیتوں اور ذہانت سے۔ شکل و جسم دیکھتی رہیں اگر اے ڈی ریاض اسے درست سمت نہ دکھاتا۔ تو کیسے ضائع کر دیتیں وہ اپنی بیٹی کو۔ تو یہ تو اللہ کا پھر ان پر خاص کرم ہوا تھا کہ وہ دوسروں کے بچوں کے لیے اتنا غلط سوچتی رہیں، لیکن اللہ ان سے بے نیاز نہیں تھا۔

ادھر ادھر دھیان لگانے کے بجائے اپنی بیٹی کو دیکھ لیتیں تو جانتیں کتنی بڑی نعمت تو انہیں بھی میسر تھی۔ قابل بیٹی۔ (انچاس ہزار پانچ سو تو خالی سخاوت تھی اس کی) صفیہ کی سوچوں سے پرے اس کا درس جاری تھا۔

”حسد سے، شرک سے، بغض سے بچنا بہت ضروری ہے امی۔ حسد دنیا برباد کرتا ہے اور شرک آخرت۔“

چاروں قل بڑی ضروری چیزیں۔ دین کی پوری تعلیمات ان میں سمٹ آتی ہیں۔

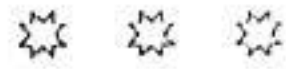
اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگالیں کہ اللہ نے انہیں نماز کا حصہ بنا دیا تاکہ جو ”دعا“ سمجھ کر ہاتھ میں نہ لے وہ ”دعا“ سمجھ کر پڑھ ڈالے۔ کتنے پیار سے سمجھایا تھا اس نے۔ کسی کامل استاد کی طرح۔

اور کتنی خوش قسمت تھیں وہ۔ انہوں نے اسے جنم دیا تھا۔

علم کسی کی میراث نہیں۔ بعض دفعہ اولاد بھی والدین کی تربیت کر دیتی ہے، کر سکتی ہے۔

”اوہ میرے اللہ۔“ صفیہ نے سر ہاتھوں پر مگر الیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں۔

شکر کے آنسو کہ شرم کے...؟
مگر جس کے بھی۔ اللہ کو دونوں پسند ہیں۔



”میں جب آپ کی جگہ پر خود کو رکھ کر سوچتا ہوں تو آپ بالکل صحیح لگتی ہیں چچی جان ابھیلا کون ماں چاہے گی کہ اس کی بیٹی کسی ایسے شخص کو اپنی تمام زندگی کا ہم سفر بنائے جو ہم سفری کے بنیادی تقاضے بھی پورے نہ کر سکے۔“

اس کے جملے بہت دل گیر تھے دل چیر دینے والے جیسے۔ مگر ان کی ذرا سی پرچھائیں بھی چہرے سے عیاں نہ تھیں۔

”وہ بہت تیز چلنے والی ہے۔ میں تو شاید چہل قدمی میں بھی قدم سے قدم نہ ملا سکوں۔“ وہ مسکرایا تھا۔
”کل میری شاپ پر آکر اس نے مجھے قائل کر لیا تھا۔“ اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔ ”اور آپ تو جانتی ہیں اسے قائل کرنا آتا ہے۔ میں بھی مان گیا لیکن جب تنہائی میں حقیقت پسندی سے سوچا تو وہ بے وقوف لگی۔ جذباتی کم فہم۔“

صفیہ اس کا چہرہ پڑھنے کی تگ و دو میں تھیں۔ دل کا حال جاننے کی خواہش اور وہ سب سے بے پرواہ بول رہا تھا۔ وہ سب جو اس نے بہت تسلی سے سوچا تھا اور ترتیب دیا تھا۔

”لیکن وہ اٹل ارادہ بھی رکھتی ہے جو ٹھان لے تو ٹھان لے۔“

”تو پھر تم مجھے کون سی کہانی سنانے آگئے ہو، تمہیں تو خوش ہونا چاہیے تھا ناں کہ ایک بے وقوف لڑکی کیسے تمہارے لیے اپنی ماں کے مقابل آگئی ہے۔“
”بالکل ہونا چاہیے تھا۔“ وہ بہت پیارا مسکرایا۔
”اگر خود غرض ہوتا۔“

صفیہ بری طرح چونکیں۔
”تم بہت اچھی باتیں کر سکتے ہو معید عبدالعزیز۔ خود کو لا تعلق ظاہر کرنا بہت آسان ہے۔ اس لیے کہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔ تمہارا مقدمہ لڑنے

کے لیے وہ بے وقوف لڑکی کسی بھی حد تک جاسکتی ہے۔“

”یہ الزام سچ نہیں ہے صفیہ چچی۔!“ معید کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ ”لیکن آپ مانیں گی نہیں... میں دس گواہ بھی لے کر آ جاؤں کہ میں نے اسے کبھی نہیں اکسایا بلکہ کبھی جتایا بھی نہیں کہ ایک رشتہ اور بھی تھا ہمارے بیچ۔ یا یہ کہ رشتہ بڑھ بھی سکتا ہے سو بات ختم کرتا ہوں۔“ وہ رکاوٹ پر مضبوط لہجے میں کہا۔
”ابو مجھے علاج کے لیے ملک سے باہر بھیجنا چاہتے ہیں۔“ صفیہ نے چونک کر دیکھا۔

انہیں ایسے کسی ارادے کی خبر نہیں تھی اور یہ کہ اب اس میں سے کیا ٹھیک کروانا باقی ہے۔ دیکھنے میں تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک لگتا تھا۔ ہاں ایک پارناہید بھابھی آنکھ کے کسی آپریشن کی بات کر رہی تھیں تو کیا وہی... لیکن پھر بھی انہیں کیا۔ جاتا ہے تو جائے۔

صفیہ نے نخوت سے سر جھٹکا اور سوالیہ نگاہوں سے اس کی صورت دیکھی۔

وہ سنجیدہ تو ہو چکا تھا مگر قطعیت کا یہ انداز۔ وہ مزید کیا کہنے والا تھا۔

”اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں واپس نہیں آؤں گا۔“ بالآخر اس نے دھماکا کر دیا۔ ”کم از کم اس وقت تک جب تک آپ اپنی پسند سے اپنی بیٹی کی زندگی کے فیصلے نہ کر لیں۔“

”اور جیسے کہ وہ مان جائے گی ناں۔!“ صفیہ کا دل پگھلا تھا مگر بس پل بھر کی تھی یہ کیفیت۔ بڑا چبھتا لہجہ تھا۔ لیکن وہ مسکرا نے لگا تھا۔

”نہ مانے، مگر کب تک نہیں مانے گی۔ میں کسی گوری چٹی میم کے ساتھ تصویریں بنوا کر بھیج دوں گا۔ سارے شہر کو دکھا دیجیے گا اور حمیرا کے لیے جو اسپیشل کاپی بھیجوں گا۔ اس کے پیچھے جلی حروف میں لکھ دوں گا۔“ بھابھی۔ کیسی لگی؟

اس کا چہرہ ہی نہیں لہجہ بھی متبسم تھا۔ مگر وہ آنکھیں... فقط جھوٹ کہنے سے وہ اتنی دکھی ہو گئی تھیں۔

تو حمیرا۔۔۔ اس جھوٹ کو سن کر وہ کتنی دکھی ہوتی؟
ہاں وہ دکھی ہوتی۔۔۔ اسے اتنا دکھ ہوتا کہ اس کا دل
پھٹ جاتا۔

وہ اتنا روتی کہ آنکھوں کا پانی خشک ہو جاتا۔
خود کو پیٹ ڈالتی۔۔۔ اور ختم ہو جاتی۔
”ہائے اللہ نہ کرے۔۔۔“ صفیہ کا دل اچھل کر حلق
میں آ گیا۔

کچھ ارادے معید عبدالعزیز بتا گیا تھا۔ اور حمیرا نے
بھی تو ایک جملہ کہا تھا اور اس کے بعد وہ زندگی بھر بھی
کچھ نہ بولتی۔ تو صفیہ کے لیے کافی تھا۔

”شادی تو میں معید ہی سے کروں گی امی۔۔۔ اور
آپ ہی کروائیں گی۔ پورے دل کی خوشی و قبولیت
سے ہمیں گھر سے بھاگ کر شادی کرنے والی نہیں۔۔۔“
اور صفیہ کے سر پر جیسے کسی نے کلہاڑا مار دیا تھا۔
شدید خوف زدگی کے عالم میں بیٹی کی صورت دیکھی۔
کیا اس نے ماں کو سنایا تھا۔ جتنا یا تھا کہ وہ۔۔۔

یا اللہ۔۔۔ ان کی بیٹی انہیں طعنہ دے گی۔ یہ تو صفیہ
نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

وہ تو اس چیز کی شعوری و لاشعوری کوشش کرتی
رہیں کہ حمیرا کو کبھی پتا نہ چلے کہ۔۔۔ لیکن ایسی باتیں
کوئی چھپتی ہیں؟ آج بیٹی کے منہ سے۔۔۔
مگر۔۔۔ وہ حمیرا کی صورت دیکھنے لگیں تو چونکیں۔

اس کے پیغام اور فیصلے میں جتانے کا گہرا تاثر ضرور
تھا مگر چہرے پر ایسا کوئی رنگ نہیں تھا جو بتا کہ وہ ماں پر
ظفر کر رہی ہے۔ ہاں اس نے ماں کو کچھ بھی نہیں کہا
تھا۔ اس نے اپنے معیار اور اقدار کی بات کی تھی۔ اس
نے ماں کو حق دیا تھا۔ ماں کا مان برہمایا تھا۔ گھٹایا نہیں
تھا۔

آپ ہی کریں گی۔ آپ ہی کو کرنا ہو گا۔ میں کوئی
بے وقوفی نہیں کروں گی۔

وہی اس کا بے ساختہ بے فکر انداز۔ اس نے اگر
ماں کو دھمکایا بھی تھا تو اتنے مان سے۔ اتنی عزت دی۔
بھروسہ کر لیا اور اپنا آپ بھی بتا دیا۔ اس کے لیے
کتنی اہم تھی صفیہ کی منظوری، خوشی۔۔۔ وہ اپنی ذات پہ

اختیار رکھتی تھی۔ اپنے پیروں پر کھڑی تھی۔ سر
جھٹ کر کہہ سکتی تھی صفیہ۔۔۔ کون صفیہ۔۔۔ زندگی تو
اس کی ہے اس کو گزارنی ہے۔

اور معید عبدالعزیز۔ سب اس کے ساتھ تھے۔
پھر۔۔۔؟ وہ اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ فرماں برداری۔۔۔
اوہ خدا۔۔۔

حمیرا صفیہ کی بیٹی تھی مگر ماں پر نہیں گئی تھی۔
معید۔۔۔ عبدالمجید کا بھتیجا تھا، اور اس پر نہیں گیا
تھا۔ ورنہ راہ بچھاتا ہاتھ پکڑ کر نکل لیتا۔ تو وہ کیا کر
لیتیں۔

تو صفیہ عبدالمجید تم نے زندگی بھر کیا کیا؟
حمیرا نے کہا تھا وہ کسی مکمل صحت مند و توانا شخص
سے شادی کر لیتی ہے۔ مگر اس کی کیا گارنٹی ہے۔ کہ وہ
شہرہ زور اور توانا رہے گا۔ حادثہ تو شادی کے بعد بھی ہو
سکتا ہے۔

اور کیا تب وہ شوہر کے عیب دیکھتے ہوئے اپنی بستی
بستی گھر بستی چھوڑ آئے گی۔ کبھی نہیں (کوئی عورت
ایسا نہیں کرتی اور یہاں تو اس کا دل دھڑکتا تھا معید
کے نام پر)

بات تو ٹھیک تھی۔ مرنے کے خوف سے لوگ جینا
تو نہیں چھوڑ دیتے۔

اور عبدالمجید بھی تو صفیہ کو بیچ راستے میں چھوڑ گیا
تھا۔ تو پھر تو صفیہ کو اس سے شادی کرنی ہی نہیں
چاہیے تھی کہ۔ اس نے تو مرجانا ہے۔

تو ایسے نہیں ہوتا۔ انسان ہر کام اچھی امید اور
توکل کے سہارے کرتا ہے۔

زندگی کتنی آسان بلکہ عیش و آرام سے گزری۔
کیسی تھی وہ شام۔۔۔ جب گھر خالی کرنے کا نوٹس مل گیا
تھا اور جیب میں پیسے نہیں تھے۔ گاڑی تھانے میں
کھڑی تھی۔ صفیہ کے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں
نے صاف انکار کر دیا تھا جو یا مرو۔ ہم سے کوئی تعلق
نہیں۔

اور دروازہ قرض خواہ بجاتے تھے اور دیکھتے تھے
صفیہ کو بھی۔۔۔ اور کچھ صفیہ کی بیٹی کو بھی۔ گھر سے

کب تک یونہی رہتیں۔ جب حمیرا کی بڑ دھڑ آمد نے چونکایا۔

اس نے زور سے دروازہ کھولا تھا۔ وہ ان سے کچھ پوچھتی آرہی تھی انہیں جائے نماز پر بیٹھا دیکھ کر لب بھینچ لیے۔

”کیا ہوا؟“ صفیہ نے جائے نماز کا کوٹا موڑا۔
گمبر: ٹی سی ہوئی۔ اس کے پیچھے معید بھی اندر آیا تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔

حمیرا ان کے پاس بیٹھ گئی۔ ”تم بھی آجاؤ ادھر۔ یہ فیصلہ ہو جاتا ہے۔“

معید ذرا سا ہچکچایا۔ ”میں ٹھیک ہوں ادھر ہی۔“

”آؤ نا۔!“ حمیرا نے ہاتھ برسھایا۔ ”بیٹھو۔! ای پھونک ساریں گی۔“

معید اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ صفیہ کے دل کی خبر نہیں تھی۔ سب کچھ تو حمیرا ہی اٹھانے ہوئے تھی۔

”مسئلہ کیا ہے؟“ صفیہ نے معید سے نظر ہٹا کر بیٹی کو دیکھا۔

”کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ آپ وال کلاک دیکھیں۔ کیا بج رہا ہے؟“

”وال کلاک۔؟“ صفیہ نے گردن موڑی ”بارہ بج رہے ہیں۔“

”ہاں۔ اور اس نے مجھے وش نہیں کیا۔ میری برتھ ڈے تھی آج۔“

”مانڈیو۔ تمہارے برتھ سرٹیفکیٹ پر یکم اپریل لکھا ہے۔“

”مجھے فول بننا پسند نہیں۔ اسی لیے میں اکتیس مارچ لکھتی ہوں۔“

”تمہارے لکھنے سے کیا ہوتا ہے حقیقت بدل تو نہیں جاتی۔“

”حقیقت یہ ہے کہ میں رات بارہ بجے پیدا ہوئی تھی۔ کیوں ای۔؟“

”ہاں زوال کا وقت۔ بارہ۔“ معید نے اٹھٹھا

نکلتیں تو کہاں جاتیں۔ رات کیا فٹ پاتھ پر کتنی۔ یا۔ یا۔

اللہ تو ہمیشہ سے مددگار رہا تھا۔ جب دنیا کے سارے در بند ہو گئے۔ تب اللہ نے فرشتہ بھیج دیا۔ اللہ کبھی خود سامنے نہیں آتا کسی کو بھیجتا ہے اور وہ ”کسی“ عبد العزیز تھے۔ جنہوں نے صرف سہارا نہیں دیا۔ عزت بھی دی۔ دنیا کے مصائب، عیاری اور گندی نظروں کے سامنے ڈھال بن گئے۔

”آپ سوچیں امی اگر اس شام بڑے ابو نہ آتے تو آج ہم کہاں اور کس حال میں ہوتے۔ انہوں نے عزت تو دی۔ محبت بھی دی اور آپ نے کیا کیا۔؟ ہمیشہ بد گمان رہیں۔ بلکہ بد گمان نہیں انجان۔ آپ کو ادراک ہی نہیں کہ کیسے اللہ ہم پر مہربان رہا۔ ایک فرشتہ ہمیں زندگی بھر کے لیے دے دیا۔“

اور واقعی صفیہ۔۔۔ یہ تو تم نے کبھی سوچا ہی نہیں۔۔۔

پچھلی بھولی دن لینے کے بعد رات گئے تک بیٹھی رہی تھی۔ اے ڈی کو ہی بلانے آنا بڑا اور صفیہ کے لیے سب کے درمیان بیٹھنا بہت مشکل تھا، مگر کیا کرتیں کہ عبد العزیز ہر بات طے کرتے ہوئے۔

”کیوں چھوٹی بھابھی! کیا خیال ہے؟“

”تم بھی تو بولو۔ یہ ٹھیک رہے گا یا نہ۔؟“

اور ناہید بھی غصہ نہ لگا ہوں سے دیکھتی تھیں جیسے صفیہ کی رائے سب سے اہم ہو اور یہ عزت اور مان۔

زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ جتنا کہ نظر انداز کرنا نہ لگتا۔ محفل ختم ہوئی تو وہ اپنے کمرے میں آکر خود احتسابی میں گھر گئی تھیں۔ بیٹی نے جو رات کہا تھا، انہیں حاسد۔

اور جو شام کو سمجھایا تھا وہ سبق۔

عشاء کے لیے کھڑی ہوئیں تو ساڑھے گیارہ ہو چکے تھے۔ دعا مانگنے کے لیے ہاتھ اٹھائے تو کتنی ہی دیر بس ہتھیلیوں پر برسات ہوئی رہی اور نجانے وہ

اڑایا۔

”معیّد! اس نے دھاڑ لگائی۔

”امی! اگلی پکار صفیہ کے لیے تھی۔ وہ معاملہ حل کیوں نہیں کرتیں۔

”ہاں بارہ ہی بجے تھے۔“

”تو پھر برتھ سرٹیفکیٹ پر یکم اپریل کیوں لکھا؟“

معیّد کا سوال وزن رکھتا تھا۔

”وہ تو اس کے ابو نے لکھوایا تھا۔“

”او ابو! حمیرا نے چھت کی طرف دیکھا۔ بہر حال۔۔۔ برتھ سرٹیفکیٹ جو مرضی کے مجھے فول نہیں بننا۔ ویسے بھی مجھ جیسی لڑکی مارچ ہی میں پیدا ہو سکتی ہے۔“

”کیوں؟“ معیّد نے ابرو چڑھائے۔ ”تم میں کیا خاص ہے۔ بلکہ مارچ میں کیا خاص ہے؟“ وہ بھنایا تھا۔

”مارچ! وہ بہت پیارا مسکرائی۔ بہار کا موسم۔ پھولوں خوشبوؤں رنگوں کا موسم۔ مجھ جیسی لڑکی ایسے ہی کسی مہینے میں پیدا ہو سکتی ہے۔ بہار جیسی لڑکی حمیرا عبد المجید۔“ وہ کھلکھلائی۔

معیّد لا جواب ہوا۔ وہ مسکرا دیا تھا۔ صفیہ نے دونوں کو ایک نظر سے دیکھا۔

”شکر ہے کہ کوئی ایسا بڑا نقصان نہیں ہوا جس کی تلافی نہ کی جاسکتی۔ ایسی کھلکھلاہٹ روشنی ہی تو چاہی تھی اپنی بیٹی کے لیے۔“

”آپ نے پھونک نہیں ماری مجھ پر۔“ اس کی ہنسی تھمی تو اس نے صفیہ سے ڈپٹ کر پوچھا۔

صفیہ اپنے خیالوں سے چونکیں۔ حمیرا بڑے اہتمام سے چوکڑی مار کے منہ ذرا سا آگے کر کے بیٹھی ہوئی تھی۔

صفیہ کی نگاہیں دروازے کی جانب اٹھیں۔

معیّد سینے پر ہاتھ لپیٹے چوکھٹ کا سہارا لیے پیروں کی قینچی بنائے ذرا سا ترچھا کھڑا حمیرا کے لاڈ اور مان مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

کتنے برے الفاظ سے پکارا تھا اسے ہمیشہ۔ صفیہ خود سے خفا ہونے لگیں۔

”ادھر آؤ۔“ اسے پکارا۔ وہ حیران ہوا۔

”ہاں تم۔“ صفیہ نے سر ہلایا۔

معیّد کچھ نا سمجھی کے عالم میں نزدیک آیا۔ صفیہ بیٹھ جانے کا اشارہ کر رہی تھیں۔ وہ کچھ جھجکا، مگر بیٹھ گیا۔

اور صفیہ نے اسے حیران کر دیا۔ حمیرا کو بھی، مگر معیّد کو زیادہ۔

صفیہ نے اپنی مانگی ہوئی ساری دعائیں ان دونوں پر پھونک دی تھیں۔ دعائیں یعنی خواہشیں۔ دعا یعنی اقرار۔

”یا ہو۔“ حمیرا پہلے ہوش میں آئی۔ معیّد تو گم سم ہو ہی گیا تھا۔ وہ صفیہ سے لپٹ گئی۔

”ارے ارے۔“ صفیہ چلائی رہ گئیں۔

”اب کہو۔“ صفیہ کمرے سے نکل گئیں تب وہ معیّد کی سمت متوجہ ہوئی۔

”کیا؟“

”مارچ کہ اپریل۔“

”مارچ! معیّد نے مان لیا۔

”لیں۔۔۔ اب یہ بھی کہو۔ محبت مارچ کا موسم۔“ معیّد نے اس کے سر آپے پر نگاہ ڈالی۔

قرمزی رنگ کے ساہ سوٹ پر دنیا جہان کے شوخ دھاگے بنے ہوئے تھے۔ اس کی ذہانت سے پر آنکھیں۔

صحت مند سرایا۔

بروہ پیاری کتنی لگ رہی تھی۔ پھول، خوشبو، بہار سی لڑکی۔

ہاں۔۔۔ محبت مارچ کا موسم۔ وہ مان گیا تھا۔

قصہ کی

”جی ہاں کل۔۔۔!“ عزت نے دہرایا۔

”شادی اٹینڈ کیے بغیر۔۔۔؟ مگر کیوں؟“ تیمور کو ان کی واپسی کا سن کر حقیقتاً حیرت ہوئی تھی۔

”وہ۔۔۔!“ عزت بے ساختہ کچھ بولتے بولتے رک گئی تھی۔

”ہاں ہاں بولو۔۔۔ رک کیوں گئیں؟“ تیمور نے اسے بولنے پر اکسایا تھا۔

”کیا آپ کو نہیں پتا۔۔۔؟“ وہ براہ راست بات کرتے ہوئے جھجک رہی تھی۔

”کیا مطلب۔۔۔؟ کیا نہیں پتا؟ صاف بات کرو عزت مجھے ٹینشن ہو رہی ہے۔“ تیمور کو سچ مچ مزید تشویش ہونے

لگی تھی۔

”آپ کو بابا کی کال نہیں آئی۔۔۔؟“ عزت! ابھی بھی کھل کے بات نہیں کر پار ہی تھی۔

”میرا سیل میرے پاس نہیں تھا۔۔۔ میں تھوڑی دیر پہلے ہی آفس سے آیا ہوں۔۔۔ لیکن تم بتاؤ۔۔۔ کیا مسئلہ ہے۔۔۔

واپسی کیوں ہو رہی ہے؟ کیا وجہ ہے؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟“ تیمور کو زیادہ پریشانی عزت کی طرف سے ہو رہی

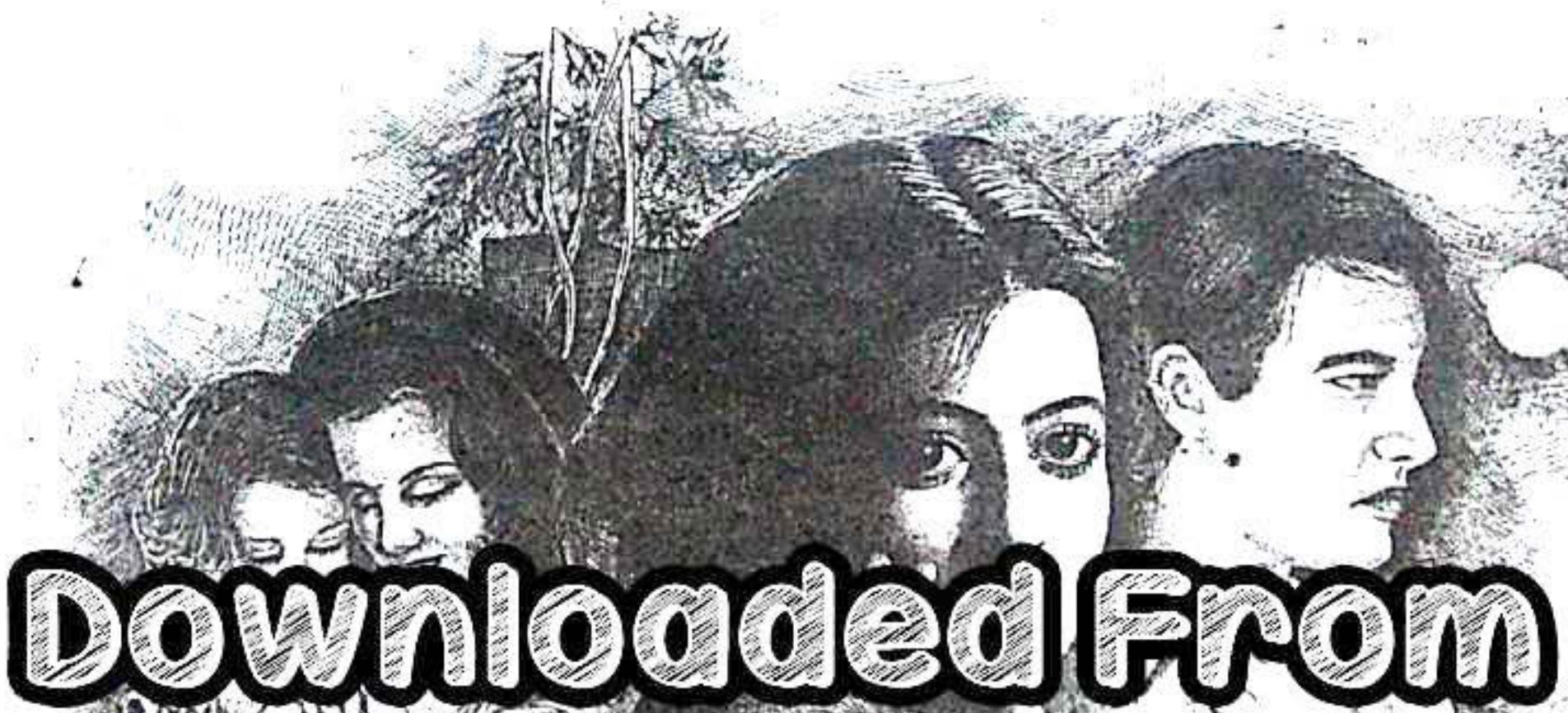
تھی۔

”نہیں۔۔۔! سب ٹھیک نہیں ہے۔۔۔ بابا بہت غصے میں ہیں اسی لیے واپس آرہے ہیں۔“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

www.pdfbooksfree.pk

انیسویں قسط



Downloaded From

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

www.pdfbooksfree.pk



”غصے میں کیوں ہیں....؟“ تیمور پریشانی کی وجہ سے اصل وجہ بھی سمجھ پایا تھا۔

”آپ کی شادی کی وجہ سے۔“ تیمور پہلے چونکا پھر سنبھل گیا۔

”اوہ! تو خبر پہنچ گئی ان تک۔۔۔ میرا سربراہ بھی نہیں رہنے دیا کسی مجبّر نے۔۔۔“ تیمور نے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔

”بھائی! وہ سچ میں بہت غصے میں ہیں۔“ عزت نے اسے رضا حیدر کے مزاج کی سنگینی کا بڑی سنجیدگی سے احساس دلایا تھا۔

”اور میں سچ میں بہت مزے میں ہوں۔“ تیمور نے بات کرتے ہوئے اب کی بار ماورا کی طرف دیکھا تھا اور اس دیکھنے میں بھی شرارت تھی۔

”اور بھابھی....؟“ عزت نے بڑے پیار اور بڑے اشتیاق سے ماورا کو بھابھی کے نام سے نوازا تھا۔

”یہ بات تم اپنی بھابھی سے ہی پوچھ لو۔۔۔“ تیمور نے کہہ کر فون ماورا کی سمت بڑھایا اور ماورا نے یکدم چونک کر تیمور کی طرف دیکھا تھا۔

”عزت ہے دوسری طرف۔۔۔ لو بات کر لو۔“ تیمور نے فون اسے تھما دیا تھا اور مجبوراً ”ماورا کو چپ کا قفل توڑنا پڑا تھا۔“

”السلام علیکم۔۔۔! اس نے محض سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام۔۔۔! مبارک ہو بھابھی!“ عزت کے لہجے میں دبی دبی شرارت اور خوشی ہمک رہی تھی۔

”خیر مبارک۔۔۔ کیسی ہو؟“ ماورا نے نرمی سے جواب دیا تھا۔

”بہت اچھی ہوں۔۔۔ بھائی نے اپنے دل کی خوشی بالی۔۔۔ اب جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا ایم ریٹی وی ری اچھی۔۔۔“

عزت کے اندر کی خوشی ماورا اتنی دور سے بھی محسوس کر سکتی تھی جیسے دن میں رضا حیدر کا غم و غصہ محسوس کیا تھا۔

”واپس آرہی ہو۔۔۔؟“ ماورا کو ان لوگوں کی بات چیت سے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ لوگ کل واپس آرہے ہیں۔

”جی۔۔۔ اور میں اس بات پہ بہت خوش ہوں کہ ہم کل واپس آرہے ہیں۔“ عزت واقعی بہت خوش تھی۔

”ہاں۔۔۔ ولید کو مس کر رہی ہوگی اسی لیے واپسی پہ اتنی خوشی کا اظہار ہو رہا ہے۔۔۔“ بالآخر ماورا بھی ذرا سے خوشگوار موڈ میں آگئی تھی۔

”بھابھی پلینز۔۔۔ بھائی کیا سوچیں گے؟“ عزت نے اس کے چھیڑنے پہ اسے روکا تھا۔

”عزت ولید کو مس کر رہی ہے اس بات پہ آپ کیا سوچیں گے۔ ذرا بتا سکتے ہیں مجھے۔۔۔؟“ ماورا نے بے

اختیار شرارت کا رخ تیمور کی طرف موڑ دیا تھا اور عزت ایرپیس سے ابھرتی اس کی آواز سن کر سرپیٹ کے رہ گئی تھی۔

”اف بھابھی۔۔۔!“ عزت شرم کے مارے اور کیا بولتی۔۔۔

”بتائیں ناں کیا سوچیں گے؟“ ماورا نے اسے اکسایا اور تیمور کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔۔۔ کیونکہ

ماورا نے اسپیکر کا بٹن آن کر رکھا تھا۔

”سوچوں گا کہ اب ولید بارات لے ہی آئے تو اچھا ہے۔“ تیمور نے بھی ماورا کی اس شرارت میں اس کا پورا

ساتھ دیا تھا۔

”اوہ گاڈ۔۔۔! بھائی آپ بھی؟“ عزت نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا تھا۔

”جی ہاں۔۔۔! میں بھی۔“ تیمور نے بھی اسی کے سے انداز میں جواب دیا تھا۔

”اچھا۔۔۔ بھابھی کے آتے ہی بھابھی کی طرف ہو گئے۔۔۔ بہن کو اکیلا چھوڑ دیا؟“ عزت نے احتجاج کیا۔
 ”نہیں۔۔۔! میں نے بہن کو اکیلا نہیں چھوڑا۔۔۔ پہلے اس کا ساتھ دینے والے کا انتظام کیا ہے۔۔۔ پھر خود کسی کا ساتھ دیا ہے۔“ تیمور ڈرائیو کرتے ہوئے عزت کو جواب بھی دے رہا تھا اور ساتھ ساتھ کن اکھیوں سے ماورا کو بھی دیکھ رہا تھا۔ جو فون کا اسپیکر آن کیے ان دونوں بہن بھائی کی نوک جھوک سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔
 ”تو اب کبھی بہن کا ساتھ نہیں دیں گے۔۔۔ بس ایک ہی بار دینا تھا؟“ عزت نے اسے جذباتی کرنے کی کوشش کی۔

”ارے کیوں نہیں میری جان۔۔۔ زندگی کے ہر موڑ، مقام پر ساتھ دوں گا۔۔۔ جب تک زندگی ہے۔۔۔ لیکن جہاں معاملہ تمہاری بھابھی کا ہو گا۔۔۔ وہاں میں تمہاری بھابھی کا ہی ساتھ دوں گا۔۔۔ تمہارا نہیں۔۔۔“ بات کرتے کرتے تیمور نے آخر میں پھر اسے چھیڑ دیا تھا۔

”ٹھیک ہے، پھر بھابھی سے ہی بات کریں مجھ سے نہیں۔“ عزت ناراض ہو چکی تھی اور تیمور قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ تم بھی اپنی بھابھی سے ہی بات کرو۔۔۔ مجھ سے نہیں۔“ تیمور نے بھی اسی کا انداز اپنایا تھا۔
 ”نہیں۔۔۔ اب میں آپ دونوں سے ہی بات نہیں کروں گی۔“ ماورا ان دونوں سے بھی چارہا تھ آگے تھی۔
 ”کیوں۔۔۔؟“ عزت اور تیمور بیک وقت بولے تھے۔

”کیونکہ آپ دونوں آپس میں بات نہیں کر رہے۔۔۔ آپس میں ناراض ہو رہے ہیں تو میری کیا ویلیو۔۔۔؟ مجھ سے بھی ہو جائیں گے۔۔۔ جن کا آپس میں اتفاق نہیں ہوتا۔ ان کا کسی اور کے ساتھ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟“
 ماورا نے بڑے طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے ان پر چوٹ کی تھی اور وہ دونوں بہن بھائی جیسے اپنا سامنہ لے کر رہ گئے تھے۔

”لیکن یہ تو ہمارا آپس کا معاملہ ہے نا۔۔۔؟“ تیمور نے کمزوری دلیل دی۔
 ”اب یہ آپس کا معاملہ نہیں ہے۔۔۔ اب اس آپس کے معاملے میں میں بھی شامل ہو چکی ہوں۔۔۔ اب آپ لوگوں کی مرضی یا تو شامل کر لیں یا اس آپس کے معاملے سے نکال دیں مجھے۔۔۔؟“ ماورا نے کہتے ہوئے بڑی لاپرواہی سے کندھے اچکائے تھے۔ اور وہ دونوں بہن بھائی اس کی بات پہ لا جواب ہو کر ایک بار پھر چپ ہوئے تھے۔

”تو پھر کیا کیا جائے اب۔۔۔؟“ عزت نے لب کشائی کی۔
 ”آپ لوگ خود سمجھ دار ہیں۔۔۔ میرے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ ماورا جان بوجھ کر لاپرواہی کا اظہار کر رہی تھی۔

”ہوں۔۔۔ سوری۔“ اب کی بار پھر وہ دونوں بیک وقت بول پڑے تھے اور ماورا ان دونوں کی اس بے ساختگی پہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی اور اس کی ہنسی سمجھ میں آتے ہی وہ دونوں بہن بھائی بھی ہنس پڑے تھے۔
 اور اسی ہنسی اور نوک جھونک کے دوران ان کا سفر تمام ہوا تھا۔ شاپنگ مال کے قریب پہنچتے ہی کال بند ہو گئی تھی۔



”سر۔۔۔! یہ ہے ریڈرسٹ واپز کی تمام کو لیکشن۔۔۔ آپ خود چیک کر لیجیے۔۔۔“ برانچ کے منیجر کے آرڈر پہ سیلز بوائے نے تمام کو لیکشن تیمور کے سامنے سجا دی تھی۔

”ان میں سے ڈائمنڈ واچ کون سی ہے۔!“ تیمور تمام رسٹ واچز کو تو صیفی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا کیونکہ تمام ہی ایک سے برہ کرا ایک تھیں۔

”یہ دس رسٹ واچز ڈائمنڈ میں ہیں۔ اور یہ آٹھ اور یجنل گولڈ میں۔“ سیلز بوائے اور منیجر الرٹ کھڑے تھے۔

”تم بتاؤ اب۔۔۔؟ یا پھر آج بھی مجھے ہی زحمت کرنا پڑے گی؟“ تیمور نے تمام رسٹ واچز کا جائزہ لینے کے بعد ماورا سے رجوع کیا تھا۔

”ریڈ رسٹ واچ آپ کی پسند ہے اس لیے سلیکشن بھی آپ کی ہی ہونی چاہیے میں نے تو بس آپ کو پسند کے دکھائی ہے۔“ ماورا نے بے حد آہستہ اور سہولت سے کہتے ہوئے معاملہ تیمور کی پسند پہ چھوڑ دیا تھا۔

”اچھا۔۔۔ تو یہ بات ہے؟ پھر اس یادگار شاپنگ پہ یادگار میلفی تو ہونی چاہیے ناں؟“ تیمور نے فرمائش کی تھی۔ اور پھر سیلز بوائے نے تیمور کی پسند کی ہوئی ڈائمنڈ کی رسٹ واچ اسے پیش کی جو تیمور نے بڑی احتیاط سے نکال کر ماورا کی کلائی کی زینت بنانی چاہی تھی جس کے لیے ماورا نے ہاتھ سامنے کر دیا تھا۔

اور تیمور نے وہ رسٹ واچ اس کی کلائی میں سجادی تھی۔

”تھینکس۔۔۔!“ ماورا کے چہرے پہ ہلکی شرم کی سرخی بکھری نظر آنے لگی تھی۔



”آئس کریم۔۔۔!“ شاپنگ مال سے نکلتے ہی ماورا کی نظر آئس کریم پارلر کی سمت اٹھی تھی۔

”کھاؤ گی۔۔۔؟“ تیمور کے قدم بھی رک گئے تھے۔

”میں اکیلی نہیں۔۔۔ آپ بھی کھائیں گے۔“ ماورا نے اسے بھی شامل کیا۔

”مجھے خاص پسند نہیں ہے۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”مجھے تو ہے پسند۔“ ماورا کا بہت موڈ تھا آئس کریم کھانے کا۔

”تو تم کھاؤ۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔

”آپ کھائیں گے تب۔“ اس نے ضد کی۔

”ماورا۔۔۔!“ تیمور نے مصنوعی خفگی سے پلٹ کر اسے دیکھا۔

”رہنے دیں۔۔۔ میں بھی نہیں کھاتی۔“ وہ سر جھٹک کر قدم آگے بڑھا چکی تھی۔

اور تیمور نے اس کی اس بچوں جیسی ناراضی پہ مسکراتے ہوئے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

”اچھا آؤ میں بھی کھاتا ہوں۔“ تیمور نے اسے ہلکے سے اپنی طرف کھینچا تھا۔ اور اس کے مان جانے پہ ماورا بھی مسکرائی تھی۔

”لیکن ایک شرط ہے۔“ تیمور نے شرط رکھی۔

”کیا۔۔۔؟“ ماورا نے بے ساختہ پوچھا۔

”آئس کریم کون میں لینی ہے۔۔۔ اور وہ بھی صرف ایک ہی کون۔۔۔ شیر کر کے کھائیں گے۔“ تیمور کی شرط پہ ماورا یکدم ہدک اٹھی تھی۔

”واٹ۔۔۔ آپ مذاق تو نہیں کر رہے۔“ ماورا کو تیمور کی دماغی حالت پہ شک گزرا تھا۔

”اس میں مذاق کی کیا بات ہے؟ اگر ہم آئس کریم کھا سکتے ہیں تو پھر کون میں کیوں نہیں؟“

”لیکن۔۔۔ کون میں تو ہے۔“ ماورا نے بات ادھوری چھوڑ دی۔
 ”تو کیا ہوا۔۔۔ آس کریم بھی تو ہے ہی کھاتے ہیں ناں۔۔۔؟“ تیمور نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے۔
 ”لیکن تیمور۔۔۔!“ وہ جھنجھلائی۔

”اب لیکن ویکن کو چھوڑو۔۔۔ بتاؤ کھاؤ گی یا نہیں؟“ تیمور نے اسے شرارتی نظروں سے دیکھا۔ اور ماورا اس کی نظروں کے مفہوم سے نظر چرا کر پلکیں جھکا گئی تھی۔
 ”کھاؤں گی۔۔۔ لیکن شیر۔“

”پھر لیکن۔۔۔؟“ تیمور نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تیمور۔۔۔“ ماورا پھر جھنجھلائی تھی۔

”لیتے ہیں ناں۔۔۔ لیکن شیر کر کے نہیں۔۔۔“ اب کی بار تیمور نے خود اس کی بات مکمل کر دی تھی اور ماورا اس کی شرارت سمجھ کے مسکرا دی۔

”چلو آؤ۔“ تیمور اس کا ہاتھ پکڑے آس کریم پارک کے اندر آگیا۔ اور پھر سچ مچ اس نے دو کون لی تھیں اور مسکراتے ہوئے باہر نکل آئے تھے۔

”ہم شیر نہیں کر سکتے۔۔۔ لیکن ایک دوسرے کے ساتھ اپنی کون تو چنچ کر سکتے ہیں ہاں؟ تیمور نے شرارت کا ایک نیا پہلو نکالا اور آس کریم کھاتے کھاتے ماورا ایک بار پھر چونک گئی تھی۔
 واٹ۔۔۔؟ مگر کیوں؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

”کیونکہ میرے پاس مینگو فلیور ہے اور تمہارے پاس اسٹرابیری۔۔۔ میں اسٹرابیری فلیور ٹیسٹ کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ تم یہ لے لو۔“ تیمور نے اپنی آدھی کون اس کی طرف برہائی اور ماورا ہکا بکا اس کی شکل دیکھتی رہ گئی۔
 ”یار۔۔۔ اتنا شاک کیوں لگ رہا ہے۔ میں بدلے میں دے تو رہا ہوں۔“ تیمور نے اسے بچوں کی طرح بہلانے کی کوشش کی۔

”پاگل ہو گئے ہیں۔“ ماورا نے اسے گھورا۔
 ”ہاں۔۔۔ اور تم تجسوس ہو گئی ہو۔۔۔ ذرا سی آس کریم نہیں دے سکتیں؟“ تیمور نے جیسے بڑے افسوس کا اظہار کیا تھا جس پر ماورا بے اختیار اٹھنے والی ہنسی نہیں روک سکی تھی۔
 ”یہ لیں۔۔۔ دونوں رکھ لیں۔۔۔“ ماورا نے بڑی سہولت سے اسے اپنی کون بھی تھما دی تھی اور تیمور اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑی کونز دیکھ کر خود ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

”اوہو۔۔۔!“ اتنے میں ایک زوردار سیٹی بجی تھی اور ان دونوں نے یکدم سامنے کی طرف دیکھا تھا جہاں اپنی بانیک۔ بیٹھا ولید ان دونوں کو دیکھ کر ہونٹک کر رہا تھا۔

”تفریح ہو رہی ہے۔۔۔ واہ۔۔۔ کیا بات ہے؟“ ولید نے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے داد دی تھی۔
 ”کیوں جناب ہمیں کوئی حق نہیں تفریح کرنے کا۔۔۔؟“ تیمور نے الٹا اس سے سوال کیا تھا۔
 ”ارے کیوں نہیں۔۔۔ کون کہتا ہے کہ آپ کو حق نہیں ہے۔ آپ کے حق تو پورے شہر ہیں۔۔۔ کون روک سکتا ہے بھلا؟ پابندی تو ہم جیسے غریبوں کے لیے ہوتی ہے جو اپنی بیگم کے ساتھ ایک کپ چائے بھی نہیں پی سکتے۔“

”چھوڑو یار۔۔۔ موڈ خراب مت کرو۔۔۔ بلکہ جوائن کرو ہمیں۔“ تیمور نے اس کی ساری فریاد پر پانی پھیر دیا تھا۔
 ”واہ۔۔۔ جوائن کروں تمہیں؟ وہ بھی اس شرمناک حلیے میں۔“ ولید نے طنزیہ اسے سر تپا دیکھا۔

”کیوں میرے حلیے کو کیا ہوا ہے بھلا؟“ تیمور نے جیسے خود کو سر تپا دیکھنے کی کوشش کی بھی اور ایسی ہی کوشش ماورا نے بھی کی تھی جس پہ ماورا کے ہونٹوں پہ بے ساختہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

”رک! دکھاتا ہوں ابھی۔“ ولید نے جیب سے موبائل نکالا اور اگلے لمحے میں اس کا حلیہ اپنے موبائل میں محفوظ کر لیا تھا۔

”اگر آپ اس کو جوائن کرنا چاہتی ہیں تو کر لیں۔“ ولید نے ماورا کو تیمور کے ساتھ کھڑے ہونے کا سگنل دیا تھا۔

”بس۔۔۔ بس یہی کافی ہیں۔“ ماورا نے ہنسی دباتے ہوئے کہا۔

”کیوں۔۔۔؟“ تیمور نے ماورا کو دیکھا۔

”کیوں کا جواب یہاں ہے۔۔۔“ ولید بایک سے اتر کر قریب آگیا تھا اور اپنا موبائل اس کے سامنے کر دیا تھا۔ جس کو دیکھ کر خود تیمور حق دق رہ گیا تھا اس نے دونوں ہاتھوں میں دو کونز پکڑی ہوئی تھیں اور ان میں سے آئیں کریم پکھل پکھل کر اس کی پتلون اور جوتوں کو رنگین کرتی جا رہی تھی ایک طرف پیلا اور ایک طرف گلابی اور یہی حشر اس کے ہاتھوں کا بھی ہو رہا تھا۔

”اوہ مائی گاڈ۔۔۔!“ تیمور نے یکدم دونوں کونز دور پھینک دی تھیں جن کا بسکٹ اب اس کی ہتھیلیوں سے چپک چکا تھا۔

”ہے ناشرم ناک حلیہ؟“ ولید نے تاسد چاہی۔

”ہو نہ۔۔۔ شرمناک کیوں؟ بچپن میں جی تو کھاتے تھے اور تقریباً یہی حال ہوتا تھا۔“ تیمور شرمندہ ہوئے بغیر اب دائیں بائیں ہاتھ دھونے کے لیے کوئی جگہ تلاش کر رہا تھا۔

”اچھا تو تم ایسے کھاتے تھے؟“ ولید نے اس کی پینٹ اور جوتوں کی طرف دیکھ کر پوچھا جس پہ ماورا مزید ہنسی تھی۔۔۔ اور تیمور اس کی ہنسی دیکھ کر سیراب ہو گیا تھا۔

”یار۔۔۔ میں جیسے بھی کھاتا تھا لیکن میرے آج کے پیسے پورے ہو گئے ہیں پینٹ اور جوتے خراب ہونے کا بھی افسوس نہیں ہے۔“ ماورا اور ولید دونوں ہی اس کی بات کا مفہوم سمجھ گئے تھے۔

”یہ تم کہہ رہے ہونا۔۔۔! ورنہ تمہاری جگہ میں ہوتا تو پینٹ سے داغ ختم کرنے کی فکر میں ہی ہلکان ہو رہا ہوتا۔۔۔ امی سے الگ ڈانٹ پڑتی کہ داغ کہاں سے لگا لیے؟ سارا واشنگ پاؤڈر ختم ہو گیا ہے۔“ ولید نے اپنا الگ رونا رویا تھا۔

ماورا بے تحاشا کھلکھلائی تھی اور تیمور نے اسے گھور کے دیکھا تھا۔

”پورے پورے میرا ہی ہو گئے ہو۔۔۔“

”یار! اب تمہارا رشتہ دار ہو گیا ہوں آخر۔۔۔ کچھ تو عزت سے پیش آؤ۔“ ولید نے سر کھجاتے ہوئے اسے تھوڑی شرم دلائی تھی۔

”عزت سے پیش آتا ہوں۔۔۔ پہلے میں ہاتھ تو دھو لوں۔“ تیمور کہہ کر واپس آئیں کریم پارلر کے اندر چلا گیا تھا اور ماورا ولید کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”عزت آپ کے ساتھ کیسے پیش آتی ہے پہلے یہ تو بتائیں۔۔۔؟“ اب چھیڑنے کی باری ماورا کی تھی اور ولید اس کی بات پر ہنس پڑا تھا۔

”وہ تو کچھ ایکسٹرا عزت سے پیش آتی ہے۔“ اس کا انداز شرارت بھرا تھا۔

”کل آرہی ہے واپس۔۔۔ اطلاع ملی آپ کو!“ ماورا نے مسکرا کے پوچھا۔
 ”آف کورس۔۔۔ اطلاع ملی اب تو ہر کام کی سب سے پہلے اطلاع ملے گی۔“ ولید نے فخریہ انداز میں بتایا۔
 ”وہ کیسے۔۔۔؟“ ماورا نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”بس کچھ دن پہلے تھوڑا رعب اور دبہ ڈالا تھا۔۔۔ اور تب سے اب تک سب ٹھیک چل رہا ہے۔“ اس نے جیسے اپنے کالر کھڑے کیے تھے اور ماورا نے اسے خاصی متاثر کن نظروں سے سرتاپا دیکھا تھا۔
 ”اوہ اچھا۔۔۔ تو یہ بھی ہو چکا ہے۔۔۔ ہماری لڑکی یہ رعب بھی ڈالے جا چکے ہیں۔“

”آپ کی لڑکی نہیں۔۔۔ اپنی بیوی پہ۔“ ولید نے صحیح کی۔

”ہاں یہ بات بھی ٹھیک ہے۔“ ماورا نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اب کہو کیا فرما رہے تھے؟“ تیمور ہاتھ دھو آیا تھا۔

”میں اب اجازت چاہ رہا ہوں۔ مجھے کسی سے ملنا ہے آپ لوگ انجوائے کریں۔“ ولید نے وقت دیکھتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں یا۔۔۔ کچھ دیر تو رکھو۔۔۔ ڈنر کرتے ہیں۔“ تیمور نے اسے روکنا چاہا۔

”نہیں پھر کبھی سہی ابھی ٹائم نہیں ہے۔“ ولید اس سے ہاتھ ملا کر اجازت لیتے ہی رخصت ہو گیا تھا۔

”اب کیا ارادہ ہے۔۔۔؟ ڈنر کہاں ہونا چاہیے؟“ تیمور ماورا کی طرف متوجہ ہوا۔

”گھر پر۔۔۔“ ماورا واقعی سکون سے ڈنر کرنا چاہتی تھی۔

”اوہ۔۔۔ یہ تو سب سے اچھا آئیڈیا ہے۔“ تیمور کو بھی پسند آیا تھا۔

”لیکن ڈنر سے بھی پہلے تم نے گھر جا کے چینیج کرنا ہے تیار ہونا ہے۔ آج تمہیں فل تیاری میں دیکھنے کا موڈ ہو

رہا ہے۔ ایک جی سنوری بیوی کے روپ میں۔۔۔“ تیمور کی فرمائش اس کے لیے مشکل تو تھی مگر ناممکن نہیں۔۔۔
 ماورا سوچ کے رہ گئی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
 www.pdfbooksfree.pk

آف وائٹ فرائڈ میں ملے میک اپ کے ساتھ جی سنوری ماورا خود کو دیکھ کر خود ہی حیران رہ گئی اس نے اپنا ایسا روپ ورنگ کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی ایسا تیار ہوئی تھی۔

”مجھے بھوک لگ رہی ہے ماورا! پلیز ذرا جلدی۔“ تیمور بھوک کے ہاتھوں مجبور کافی عجلت میں اندر داخل ہوا

تھا لیکن ڈریسنگ ٹیبل کی سمت نظر اٹھتے ہی ساری بھوک و پیاس ختم ہو گئی تھی وہ مبہوت سا اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

”میں تیار ہوں چلیے۔۔۔“ ماورا اس کے قدموں اور زبان کی خاموشی نوٹ کر چکی تھی اسی لیے اس خاموشی

کے تسلسل کو اس نے خود ہی توڑنے کی کوشش کی تھی۔

”کہاں۔۔۔؟“ تیمور نے نا سمجھی سے پوچھتے ہوئے اس کی طرف قدم بڑھائے تھے۔

”ڈائننگ روم میں۔۔۔ آپ کو بھوک لگی ہے ناں۔۔۔ اس لیے۔“ اس نے پلکیں جھکالی تھیں کیونکہ وہ اسے بہت وارفتگی سے دیکھ رہا تھا۔

”کس نے کہا کہ مجھے بھوک لگی ہے۔۔۔؟“ تیمور نے قریب آتے ہوئے اسے ساتھ لگالیا۔

”آپ نے۔۔۔“ ماورا نے دونوں ہاتھ اس کے سینے پہ رکھ کر پیچھے دھکیلا۔

”میری بھوک تو ختم ہو گئی۔۔۔“

”پھر پیاس ختم ہوگی۔۔۔ پھر نیند ختم ہوگی۔۔۔ پھر۔۔۔“

”جب تم پاس ہو تو پھر ہر چیز ختم ہی ہوگی ناں؟ تمہارے ہوتے ہوئے کسی اور چیز کی کیا ضرورت؟ بھوک پاس
 نیند سب جانے دو۔۔۔ کیونکہ تم جو ہو۔“
 تیمور کی آواز مدھم مدھم ہو گئی تھی اور اس کی آواز کے ساتھ ماورا کی دھڑکن کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔
 ”لیکن مجھے تو بھوک لگی ہے۔“ ماورا نے اس کی بات ٹالنے کی کوشش کی۔۔۔
 ”فرصت سے میرے پاس بیٹھو۔۔۔ دل سے دل کی باتیں سنو۔۔۔ ایسی فرصتیں بار بار نہیں ملتیں۔“ تیمور دل کی
 گہرائیوں سے ان لمحوں کو محسوس کر رہا تھا۔
 ”زندگی ہو تو سب کچھ مل جاتا ہے۔“ ماورا نے لا پرواہی سے کہا۔
 ”زندگی کب ہے اور کب نہیں؟ یہ تو پتا نہیں چلتا۔ اس لیے اپنے ہر بل کو اپنی مٹھی میں اس طرح قید کر لینا
 چاہیے کہ سب رنگ آپ کے ہاتھوں میں محفوظ ہو جائیں۔“ تیمور نے فلسفہ جھاڑا۔
 ”اچھا تو آپ سب رنگ اپنی مٹھی میں محفوظ کر رہے ہیں۔؟“
 ”بالکل۔۔۔“ تیمور نے اثبات میں سر ہلایا۔
 ”تو پھر یہ بھی محفوظ کر لیں۔“ ماورا نے کہتے ہوئے یکدم اسے پرے دھکیلا اور خود دروازے کی طرف بھاگ گئی
 تھی تیمور اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے سٹپٹا کے رہ گیا تھا اور ماورا کھلکھلاتی ہوئی باہر نکل گئی
 تھی۔
 ”ماورا!“ اس کے پیچھے وہ بھی بھاگا آیا تھا۔

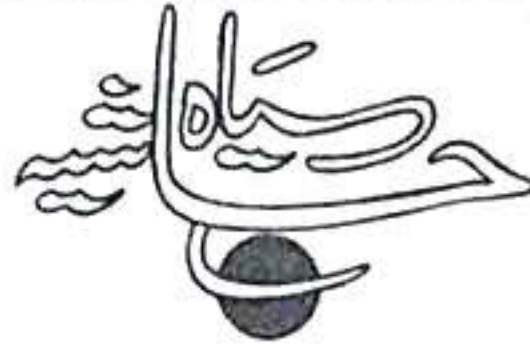


ان کی زندگی کے یہ تین دن بہت خوشگواریت لیے ہوئے گزرے تھے۔
 لیکن صبح ہوتے ہی وہ تمام خوشگواریت کہیں دور جا سوئی تھی۔
 وہ دونوں ابھی اپنے کمرے میں سو رہے تھے جب رضا حیدر کی جھنگھلاہٹ ہوئی آواز ان تک پہنچی تھی۔
 ”تیمور۔ تیمور کہاں ہو۔ نیچے آؤ۔“ رضا حیدر پتا نہیں یہاں تک کسے برواشت کر کے پہنچے تھے۔ اور گھر
 میں داخل ہوتے ہی ان کی برواشت جواب دے گئی تھی۔ تیمور کی آنکھ کھلی اور وہ یکدم بستر سے اٹھ بیٹھا تھا۔ ماورا
 بھی بیدار ہو چکی تھی۔
 ”بابا آگئے۔؟“ تیمور نے اسے دیکھا۔
 ”جی۔!“ وہ نظریں جھکا گئی۔
 ”اچھا۔۔۔ میں دیکھتا ہوں۔“ وہ شرٹ اور سلیپر پہن کر دروازے کی طرف لپکا۔
 ”تیمور۔!“ ماورا نے اسے بے ساختہ پکارا تھا ”نجانے کیوں اس کا دل بری طرح دھڑک اٹھا تھا۔
 ”کیا ہوا؟“ وہ اس کی طرف پلٹا ماورا کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی وہ بے اختیار اس کے قریب آیا۔
 ”ڈونٹ وری! کچھ نہیں ہو گا تم پریشان نہ ہو۔“ تیمور اس کے ماتھے سے اس کے بال پیچھے ہٹا کر اس کا ماتھا چوم
 کر گال تھکتے ہوئے اٹھ کر باہر نکل گیا تھا۔ اور ماورا کو لگا جیسے اس کے سینے سے دل نکل کر باہر آ گیا ہو۔ اس کے
 آنسو بے اختیار بہ نکلے تھے!

(باقی آئندہ ان شاء اللہ)



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
 www.pdfbooksfree.pk



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

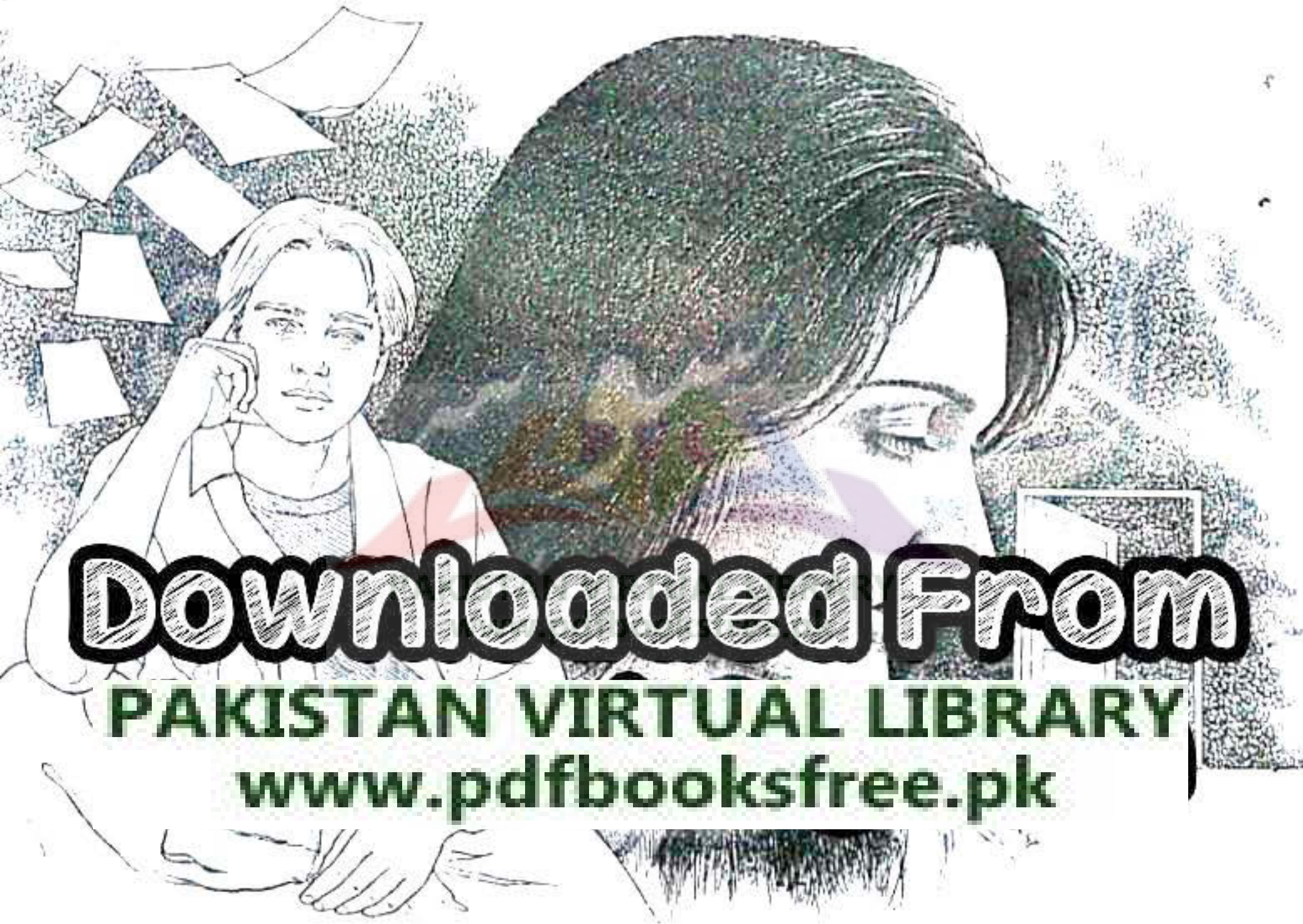
سیاہ حاشیہ پار مت کرو۔ ”پچھتاؤ گی۔ ایک نادیہ آواز روکتی رہی لیکن وہ لڑکی نہ رکی۔ سیاہ حاشیہ عبور کر گئی اور تب اسے احساس ہوا کہ اپنے لیے جہنم خرید چکی ہے۔



عمر نہ کاٹھ کباڑ میں اپنی پرانی ڈائریاں تلاش کر رہی ہے تو اسے ایک کتبہ ملتا ہے۔ جس پر اس کی والدہ صالحہ رفیق کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج ہوتی ہے۔ وہ بری طرح الجھ جاتی ہے۔ اس کی والدہ تو زندہ ہیں پھر یہ کتبہ کس نے اور کیوں بنوایا ہے۔ تب ہی اس کی والدہ صالحہ آجاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ڈائریاں تو انہوں نے ردی والے کو دے دی ہیں۔

عدینہ لو بہت دکھ ہوتا ہے پھر اسے کتبہ یاد آتا ہے تو وہ سوچتی ہے کہ عبد اللہ سے اس کے متعلق پوچھنے کی۔
 عبد اللہ پابند صوم و صلوٰۃ وہ مسجد کا موزن بھی ہے اور اس نے عربی میں ایم فل کر رکھا ہے عدینہ کی اس کے ساتھ منگنی
 ہو چکی ہے۔ عدینہ ہاسٹل میں رہتی ہے اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔
 عدینہ کے والد مولوی رفیق کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اپنی ماں سے زیادہ دادی سے قریب ہے مونا اس کی کزن ہے۔ وہ
 حویلیاں شہر سے قرآن حفظ کرنے ان کے گھر آئی ہے۔

ناؤلیٹ



عدینہ عبد اللہ سے بہت محبت کرتی ہے۔ عبد اللہ بھی اسے چاہتا ہے لیکن شرعی اصولوں کے تحت زندگی گزارنے والی
 صالحہ آپا نے منگنی ہونے کے باوجود انہیں آپس میں بات چیت کی اجازت نہیں دی۔
 شانزے ماڈل بننا چاہتی ہے۔ ریمپ پرواک کرتے ہوئے اس کا پاؤں مڑ جاتا ہے اور وہ گر جاتی ہے۔
 ڈاکٹر بینش نیلی کو بھی میں اپنے بیٹے ارجم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کے شوہر کر نل جاوید کا انتقال ہو چکا ہے۔
 نیلی کو بھی کے دوسرے حصے میں ان کے تایا ڈاکٹر جلال اپنی بیوی اور پوتی اوریدا کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی دوشادی
 شدہ بیٹیاں ہیں اور اکلوتا بیٹا تیمور لندن میں مقیم ہے۔ بیوی کی وفات کے بعد تیمور نے اوریدا کو پاکستان اپنے باپ کے پاس
 بھجوا دیا ہے۔ بیٹا ماہیر ان کے پاس لندن میں ہے۔

اورید اور ارصم کی بہت دوستی ہے جو ڈاکٹر بنیش کو بالکل پسند نہیں۔ ڈاکٹر بنیش تیمور کے نام سے بھی نفرت کرتی ہیں۔
عبد اللہ عدینہ کو اپنا سیل نمبر بھجواتا ہے۔ صالحہ آپادیکھ لیتی ہیں۔ وہ شدید غصہ ہوتی ہیں اور نمبر بھاڑ کر پھینک دیتی ہیں۔
سرب اپنے دوست کے پروڈکشن ہاؤس میں جاتا ہے تو وہاں شانزے کو دیکھتا ہے۔ شانزے اس کی منتیں کر رہی ہے کہ وہ
ایک چانس اسے دے کر دیکھے۔

شانزے سخت مایوسی کا شکار ہے۔ رباب اس کی روم میٹ اسے تسلی دیتی ہے تو وہ بتاتی ہے کہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں
ہے صرف ایک پھوپھی ہیں جن کے گھر میں اسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ اس کی ماں اسے پھینک کر چلی گئی تھی اور باپ کو
کسی مذہبی جنونی نے قتل کر دیا۔ شانزے کا خاندان مسلمان ہے لیکن وہ کسی مذہب کو نہیں مانتی۔ ہاسٹل میں رہنے کے لیے
اس نے کالج میں داخلہ لے رکھا ہے۔ وہ شو بزم میں اپنا نام بنانا چاہتی ہے۔

آپا صالحہ نے عدینہ کی عبد اللہ سے منگنی توڑ دی ہے۔ عبد اللہ عدینہ سے ایک بار بات کرنا چاہتا ہے۔ عدینہ چھت پر جاتی
ہے تو عبد اللہ وہاں آ جاتا ہے۔ آپادیکھ لیتی ہیں۔ وہ عدینہ کو برا بھلا کہتی ہیں اور اللہ کے عذاب سے ڈراتی ہیں۔
اورید ارصم کے ساتھ پیسے دینے جاتی ہے۔ ارصم باہر اس کا انتظار کرتا ہے۔ وہ اورید کو واپس لے کر آتا ہے تو ڈاکٹر
بنیش اسے بہت ڈانٹتی ہیں کیونکہ وہ ان کی گاڑی لے کر جاتا ہے۔ اورید اپنے باپ تیمور کو یہ بات بتاتی ہے تو وہ اس کو نئی
گاڑی خرید کر دے دیتے ہیں، آغا جی کو یہ بات بری لگتی ہے۔

ٹی وی پر ایک مذہبی پروگرام دیکھتے ہوئے صالحہ آپا شدید جذباتی ہو کر رونے لگتی ہیں۔ عدینہ کو اسٹور روم کی صفائی کے
دوران ایک تصویر ملتی ہے جو کسی مرد کی ہے۔

ارصم اورید کو گاڑی چلانا سکھاتا ہے۔ اورید کے امتحان میں کم نمبر آتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتی ہے۔
مونا عدینہ کو بتاتی ہے کہ آپا نے اس کی منگنی اس لیے توڑی کہ وہ چاہتی تھیں کہ عبد اللہ عدینہ سے فوراً شادی کر لے۔
عبد اللہ نے فوراً شادی سے انکار کر دیا تھا۔

عبد اللہ تبلیغی دورے پر جاتا ہے تو اس کا جہاز کریش ہو جاتا ہے۔ اور اس کے مرنے کی خبر آ جاتی ہے۔
عدینہ پر عبد اللہ کی موت کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ وہ اپنی ماں سے بری طرح بدظن ہو جاتی ہے۔
شانزے جب بھی کوئی غلط کام کرنا چاہتی ہے کوئی حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ رباب اسے سمجھاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے غلط
راستوں سے بچانا چاہتا ہے۔
ارسل شانزے کو زخمی ہونے پر تسلی دیتا ہے وہ بتاتا ہے کہ ایڈ میں کام کے لیے اس نے سفارش کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ
شانزے اسے اپنا بھائی سمجھے۔

ارصم بہت اچھے نمبروں سے ایف ایس سی کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر بنیش اس خوشی میں ڈنڈتی ہیں۔
عدینہ فیصلہ سنا دیتی ہے کہ ا۔ س ڈاکٹر نہیں بننا۔ یہ سنتے ہی آپا صالحہ شدید پریشان ہو جاتی ہیں۔

تیرہویں قسط

جلال صاحب نے ناراضی سے اپنی زوجہ محترمہ کی
طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے اپنے پیروں کے ناخنوں کو
گھورنے میں مصروف تھیں۔ اتنا تو انہیں بھی اندازہ
تھا کہ وہ ان سے پوچھے بغیر ایک قدم اٹھا چکی ہیں۔ اب
انہیں جلال صاحب کے رد عمل کا ڈر تھا۔
تیمور کی ترسی ہوئی نگاہیں اپنے بوڑھے باپ پر جمی
ہوئی تھیں جو ان سے چند قدموں کے فاصلے پر کسی بلند
و بالا پہاڑ کی مانند ساکت کھڑے تھے اور ان کے
درمیان صدیوں کا فاصلہ تھا۔ جسے وہ چاہتے ہوئے بھی
اکیلے عبور نہیں کر سکتے تھے۔ سات لوگوں کی موجودگی
میں بھی ایک اعصاب شکن خاموشی ان کے درمیان
آکر ٹھہر گئی۔

سب ہی ایک دوسرے سے نظریں چرائے کھڑے تھے۔

”بڑے ابا کیسے ہیں آپ۔۔۔؟“ ماہیر کی آواز نے اس سناٹے کو توڑا۔ ان لمحات میں ایسی ہمت وہی کر سکتا تھا اور اس نے کی تھی۔ اس کے سوال پر سب ہی کی سوالیہ نگاہیں بڑے ابا کے چہرے کی جانب اٹھیں۔

”ٹھیک ہوں۔۔۔“ ان کا لہجہ سرد، چہرہ سپاٹ اور آنکھوں سے صاف خفگی جھلکی۔

”کہیں جارہے تھے کیا۔“ اس دفعہ سوال کرنے کی ہمت ان کی بیگم نے کی۔

”ہوں۔۔۔“ انہوں نے اپنی شریک سفر کی طرف دیکھے بغیر سر ہلایا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ بڑے عجلت بھرے انداز میں انہوں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اگلے ہی لمحے انجن کی آواز پر سب لوگ بے اختیار ہی ایک طرف ہو گئے۔

”ماہیر، تم لوگ جاؤ میں کسی ملازم سے کہہ کر سامان اندر بھجواتی ہوں۔“ بڑی اماں کے چہرے پر پھیلی بڑی بے ساختہ سی شرمندگی اور مایوسی کے ملے جلے جذبات کسی سے بھی پوشیدہ نہیں رہ سکے۔ وہ بہت زیادہ ضد کر کے تیمور کو پاکستان لائی تھیں اور دل کے کسی کونے میں یہ خوش تمنہی پنپ اٹھی تھی کہ شاید

اتنے سالوں کے بعد بیمار بیٹے کو دیکھ کر سرد جذبات کی برف پگھل جائے لیکن ہوا وہی تھا جس کا ڈران کے دل میں کنڈلی مارے کسی سانپ کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر جلال نے انا اور ضد کا چولا آج بھی مضبوطی سے پہنا ہوا تھا اور اسے کسی صورت اتارنے کو تیار نہیں تھے۔

”ماہیر! اپنے بابا کو اندر لے کر جاؤ۔۔۔“ اتنے سرد استقبال پر بڑی اماں کی آنکھیں نم ہوئیں۔

”اماں! آپ تو اس طرح کہہ رہی ہیں جیسے میں پہلی دفعہ اس گھر میں آیا ہوں۔“ تیمور نے ہلکے پھلکے انداز سے کہا تو وہ پھلکے سے انداز میں مسکرا دیں۔

”ہاں بھئی، یہ عدینہ ہے ناں۔۔۔“ تیمور کے

شفقت بھرے لہجے پر عدینہ نے جھٹ سے انہیں سلام کیا۔

”انکل کیسے ہیں آپ اور بڑی اماں شکر ہے آپ واپس آگئیں اور یہاں مجھے بہت تنگ کر رکھا تھا۔“ عدینہ ہلکے پھلکے انداز میں ماحول میں پھیلے تناؤ کو کم کرنے کی کوشش میں بولی۔ عدینہ کو بڑی اماں کے نقوش بہت جانے پہچانے سے لگ رہے تھے۔

”اچھا، مجھے تو بتا رہی تھی کہ یہ اب سدھر گئی ہے۔“ بڑی اماں نے محبت سے عدینہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر پیار دیا۔

”بڑی اماں ایسا اس صدی میں تو ممکن نہیں، اگلی صدی کی ضمانت میں دے نہیں سکتا۔“ ماہیر اوریدا کو چھیڑتا ہوا سرید کے ساتھ مل کر گاڑی سے سامان نکالنے لگا۔ سرید کی نظریں بار بار بھٹک کر اوریدا کی طرف جا رہی تھیں جو اسے خاصی کمزور اور افسردہ سی لگ رہی تھی۔

”دیکھ لیں بابا! یہ آتے ہی شروع ہو گئے۔“ اوریدا نے منہ بنا کر شکایت لگائی، وہ تیمور کے کندھے سے لٹکی کھڑی تھی۔

”اچھا اچھا اب یہ شکایتیں اندر جا کر کر لیتا، کھڑے کھڑے ٹانگلیں شل ہو گئی ہیں میری۔“ بڑی اماں نے لاپرواہی سے اسے ٹوکا اور اندر کی جانب بڑھ گئیں۔

”یہ تم دونوں کہاں خالی ہاتھ لٹکاتی جا رہی ہو، تھوڑا سامان اٹھاؤ۔“ ماہیر نے ایک دفعہ پھر شرارت کی۔

”تو کس نے کہا تھا سارا لندن خالی کر کے آجائیں۔“ اوریدا نے ناک چڑھا کر بیزاری سے ماہیر کو جواب دیا اور عدینہ کا ہاتھ تھام کر اندر کی جانب چل دی، جب کہ ماہیر اور سرید دونوں مسکراتے ہوئے سامان نکالنے لگے۔



ہاشم اور بختاور کی زندگی شدید قسم کی مشکلات کا شکار ہو چکی تھی۔ معاشی مسائل منہ کھولے ان کی ساری خوشیاں نگٹنے کے لیے تیار تھے۔ دکانوں پر لگنے

والی آگ نے ہاشم کو ایک دن میں آسمان سے زمین تک پہنچا دیا تھا۔ ایک تو غمت اور اوپر سے بیماری نے اسے بے انتہا چڑچڑا کر دیا تھا۔ وہ بات بات پر بختاور سے لڑنے لگتا۔ ان حالات نے بختاور کی ساری دلکشی اور رنگ روپ اجاڑ کر رکھ دیا، اس کی آنکھوں کے گرد حلقے دن بہ دن سیاہ ہوتے جا رہے تھے۔ ان ہی دنوں دوبارہ اماں بننے کی خبر نے ان دونوں کو ہی خوف زدہ کر دیا۔

”مجھے نہیں چاہیے یہ بچہ جس کی طرح سے اس سے جان چھڑاؤ۔“ ہاشم نے سنتے ہی آسمان سر پر اٹھالیا۔

”میں کیسے جان چھڑا سکتی ہوں ہاشم! یہ گناہ ہے۔“ وہ بوکھلا گئی۔

”مجھے کسی گناہ ثواب کا نہیں پتا، میں اسے نہیں پال سکتا۔“ وہ حد درجہ مایوس اور قنوطیت کا شکار تھا۔

”ہم انسان کون ہوتے ہیں کسی کو پالنے والے، وہ رب ہے جو پوری دنیا کو پالتا ہے۔“ بختاور نے بڑے غلط موقع پر اسے نصیحت کی۔

”تو کہو ناں! اپنے رب کو ہمیں چینی، گھی، دال اور گوشت دے کر جائے۔“ وہ ایک دم بھڑک کر بولا۔

”استغفر اللہ۔“ وہ فوراً ”خوف زدہ ہوئی۔“
”یہ ایکٹنگ میرے سامنے مت کیا کرو۔“ اس نے بے زار لہجے میں کہا۔

”ہاشم! کیوں اتنا زیادہ مایوس ہو رہے ہو اللہ بہتر کرے گا۔“ بختاور رو ہانسی ہوئی۔

”میں تمہاری طرح ان خوش فہمیوں کے سہارے زندگی نہیں گزار سکتا۔“ وہ بلند آواز میں چیخا۔

”اس میں خوش فہمی کی کیا بات ہے۔؟“ اسے بھی غصہ آیا۔

”بچھلے آٹھ ہفتوں سے میں اس بیڈ پر پڑا ہوا ہوں، ادھار لے لے کر ہمارا گزارا ہو رہا ہے اور تمہاری شکرگزاری ہی ختم نہیں ہو رہی۔“ وہ متغیر لہجے میں گویا ہوا۔

”ایک بات کہوں، اگر برا نہ مانو تو۔۔۔“ وہ اس کے قریب آن بیٹھی اور اس بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔
”کوئی تبلیغی لیکچر مت دینا پلیز!“ اس نے بھی جواباً انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔

”لیکچر نہیں دے رہی، اصل میں مجھے فائزہ بھابھی نے کہا ہے۔“ وہ ہلکا سا ہنسی۔

”کیا کہا ہے۔؟“ ہاشم نے ناگواری سے اسے دیکھا جو شش و پنج کا شکار ہو رہی تھی۔

”اب بول بھی دو خوا مخواہ کی ایکٹنگ مت کرو۔“ ہاشم کی قوت برداشت آج کل بالکل ختم ہو کر رہ گئی تھی اور اس کے چہرے پر پھیلی ناگواری کو دیکھ کر بختاور نے کھل کر اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا ویسے بھی وہ ان حالات سے خود بھی خاصی دل برداشتہ ہو چکی تھی۔

”اصل میں فائزہ بھابھی کی کسی دوست کا پرائیویٹ اسکول ہے، انہوں نے مجھے آفر کی ہے کہ میں وہاں جاب کر لوں۔“ اس کے منہ سے انتہائی غیر متوقع بات سن کر ہاشم ایک لمحے کو چپ کر گیا، کچھ بھی تھا وہ بختاور پر معاشی ذمے داریوں کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔

”مجھے معلوم تھا، تمہیں یہ بات پسند نہیں آئے گی، لیکن جیسے ہی تمہیں کوئی جاب ملے گی چھوڑ دوں گی اسے۔“ اس نے فوراً ہی اس کی سوچ پڑھ کر اپنی بات میں مزید اضافہ کیا۔

”کہاں پر ہے اسکول۔؟“ ہاشم کے لہجے میں ہلکی سی رضامندی دیکھ کر وہ پرجوش ہوئی۔

”یہیں، دو گلیاں چھوڑ کر۔“ اس نے فوراً جواب دیا۔

”اچھا ٹھیک ہے، لیکن اس سے پہلے اس بچے سے جان چھڑاؤ۔“ ہاشم کی اس بات نے اس کا سارا سکون دور ہم برہم کیا۔

”گھر میں کھانے کے لالے بڑے ہوئے ہیں۔“ میں کسی ڈاکٹر کو دینے کے لیے فیس کہاں سے لاؤں۔؟“ وہ جھنجھلا سی گئی۔

”بے وقوف لڑکی“ یہ ہی بات تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہاں اپنا گزارہ نہیں ہو رہا اور تمہیں آبادی پر مہمانانہ کی پڑی ہوئی ہے۔“ اس کی زبان دن بہ دن تلخ اور دل دکھانے والی بن چکی تھی۔ بخٹاور ایک دم شرمندہ ہوئی جیسے اس جان کو دنیا میں لانے کی وہ اکیلی ذمہ دار ہو۔

”میں ڈاکٹر کو دینے کے لیے پیسوں کی بات کر رہی ہوں۔“ اس نے جتنی ہوئی نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔

”فائزہ بھابھی سے بات کرو، کسی مڈوائف یا لیڈی ہیلتھ ورکر کو غیرہ کے پاس لے جائیں گی تمہیں۔“ اس نے نظریں چرا کر اس دفعہ ذرا دھیسے لہجے میں مشورہ دیا۔

”اچھا، دیکھوں گی۔“ بخٹاور نے اسے ٹالا۔

اگلے ہی ہفتے فائزہ بھابھی کے توسط سے اس کی راسیوٹ اسکول میں جاب شروع ہو گئی تھی۔ تنخواہ اگرچہ کم تھی لیکن کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا، لیکن بخٹاور کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ نوکری آنے والے دنوں میں اس کے لیے اور زیادہ مشکلات کا باعث بن جائے گی۔ ایک تو اس کی اپنی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی اور اوپر سے گھر میں اکیلے رہ رہ کر ہاشم حد درجہ چڑچڑا ہو گیا تھا، وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اس سے لڑنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔ اس دن بھی وہ اسکول سے واپسی پر سبزی منڈی چلی گئی۔ واپسی پر کچھ دیر ہو گئی تھی، اس لیے جیسے ہی اس نے گھر میں قدم رکھا، ہاشم

اس پر برس پڑا۔

”کہاں آوارہ گردیاں کرتی ہوئی آرہی ہو، کچھ اندازہ ہے کہ سارا دن گھر میں پاگلوں کی طرح اکیلا پڑا رہتا ہوں۔“ وہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کے وجود سے دانستہ نظریں چرائے اپنی بھڑاس نکال رہا تھا۔

”گھر میں پکانے کے لیے کچھ نہیں تھا، وہی لینے گئی تھی۔“ بخٹاور نے آہستہ سے کہہ کر شارپ سائیڈ میز پر رکھے۔

”اور یہ گھاس پھونس اور کھیت کھلیاں اٹھا کر لے

آئی ہو تم۔“ وہ طنزیہ نگاہوں سے پالک اور میتھی کی طرف دیکھ رہا تھا، وہ تین چار دن کی سبزی اکٹھی لے آئی تھی۔

”تمہارے لیے گوشت بھی لائی ہوں۔“ اس نے ہاشم کو چپ کروانے کے لیے افسردگی سے کہا۔

”تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے گوشت کا بھوکا ہوں، کبھی اچھا کھانا نہیں کھایا میں نے۔“ وہ ہمیشہ کی طرح اس کی بات میں سے غلط مطلب نکال چکا تھا۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کہا ہاشم، کیوں بات بات پر لڑنے لگتے ہو۔“ وہ روہانسی ہوئی۔

”تم میری کوئی بات نہیں مانتی ہو۔“ وہ ناراضی سے گویا ہوا۔

”مثلاً“ کون سی بات نہیں مانی۔“ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

”تم مڈوائف کے پاس کیوں نہیں گئیں۔“ وہ منہ پھلائے بیٹھا تھا۔

”اس دفعہ صرف پندرہ دن کی تنخواہ ملی ہے، اگلے ماہ چلی جاؤں گی۔“ وہ افسردگی سے گویا ہوئی۔

”میں بتا رہا ہوں تمہیں۔“ وہ انگلی اٹھا کر دھمکی دینے کے انداز میں بولا۔ ”مجھے یہ بچہ ہی نہیں بلکہ

اگلے تین چار سال تک کوئی بچہ نہیں چاہیے، جب تک میں خود امیٹھبلش نہیں ہو جاتا۔“ اس کے ارادوں نے بخٹاور کو خوف زدہ کیا۔

”یہ کیا بات ہوئی بھلا۔“ وہ گھبرا کر اس کے پاس

آن کھڑی ہوئی۔

”میں اپنے بچے کو نکلے نکلے کی چیزوں کے لیے نہیں ترسا سکتا۔“ اس کے پورے وجود میں تلخی رچ بس گئی تھی۔

”حالات ایک جیسے ہمیشہ تھوڑی رہیں گے، انشاء اللہ کوئی نہ کوئی سبب نکل آئے گا۔“ وہ اسے دلاسا دینے کے انداز میں بولی۔

”ایک دفعہ دکانیں سیٹ ہو جائیں تو چلو، کوئی نہ کوئی

تو آسرا ہو جائے۔۔۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں گویا ہوا۔۔۔ اس کا مزاج عجیب سا ہو گیا تھا ایک دم غصے سے چیختے ہوئے فوراً ہی ٹھنڈا پڑ جاتا شاید یہ غصہ ناراضی اور تلخی اس کے وجود کی نہیں حالات کی پیدا کردہ تھی۔ بخٹاور نے تو اس کا یہ روپ یہاں آنے کے بعد ہی دیکھا تھا۔

وہ اپنی زندگی کے بدترین دور سے گزر رہی تھی۔
”اندازاً“ کتنے پیسے درکار ہوں گے۔۔۔“ بخٹاور کچھ سوچ کر اس کے قریب آئی۔

”کافی سارے۔۔۔“ اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔
”کیا تم میری یہ گولڈ کی چین اور کچھ اور چھوٹی موٹی چیزوں کو بیچ کر گزارا کر سکتے ہو۔؟“ اس نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

”اب میں اتنا بھی گھٹیا نہیں ہوا۔۔۔“ اسے کرنٹ لگا۔

”جب وقت اچھا آئے گا تو میں بنوالوں گی ناں۔۔۔“ بخٹاور اس کے بالکل پاس آکر بیٹھ گئی اور نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہاشم کے چہرے پر پھیلا تناؤ تھوڑا کم ہوا۔ بخٹاور کو احساس ہوا ان دونوں کو ایک دوسرے کے پاس بیٹھ کر محبت اور نرمی سے بات کیسے پورا پورا۔۔۔ مہینہ گزر جاتا تھا۔ حالات کی تلخ دھوپ محبت بھری چھاؤں پر حاوی ہو چکی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے لڑتے لڑتے محبت کرنا بھول گئے تھے۔

”بال کتنے بڑے اور رف ہو چکے ہیں۔۔۔“ بخٹاور کو بات کرتے کرتے احساس ہوا تو وہ سرسوں کا تیل اٹھا لائی اور آہستہ آہستہ اس کے سر کا مساج کرنے لگی۔

اب یہ اس کی نرم پوروں میں رچی محبت کا اثر تھا یا ہاشم ذہنی طور پر خود سے لڑتے لڑتے تھک چکا تھا اس کے چہرے پر طمانیت کے رنگ پھلنے لگے۔

”ہاتھ کتنے سخت ہو گئے ہیں تمہارے۔۔۔“ اس نے ایک دم ہی اس کا بازو پکڑ کر اپنے چہرے کے سامنے کیا۔ بخٹاور نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ہاشم کی آنکھوں میں شرمندگی اداسی اور دکھ کے سوا کچھ نہیں

تھا۔

”کیا ہوا۔۔۔؟“ بخٹاور کو عجیب سا احساس ہوا۔۔۔
”وقت بہت ظالم ہے۔۔۔“ وہ کسی تکلیف دہ سوچ کے زیر اثر بولا وہ نا سمجھی کے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

”انسان اتنے وقتوں میں محبت کے جو بڑے بڑے دعوے زعم کے ساتھ کرتا ہے، حالات کی ایک ٹھوکر کے آگے ساری قسمیں، سارے وعدے بھر بھری ریت کی مانند ہاتھوں سے پھسل جاتے ہیں۔ وقت کی بساط پر کوئی نہیں جانتا، کسی مرے کو کس وقت کہاں پر مات ہو جائے۔“ اس نے گہری سانس اندر کو کھینچی۔
”برا وقت خزاں رسیدہ شجر کی مانند سہی لیکن اس پر بھی امید کی کوئلوں کو پھوٹنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ شرط یہ ہے کہ اسے خلوص دل سے پانی دیا جائے۔“

اس نے اپنی انگلیوں سے اس کی کنپٹیوں کو ہلکا ہلکا دبانا شروع کیا تو ہاشم کو ایسے لگا جیسے دنیا بھر کے غم، دکھ اور رنج بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہو رہے ہوں اس پر ایک دل فریب سی غنودگی طاری ہونے لگی اور آج کافی مہینوں کے بعد ایک پرسکون نیند اس کا مقدر بنی تھی۔



آپا صالحہ نے جب سے بل بورڈ پر وہ چہرہ دیکھا تھا ان کا آدھا سکون تباہ ہو چکا تھا۔ وہ آج کل نماز پڑھنے کے بعد اکثر ہی اپنی ساس کے کمرے میں بیوی کے سامنے پائی جاتیں۔ وہ اس لڑکی کو ایک دفعہ پھر غور سے

دیکھنا چاہتی تھیں جسے دیکھ کر ان کے دل کی دھڑکنیں مرتعش ہوئی تھیں۔

”آج کل کوئی نیا ڈراما نہیں آرہا کیا؟“ آپا صالحہ نے اپنی ساس کو دودھ کا گلاس پکڑاتے ہوئے دانستہ لاپرواہی سے پوچھا۔ اتنا تو انہیں بھی پتا تھا کہ وہ ڈراموں کی خاصی شوقین تھیں۔

”کس چینل پر۔۔۔؟“ بے بے نے دودھ کا گلاس پکڑتے ہوئے انہیں تحریر میں مبتلا کیا۔

”آپ کو پتا تو ہے مجھے کہاں شوق ہے ان فلموں ڈراموں کا اور کیا پتا کون کون سے چینلز پر آتی ہیں ایسی چیزیں۔۔۔“ انہوں نے صاف گوئی سے کہا۔

”پھر کیوں پوچھ رہی ہو تم۔۔۔؟“ بے بے کا لہجہ تو عام سا تھا، لیکن وہ گھبرا گئیں۔

”میں تو ایسے ہی بات کر رہی تھی۔“ وہ اٹھ کر خواجواہ ان کے پلنگ پر بچھی چادر کی نادیدہ سلوٹیں دور کرنے لگیں۔

”آج کل دو نئے ڈرامے شروع ہوئے ہیں۔“ بے بے نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”اچھا۔۔۔ کون کون سے۔۔۔؟“ وہ ان کے قریب آکر بیٹھ گئیں، جب کہ بے بے ان کو دونوں ڈراموں کی کہانی سناتے لگیں، جو انہیں بالکل سمجھ میں نہیں آئی، کیونکہ ان کی نظریں ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں جہاں وہ کسی خاص چہرے کی منتظر تھیں، جو اللہ جانے کہاں چھپ گیا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ہی وہ بور ہو کر کھڑی ہو گئیں، عشاء کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔

”اب ڈراما تو پورا دیکھ لو۔۔۔“ بے بے نے انہیں دروازے کی طرف جاتے دیکھ کر ٹوکا۔

”میں نماز پڑھ کر آتی ہوں۔“ وہ جلدی سے کہہ کر کمرے سے نکل گئیں۔ عشاء کی نماز کے بعد وہ اپنی تسبیحات سے فارغ ہو کر بے بے کے کمرے میں آئیں تو ٹی وی چل رہا تھا، جب کہ وہ گہری نیند میں تھیں، یہ ان کی ہمیشہ سے عادت تھی کہ ٹی وی دیکھتے دیکھتے سو جائیں اور پھر رات کے کسی پہر ان کی آنکھ کھلتی تو ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی بند کر کے دوبارہ سو جاتیں۔

صالحہ نے ان کے سرہانے کے پاس رکھا ریموٹ اٹھایا اور جیسے ہی بند کرنے کے لیے ان کی انگلی ریموٹ کنٹرول کی طرف بڑھی انہیں زوردار جھٹکا لگا۔ سامنے ٹی وی پر بسکٹ کے اشتہار میں ہنستا مسکراتا چہرہ وہی تھا جو اس دن انہوں نے بل بورڈ پر دیکھا تھا۔ اس

کے ہونٹوں کے بائیں طرف موجود چھوٹا سا تل اور وہی روشن چمکدار آنکھیں جن کا نقش ان کے دل پر کھدا ہوا تھا۔ وہ بے تاب انداز میں ٹی وی کی جانب بڑھیں، جیسے ہاتھ پرہا کر اسے باہر نکال لیں گی، لیکن چند سیکنڈ کا اشتہار ختم ہو چکا تھا۔ وہ مایوس ہو کر وہیں بیٹھ گئیں اور ٹی وی کی آواز بند کر کے وہ پوری دل جمعی سے اشتہارات دیکھنے لگیں۔ ان کا دل اتنے زوردار طریقے سے دھڑک رہا تھا، جیسے پسلیوں کو توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

”صالحہ پتر! نیند نہیں آرہی کیا۔۔۔؟“ بے بے کی آواز پر وہ بری طرح اچھلیں۔

”آپ جاگ رہیں نہیں کیا؟“

وہ اچھی خاصی شرمندہ ہو گئیں۔

”نہیں۔۔۔ ٹی وی کی آواز بند ہونے سے آنکھ کھلی ہے میری۔۔۔“ وہ معصومیت سے گویا ہوئیں۔

”آپ بھی دنیا کی پہلی اور آخری خاتون ہوں گی، جن کی نیند شور سے نہیں بلکہ خاموشی سے خراب ہوتی ہے۔“ انہوں نے ہلکے پھلکے انداز میں اپنی ساس کو چھیڑا تو وہ مسکرا دیں۔ جب کہ صالحہ کی نگاہیں ابھی تک ٹی وی پر جمی ہوئی تھیں، لیکن بسکٹ کا وہ اشتہار آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ تنگ آکر انہوں نے ٹی وی بند کر دیا اور اپنے کمرے میں چلی آئیں۔ یہ رات بھی گزشتہ راتوں کی طرح انہوں نے کانٹوں پر ہی گزاری تھی۔

”آخر کون تھی وہ لڑکی اور میرا دھیان بار بار ایک ہی طرف کیوں جا رہا ہے۔“ انہوں نے اپنے اندر بڑھتے ہوئے گھٹن کے احساس کو کم کرنے کے لیے کمرے کی کھڑکی کھولی اور لمبے لمبے سانس لینا شروع کر دیے۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے میرا اندازہ غلط ہو۔“ انہوں نے خود کو تسلی دینے کی کوشش کی، لیکن دل ناداں اس بار سنبھلنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

”یا اللہ اسے اپنی حفظ و امان میں رکھنا۔“ انہوں نے ہمیشہ کی طرح اللہ سے رجوع کیا۔ نوافل پڑھنے

کے بعد ان کا ذہن کچھ پرسکون ہوا تو وہ سو گئیں، لیکن دل ہی دل میں وہ تہیہ کر چکی تھیں کہ اس لڑکی کا کھوج لگا کر رہیں گی۔

اگلی صبح مدرسے کی بچیوں سے فراغت پا کر وہ کسی کام سے بے بے کے کمرے میں آئیں تو مونا وہاں بیٹھی چائے پی رہی تھی اور لی وی چل رہا تھا۔
”آپا! آئیں نا بہت زبردست ڈراما شروع ہوا ہے۔“ مونا نے بوکھلا کر انہیں پیش کش کی۔

”کون سا...؟“ انہوں نے خلاف عادت پوچھا تو مونا ایک دم حیران ہوئی۔ جب کہ ان کی نظریں لی وی پر جمی ہوئی تھیں جہاں وہی معصوم چہرہ اپنی آب و تاب کے ساتھ موجود تھا۔

”مونا! اس لڑکی کا نام کیا ہے...؟“ انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

”کس کا...؟“ مونا نے چونک کر ان کی نظروں کے تعاقب میں لی وی اسکرین کی طرف دیکھا۔

”اوہ یہ تو شانزے ابراہیم ہے، پہلا سیریل ہے یہ اس کا...“ مونا کی معلومات قابل رشک تھیں۔ جب کہ دوسری طرف آیا صالحہ جتنی دفعہ اسے دیکھ رہی تھیں اتنی ہی دفعہ ان کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ایک ہی نام رقص کر رہا تھا جسے وہ سنتا نہیں چاہتی تھیں۔



شانزے نے بمشکل رباب کو منایا تھا بس ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے کی کسر رہ گئی تھی۔ رباب نے اگرچہ اپنا بیگ دوبارہ اسے الماری میں رکھ دیا، لیکن اس کے چہرے پر چھائی سنجیدگی کسی صورت بھی کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

”اب اپنا موڈ تو ٹھیک کر لو تم۔“ وہ اس کے لیے کافی بنا کر ٹیبل میں لے آئی۔

”موڈ میرا ٹھیک ہے، میں بس اس وقت سے ایک ہی بات سوچ رہی ہوں۔“ وہ بات کرتے کرتے رکی، شانزے نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کچھ لوگ بہت بد قسمت ہوتے ہیں شانزے، انہیں رشتوں کی قدر اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک وہ انہیں کھونہ دیں۔“

”تم مجھ پر طنز کر رہی ہونا...“ شانزے فوراً بات کی تہ تک پہنچی۔

”نہیں... تمہیں بتا رہی ہوں۔“ رباب نے سادگی سے کہا۔

”فکر مت کرو، میری زندگی میں ویسے ہی گنے چنے لوگ ہیں اور تم واحد دوست ہو میری...“ شانزے نے اطلاع دینے کے انداز میں اسے بتایا۔

”یہ ہی تو سب سے بڑی مصیبت ہے۔“ اس کے برادر نے پر شانزے چونکی۔ ”کیسی مصیبت...؟“

”پتا ہے جن لوگوں کا کوئی دوست نہیں ہوتا ان سے بہت زیادہ ڈر لگتا ہے مجھے...“ وہ صاف گوانداز میں گویا ہوئی۔

”وہ کیوں بھلا...؟“ شانزے کافی پینا بھول کر اس کا سنجیدہ چہرہ غور سے دیکھنے لگی۔

”جن کا کوئی دوست نہیں ہوتا، ان میں کوئی نہ کوئی ایسی ناپسندیدہ بات ہوتی ضرور ہے جو کوئی بھی ان کے قریب جانا پسند نہیں کرتا۔“ رباب کا لہجہ اس کا دل دکھا گیا۔

”تمہارا خیال ہے کہ میرا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔“ شانزے دکھی ہوئی۔

”میں چاہتی ہوں کہ تمہارا شمار ایسے لوگوں میں نہ ہو۔“ رباب کی بات پر اس کے دکھ کی شدت کم ہوئی۔

”پلیز۔۔۔ شانزے! لوگوں کی قدر کیا کرو، اچھے اور مخلص لوگ زندگی میں بار بار نہیں ملتے۔“ رباب کی بات پر وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دی۔

”ہاں... اسی لیے میں اس ویک اینڈ پر پھپھو کے پاس جا رہی ہوں۔“ شانزے کی بات نے اسے حیران کیا۔

”لاہور...؟“ رباب نے تصدیق کے لیے پوچھا۔

کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔



”آج تو یقین ہو گیا مجھے۔“ بڑی اماں نے اپنے بریف کیس سے کپڑے نکالتے ہوئے بوا رحمت کو مخاطب کیا۔ وہ اس وقت اپنا انگلیٹھ سے واپس لایا ہوا سامان ٹھکانے لگانے میں مصروف تھیں۔

”کس بات کا بیگم صاحبہ؟“ بوا رحمت نے ان کے سوٹ کو سلتے سے لٹکاتے ہوئے پوچھا۔

”یہ ہی کہ تمہارے صاحب کے سینے میں دل نہیں کوئی پتھر کی سلیب گڑی ہوئی ہے، تب ہی تو کسی بات کا اثر نہیں ہوتا ان پر۔“ وہ حد درجہ خفا تھیں۔

”لیکن اب تو بہت فرق آچکا ہے ان میں۔“ بوا رحمت نے ان کی بات سے اختلاف کیا جو انہیں بالکل اچھا نہیں لگا۔

”کیسا فرق؟ اتنے سال بعد کوئی دشمن کا بچہ بھی سامنے آجائے تو انسان اس کا حال احوال پوچھ لیتا ہے۔ ادھر تو ہنوز ماتھے کے بل ہی کم ہونے کا نام نہیں لے رہے، الٹا مجھے تو ان میں اضافہ ہی لگ رہا ہے۔“ انہوں نے غصے سے ہاتھ میں پکڑا دوپٹا مسری پر پھینکا۔

”میں تیمور میاں کی نہیں، اورید ایٹی کی بات کر رہی ہوں، اب تو صاحب بہت خیال رکھنے لگے ہیں اس کا۔“ بوا نے گھبرا کر وضاحت دی۔

”تو یہ بھی سوچو نا، اورید اکو پاکستان آئے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا۔ پورے پانچ سال۔“ انہوں نے باقاعدہ انگلیوں پر گن کر بتایا۔

”اچھا۔ آپ ٹینشن نہ لیں، ٹھیک ہو جائیں گے وہ۔“ بوا رحمت الماری میں کپڑے جمانے لگیں۔

”کتنا دل خراب ہوا ہو گا میرے بچے کا۔“ ان کی سوتلی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

”تو تیمور میاں کو کون سا نہیں پتا تھا۔ یاد نہیں، کتنی کھری کھری سنائی تھیں، انہوں نے اسے فون کر کے۔“ بوا رحمت نے ماضی کی ایک تلخ یاد کی

”ہاں میرے تایا کے بیٹے کی شادی ہے اور سب لوگ بلارہے ہیں مجھے۔“ اس نے مسکرا کر بتایا۔

”اس دفعہ جاؤ تو ان سے اپنی والدہ کے بارے میں ضرور پوچھنا۔“ رباب نے جلدی سے کہا۔

”ہاں بات کر کے دیکھوں گی شاید وہ لوگ ان کے بارے میں کچھ جانتے ہوں۔“ اس نے نیم رضامندی کا اظہار کیا۔

”شاید نہیں یقیناً“ وہ ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتے ہوں گے۔“ رباب نے اسے تسلی دی۔

”مجھے اب ماہیر کی بھی ٹینشن ہونے لگی ہے۔“ شانزے نے ہلکا سا جھجک کر کہا تو رباب نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا، وہ ایسی ہی تھی پل میں تولہ اور پل میں ماش۔

”کب آرہا ہے وہ پاکستان؟“ رباب نے اپنی معلومات میں اضافے کے لیے پوچھا۔

”پتا نہیں۔“ وہ واقعی نہیں جانتی تھی۔

”ایسا کرو تم اسے خود فون کر کے بتادو، ایسی باتیں جب تیسرے بندے کے منہ سے پتا چلیں تو زیادہ تکلیف دیتی ہیں۔“ رباب نے اسے خلوص دل سے مشورہ دیا۔

”اب تک تو سرمد بھائی انہیں بتا بھی چکے ہوں گے۔“ شانزے نے منہ بنا کر یاد دہانی کروائی۔

”نہیں۔“ وہ ایسے نہیں ہیں، میرا نہیں خیال کہ انہوں نے کچھ ماہیر کو بتایا ہو گا۔“ رباب نے نے فوراً

ہی سرمد کی حمایت کی۔

”خیر ہے۔ تم آج کل بہت سرمد بھائی کا فیور کرنے لگی ہو۔“ شانزے کے چھیڑنے پر رباب کا چہرہ بلش ہوا۔

”میں تو یونہی ایک جنرل سی بات کر رہی تھی۔“ اس نے گھبرا کر صفائی دی۔

”فکر مت کرو، یہ جنرل سی باتیں ہی بعض دفعہ ”خاص“ بن جاتی ہیں، انسان کو پتا ہی نہیں چلتا،

شانزے شرارت کے موڈ میں تھی۔ رباب نے ہنستے ہوئے اسے ایک جھانپڑ سید کیا۔ اگلے ہی لمحے دونوں

طرف اشارہ کیا۔

”وہ قیامت خیز گھڑیاں کیسے بھول سکتی ہوں میں۔“ انہوں نے ایک سر د آہ بھری۔

”جب وہ وقت گزر گیا تو یہ بھی گزر جائے گا۔ تھوڑا حوصلے سے کام لیں۔“ بوائے انہیں حوصلہ دیا۔

”ویسے طبیعت ٹھیک تھی تمہارے صاحب کی جو بھتیجی کے ہاں فنکشن میں نہیں گئے۔“ انہیں اچانک یاد آیا۔

”یہ معمہ تو میری بھی سمجھ سے باہر ہے تب سے منہ پھلائے گھوم رہی ہے بینش۔“ بوار حمت الماری بند کرتے ہوئے مسکرائیں۔

”لیکن یہ معجزہ ہوا کیسے۔“ بڑی اماں کا موڈ بھی کچھ بہتر ہوا۔

”یہ تو اب بڑے صاحب جانتے ہیں یا بینش بیگم، اوپر سے ارصم نے بھی ادھر آنا بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔“ انہوں نے مزید ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”ہاں تاؤ دن ہو گئے ہمیں آئے ہوئے“ آغا کے علاوہ کسی نے جھانک کر بھی نہیں دیکھا ادھر۔“ انہوں نے بھی منہ بنایا۔

”بینش تو سنا ہے لاہور گئی ہوئی ہے اپنے مہمانوں کو چھوڑنے۔“ بوائے لقمہ دیا۔

”ویسے کچھ زیادہ ہی لمبا عرصہ نہیں رہ گئی اس کی نند یہاں۔“ بڑی اماں کو حیرانی ہوئی۔

”ظاہر ہے بیٹے کی شادی کرنی تھی اور اپنی پرکٹی کبوتری بیٹی کو بھی زبردستی باندھ دیا ارصم کے ساتھ۔“ بوار حمت کو غصہ آیا۔

”ہاں! ارصم والے قہے کا تو مجھے بھی دکھ ہے، یہ زیادتی نہیں کرنی چاہیے تھی بینش کو۔ اس کے نانا بتا رہے تھے بالکل خوش تھیں ہے وہ۔“ بڑی اماں کا یہ جملہ کمرے میں داخل ہوئیں اوریدا اور عدینہ دونوں نے سنا تھا۔

”کون خوش نہیں ہے بڑی اماں؟“ اوریدانے یوں ہی پوچھا۔

”ارصم۔!“ انہوں نے پھر ایک سر د آہ کھینچی۔

”کیوں۔ کیا ہوا ہے اسے۔؟“ اوریدا کا دل بے ربط انداز میں دھڑکا۔

”پوچھ تو تم ایسے رہی ہو جیسے تمہیں کسی بات کی خبر ہی نہ ہو۔؟“ بڑی اماں نے ہلکی سی بے زاری سے اسے ٹوکا۔ عدینہ کو ہنسی آگئی۔

”کیا بات کر رہی ہیں؟ مجھے واقعی کچھ نہیں پتا۔“ وہ جھنجھلا گئی۔

”کیوں ارصم نے تمہیں نہیں بتایا کہ اس کی ماں نے زبردستی اسے اس کی پھپھی کی بیٹی سے باندھ دیا ہے؟“ وہ منہ بنا کر بولیں۔

”اب اتنا بھی بچہ نہیں ہے وہ کہ کوئی بھی انگلی سے پکڑ کر اسے جس مرضی کھونٹے سے باندھ دے۔“ اوریدا کے بولنے سے پہلے ہی بوار حمت نے بے تکلفی سے تبصرہ کیا۔ اوریدا چپ کی چپ رہ گئی۔ عدینہ کو اس پر رحم آیا۔

”تمہیں بینش کی مکاریوں کا اندازہ نہیں ہے بوا، ایسا جال بچھاتی ہے کہ بندہ کہیں پر نہیں مار سکتا۔“ بڑی اماں نے تو لگتا تھا بینش پر پی ایچ ڈی کر رکھا تھا۔

”اماں! آپ چھوڑیں ان باتوں کو۔“ اوریدا کے صبر کا پیمانہ چھلکا۔

”تمہیں کیا ہوا ہے؟ ایسے کیوں منہ بنا رہی ہو؟“ انہوں نے غور سے اس کی شکل دیکھی۔

”یہ عدینہ واپس جا رہی ہے ہاسٹل، آپ اسے منع کریں نا۔“ اوریدا کو یاد آیا کہ وہ بڑی اماں کے پاس کس کام سے آئی تھی۔

”کیوں بھئی لڑکی ہماری آمد کیا اتنی بری لگی ہے کہ تم نے اپنا سامان باندھ لیا۔“ ان کے دو ٹوک انداز پر عدینہ گڑبڑائی۔

”نن نہیں! بڑی اماں ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ ”تو پھر سامان کھولو اپنا، کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔“ بڑی اماں کے لہجے اور انداز میں ایسا کچھ تھا

کہ عدینہ بوکھلا گئی۔ جبکہ اوریدا نے بڑے مزے سے اس کی بوکھلاہٹ سے لطف اٹھایا۔

”وہ تو میں اس لیے کہہ رہی تھی بڑی اماں۔ اب آپ لوگ آجو گئے ہیں۔“ عدینہ کی بات پر بڑی اماں نے پاس رکھا اپنا چشمہ اٹھا کر آنکھوں پر لگایا اور اسے گھور کر دیکھا، وہ مزید گڑبڑا گئی۔

”بیٹا! اگر ہمارا آنا اچھا نہیں لگا تو ہم واپس چلے جاتے ہیں۔“ ان کا انداز ہلکا پھلکا تھا، لیکن عدینہ کو گھبراہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا بڑی اماں۔“ وہ ٹھیک ٹھاک پریشان ہوئی۔

”جو بھی مطلب تھا اپنا سامان کھولو، کچھ دن بعد چلی جانا، ابھی تو میری تم سے ڈھنگ سے ملاقات تک نہیں ہو پائی۔“ اس دفعہ انہوں نے محبت بھرے انداز میں کہا تھا، تب ہی عدینہ کے حلق سے ایک پرسکون سانس خارج ہوئی۔

”میں نے کہا تھا، بڑی اماں جانے نہیں دیں گی، لیکن تم نے خواہ مخواہ کی ضد لگا رکھی تھی۔“ وہ اوریدا کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئی۔

”قسم سے تمہاری بڑی اماں تو بالکل میری آپا کی طرح ڈانٹتی ہیں۔“ عدینہ کو ان کا انداز ابھن میں مبتلا کر رہا تھا۔ کوئی بات تھی ایسی جو اس کی سمجھ سے باہر تھی، وہ جب بھی بڑی اماں کی طرف دیکھتی تو ان کا انداز اسے خاصا مانوس اور آشنا سا محسوس ہوتا۔

”تم اپنی امی کو آپا کیوں کہتی ہو؟“ اوریدا کی حیرانی پر وہ مسکرائی، کیونکہ یہ سوال اکثر ہی اس سے کیا جاتا تھا۔ ”اصل میں امی کے مدرسے کی سناری بچیاں ان کو آپا کہتی تھیں تو میں نے بھی بچپن میں ان کی دیکھا دیکھی انہیں آپا کہنا شروع کر دیا۔“ وہ اوریدا کے ساتھ لان کی طرف نکل آئی تھی۔

”تو انہوں نے کبھی تمہیں ٹوکا نہیں۔؟“ اوریدا حیران ہوئی۔

”شروع شروع میں تو بہت کہتی تھیں، لیکن میری زبان پر امی کا لفظ چڑھتا ہی نہیں تھا، تنگ آکر انہوں

نے مجھے میرے جال پر چھوڑ دیا۔“ عدینہ بڑے مزے سے اسے بتا رہی تھی۔ دونوں جیسے ہی لان میں پہنچیں، اپنے پورشن سے باہر نکلتا ارصم انہیں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

”ہائے ارصم! کیسے ہو؟ گیٹ چلے گئے تمہارے؟“ عدینہ نے اس کی طرف دیکھ کر دوستانہ انداز میں ہاتھ ہلایا۔ وہ ان کے قریب پہنچ گیا۔ اوریدا دانستہ نہلتے ہوئے گل چین کے پودے کے پاس آکر رک گئی۔

وہ ارصم کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ گل چین کے سفید اور سرخی نما پھولوں پر ایک تتلی بیٹھی ہوئی تھی۔ اوریدا کی نگاہیں تتلی پر اور ساعتیں ارصم اور عدینہ کی گفتگو پر تھیں۔

”ہاں۔ گیٹ چلے گئے تھے۔ تم سناؤ، کیا ہو رہا ہے آج کل؟“ وہ بظاہر عدینہ سے بات کر رہا تھا، لیکن اس کی افسردہ نگاہیں اوریدا کی پشت پر جمی ہوئی تھیں جو اس کی جانب رخ موڑے ناراض سے انداز میں کھڑی تھی۔

”کچھ نہیں، بس ایگزام ہونے والے ہیں اور سخت ٹینشن ہو رہی ہے مجھے۔“ عدینہ نے مسکرا کر اطلاع دی۔

”تم جیسی جینٹلس لڑکی کو بھی ٹینشن ہوتی ہے تو باقی لوگوں کا کیا حال ہو گا۔“ اس کا لہجہ اوریدا کو کچھ حتماتا ہوا محسوس ہوا۔

”باقی لوگوں کے گھر میں چار چار ڈاکٹرز موجود ہیں، انہیں ٹینشن لینے کی کیا ضرورت ہے۔“ عدینہ فوراً ہی اس کا اشارہ سمجھی۔

”کسی ایملپ کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔“ ارصم نے کھلے دل سے پیش کش کی۔ ”فی الحال تو بڑے ابا ہی کافی ہیں۔ اس کے بعد دیکھیں گے۔“ اس نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے۔

”عدینہ! میں پیپا کے پاس جا رہی ہوں، تم فارغ ہو کر وہیں آ جانا۔“ اوریدا پٹی اور اپنی بات مکمل کر کے اندر کی جانب بڑھ گئی۔

ساتھ اندر کی طرف چل پڑا۔



”پاپا۔۔۔ آپ کوئی ٹینشن لے رہے ہیں کیا؟“ ماہیر نے تیمور صاحب کا بلڈ پریشر چیک کرتے ہوئے فکر مندی سے پوچھا۔ اتنا تو وہ بھی جانتا تھا کہ وہ اپنے والد کے رویے کی وجہ سے خاصے تناؤ کا شکار تھے۔

”کیوں میاں کیا فشار خون بلند ہو رہا ہے میرا۔۔۔“ وہ مسکرا کر اپنے دونوں بچوں کی پریشان شکلیں دیکھنے لگے۔ اور پتا ان کے ساتھ جڑ کر بیٹھی ہوئی ان کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔

”اے بھی ہوا تو نہیں، لیکن اسی طرح ٹینشن لیتے رہے تو ضرور ہو جائے گا۔“ ماہیر نے ہلکے پھلکے لہجے میں انہیں ڈرایا۔

”جس باپ کی اتنی اچھی۔۔۔ لائق اور فرماں بردار اولاد ہو، وہ بھلا کیوں ٹینشن لے گا۔“ انہوں نے مسکرا کر اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

”اب لائق اور فرماں بردار تو سمجھ میں آتا ہے کہ آپ نے ”میرے“ لیے کہا ہے اس کا مطلب ہے کہ آپ اور پتا سے مطمئن نہیں۔“ ماہیر نے بالکل خاموش بیٹھی اور پتا کو چھیڑا جو اس وقت کچھ افسردہ سی لگ رہی تھی۔ ماہیر کی شرارت پر اس نے گھور کر اپنے بھائی کو دیکھا۔

”میری بیٹی تو بہت بدل گئی ہے ماہیر۔۔۔ تیمور نے بے ساختہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بوسہ لیا تو اور پتا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”آپ کو پتا ہے پاپا۔۔۔ میں آپ کو بہت مس کرتی تھی۔“ وہ جذباتی ہوئی۔

”فار گاڈ سیک اور پتا، یہاں کوئی رونے دھونے والا سین مت کرنا، میرا دلا سا دینے کا کوئی موڈ نہیں۔“ ماہیر نے انگلی اٹھا کر شرارتی انداز میں تنبیہ کی تو اور پتا نے بھی ممکن آنسوؤں کا ایک گولہ زبردستی اپنے اندر دھکیلا۔

”مجھے کیا ضرورت ہے رونے کی۔۔۔ ہونہ۔۔۔“ وہ

”پاپا۔۔۔“ ارصم نے تعجب انگیز نگاہوں سے عدینہ کی طرف دیکھا۔ ”یہ کس کی بات کر رہی تھی؟“

”اپنے فادر کی۔۔۔ اور کے پاپا کہہ سکتی ہے وہ۔۔۔“ اب کے حیران ہونے کی باری عدینہ کی تھی۔

”انکل تیمور۔۔۔“ ارصم کو جھٹکا لگا۔ ”انکل تیمور پاکستان آئے ہوئے ہیں کیا۔۔۔؟“

”کیا مطلب؟ آپ کو نہیں پتا کیا؟“ عدینہ نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ جیسے یقین نہ آیا ہو۔

”نہیں تو۔۔۔ میں تو کچھ دیر پہلے ہی ماما کے ساتھ لاہور سے واپس آیا ہوں، اصل میں میری پھپھو واپس جا رہی تھیں نا۔ ان کی لاہور سے فلائٹ تھی۔“ ارصم نے اس دفعہ ذرا تفصیل سے بتایا۔

”اوہ اچھا۔۔۔“ اسے ساری بات سمجھ میں آگئی۔

”پھر تو آپ کو یہ بھی نہیں پتا ہو گا کہ ماہیر اور بڑی اماں بھی واپس آچکے ہیں۔“ عدینہ نے اسے مزید حیران کیا۔

”نہیں۔۔۔“ اس نے شرمندگی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”کب پہنچے سب لوگ۔۔۔؟“

”پرسوں دوپہر میں۔۔۔ میں بھی حیران تھی کہ آپ ملنے کیوں نہیں آئے۔“ عدینہ مزے سے بولی۔

”انکل تیمور کیسے ہیں اب۔۔۔؟“ ارصم نے جلدی سے پوچھا۔

”یہ سامنے ہی تو ان کا پورشن ہے، آپ جا کر پوچھ لیں، انہیں خوشی ہوگی۔“ عدینہ کے خوش گوار لہجے پر وہ پھلکے سے انداز میں مسکرا دیا۔

”میں، ماما اور آغا جی کو بتا کر آتا ہوں۔“ وہ اس کے ساتھ ہی چل پڑا۔

”اے ارصم بھائی کب بڑے ہوں گے آپ بس کر دیں اب، سارے فیصلے ماما کے پلو کو پکڑ کر ہی کرنے ہوتے ہیں کیا؟“ عدینہ کا طنزیہ انداز اسے کوفت میں مبتلا کر گیا۔ وہ جان گیا تھا کہ وہ کس تناظر میں یہ بات کر رہی ہے۔

”میں تو ویسے ہی کہہ رہا تھا، چلو انکل۔۔۔ تیمور سے مل کر آتے ہیں۔“ وہ شرمندگی سے سر جھکا کر اس کے

اچھی خاصی چڑ گئی تھی۔

محبت بھرے انداز میں اس نوجوان لڑکے کو دیکھا، وہ بالکل اپنے باپ کی طرح تھا۔ طیبہ نے بینش کی شادی کی تصویریں انہیں ای میل کی تھیں۔

”پاپا۔۔۔ میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے؟“ ماہیر نے اپنا۔۔۔ سوال پھر دہرایا۔

”بھئی میں کیوں سنیں ہوں گا بھلا۔۔۔؟“ تیمور صاحب نے انہیں اس سے سوال پوچھا۔

”وہ۔۔۔“ وہ تھوڑا سا اٹکا۔ ”بڑے ابا جو آپ سے بات نہیں کر رہے اس لیے پوچھ رہا ہوں۔“

”بھئی کر لیں گے“ ابھی مجھے آئے ہوئے ٹائم ہی کتنا ہوا ہے۔“ انہوں نے مسکرا کر اسے دلا سا دیا۔

”بڑے ابا کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔“ اوریدانے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”وہ خفا ہیں مجھ سے اور سچ پوچھو تو یہ ناراضی ان کا حق بنتی ہے۔“ وہ اداس ہوئے۔

”بچوں سے غلطیاں تو ہو ہی جاتی ہیں۔“ اوریدانے نے جھٹ۔۔۔ کہا۔

”کچھ غلطیاں ناقابل معافی ہوتی ہیں۔ انسان چاہے بھی تو اپنا ظرف بڑا نہیں کر سکتا۔“ وہ لاشعوری طور پر اپنے باپ کی حمایت کر رہے تھے۔ اسی دوران کھلے دروازے سے عدینہ اور ارصم داخل ہوئے۔ تیمور نے خوش گوار حیرت سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

”السلام علیکم انکل! کیسے ہیں آپ۔۔۔؟“ ارصم بڑے پرجوش انداز میں ان کی طرف بڑھا، اوریدانے سہارا دے کر تیمور کو بیٹھنے میں مدد دی۔

”آپ ڈاکٹر ارصم ہیں نا؟“ تیمور نے مسکرا کر بالکل درست انداز لگایا۔ اوریدانے مختلف فنکشنز کی تصویریں اکثر انہیں والٹس اپ کرتی رہتی تھیں اور ایک دو دفعہ ان کی ارصم سے فون پر بھی بات ہوئی تھی، لیکن اس طرح رو برو ملاقات کا یہ پہلا موقع تھا۔

ارصم کو پہلی نظر میں تیمور انکل کی شخصیت بڑی متاثر کن لگی تھی۔ وہ بے تکلفانہ انداز میں اس کا حال احوال پوچھ رہے تھے۔

”اوریدانے اکثر ذکر سنا تھا تمہارا۔۔۔“ تیمور کی بات پر اوریدانے بے چینی سے پہلو بدلا اور ارصم کے چہرے پر ایک پھینکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ تیمور نے

”وہ ٹھیک ہیں“ انہیں شاید آپ کی آمد کا علم نہیں ہے۔“ ارصم نے کچھ جھجک کر جواب دیا۔

”ایسی کوئی بات نہیں بر خوردار وہ مجھ سے مل کر گئے ہیں کل۔۔۔“ تیمور نے اسے حیران کیا۔

”اچھا۔۔۔“ ارصم نے تعجب سے ان کی جانب ایسے دیکھا جیسے اس بات کا یقین نہ آیا ہو۔

”اور سناؤ ارصم، تمہاری نالائق اسٹوڈنٹ کی اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں۔“ ماہیر نے بھی مسکرا کر گفتگو میں حصہ لیا۔

”آپ شاید اوریدانے کی بات کر رہے ہیں۔“ وہ ہلکا سا جھجک کر بولا۔

”کیا کوئی اور بھی نالائق کزن آگئی ہے تمہاری اس گھر میں۔۔۔؟“ ماہیر نے اس دفعہ ذرا غور سے اس کا الجھن بھرا چہرہ دیکھا۔ وہ اسے کچھ پریشان لگا تھا۔ جیسے اس موضوع پر بات کرنا نہ چاہ رہا ہو۔

”میں بڑے ابا سے پڑھتی ہوں اب۔۔۔“ اوریدانے سنجیدگی سے بولتی ہوئی ماہیر اور تیمور کو خوش گوار حیرت میں مبتلا کر گئی۔

”بڑے ابا سے۔۔۔؟“ ماہیر کو یقین نہیں آیا۔

”یقین نہیں آتا تو عدینہ سے پوچھ لیں، یہ بھی تو بڑے ابا کی بڑی چیمٹی اسٹوڈنٹ ہے۔“ اوریدانے فوراً ہی خاموش بیٹھی عدینہ کو معاملے میں گھسیٹا۔

”عدینہ کو تو خیر کسی ٹیوٹر کی ضرورت ہی نہیں، اس سے پتا چل گیا کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔“ ماہیر جب سے آیا تھا اسے مسلسل تنگ کر رہا تھا۔

”پاپا دیکھ لیں انہیں۔۔۔“ اوریدانے مصنوعی ناراضی سے بولی۔

”اے تو میں دیکھتا ہی رہتا ہوں بیٹا، ابھی آپ جا کر میرے اور ارصم کے لیے اچھی سی چائے بنا کر لائیں۔“ تیمور نے محبت سے اسے اٹھایا۔

بھول گئے آپ لوگ۔۔۔“ وہ متفر لہجے میں انہیں یاد دلا رہی تھیں۔

”شادی ہی تو کی تھی نا اس نے؟ ایسا کون سا غلط کام کر لیا۔“ آغا جی کا ساہلہ لہجہ ان کے دل میں آگ لگا گیا۔

”بہت افسوس کی بات ہے آغا جی، اگر آپ کے نزدیک یہ ایک معمولی بات ہے۔ اس ایک بات نے میری ساری زندگی کا سکون غارت کر دیا، کیا کمی تھی آپ کی بیٹی میں۔ بولیں، جواب دیں۔“ وہ آج پہلی دفعہ اس موضوع پر ان کے روبرو آئی تھیں۔

”بات کمی کی نہیں بیٹا۔“ انہوں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”تو پھر کس چیز کی ہے؟“ بینش نے فوراً ان کی بات کو کاٹا۔

”یہ تو قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں، تمہاری قسمت میں جاوید کا ساتھ تھا تو کوئی اور شخص کیسے آسکتا تھا تمہاری زندگی میں۔“ انہوں نے سنجیدگی سے اس کا سخت ناراض چہرہ دیکھا۔

”اس دو ٹوٹے کی لڑکی کی خاطر۔۔۔ اس نے ایک بڑھی لکھی، قابل ڈاکٹر کو ٹھکرا دیا، یہ قسمت کا فیصلہ نہیں، آپ کی اور میری بے وقوفی تھی، جو اس منشی کی تھرڈ کلاس بیٹی کو اپنے گھر میں لے آئے منہ اٹھا کر۔“ وہ غصے سے اب باقاعدہ ٹھکنے لگیں۔

”وہ مرچھکی ہے بینش۔“ آغا جی نے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی۔

”تو۔۔۔“ وہ خفگی سے بھرپور نظروں سے انہیں دیکھنے لگیں۔

”مرے ہوئے انسان کے لیے ایسے لفظوں کا استعمال مت کرو۔“ انہوں نے نرمی سے ٹوکا۔

”وہ تو مر کر جان چھڑا گئی اس دنیا سے، آپ مجھے بتائیں، میں کیا کروں؟ میں تو روز جیتی ہوں اور روز مری ہوں، اپنی توہین کا احساس مجھے ہر وقت چر کے لگاتا ہے۔ آخر کیوں کیا تیمور نے میرے ساتھ ایسا۔؟“ وہ ایک دم چیخیں۔

”تیمور کی زندگی میں اسی نے آنا تھا۔ تم اپنے آپ

”ارصم چائے نہیں بلیک کافی پیتا ہے۔“ اورید کی زبان پھسلی اور وہ بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔ عدینہ اور اارصم نے چونک کر اس کا خفت زدہ چہرہ دیکھا۔ وہ جلدی جلدی اپنی چپل پہن رہی تھی جیسے اڑ کر اس کمرے سے نکل جانا چاہتی ہو۔ جبکہ اارصم ان سے بے نیاز ٹکنکی باندھے اسے دیکھے جا رہا تھا جیسے اسے یقین نہ آیا ہو کہ یہ جملہ اورید کے منہ سے نکلا ہے۔



”تیمور، پاکستان آگیا ہے؟“ حیرت، غصے اور صدمے کی زیادتی سے بینش کا منہ کھلا اور بند ہونا بھول گیا۔

”ہاں۔۔۔“ آغا جی نے نظریں چرا کر اپنی بات کی تصدیق کی۔

”واٹ۔۔۔؟“ ناگواری کی ایک تیز لہر ان کے پورے وجود میں بجلی کی طرح دوڑی، ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی لاوا ایک دم ہی ان کے وجود کے اندر پھوٹا ہو۔ انہوں نے اس طرح آغا جی کی طرف دیکھا جیسے ابھی تک ان کی بات کا یقین نہ آ رہا ہو۔

”اس میں اتنی حیرانی والی کیا بات ہے؟“ آغا جی کی گود میں ایک ہیلتھ جرنل کھلا پڑا تھا۔ وہ ہاتھ میں چائے کا کپ لیے بالکل عام سے انداز میں اپنی بیٹی کی طرف دیکھ رہے تھے جس کا چہرہ دھواں دھواں اور آنکھوں میں تنفر کے۔۔۔ بد نما رنگ ایک دم ہی ابھرے تھے۔

”نیا ابا نے اسے گھسنے بھی کیسے دیا گھر میں۔؟“ انہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے کپ کو باقاعدہ میز پر پٹنا تھا۔ تھوڑی سی چائے چھلک کر میز کے سیاہ شیٹ پر پھیل گئی۔ آغا جی نے ناگواری سے ان کی اس حرکت کو دیکھا۔

”یہ گھر تیمور کے نام ہے، یہاں آنے سے کون روک سکتا ہے اسے۔“ آغا جی کی بات پر بینش نے خود کو بمشکل بھرنے سے روکا۔

”کتنی گھٹیا حرکت کر کے گیا تھا وہ یہاں سے؟ کیا یہ

”ممی! آپ ایسے کیوں بات کر رہی ہیں، میں نے کیا کیا ہے؟“ اس نے خلاف توقع احتجاج کیا۔
”کیا ضرورت تھی ان کی طرف جانے کی؟“ وہ تلخ لہجے میں بولیں۔

”کیوں نہیں جانا چاہیے تھا آخر؟ مجھے بھی تو پتا چلے۔“ اس کے ضبط کا پیمانہ بھی چھلکا۔

”اب تم مجھ سے سوال جواب کرو گے؟“ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئیں۔ اس سے پہلے کہ ارصم ان کی بات کا جواب دیتا، آغا جی نے فوراً ”بات بدلنے کی کوشش کی۔“ ارصم بیٹا آپ نے ہاسٹل نہیں جانا کیا، بہت ہرج ہو گیا ہے اسٹڈیز کا۔“
”کیس نہیں جانا اس نے، اسی گھر میں رہے گا۔“
”بینش کے اعصاب بری طرح چٹختے۔“

”اگر آپ اسی طرح کہیں کا غصہ کہیں اور نکالتی رہیں تو میں یہ گھر ہی کیا شہر بھی چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“
ارصم بھی بھڑک کر بولا۔ وہ تو ویسے ہی پچھلے کچھ دنوں سے شدید ذہنی اذیت سے دوچار تھا اور اوپر سے بینش کی گئی زبردستی کی منگنی کا غم بھی ابھی تازہ تھا۔
”آپ نے دیکھا آغا جان، یہ کیسے دھمکیاں دے رہا ہے مجھے؟“ انہوں نے شکایتی نگاہوں سے آغا جی کی طرف دیکھا۔

”تم بھی تو ہر معاملے میں اسے خواہ مخواہ گھسیٹ لیتی ہو۔“ آغا جی کا اپنا بھی مزاج آج برہم تھا۔

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔! اس گھر میں ایک میں ہی فساد کی جڑ ہوں، باقی سب تو دودھ کے دھلے ہوئے ہیں۔“ وہ اندرونی خلفشار کے تحت ناراضی سے گویا ہوئیں اور پاؤں پیختے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔ ارصم نے شکایتی نظروں سے آغا جی کی طرف دیکھا۔

”تم نے ضروری بی سی لندن کی طرح آگرنوز بریک کرنا تھی۔“ آغا جی نے ارصم کی کلاس لی جو منہ بنائے کھڑا تھا۔

”تو مجھے کون سا پتا تھا وہ پرانے کھاتے کھول کر بیٹھی ہوئی ہیں۔“ ارصم نے بے زاری سے جواب دیتے ہوئے ارسلہ کی کال دوسری دفعہ کالی۔ وہ پچھلے دس

کو یہ بات سمجھا کیوں نہیں لیتی ہو۔“ آغا جی کو اپنی بیٹی پر ترس آیا۔ وہ اپنی لگائی ہوئی خود ساختہ حسد کی آگ میں بہت سالوں سے جل رہی تھیں۔ ارصم نے اندر داخل ہوتے ہوئے آغا جی کا یہ جملہ سنا تو ٹھنک کر اپنی جگہ کھڑا رہ گیا، وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بینش کی نفرت کے پیچھے چھپی اصل وجہ یہ ہوگی۔

”نہیں نکال سکتی میں آغا جی! آپ یہ بات مت کہا کریں مجھے۔“ وہ اس قدر زور سے چلا میں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ارصم کو کمرے میں داخل ہونا پڑا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ گھر کے ملازموں تک اس چیخ و پکار کے پیچھے چھپی ہوئی ”اصل“ وجہ پہنچے۔

”ماما! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔۔۔ کیوں ایسے چلا رہی ہیں آپ؟“ ارصم ایک دم ان کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ بینش کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ کچھ بھی تھا وہ اپنے ماضی کا یہ قصہ اپنی جوان اولاد کے سامنے نہیں کھول سکتی تھیں۔

”کچھ نہیں ہوا؟ تم کہاں گئے تھے؟“ وہ تھوڑا سا رخ موڑ کر اپنے آنسو صاف کرنے لگیں۔

”بڑے ابا کی طرف۔“ وہ لاپرواہی سے بولتا ہوا آغا جی کی طرف متوجہ ہوا۔ ”آغا جی! آپ بڑی اماں اور انکل تیمور سے مل کر بھی آگئے اور بتایا تک نہیں۔“
ارصم کی بات پر بینش نے تڑپ کر اپنے باپ کی طرف دیکھا جو نظریں چرائے بیٹھے تھے۔

”کیوں۔۔۔ تم نے کیا کرنا تھا؟“ وہ آہستہ سے گویا ہوئے۔

”میں اور ممی بھی مل آتے، وہ لوگ پرسوں سے آئے ہوئے ہیں۔“ ارصم نے روانی میں بینش کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”کیوں۔۔۔؟ میں نے کیا اکیس توپوں کی سلامی دینی تھی انہیں یا ریڈ کارپٹ استقبال کرنا تھا۔“ وہ بولی نہیں پھنکاری تھیں۔ ”اور تم کس خوشی میں انہیں سلامیاں دینے پہنچ گئے تھے؟“ ارصم ہکا بکا انداز میں انہیں دیکھنے لگا، جو اکثر ہی اس کے ساتھ زیادتی کر جاتی تھیں۔

کنپٹیوں کو سہارا دے تھے۔ بینش کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔ آج کی رات ابھی انہیں اکیلے ہی کڑھنا تھا۔



”اوریدا! تم نے نوٹ کیا ارصم کچھ ڈسٹرب سا تھا۔“ وہ اور عدینہ دونوں میڈیکل کی بھاری بھر کم کتابوں میں سر دیے بیٹھی تھیں۔ جب کہ اوریدا کی نگاہیں کتاب پر اور دھیان کہیں اور تھا۔ عدینہ نے کئی دفعہ اس کی بے توجہی کو محسوس کیا اور پھر بولے بغیر نہ رہ سکی۔

”پتا نہیں۔۔۔“ وہ صاف مکر گئی۔

”اب تم کم از کم میرے سامنے تو جھوٹ نہ بولو۔“ عدینہ کو غصہ آیا۔

”ٹرسٹ می میں نے اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔“ اس نے جھٹ سے صفائی دی۔

”جن سے محبت ہو، انہیں دل کی آنکھ سے دیکھا جاتا ہے اور اس کے لیے ظاہری بینائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔“ عدینہ نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”مجھے اس سے محبت ہے“ نہیں ”تھی۔“ اوریدانے فوراً تھجج کی۔

”محبت کوئی نزلہ، زکام یا بخار تو نہیں، کبھی ہے اور کبھی نہیں۔“ اس نے برا سامنہ بنا کر مزید اضافہ کیا۔ ”تم اتنا زیادہ کونشنس کیوں ہو جاتی ہو میرے سامنے۔؟“

”میں سچ کہہ رہی ہوں، ارصم کے لیے میرے دل میں اب کوئی گنجائش نہیں۔“ اوریدانے اس سے زیادہ خود کو یقین دلایا تھا۔

”زبان سے کہہ دینے سے دل اتنی جلدی مان جائے تو پیچھے رہ ہی کیا جاتا ہے۔“ عدینہ کو پتا تھا وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

”تو تم کیوں پھر عبداللہ بھائی کے ساتھ ایسا کر رہی ہو؟“ اوریدانے بھی اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

”اس نے تو مجھے اس بات کی سزا دی، جس میں میرا

منٹ سے بار بار اسے فون کر رہی تھی، جب کہ وہ اس موقع پر اس سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔“ ”تمہیں ابھی تک اپنی ماں کے مزاج کا نہیں پتا چل سکا۔“ انہوں نے سنجیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ان کا پتا تھوڑی چلتا ہے۔ کبھی دھوپ، کبھی چھاؤں۔“ اس نے بے زاری سے سائیڈ میز پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی ڈالا اور پینے لگا۔ اس کا بلند ہوتا ہوا فشار خون آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگا تھا۔

”بہر حال خیال رکھا کرو اپنی ماں کا۔“ آغا جی نے اسے نرم لہجے میں نصیحت کی۔

”اب آپ ہی بتادیں اور کتنا رکھوں؟ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی سے تو دست بردار ہو گیا ان کے کہنے پر اب پیچھے رہ ہی کیا جاتا ہے۔“ وہ جھنجھلا گیا۔ کمرے میں دوبارہ داخل ہوتی بینش کو ارصم کی بات سن کر دھچکا سا لگا، وہ سیل فون ہاتھ میں لیے آرہی تھیں، دوسری طرف ارسلہ بھی جس نے ارصم کے بار بار کال کالنے پر تنگ آکر بینش کے نمبر پر فون کر دیا تھا۔

”ارسلہ کی کال ہے، وہ تم سے بات کرنا چاہ رہی ہے۔“ بینش نے خفگی سے کہتے ہوئے اپنا سیل فون اس کی جانب بڑھایا۔ اس نے بے زاری سے فون پکڑ کر کان سے لگایا اور ارسلہ کے بولنے سے پہلے ہی شروع ہو گیا۔

”میں تمہیں رات میں خود کال کر لوں گا۔ ابھی تھوڑا بڑی ہوں۔“ اس نے سرد لہجے میں کہہ کر فون بند کر دیا۔ بینش ہکا بکا سی رہ گئیں۔

”تم سے بات کرنا چاہ رہی تھی وہ۔“ انہوں نے جھنجھلا کر اپنے بیٹے کا بے زار چہرہ دیکھا۔

”سوری۔ میں اتنے خراب موڈ کے ساتھ کسی سے بات نہیں کر سکتا۔“ وہ ناراضی سے کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

”آپ نے دیکھے اس کے تیور۔“ بینش نے چڑ کر اپنے باپ کی طرف دیکھا، جواگلیوں کی پوروں سے اپنی

کوئی قصور ہی نہیں تھا۔ ”عدینہ افسردہ ہوئی۔

”تو میرا کیا قصور تھا؟ میں نے ایک جائز رشتے کو ناپسندیدہ طریقے سے اپنانے سے انکار ہی تو کیا تھا۔“

اوریدا کی آنکھیں نم ہوئیں۔
”کبھی کبھی میں سوچتی ہوں اوریدا، محبت کے معاملے میں ہم لڑکیاں کتنی بے بس ہوتی ہیں۔“ اس نے گود میں رکھی کتاب بند کر کے کشن قالین پر رکھا اور مسہری سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔

”وہ کیسے؟“ اوریدا کو اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

”دیکھو نا محبت کے سفر میں اگر کوئی لڑکی اپنے گھر والوں سے بغاوت کر کے محبوب کی انگلی تھام لے تو دنیا والوں کی انگلیاں اس پر اٹھ جاتی ہیں اور جب وہ اپنے خاندان اور ماں باپ کی عزت کا بھرم رکھ لے تو تب بھی بے وفائی کا طوق اس کے گلے میں پہنا دیا جاتا ہے۔“ عدینہ مزید تلخ ہوئی۔ ”اس لیے بتاؤ لڑکیاں بے چاریاں کریں تو کیا کریں آخر؟“

”انہیں چاہیے کہ وہ اپنے شرعی رشتوں کو غیر شرعی طریقوں سے مت ڈھونڈیں، اللہ نے کسی نہ کسی کا ساتھ تو لکھا ہی ہوتا ہے قسمت میں۔“ اوریدا نے اپنے دل کو جب سے سمجھا لیا تھا تب سے کچھ پرسکون تھی۔

”کچھ بھی ہے ارصم کو تمہارے لیے اسٹینڈ لینا چاہیے تھا۔“ عدینہ کی سوئی ابھی تک وہیں انگلی ہوئی تھی۔

”کیا فائدہ۔ مجھ جیسی لڑکیاں تو اسے ہزاروں مل سکتی ہیں، لیکن ماں کا رشتہ تو نہیں۔“ اوریدا نے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا۔

”ہاں یہ تو ٹھیک کہتی ہو تم، ماں کے رشتے کا تو کوئی بھی نعم البدل نہیں ہوتا۔“ عدینہ خلاف توقع فوراً ہی متفق ہوئی۔ ”تمہاری ماما کیسی تھیں اوریدا۔؟“

”میری ماما۔“ اوریدا کی آنکھوں میں ایک ساتھ کئی جگنو جم گئے۔

”تم بیٹھو، میں تمہیں ان کی تصویریں دکھاتی

ہوں۔“ اوریدا جلدی سے اپنی الماری سے ایک پرانا اور بوسیدہ سا البم اٹھا لائی۔

”ہاں ہاں دکھاؤ۔“ عدینہ پرجوش انداز میں اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔

”ارے یہ انکل تیمور ہیں۔“ عدینہ پہلی تصویر دیکھ کر ہنسی، اس تصویر میں تیمور کی عمر کوئی چودہ پندرہ سال تھی اور وہ کسی درخت سے شرارتی انداز میں لٹکا ہوا تھا۔

”بابا۔۔۔ بہت جلدی تھے، طیبہ پھپھو اکثر ان کی شرارتوں کے قصے سناتی ہیں۔“ اوریدا نے مسکرا کر بتایا۔

”یہ دیکھو طیبہ پھپھو کی سالگرہ کی تصویر۔“ اوریدا نے ایک تصویر پر انگلی رکھی۔ جہاں ایک سات آٹھ سالہ لڑکی ہنستے ہوئے اپنی سالگرہ کا کیک کاٹ رہی تھی۔

”بہت مزے کی تصویریں ہیں۔“ عدینہ بڑے شوق سے پورا البم دیکھ رہی تھی۔

”اور یہ میری ڈیزی پھپھو۔“ اوریدا کے پرجوش انداز پر وہ ایک تصویر پر جھکی اور ساتھ ہی اسے زوردار کرٹ لگا۔ اس نے خوف زدہ انداز سے دوبارہ اس تصویر کو دیکھا اور پھر سراٹھا کر اوریدا کا چہرہ غور سے دیکھنے لگی۔ پھپھی، بیٹیجی کے نقوش میں مماثلت کوئی ایسی انوکھی بات بھی نہیں تھی۔

”یہ تمہاری ڈیزی پھپھو ہیں؟“ اس نے بے قابو ہوتی دھڑکنوں پر بمشکل قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ بہت سبک اتاج میں ان کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔“ اوریدا کی بات نے اس کا رہاسا سکون بھی برباد کر دیا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے اس کی ڈیزی پھپھو کی تصویریں دیکھے جارہی تھی۔ اب تو اس میں ذرہ برابر بھی شبہ کی بات نہیں رہی تھی۔ عدینہ کے دل و دماغ میں ایک حشر پھا ہو گیا۔

”تمہیں کیا ہوا؟“ اوریدا کو ایک دم ہی اس کی خاموشی کچھ پراسرار سی لگی۔

”کک کچھ نہیں۔“ وہ ہٹلائی۔

”تمہیں یقین ہے کہ تمہاری پھپھو کی ڈھتھ ہو چکی ہے؟“ وہ محتاط انداز میں گویا ہوئی۔

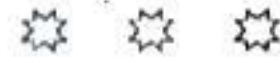
”ہاں نا۔۔۔ ہر سال ان کی برسی پر بڑی اماں باقاعدہ ختم دلواتی ہیں۔“ وہ لاپرواہی سے کہتے ہوئے چونکی۔

”لیکن تم یہ بات کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”اے ہی، مجھے یوں لگا جیسے ان خاتون کو میں نے کہیں دیکھا ہے۔“ اس نے جلدی سے بات بنائی۔

”ارے نہیں۔۔۔؟“ اور یہاں ہی۔۔۔ ”تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

جبکہ عدینہ چاہتے ہوئے بھی اسے یہ نہیں بتا سکی کہ آج ہی تو کئی سالوں کی غلط فہمی دور ہوئی ہے۔ ایک دم ہی اس کا دل باقی تصویروں سے اچاٹ ہو گیا اور وہ اب بے دلی سے بس اور یاد کی باتوں پر ہوں ہاں میں سر ہلا رہی تھی۔ جبکہ اس کا ذہن دور کہیں کسی اور گتھی کو سلجھانے میں لگا ہوا تھا۔



بخاور اس دن معمول سے زیادہ تھک گئی تھی۔ بجلی اور گیس کے بل ادا کرنے کی آخری تاریخ بھی اور اسے کافی دیر لائن میں لگ کر بل جمع کروانے پڑے تھے۔ واپسی پر وہ گھر کا سودا سلف لے کر گھر پہنچی تو سیڑھیوں پر ہاشم کے قمقمے کی آواز نے اسے حیران کیا۔ فلیٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہی وی لاؤنج میں کسی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

تین چار دن پہلے ہی اس کا پلستر کھلا تھا اور اب وہ چلنے لگا تھا۔

”لو تمہاری بھابھی بھی آگئیں۔“ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئی ہاشم کی پر جوش آواز اس کے کانوں سے ٹکرانی۔

”السلام علیکم۔۔۔“ تھوڑی سی جھجک کر وہ دروازے میں ہی رک گئی۔ ہاشم کے ساتھ اس ہی کی عمر کا ایک شخص موجود تھا۔ جس کے ساتھ بیٹھا ہوا وہ بے تکلفی سے پھل کھا رہا تھا۔ سینٹرل ٹیبل پر پھلوں کے بہت سے شاپر رکھے ہوئے تھے اور یہ پھل شاید نہیں یقیناً

وہ ہی شخص لایا تھا۔

”بخاور! یہ میرا بہت اچھا دوست ہے سیموئیل، کل ہی پاکستان آیا ہے۔“ ہاشم نے اسے دیکھتے ہی تعارف کی رسم نبھائی۔

”کیسے ہیں آپ۔۔۔؟“ بخاور کو پہلی نظر میں ہی یہ فریج کٹ واڑھی والا اس کا دوست اچھا نہیں لگا۔ مناسب قد کے ساتھ اس کی رنگت خاصی سپید تھی اور سر کے بال شاید اس نے ڈالنی کر کے سنہری کر رکھے تھے اور اس کے چہرے پر موجود چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک محسوس کی جانے والی مکاری تھی۔

”فائن اینڈ؟“ آپ کیسی ہیں؟“ اپنی شخصیت کے برعکس اس کی آواز خاصی متاثر کن تھی۔

”تھیک ہوں، چائے بناؤں آپ لوگوں کے لیے؟“ بخاور نے رسماً پوچھا۔

”نہیں، میں سیموئیل کے ساتھ باہر کھانا کھانے جا رہا ہوں، تم بھی کھانا نہ بنانا کچھ بھی نہ بنانا بلکہ کچھ نہ کچھ لے آؤں گا۔ میں تمہارے لیے۔۔۔“ ہاشم کی بات پر اس کے حلق سے ایک پرسکون سانس خارج ہوئی، ویسے بھی وہ اس قدر تھکی ہوئی تھی کہ اس وقت ایک بستر کے علاوہ اسے کسی اور چیز کی طلب محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ہاشم اپنے دوست کے ساتھ شام۔۔۔ چار بجے کا گیارہ گیارہ بجے ڈھیروں سامان کے ساتھ لدا پھندا لوٹا تو بخاور کی آنکھوں سے ساری نیند بھک کر کے اڑ گئی۔

”یہ اتنا سامان کہاں سے آیا۔۔۔؟“ وہ ایک دم گھبرا گئی۔

”میں لے کر آیا ہوں اور کہاں سے آئے گا؟“ وہ لاپرواہی سے کہہ کر چیزیں شاپر سے باہر نکالنے لگا۔

”لیکن پیسے کہاں سے آئے آپ کے پاس۔۔۔؟“ وہ پریشان ہوئی۔

”آسمان سے بارش ہوئی تھی، میں نے جلدی جلدی سمیٹ لی۔“ اس کا موڈ خاصا خوش گوار تھا۔

”ہاشم! میں آپ سے پوچھ رہی ہوں کہاں سے

لے کر آئے ہیں یہ سب۔ وہ فکر مندی سے جیم ڈبل روٹی، مکھن، چینی، شربت، کولڈ ڈرنکس، مسالے اور ان ساری چیزوں کو دیکھ رہی تھی جنہیں وہ عیاشی کے زمرے میں لا کر استعمال کرنا ترک کر چکی تھی۔

”فکر مت کرو، ڈاکا نہیں مارا میں نے کہیں پر۔“ وہ ایر فریشرنکال کراب کمرے میں اسپرے کرنے لگا۔ ایک دم ہی پورا کمرہ جیسمن کی خوشبو سے مہکنے لگا۔ ”لیکن پھر بھی کچھ پتا بھی تو چلے۔؟“ وہ اب ٹھیک ٹھاک پریشان ہوئی۔

”سیموئیل نے کچھ عرصہ پہلے مجھ سے قرضہ لیا تھا، وہ واپس کیا ہے آج۔“ اس نے ہنستے ہوئے انکشاف کیا۔

”کیا ضرورت تھی اتنی فضول خرچی کرنے کی، ہمیں تو آج کل ویسے ہی پیسوں کی اشد ضرورت ہے۔“ بخٹاور اب فکر مند انداز سے دل ہی دل میں ان تمام چیزوں کی قیمت کا اندازہ لگا رہی تھی۔

”فکر مت کرو ابھی بھی کافی پیسے ہیں میرے پاس اور صبح دکانوں کی مرمت کا کام بھی شروع ہو جائے گا۔“ اس نے مزید اسے حیران کیا۔

”کیا لاکھوں کا قرضہ دے دیا تھا اسے۔؟“ بخٹاور کی بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔

”نہیں جان من، میں اب سیموئیل کے ساتھ پارٹنرشپ میں بزنس کر رہا ہوں۔“ اس نے مزے سے ایک سوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ”یہ دیکھو میں تمہارے لیے لایا ہوں، کیسا ہے؟“ بخٹاور نے ایک نظر اس خوب صورت لان کے سوٹ پر ڈالی، موسم بدل چکا تھا اور اسے اب ان کپڑوں کی اشد ضرورت تھی، لیکن ان سب چیزوں کو دیکھ کر اسے خوشی کے بجائے گھبراہٹ کا احساس ہو رہا تھا۔

”ہوں۔۔۔ اچھا ہے۔“ اس نے ہاشم کا دل رکھنے کے لیے زبردستی مسکرا کر کہا۔

”ویسے کیا بزنس شروع کر رہے ہیں آپ لوگ۔“ بخٹاور سیموئیل کی طرف سے متفکر تھی۔ ”فی الحال تو ایک پبلشنگ ادارہ لگائیں گے اور

سیموئیل امریکہ سے کچھ مہنگی بکس لا کر یہاں پاکستان میں پبلش کرے گا، جن کی ادھر کافی مانگ ہوگی۔“ ہاشم اپنے بازوؤں کا تکیہ بنا کر بیڈ پر لیٹ گیا۔

”اس نے کیا وہاں سے پریشن لی ہے، میرا مطلب ہے ان اشاعتی اداروں سے۔ کہیں کاپی ایکٹ کی خلاف ورزی تو نہیں ہوگی۔“ بخٹاور کو ایک دم ہی کئی خدشات لاحق ہوئے۔

”ظاہر ہے اس نے کچھ نہ کچھ تو انتظام کیا ہی ہو گا، اب اتنا بھی بے وقوف نہیں ہے وہ۔“ ہاشم ہنسا۔ ”پھر بھی آپ دیکھ بھال کر ہی پارٹنرشپ کیجیے گا۔“ اس نے فوراً ہی نصیحت کی۔

”بے وقوف لڑکی، ابھی تو سارا سرمایہ ہی وہ لگا رہا ہے اور میں تو صرف اپنی خدمات دوں گا اسے، اس کام کے لیے۔“ اس نے وضاحت دی۔

”سیموئیل کیا کر رہا ہے؟“ بخٹاور نے اس کے نام سے اندازہ لگایا۔

”پہلے تھا، اب نہیں ہے۔“ دوسری طرف سے فوراً ہی جواب آیا تو وہ کچھ مطمئن ہوئی۔

”اچھا تو اسلام قبول کرنے کے بعد کم از کم انسان اپنا نام ہی تبدیل کرے۔“ وہ مطمئن ہو کر اب چیزیں سمیٹنے لگی۔ جبکہ ہاشم نے اس کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

”سنو بخٹاور اب تم جاب چھوڑ دینا۔“ اس کی بات پر وہ مسکرائی۔ ”وہ کیوں۔۔۔؟“

”مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا کہ تم جاب کرو، مجھے بہت شرمندگی ہوئی تھی دل ہی دل میں۔“ پیسے جیب میں آنے کے بعد ہاشم کا لہجہ ایک دم ہی تبدیل ہو گیا۔ بخٹاور کو پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ غربت واقعی خوب صورت رشتوں کو بہت بد صورت بنا دیتی ہے۔

”ہاں دیکھوں گی، تھوڑا آپ کا کام سیٹ ہو جائے، پھر ریزائن کروں گی۔“ وہ خود بھی جاب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے شاپر اٹھا کر الماری میں رکھنے شروع کر دیے، ہاشم اسے غور سے دیکھتے ہوئے ایک دم ہی چونکا۔

”بختاور۔۔۔“ اس کے نرم لہجے پر وہ فوراً متوجہ ہوئی
 ”تم کسی ڈاکٹر کے پاس تو نہیں گئیں نا۔“ وہ اب
 شرمندہ لہجے میں اس سے پوچھ رہا تھا، بختاور فوراً سمجھ
 گئی کہ وہ کس معاملے کے بارے میں بات کر رہا ہے۔
 اس نے فوراً ہی نفی میں سر ہلایا تو وہ پرسکون ہو گیا۔
 ”کوئی ضرورت نہیں ہے اب جانے کی۔۔۔“ وہ
 نظریں چرائے بیٹھا تھا۔ بختاور کو ایک دم ہی اس پر پیار
 آیا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ فطرتاً ایک برا انسان نہیں
 تھا لیکن حالات کے گرداب میں پھنس کر یہ سب
 کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس رات بہت عرصے کے
 بعد وہ دونوں ہی پرسکون نیند سوئے تھے۔



شائستہ بیگم اپنے دوپٹے پر بیل لگاتے ہوئے کن
 اکھیوں سے اپنے مجازی خدا کو دیکھ رہی تھیں جو
 مسلسل ایک ہی کتاب میں سر دیے بیٹھے تھے۔ انہیں
 آئے ہوئے دودن ہو چکے تھے اور ڈاکٹر جلال نے ایک
 دفعہ بھی تیمور کے متعلق بات نہیں کی تھی۔ جبکہ
 شائستہ بیگم دل ہی دل میں ہر وقت آل تو جلال تو کا ورد
 کرنے میں مگن رہتیں۔ ان دونوں کے درمیان گھریلو
 معاملات پر چھوٹی مولی گفتگو تو ہو رہی تھی مگر دونوں ہی
 اس متنازعہ موضوع پر بات کرنے سے کترارہے تھے۔
 ”یہ بینش نظر نہیں آرہی آج کل خیر تو ہے نا؟“
 انہوں نے ڈاکٹر جلال کو مخاطب کرنے کے لیے ان کی
 لاڈلی بیٹی کے بارے میں پوچھا۔
 ”شاید بڑی ہوگی کہیں۔۔۔“ انہوں نے مختصر جواب
 دیا۔

”ارصم کی منگنی پر کیوں نہیں گئے آپ۔۔۔؟“ ابھی
 تک یہ بات ان کے ذہن میں اٹکی ہوئی تھی اس لیے
 جھٹ سے پوچھ لی۔

”ویسے ہی۔۔۔“ ان کے مختصر جواب پر وہ مایوس
 ہوئیں۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ ہلکا سا کھٹکھٹا کر ماہیر
 بڑے عجلت میں اندر داخل ہوا۔
 ”بڑے ابا۔۔۔ کسی اچھے کارڈیا لوجسٹ کا تو بتائیں۔“

پاپا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ ماہیر اچھا خاصا گھبرایا
 ہوا تھا۔

”کسی بھی اسپتال کی ایمرجنسی میں لے جاؤ کوئی نہ
 کوئی کارڈیا لوجسٹ بیٹھا ہوگا۔“ ان کی بے رخی پر ماہیر
 کو ایک دم جھٹکا لگا۔

”کیا ہوا تیمور کو۔۔۔ خیریت تو ہے نا؟“ بڑی اماں کے
 فوراً ہی ہاتھ پیر پھولے۔

”کچھ نہیں ہوا انہیں۔“ ماہیر نے بے حد غصے سے
 بڑے ابا کی طرف دیکھا جو بڑے سکون سے اپنی کتاب
 پڑھنے میں مصروف تھے۔ ان کی بے حسی خاصی دل
 دکھانے والی تھی۔ وہ پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے نکلا اور
 غصے کے اظہار کے طور پر اس نے بڑے زور سے
 دروازہ بند کیا تھا۔

اس کی اس بد تمیزی پر ڈاکٹر جلال کے چہرے پر
 ناگواری کا تاثر بڑی قوت سے ابھرا، لیکن وہ مصلحتاً
 خاموش رہے، کیونکہ ان کی بیگم صاحبہ حواس باختہ
 انداز میں اپنے پوتے کے پیچھے جانے کے لیے اٹھی
 تھیں۔

”آگ لگ جائے ایسے اسپتال کو جہاں میرے
 بچے کا علاج نہیں ہو سکتا۔“ وہ کمرے سے نکلتے ہوئے
 بلند آواز میں بڑبڑاتیں۔ کھلے دروازے سے انہیں
 ملازموں کے بھاگنے، شائستہ بیگم اور اوریدا کے رونے
 کی آوازیں بلند آواز میں آرہی تھیں، ایسا لگ رہا تھا
 جیسے باہر کوئی افراتفری کا سماں ہو۔ انہوں نے اٹھ کر
 کمرے کا دروازہ بند کیا، لیکن اپنی بیگم کے رونے کی
 آواز ان کے اعصاب پر بری طرح سے سوار ہو چکی
 تھی۔

”ذرا ماہیر کو کال کرلو، اس کے باپ کی طبیعت
 خراب ہے۔“ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کو فون
 کر کے درخواست کی اور خود ایک دفعہ پھر اپنی کتاب
 کھول لی، لیکن اس دفعہ ایک لفظ بھی ان کے لیے
 نہیں پڑ رہا تھا۔ تنگ آکر وہ اپنے کمرے سے نکل
 آئے۔ سامنے ٹی وی لاؤنج کے صوفے سے ٹیک
 لگائے اوریدا قالین پر افسردہ انداز میں بیٹھی تھی۔

انہیں دیکھ کر بھی وہ ویسے ہی سر جھکا کر بیٹھی رہی۔
 ”عدینہ کہاں ہے؟ ہاسٹل واپس چلی گئی کیا؟“
 انہوں نے یوں ہی اسے مخاطب کرنے کے لیے پوچھا۔
 ”جی۔۔۔“ اور ید کا لہجہ بھیگا ہوا تھا، وہ شاید کافی دیر
 سے رو رہی تھی۔ اسی وقت آغا جی پریشان انداز میں
 ان کے پورشن میں داخل ہوئے۔
 ”بھائی جان! کس اسپتال میں لے کر گئے ہیں تیمور
 کو۔۔۔؟“ انہوں نے اندر داخل ہوتے ہی پریشانی سے
 پوچھا۔

”کیوں۔۔۔ تمہاری بات نہیں ہوئی ماہیر سے۔۔۔؟“ وہ
 التاحیران ہوئے۔
 ”بات تو ہوئی تھی، لیکن وہ اس وقت ڈرائیو کر رہا
 تھا، اس نے کچھ خاص بتایا نہیں۔“ وہ فکر مند انداز میں
 صوفے پر بیٹھ گئے۔

”دوبارہ کال کر کے دیکھ لیں۔“ انہوں نے حتی
 الامکان اپنے لہجے کو لا پرواہ رکھنے کی کوشش کی، آغا جی
 فوراً ہی ماہیر کا نمبر ملانے لگے، دوسری طرف بیل
 جارہی تھی، لیکن کال اٹینڈ نہیں کی جارہی تھی۔
 انہوں نے تنگ آکر فون بند کر دیا۔ دونوں بھائی اگلے
 ایک گھنٹے تک یوں ہی بیٹھے رہے۔ ماہیر کسی کا بھی فون
 اٹینڈ نہیں کر رہا تھا، وہ سب ہی سے خفا ہو چکا تھا۔



”لگتا ہے آج کوئی خاص مہمان آنے والا ہے۔“
 بے بے نے صحن میں مٹر گشت کرتی مرغیوں کے آگے
 باجرہ ڈالتے ہوئے، ”مونا کو مخاطب کیا، جو گیلے کپڑوں کا
 ٹب اٹھائے غسل خانے سے نکل رہی تھی۔ اس کے
 چہرے پر تھکن اور بے زاری کا عنصر غالب تھا۔
 ”آپ کو کیسے پتا چلا۔۔۔؟“ مونا نے دھلے ہوئے
 کپڑوں کا پانی مزید نچوڑا۔

”صبح سے منڈیر پر بیٹھا کوا جو کائیں کائیں کر کے سر
 کھا رہا ہے۔“ انہوں نے ہش ہش کر کے مرغیوں کو
 پودوں کی طرف جانے سے روکا۔
 ”بے بے کوؤں اور کبوتروں والا ٹائم گزر گیا، اب

مہمان موبائل پر کال کر کے آتے ہیں۔“ مونا نے انہیں
 چھیڑا اور خود جھٹک جھٹک کر کپڑے تار پر پھیلانے
 لگی۔

”بھاڑ میں جائے یہ مواں بیل۔۔۔“ بے بے نے برا
 سامنے بنایا۔

”اس نے تو پروں (مہمانوں) کو دیکھ کر اچانک ملنے
 والی خوشی ہی چھین لی۔۔۔“

”بے بے آج کل کے دور میں کوئی خوش نہیں ہوتا
 مہمانوں کے آنے سے۔۔۔“ مونا نے بے زاری سے
 ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔ وہ صبح سے کپڑے دھو
 دھو کر تھک چکی تھی، لیکن ابھی بھی آپا کو تفصیلی صفائی
 کی دھن سوار تھی۔

”اس لیے تو گھروں میں اتنی بے برکتی ہے، پورا پورا
 نمبر کما رہا ہوتا ہے اور پھر بھی سب ہی رو رہے ہوتے
 ہیں۔“

”کپڑے پھیلا کر صالہ کو ایک کپ دودھ گرم کر کے
 دے دینا، اس نے دوائی کھانی ہے۔“ بے بے نے مونا
 کو مخاطب کیا۔

”اچھا ابھی دیتی ہوں۔“ مونا نے خالی ٹب اٹھایا اور
 غسل خانے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ باہر کے
 دروازے پر کسی نے دستک دی۔

”مونا۔۔۔ باہر دیکھو کون آیا ہے؟“ بے بے نے
 وہیں سے بیٹھے بیٹھے اس سے کہا تو وہ ٹب زمین پر رکھ
 کر دروازہ کھولنے چلی گئی اور جیسے ہی اس نے گیٹ
 کھولا اسے خوش گوار حیرت کا جھٹکا لگا۔ سامنے عبد اللہ
 سر جھکائے اپنی والدہ کے ساتھ کھڑا تھا۔ اگر عدینہ نے
 اس کے زندہ ہونے کی اطلاع نہ دی ہوتی تو شاید اس
 وقت مونا خوف کے مارے بے ہوش ہو چکی ہوتی۔

”ارے خالہ آپ۔۔۔ آئیں نا اندر، باہر کیوں کھڑی
 ہیں۔“ خوشی مونا کے لہجے سے چھلکی۔

”ہاں بھئی میاں! تم کون سی قبر سے کفن پھاڑ کر
 نکل آئے۔“ بے بے کو آپا صالہ بتا چکی تھیں۔ ان
 کے طنزیہ انداز پر وہ شرمندہ ہوا۔

”مونا مہمانوں کو بیٹھک میں بٹھا دو میں صالہ کو

اٹھاتی ہوں۔“

مونا نے انہیں فوراً بیٹھک میں بٹھایا اور خود باورچی خانے کی طرف چلی آئی، آپا کے کئے بغیر اس نے جلدی جلدی چائے کا پانی رکھا اور خود بسکٹ پلیٹوں میں ڈال کر انڈے ابلنے لگی۔ اس وقت گھر میں جو کھانے کو موجود تھا، وہ سب رکھ کر جب وہ بیس پچیس منٹ کے بعد بیٹھک میں آئی تو اندر کا ماحول خاصا سرد تھا۔ آپا کے چہرے پر پھیلا غصہ اور ناراضی دوری سے نظر آرہی تھی۔

”تم تو خود اچھے خاصے باشعور، سمجھ دار اور سلجھے ہوئے لڑکے تھے، پوری ایمان داری سے بتاؤ ایسی کون سی غلط بات کہہ دی تھی میں نے، جو تم منہ چھپا کر ایسے عائب ہوئے کہ سارے ہی رابطے ختم کر ڈالے۔“ آپا صالحہ اگرچہ بیمار تھیں لیکن ان کا لہجہ ابھی بھی خاصا جان دار تھا۔ وہ اپنے سامنے شرمندگی سے سر جھکا کے بیٹھے عبد اللہ کی ٹھیک ٹھاک کلاس لے رہی تھیں۔

”یہ تمہارے سامنے بیٹھا ہے صالحہ، سو جوتے بھی مارو گی تو آف نہیں کرے گا۔“ عبد اللہ کی والدہ نے خفت زدہ لہجے میں کہا۔

آج کل کے بچے کھاتے کہاں ہیں جوتے، الٹا والدین کو ہی بھگو بھگو کر مارتے ہیں۔ ان کا غصہ کسی صورت کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔

”میں نے اتنا سمجھایا تھا اسے، کم از کم اپنی خیریت کی تو اطلاع دے دو، لیکن اس نے میری ایک بات نہیں مانی۔“ عبد اللہ کی والدہ بھی آج اپنے بیٹے کی حمایت کے موڈ میں نہیں تھیں۔

”ہم اس کے کیا لگتے تھے جو یہ ہمیں اطلاع دیتا۔“ آپا صالحہ کا لہجہ غم سے لبریز ہوا۔ انہیں حقیقتاً عبد اللہ پر بہت غصہ آرہا تھا۔

”میں کچھ بن کر آپ کے پاس آنا چاہتا تھا۔“ وہ تھوڑا سا جھجک کر بولا۔

”بیٹا! تم شاید بھول رہے ہو، میں نے اس وقت اپنی بیٹی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں تھمانے کی بات کی تھی، جب تم کچھ بھی نہیں تھے۔“ آپا صالحہ کے رنجیدہ لہجے

پر وہ ایک دفعہ پھر شرمندہ ہوا۔

”آپا! میں آپ سے معافی کا طلب گار ہوں اور اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گا، جب تک آپ مجھے معاف نہیں کریں گی۔“ اس نے خفت زدہ انداز میں اپنا سر مزید جھکا لیا۔

”بیٹا، ہم کون ہوتے ہیں معاف کرنے والے، ہماری بساط ہی کیا ہے۔ معافی مانگنی ہے تو اللہ سے مانگو۔“ انہوں نے بے رخی کی انتہا کر دی۔

”اچھا اچھا اب غصہ تھوک دے صالحہ۔“ بے نے محتاط انداز میں گفتگو میں حصہ لیا۔ ”گھر چل کر تو اگر دشمن بھی آجائے تو اسے معاف کر دینا چاہیے۔“

”تمہارا کون سا اس کے ساتھ دشمنی والا تعلق تھا بے۔“ آپا صالحہ نے انہیں یاد دلایا۔

”جو بھی ہے قطع تعلقی اللہ کو پسند نہیں۔“ بے نے مونا کو اشارہ کیا، وہ جلدی جلدی گھر اس سے چائے نکال کر پیالیوں میں ڈالنے لگی۔

”تو اس کا مطلب ہے۔ آپ مجھے معاف نہیں کریں گی۔“ عبد اللہ نے پہلی دفعہ پریشان انداز میں آپا صالحہ کا چہرہ دیکھا، ایک نظر میں ہی وہ اسے کافی بیمار اور بوڑھی لگی تھیں۔ ایک نامعلوم سی بے چینی نے اس کے وجود کو گھیرا۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے آپا۔“ اس کے تشویش زدہ انداز پر آپا صالحہ نے بے اختیار نظریں چرائیں۔ عبد اللہ انہیں اپنی سگی اولاد کی طرح عزیز تھا اور سچ بات تو یہ تھی کہ اس کی موجودگی میں انہیں کبھی بھی بیٹے کی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ آج اسے دیکھ کر ان کے زخموں کے سارے ٹانگے ادھر گئے تھے۔

”ہاں ٹھیک ہوں میں۔“ ان کا لہجہ اس دفعہ خاصا مدہم تھا۔

”مدرسہ کیسا چل رہا ہے؟“ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”اللہ کا بہت کرم ہے، کسی کے جانے سے دنیا کے کام نہیں رکتے، یہاں تو پھر دینی تعلیم کا کام تھا، اللہ نے

مدد کر دی۔ ”وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دفعہ پھر طنز کر گئیں۔“

”آپا۔۔۔ آپ جو مرضی کہیں لیکن پلیز اپنا دل صاف کر لیں میری طرف سے۔“ عبداللہ نے دو ٹوک انداز میں بات کرنے کی ٹھان لی۔

”میاں۔۔۔ ہمارے دل صاف کرنے سے کیا ہوتا ہے، بس تم خوش رہو، آباد رہو۔“ وہ تھوڑا سا افسردہ ہوئیں۔ عبداللہ ایک دم اٹھا اور ان کے قدموں میں آکر بیٹھ گیا۔ وہ بوکھلا سی گئیں۔

”بیٹا! یہ کیا کر رہے ہو تم۔۔۔؟“ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئیں، مونانے اپنے چہرے پر آنے والی مسکراہٹ کا گلابی مشکل سے گھونٹا تھا۔ اس کی لائی ہوئی چائے کیوں میں پڑے پڑے ٹھنڈی ہونے لگی۔ کمرے کا ماحول ابھی بھی سرد تھا۔

”آپ جب تک مجھے معاف نہیں کریں گے میں اپنی جگہ سے نہیں اٹھوں گا۔“ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی لیکن لہجہ بے لچک تھا۔

”اچھا اچھا معاف کیا اب اٹھ کر کرسی پر بیٹھو۔ پی ایچ ڈی تک پہنچ گئے لیکن حرکتیں ابھی بھی بچوں جیسی ہی ہیں تمہاری۔“ آپا صالحہ اپنے مخصوص شفقت بھرے انداز میں گویا ہوئیں تو کمرے میں موجود سب افراد کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”تو پھر میں کب سے اپنا مدرسہ سنبھالنے آؤں۔۔۔“ عبداللہ کی اگلی فرمائش نے آپا صالحہ کو ہکا بکا کر دیا۔ وہ بھونچکا ہو کر اس کی سنجیدہ شکل دیکھنے لگیں۔ ”تم پی ایچ ڈی کر کے اب مدرسہ سنبھالو گے کیا۔۔۔؟“ انہوں نے ذرا سا سنبھل کر کہا۔

”آپ سے زیادہ کون جان سکتا ہے یہ کہ ہمارے دینی مدرسوں کو پڑھے لکھے لوگوں کی ضرورت ہے آپا۔“ وہ سنجیدگی سے مزید گویا ہوا۔

”پڑھے لکھے لوگ ان بچوں کے ناپختہ ذہنوں میں جو فیڈ کریں گے اسی سے ان کے مستقبل کی راہیں متعین ہوں گی۔ ہم اپنے مدرسے سے چند سو بھی اچھے مسلمان بنانے میں کامیاب ہو گئے تو آخرت میں

ہماری نجات کا کچھ نہ کچھ سامان پیدا ہو ہی جائے گا۔“ عبداللہ کی باتیں ہمیشہ کی طرح آپا صالحہ کے دل پر اثر کرنے لگی تھیں۔

یہی وجہ تھی کہ دو گھنٹے کی اس ملاقات کے بعد عبداللہ جب اٹھا تو آپا کے دل پر چھائی بدگمانی کی کثافت آخر کار دھل ہی گئی تھی۔



بختاور اور ہاشم کی — خوش حال زندگی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ اگلے پانچ ماہ میں بختاور کے گھر میں بی وی سمیت بہت سی الیکٹرانک اشیاء کا اضافہ ہو چکا تھا۔ سیموئیل کے ساتھ پارٹنر شپ ہاشم کو اس آگنی تھی اور اوپر سے اس کی دکانیں دوبارہ سے کرائی پر چڑھ گئیں تھیں اس لیے معاشی لحاظ سے وہ دونوں اب خاصے بر سکون تھے جب کہ بختاور نے اپنی نوکری ابھی تک نہیں چھوڑی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ ریگیننسی کے آخری مہینے میں جاب چھوڑ دے گی، کیونکہ ہاشم اپنے پبلشنگ ادارے میں خاصا مصروف ہو چکا تھا، وہ صبح نو بجے کا گیا ہوا رات کو دس گیارہ بجے کے بعد ہی لوٹا تھا۔ — جمعے کا دن تھا اور وہ چھٹی کی وجہ سے گھر میں تھی کہ پی ٹی سی ایل فون پر نیلیم کی کال آگئی وہ خاصی خوش تھی۔

”ریٹی ٹمہاری شادی ہو رہی ہے۔۔۔؟“ بختاور اس اطلاع پر ایک دم خوش ہو گئی۔

”ایک بات کان کھول کر سن لو بختاور، اگر تم میری شادی پر نہ آؤ تو میں سخت خفا ہو جاؤں گی تم سے۔“ دوسری طرف موجود نیلیم نے اسے دھمکی دی۔

”ایسا ہو سکتا ہے بھلا۔۔۔؟“ بختاور کھلکھلا کر ہنسی۔

”تمہاری وجہ سے میں نے شادی کی ڈیٹ کافی لیٹ کی ہے، اب تم میرے بھانجے یا بھانجی کے ساتھ پہنچ جانا۔“ نیلیم نے ہنستے ہوئے اسے یاد دلایا۔

”اچھا اچھا“ اب کتنی دفعہ احسان جتاؤ گی تم اس بات کا۔“ بختاور نے مصنوعی ناراضی سے کہا۔

”تمہیں پتا ہے ناں میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہوں اور میری شادی پر میری بہن اور دوست کا کردار تم نے ہی ادا کرنا ہے۔“ دوسری طرف نیلم کچھ اداس ہوئی۔

”تم ٹینشن ہی مت لو میں انشاء اللہ پورے دس دن پہلے پہنچ جاؤں گی۔“ بختاور نے اسے اپنے ارادوں سے آگاہ کیا۔

”ہاشم بھائی اتنے دن پہلے آنے کی اجازت دے دیں گے ناں۔“ اسے یقین نہیں آیا تھا۔

”ارے اب ان کی کوئی ٹینشن نہیں وہ دن رات اپنا بزنس پھیلانے میں لگے ہوئے ہیں۔“ بختاور نے اسے مطمئن کیا۔

”ان کے گھر سے دوبارہ کوئی نہیں آیا۔“ نیلم نے تھوڑا سا جھجک کر پوچھا۔

”نہیں یار! ان کے بڑے بھائی نے بھی دوبارہ جھانک کر بھی نہیں دیکھا۔“ بختاور نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

”بختاور ایک بات پوچھوں اگر تم برا نہ مانو تو۔۔۔؟“ نیلم پھر ہچکچائی۔

”کمال کرتی ہو نیلم تم اب تم بھی غیروں جیسی باتیں کرو گی کیا؟“ اس نے فوراً ہی اسے جھاڑا۔

”اصل میں تم نے بتایا ہی نہیں کہ ہاشم بھائی اب نماز وغیرہ پڑھتے ہیں کہ نہیں؟“ نیلم کی بات پر بختاور ایک دم افسردہ ہوئی۔

”سچ کہو تو یار وہ اس ٹاپک پر ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں ہوتے تنگ آکر میں نے بھی انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔“

”لیکن یہ اچھی بات نہیں ہے بختاور۔“ نیلم پریشان ہوئی۔

”تو کیا کروں یار روز روز کے جھگڑوں سے مجھے ٹینشن ہوتی ہے۔“ بختاور نے اسے اپنی مجبوری سے آگاہ کیا۔

”لیکن ایک مسلمان کی حیثیت سے تمہیں ان کے عقائد کی تصحیح کرنی چاہیے ورنہ کل کو یہ بات

تمہارے بچوں کے لیے مسئلے کا باعث بنے گی۔“ نیلم کی بات پر وہ ایک دم پریشان ہو کر بولی۔ ”وہ کیسے؟“

”دیکھو ناں کل کو اگر ہاشم بھائی نے اپنے نظریات اپنے بچوں پر ٹھونسنے کی کوشش کی تو۔۔۔؟“ بختاور اس کی بات سن کر خوفزدہ ہوئی۔

”اللہ نہ کرے یار! اس کے منہ سے بے اختیار پھسلا۔ نیلم کی اس بات کے بعد اس کا ایک دم ہی ساری گفتگو سے دل اچاٹ ہو گیا تھا تب ہی تو اس نے دو چار باتیں کر کے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ نیلم کے ساتھ ہونے والی تازہ تازہ باتوں کا ہی اثر تھا جو رات کو ہاشم کو کھانا دیتے ہوئے اس نے دانستہ ہی موضوع چھیڑ دیا۔

”ہاشم آپ کے خیال میں اس دفعہ ہمارے ہاں بیٹا ہو گا یا بیٹی؟“ اپنی پلیٹ میں مٹن پلاؤ نکالتے ہوئے وہ اس کی بات پر مسکرایا۔

”بیٹا۔۔۔“ وہ اس کے بر اعتماد انداز پر خیران ہوئی۔

”آپ کیسے اتنے یقین سے کہہ رہے ہیں؟“

”مجھے پتا ہے اس دفعہ بیٹا ہی ہو گا۔“ اس نے سلاوا اپنی پلیٹ میں ڈالا اور مزے سے کھانے لگا۔

”اور اگر بیٹی ہو گئی تو۔۔۔؟“ اس نے تھوڑا سا جھجک کر پوچھا۔ ایک لمحے کو ہاشم کا چہرہ تاریک ہوا اور ساتھ ہی اس نے جھٹ سے نفی میں سر ہلادیا۔

”نہیں اس بار ایسا نہیں ہو گا۔“ وہ سر جھٹک کر ایک دفعہ پھر کھانا کھانے لگا۔

”پتا ہے ہاشم میرا بیٹا ہوا ناں تو میں اسے قرآن پاک حفظ کرواؤں گی۔“ بختاور کے بر جوش انداز پر ہاشم سے نوالہ نگلنا مشکل ہو گیا۔ اسی لمحے اسے کھانسی آئی اور لقمہ گلے میں اٹکا اور وہ بری طرح کھانسنے لگا۔ بختاور نے گھبرا کر پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا چند ہی سیکنڈ میں ہاشم کا منہ ٹماٹر کی طرح سرخ ہو گیا، بختاور جلدی سے اٹھ کر اس کی پشت سہلانے لگی۔

”میں ٹھیک ہوں اب۔۔۔“ ہاشم نے نشو سے منہ صاف کیا۔

”کتنی دفعہ کہا ہے کہ کھانا کھاتے ہوئے بولتے

نہیں ہیں۔۔۔ ”وہ خفا ہوئی۔
 ”اور کتنی دفعہ سمجھایا ہے تمہیں کہ مجھ سے ایسے
 ٹاپک بر بات مت کیا کرو۔“ وہ ہلکا سا برہم ہوا۔
 ”کیسے ٹاپک پر۔۔۔؟“ بخاور کو اپنی بات بھول چکی
 تھی اس لیے وہ تعجب بھری نگاہوں سے اپنے شوہر کا
 چہرہ دیکھنے لگی۔ جس کی کھانے سے دلچسپی بالکل ختم
 ہو گئی تھی اور وہ بے زاری سے رے پرے کر کے اب
 ٹی وی دیکھنے میں مگن ہو چکا تھا۔



ماہیر، سرمد کے ساتھ اے ایف آئی سی (آرٹ فورس
 انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی) کی پارکنگ کی طرف بڑھ
 رہا تھا۔ اس کے چہرے پر حد درجہ پریشانی تھی۔ تیمور
 کے سینے میں ایک دم درد اٹھا تھا اور وہ لوگ گھبرا کر
 انہیں اسپتال لے آئے تھے۔ جہاں انہیں ابتدائی طبی
 امداد کے بعد داخل کر لیا گیا تھا۔

”بڑے ابا سے مجھے اس قدر بے حسی کی امید نہیں
 تھی۔“ ماہیر ان سے اچھا خاصا خفا ہو چکا تھا۔

”اچھا تم اپنا دل برا مت کرو۔“ ان دونوں کے
 درمیان تعلقات ٹھیک ہو جائیں گے۔“ سرمد نے
 گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئی اسے تسلی دی۔

”یار! حد ہوتی ہے ہر بات کی ایسی بھی کیا ناراضی
 کہ انسان اپنے پروفیشن کے تقاضے ہی بھول
 جائے۔“ اس نے بے زاری سے گاڑی کا دروازہ کھولا
 اور بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی سرمد نے گاڑی اشارت
 کی۔ وہ دونوں اسپتال سے گھر جا رہے تھے کیونکہ
 اسپتال میں کسی انٹینڈنٹ کو رکنے کی اجازت نہیں
 تھی۔

”مجھے بابا کو بائی پاس سرجری کے بعد یہاں لانا ہی
 نہیں چاہیے تھا۔“ اس نے سنجیدگی سے کہہ کر سیٹ
 کالیور کھینچا اور آرام وہ انداز میں بیٹھ گیا۔

”شکر ہے تم نے بڑی اماں کو گھر بھجوا دیا“ ورنہ بڑی
 مشکل ہو جاتی۔“ سرمد گاڑی کو اسپتال سے نکال کر
 پشاور روڈ کی طرف لے آیا۔

”بڑی مشکلوں سے تو راضی ہوئی تھیں وہ۔۔۔“ ماہیر
 خاصا تھک دکھتا تھا اس لیے آنکھیں بند کر کے اس کے
 ساتھ موگتنگو تھا۔ دونوں نے شام سے کافی بھاگ دوڑ
 کی تھی۔

وہ تو سرمد کی والدہ طیبہ کی ایک کولیگ، پروفیسر کی
 حیثیت سے یہاں جاب کر رہی تھیں اس لیے انہیں
 کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

”شانزے کہاں گم ہے؟ تم نے اسے بتایا نہیں،
 میں پاکستان آچکا ہوں۔“ ماہیر نے ایک دم ہی آنکھیں
 کھولیں تو سرمد بوکھلا گیا، کیونکہ سامنے سگنل کے
 دائیں طرف لگے بل بورڈ پر شانزے کے سیریل کا بڑا سا
 ایڈ لگا ہوا تھا جس پر شانزے کا مسکراتا ہوا چہرہ دور ہی
 سے لشکرے مارتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”ابھی کچھ دن اور نہ ہی بتاؤ تو اچھا ہے، ورنہ اس کا
 شکایت نامہ شروع ہو جائے گا۔“ سرمد نے سگنل کھلتے
 ہی تیزی سے اپنی گاڑی نکالی اور سکون کا سانس لیا کہ
 ماہیر کی اس بل بورڈ پر نظر نہیں پڑی تھی۔

”ویسے کر کیا رہی ہے وہ آج کل۔۔۔؟“ وہ دوبارہ
 آنکھیں موند چکا تھا۔

”کوئی خاص آئیڈیا نہیں، کیونکہ میں خود پچھلے دنوں
 ایک کمرشل کے شوٹ میں کافی بڑی تھا۔“ سرمد نے
 صاف اسے ٹالا تھا۔ وہ پریشانی کے اس موقع پر اسے
 ایک اور بری خبر نہیں سنانا چاہتا تھا کیونکہ اتنا تو اسے
 بھی اندازہ تھا کہ ماہیر کو اس کا شو بزم میں کام کرنا سخت
 ناپسند تھا۔

”فارغ تو وہ بیٹھ نہیں سکتی یقیناً“ کچھ نہ کچھ تو کر ہی
 رہی ہوگی وہ۔“ ماہیر اس کی رگ رگ سے واقف تھا۔
 ”تم چھوڑو اسے، یہ بتاؤ شادی کا کیا پروگرام
 ہے؟“

”پاپازرا ٹھیک ہو جائیں تو انہیں شانزے کی پھپھو
 کے گھر لے کر جاؤں گا۔“ وہ اسے اپنے ارادے بتا رہا
 تھا۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے گھر تک پہنچ چکے تھے
 جیسے ہی سرمد نے گاڑی اندر داخل کی، سامنے بینش
 بڑی تیزی سے پورچ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف

دیکھ کر فوراً کھڑی ہوئی۔

”بس دعا کرو۔“ ماہیر نے مختصر جواب دیا اور بڑے ابا کو نظر انداز کر کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر جلال نے بطور خاص اس کا یہ انداز نوٹ کیا تھا وہ سرمد سے اس کا حال احوال پوچھنے لگے۔ انہوں نے ابھی بھی تیمور کی طبیعت کا نہیں پوچھا تھا۔ ماہیر کو ایک دم ہی ان کی بے حسی پر غصہ آیا۔

”بھائی! پاپا کب آئیں گے گھر؟“ اوریدا اس کی اندرونی کیفیت سے بے خبر اپنی ہی دھن میں سوال کر رہی تھی۔

”پتا نہیں۔“ ماہیر بڑے ابا کی موجودگی میں کھل کر بات کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے نا ان کی۔“ اسے تسلی نہیں ہوئی۔

”اوریدا کیا پر اہلم ہے تمہارے ساتھ؟ تم کوئی بچی ہو جسے اتنا نہیں معلوم کہ اگر کسی شخص کو اسپتال میں ایڈمٹ کر لیا جائے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ خواہ مخواہ بے تکی سوال کر کے سر کھار ہی ہو۔“ وہ جھنجھلا کر اٹھا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا مموٹ غصے سے کارپٹ پر پھینکا اور اپنے کمرے کی طرف برہ گیا۔ اوریدا اور سرمد دونوں نے پریشانی سے اس کا یہ رویہ دیکھا۔

”سرمد بھائی! پاپا کی طبیعت زیادہ خراب ہے کیا؟“ اوریدا کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر سرمد کے دل کو کچھ ہوا۔

”کیوں ٹینشن لے رہی ہو اوریدا؟ ٹھیک ہو جائیں گے وہ۔“ سرمد نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی، لیکن اوریدا اپنے مچلتے ہوئے آنسو روکنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی۔ بڑے ابا کچھ سوچ کر اٹھے اور لاؤنج سے نکل گئے۔

”پاگل تو نہیں ہو گئی ہو تم۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی کوئی روتا ہے بھلا؟“ وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے نرمی سے اسے دلاسا دینے کی کوشش کر رہا تھا، لاؤنج میں ارصم کے ساتھ داخل ہوتے آغا جی نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ارصم کے اندر چھین

برہ رہی تھیں۔

”السلام علیکم آنٹی، کیسی ہیں آپ۔۔۔؟“ سرمد نے گاڑی سے اترتے ہی انہیں سلام بھاڑا۔

”فائن۔۔۔“ وہ ماہیر کو نظر انداز کر کے اپنی گاڑی کی طرف برہ گئیں۔

”ساری دنیا بدل سکتی ہے لیکن یہ لوگ نہیں۔“ ماہیر نے اندر کی جانب بڑھتے ہوئے بے زاری سے کہا۔

”کون لوگ۔“ سرمد اپنے سیل فون پر آیا۔ ٹیکسٹ پڑھتے ہوئے بے دھیانی سے بولا۔

”بڑے ابا اور بینش پچھپی صاحبہ۔۔۔“ ماہیر نہ جانے کس بات پر بری طرح چڑا ہوا تھا۔

”شرم کرو۔“ تمہارے پاپا کی سابقہ منگیتر رہی ہیں یہ خاتون۔۔۔“ سرمد نے منستے ہوئے اسے چھیڑا۔

”میں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں پار کہ پاپا نے عقل مندی کا فیصلہ کرتے ہوئے شادی نہیں کی ان سے، ورنہ ایسی سڑیل مدر کو برداشت کرنا آسان کام تھوڑی تھا۔“ ماہیر کی بات پر سرمد کھلکھلا کر ہنسا۔ ”یہ تو تم ارصم بے چارے سے پوچھو۔“

”اس کی تو مجبوری ہے یار، اب قادر بھی زندہ نہیں اس کے، ورنہ سوتیلی ہی سہی، ایک اور مدر لے آتا مارکیٹ سے۔“ ماہیر غیر سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”شرم کرو، ارصم سن لے تو کیا سوچے۔“ سرمد نے مسکرا کر کہا۔

”اس کی تو لگتا ہے آج کل سوچنے سمجھنے کی ساری حسیں ختم ہو چکی ہیں، دماغ کہیں اور ہوتا ہے اور دل کہیں اور ہوتا ہے۔“ ماہیر نے بے لاگ تبصرہ کیا۔ وہ دونوں اندر داخل ہو چکے تھے۔ سامنے لاؤنج میں اوریدا بڑے ابا کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی، اس کی نظریں نیوی پر جمی ہوئی تھیں جبکہ بڑے ابا صبح کا باسی اخبار دوبارہ پڑھ رہے تھے۔ بڑے ابا کو دیکھتے ہی ماہیر کو دوپہر کی ساری ٹینشن دوبارہ یاد آگئی اور ساتھ ہی اس کا اچھا خاصا موڈ خراب ہو گیا۔

”بھائی! پاپا کیسے ہیں اب۔۔۔؟“ اوریدا ان دونوں کو

سے کچھ ٹوٹا اب بھی اوریدا کے ارد گرد سردی موجودگی اس کے لیے اذیت کا باعث بنتی تھی۔
 ”بیٹا، تیمور کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ آغا جی اوریدا کو روتا دیکھ کر بوکھلا گئے۔ جب کہ وہ اپنی ہتھیلی کی پشت سے اپنی آنکھیں بے دردی سے رگڑتے ہوئے لاؤنج سے نکل گئی۔ وہ ارصم کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔

”انکل تیمور بہتر ہیں لیکن۔۔۔ مکمل ٹھیک ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔“ سرد نے انہیں صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”تیمور کو بائی پاس سرجری کے بعد فوراً اتنی لمبی ٹریولنگ نہیں کرنی چاہیے تھی۔“ آغا جی نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”جی وہ تو نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن بڑی اماں کی ضد کے آگے انہیں سر جھکانا پڑا۔“ سرد نے انہیں اصل بات بتائی۔

”ٹھیک ہے۔ میں بھائی جان کے کمرے میں جا رہا ہوں تم ذرا ماہیر کو بھیجو وہاں۔“ آغا جی ارصم کے ساتھ ڈاکٹر جلال کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

وہاں ایک اور منظر ان کا منتظر تھا، بڑی اماں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے افسردہ انداز میں نیم دراز تھیں۔ انہوں نے سپاٹ نظروں سے آغا جی اور ارصم کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ان کی آنکھیں متورم اور چہرہ بہت زیادہ رونے کی وجہ سے سرخ ہو چکا تھا جو سفید رنگ کے دوپٹے میں اور زیادہ نمایاں ہو رہا تھا۔

پھر وہ بے زاری سے انھیں اور اپنی چپل پہن کر کمرے سے نکل گئیں۔ آغا جی اور ارصم دونوں نے حیرانی سے جلال صاحب کی طرف دیکھا۔

”بھابھی کو کیا ہوا۔۔۔؟“ آغا جی ایک دم پریشان ہوئے۔

”ناراض ہیں وہ سب سے۔“ ڈاکٹر جلال کے جواب نے انہیں مزید تشویش میں مبتلا کیا۔ ”لیکن کیوں۔۔۔؟“

”انہیں لگتا ہے کہ ان کے بیٹے پر گھر کے کسی ڈاکٹر نے کوئی توجہ نہیں دی؟“ وہ سنجیدہ انداز میں ان کی ناراضی کی وجہ بتانے لگے۔ وہ جب سے اسپتال سے آئی تھیں اسی طرح سے سب اکھڑی اکھڑی ہوئی تھیں اور ملازموں کی الگ شامت آئی ہوئی تھی۔
 ”پھر تو یہ ناراضی ان کا حق بنتی ہے، آپ کو جانا چاہیے تھا ساتھ۔۔۔“ آغا جی نے محتاط انداز میں ان کی نفیس مگر بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ ابھی تک تیمور سے خفا تھے۔ اسی وقت ماہیر ست انداز میں کمرے میں داخل ہوا۔

”آغا جی آپ نے بلایا تھا مجھے۔“
 ”بیٹا تیمور کو کہاں لے کر گئے تھے تم اور کیسی طبیعت ہے اب اس کی؟“ وہ فکر مندی سے پوچھ رہے تھے۔

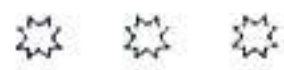
”آغا جی۔ آپ کے اسپتال کے علاوہ بھی بہت اچھے اسپتال موجود ہیں اس شہر میں۔“ اس کا طنزیہ انداز آغا جی کے لیے بالکل نیا تھا وہ سمجھ گئے۔ کہ وہ بھی بڑی اماں کی طرح ان سب سے بدگمان ہو چکا ہے۔
 ”بیٹا، مجھے تو بھائی جان نے کہا تھا تم سے رابطہ کرنے کو۔“ انہوں نے بوکھلا کر اپنی صفائی دی جبکہ ماہیر کے سامنے اس بات پر ڈاکٹر جلال جزبہ سے ہو کر رہ گئے۔ تیمور نے غور سے بڑے ابا کا چہرہ دیکھا اور سنجیدگی سے گویا ہوا۔ ”اے ایف آئی سی میں ایڈمٹ کروادیا ہے انہیں؟“

”وہاں میرے بہت اچھے دوست ڈاکٹر فاروق ہیں، میں ان سے بات کرتا ہوں۔“

”آغا جی اس کی ضرورت نہیں ہے اب۔۔۔“ ماہیر نے جلدی سے ان کی بات کاٹی۔ ”میرے ایک دوست کے فادر ہیں وہاں، ان شاء اللہ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔“ ماہیر نے بھی آج ان سب کو شرمندہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

”چلو ٹھیک ہے۔ اب نیہکسٹ ٹائم تم اسپتال جاؤ تو مجھے ساتھ لے کر جانا۔“ انہوں نے محتاط لہجے میں کہا۔

”جی، ٹھیک ہے اب میں جاؤں۔؟“ وہ ابھی تک خفا خفا سالگ رہا تھا۔ اس کے کمرے سے نکلتے ہی آغا جی نے شکایتی نظروں سے ڈاکٹر جلال کی طرف دیکھا۔ انہیں بھی اپنے بھائی کا یہ طرز عمل اچھا نہیں لگا تھا۔ ”بھائی جان کلمے شکوے اور ناراضگیاں زندہ انسانوں کے ساتھ ہوتی ہیں اور اس کے بعد تو بس افسوس ہی رہ جاتا ہے۔“ آغا جی نہ چاہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گئے تھے ڈاکٹر جلال کے سپاٹ چہرے پر ایک اضطراب کی لہر دوڑی، لیکن وہ اس موقع پر کچھ بھی نہیں بولنا چاہتے تھے اور ویسے بھی اب بولنے کے لیے کچھ تھا بھی نہیں ان کے پاس اس لیے کمرے میں ایک چیمنے والا ساٹا پھیل گیا۔



بہت سال پہلے ایسی ہی ایک افسردہ شام کو شائستہ بیگم نے تیمور اور بندیا کا نکاح خاموشی سے پڑھوا دیا تھا۔ اس کے بعد ہر وقت ان کے دل کو دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں کسی کو پتا نہ چل جائے لیکن دس دن گزرنے کے بعد آہستہ آہستہ وہ خود ہی مطمئن ہو گئی تھیں۔ تیمور جانے سے پہلے بندیا کا آئی ڈی کارڈ اور بہت سے کاغذات خاموشی سے بنوا رہا تھا۔ بندیا کے ہونٹوں پر بھی خاموشی کی مہر لگ گئی تھی۔ سؤیزی کی شادی کے بعد یہ دوسری شادی تھی جو خاصے عجیب حالات میں ہوئی تھی۔

”کل طیبہ اور صلاح الدین کا نکاح ہے۔“ ڈاکٹر جلال کی اطلاع پر شائستہ بیگم کا دل دکھ گئے گھرے احساس سے بھر گیا اور انہیں یقین ہو گیا تھا کہ ان کی قسمت میں اپنی اولاد کی شادی کی خوشیاں نہیں ہیں۔ کسی ایک کی شادی پر بھی وہ اپنے چاؤ پورے نہیں کر سکی تھیں۔ گھر میں طیبہ کے نکاح کی تیاریاں بے دلی سے شروع ہو گئی تھیں۔ تیمور اور اس کی ماں کے اعتراضات کو جلال صاحب نے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا تھا۔ اگلے دن گنتی کے چار لوگ آئے اور طیبہ کا نکاح بڑی خاموشی سے صلاح

الدین سے پڑھوا دیا گیا۔ ”میں ساری زندگی بابا سے بات نہیں کروں گی۔“ طیبہ نے نکاح نامے پر دستخط کر کے فلم غصے سے میز پر پھینکا۔

”اللہ تمہاری قسمت اچھی کرے۔“ بڑی اماں نے روتے ہوئے اسے دعا دی۔

”مت دیا کریں مجھے ایسی دعائیں“ آپ کی اولاد کو آپ کی دعا بددعا بن کر لگتی ہے۔“ طیبہ سخت قنوطیت کا شکار تھی۔ اسی وقت دروازہ دھڑک کر کھلا اور حواس باختہ انداز میں تیمور اندر داخل ہوا۔

”کیا بات ہے تیمور۔؟“ بڑی اماں اور طیبہ اس کا چہرہ دیکھ کر دہل گئیں۔

”صلاح الدین نے باہر ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔“ وہ سخت بوکھلایا ہوا تھا۔

”لیکن کیوں۔؟“ شائستہ بیگم کا دل دھک کر کے رہ گیا۔

”وہ کہتا ہے کہ ابھی اور اسی وقت رخصتی کروا کر لے کر جائے گا۔“ تیمور نے کمرے میں دھماکا کیا تھا۔

طیبہ نے خوف زدہ نگاہوں سے اپنی ماں کا چہرہ دیکھا۔

”یہ کیا بات ہوئی۔ اس کی باپ نے تو گارنٹی دی تھی کہ طیبہ کو تعلیم مکمل ہونے سے پہلے رخصتی نہیں مانگیں گے۔“ شائستہ بیگم کو غصہ آیا۔

”وہ کہتا ہے کہ گارنٹی میں نے نہیں میرے باپ نے دی تھی جبکہ نکاح تو میرے ساتھ ہوا ہے۔“ تیمور کا چہرہ ضبط کی کوشش میں لال ہو رہا تھا۔ طیبہ دہل کر اپنی ماں کے ساتھ چمٹ گئی۔ اسی وقت کھلے دروازے سے ڈاکٹر جلال اندر داخل ہوئے۔ وہ خود بھی اچھے خاصے پریشان لگ رہے تھے۔

”یہ تیمور کیا کہہ رہا ہے، کیا کہا ہے صلاح الدین نے؟“ انہوں نے گھبرا کر اپنے شوہر سے پوچھا۔

”کمینگی کر رہا ہے وہ۔“ جلال صاحب فکر مند انداز میں ٹھنکنے لگے۔ شائستہ بیگم کو اندازہ ہو گیا تھا کہ معاملہ خاصا سنجیدہ ہے۔

”بھلا یہ کیسے ممکن ہے، ابھی تو طیبہ کا میڈیکل کا

پہلا سال ہے۔۔۔ وہ بوکھلا کر بولیں۔

”لیکن اب بات تو مانتی پڑے گی۔ وہ لان میں دھڑنا دیے بیٹھا ہے اور ساری برادری کے لوگ اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔“ ڈاکٹر جلال کی بات پر طیبہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”بابا وعدہ خلافی کر رہے ہیں وہ لوگ۔۔۔“ تیمور ان کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

”تو کیا طلاق کا ٹھپہ لگوا کر گھر میں بٹھالوں اسے۔۔۔“ وہ ایک دم بھڑک کر بولے۔

”دے دے طلاق“ طیبہ کو لڑکوں کی کمی نہیں ہے۔“ وہ پہلی دفعہ باپ کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

”تمہارا دماغ خراب ہے“ میرا نہیں۔“ وہ استہزائیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

”تو ٹھیک ہے۔ اٹھا کر دے دیں اپنی بیٹی“ ان جاہل جنگلی لوگوں کو۔۔۔“ تیمور کا منہ سرخ ہوا۔

”مجھے جو کرنا ہو گا کر لوں گا“ تم اپنے مشورے اپنے پاس رکھو۔“ جلال صاحب بھی طیبہ کے سسرال والوں کا غصہ اس پر اتار رہے تھے۔ جب کہ تیمور کو اپنی بہن طیبہ کا سما ہوا چہرہ طیش دلارہا تھا۔

”ساری زندگی غلط ہی فیصلے کیے ہیں آپ نے“ اسی وجہ سے ڈیزی گھر سے بھاگ گئی اور بہت اچھا کیا اس نے جو اس جہنم سے نکل گئی۔“ تیمور مشتعل انداز میں بولا۔ اور ڈیزی کے نام پر ڈاکٹر جلال کا دماغ گھوم گیا اور انہوں نے چٹاخ سے ایک تھپڑ پوری قوت سے تیمور کے منہ پر دے مارا۔ وہ جو اپنے ہی دھیان میں کھڑا تھا، پیچھے دیوار کے ساتھ برے طریقے سے جا ٹکرایا۔

بڑی اماں اور طیبہ حواس باختہ ہو گئیں، جب کہ تیمور کے ہونٹوں سے ایک باریک سی لہو کی لکیر ٹھوڑی کی طرف بہنے لگی۔ اس نے سخت متفرنگا ہوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اس وقت ڈاکٹر جلال کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کسی دن وہ ایسے ہی ان کی زندگیوں سے بھی نکل جائے گا۔

جائے گا۔

”شرم آتی چاہیے آپ کو جو ان اولاد پر ایسے ہاتھ اٹھاتے ہوئے۔“ شائستہ بیگم بھڑک کر بولیں۔

”تم بھی اپنی زبان بند رکھو ورنہ۔۔۔“ انہوں نے انگلی اٹھا کر غصے سے دھمکی دی۔

”ایک دفعہ ہی ساری اولاد کو پھانسی کے پھندے پر لٹکادیں“ قطرہ قطرہ اپنی نفرت کا زہر کیوں پلا رہے ہیں انہیں۔“ وہ بھی اپنے حواس کھو بیٹھیں۔

”تم اپنا سامان پیگ کرو“ میں بوا کو بھیج رہا ہوں مدد کے لیے۔“ انہوں نے طیبہ کی طرف دیکھ کر حکم دیا اور کمرے سے نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی شائستہ بیگم طیبہ کو گلے لگا کر بلند آواز سے رونے لگیں، ان کے بین سن کر گھر کے ملازم تک سہم گئے تھے۔

اس دن طیبہ نے جب اس گھر سے قدم نکالا تو ساتھ ہی اس کے دل سے اپنے باپ کے نام کی ساری محبت بھی یہیں کہیں رہ گئی تھی، بس گلے شکوؤں کی ایک فصل یک کر تیار ہو گئی تھی۔ انہوں نے صلاح الدین کی حویلی میں قدم رکھ کر دوبارہ مڑ کر نہیں دیکھا۔ ڈاکٹر جلال شروع شروع میں اس سے ملنے جاتے تھے، لیکن وہ انہیں دیکھ کر کمرے میں بند ہو جاتیں اور ان کے جانے کے بعد ہی دروازہ کھولتیں۔ حویلی میں طیبہ کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں ہوتا تھا، جلال صاحب تک یہ خبریں پہنچتی تھیں تو وہ بے چین ہو جاتے، صلاح الدین عجیب عیاش قسم کے مزاج کا حامل بندہ تھا، لیکن اس کے سر نے ایک وعدہ نبھایا تھا اور وہ طیبہ کی تعلیم کا تھا۔

اپنی میڈیکل کی تعلیم کے دوران وہ دو بیٹوں کی ماں بنیں اور پھر ہاؤس جاب کر کے انہوں نے اپنی میڈیکل کی ڈگری کو تالا لگا کر کسی ایچی کیس میں چھپا دیا تھا۔ طیبہ نے پورے دس سال کے بعد اپنی ماں کی بیماری کے بعد دوبارہ اس گھر میں قدم رکھا تھا اور تب بھی اپنے باپ سے سلام دعا کیے بغیر واپس آ گئی تھیں۔ بڑی اماں کے بار بار مجبور کرنے پر وہ کبھی کبھار میکے آ جاتی تھیں، لیکن باپ سے ناراضی کا پڑا اب ایک تناور درخت کی

صورت اختیار کر چکا تھا۔

بڑے ابا، دل ہی دل میں طیبہ سے خاصے شرمندہ تھے اور اس چیز کا دوا کرنے کی کوشش کرتے، لیکن طیبہ کے دل پر جمی کدورت کسی صورت بھی کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اس کا اپنے بھائی تیمور سے اس کی شادی کے بعد بھی رابطہ رہا اور وہ اکثر بندیا سے بھی فون پر بات کر لیتی تھی، اسے تیمور کی شادی سے کوئی مسئلہ نہیں تھا بلکہ بینش کے ساتھ تیمور کی شادی نہ ہونے پر اس نے باقاعدہ شکرانے کے نوافل پڑھے تھے۔ اپنے بیٹوں اشعر اور سرمد کے جوان ہونے کے بعد طیبہ کے حالات خاصے بدل گئے تھے۔ سرمد کا اپنے ننھیال سے خاصا لگاؤ تھا اور وہ اکثر ہی بڑے ابا کے گھر میں پایا جاتا تھا جبکہ اشعر بی ایچ ڈی کرنے آسٹریلیا گیا ہوا تھا، لیکن طیبہ کے اپنے باپ کے ساتھ تعلقات اتنے سال گزرنے کے بعد بھی سرد مہری کا شکار تھے۔



بخاور اس دن الراساؤنڈ کروا کر آئی تو کچھ چپ چپ سی تھی کیونکہ وہ ایک دفعہ پھر بیٹی کی ماں بننے جا رہی تھی، حالانکہ اسے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ اس بار اللہ اسے اپنی نعمت سے نوازے گا۔ اس نے بے شمار دعائیں اور وظائف کیے تھے۔ اس خبر کے بعد وہ خاصی اداس تھی اور اس نے ہمیشہ کی طرح نیلم کے پی ٹی سی ایل نمبر پر کال ملائی اور بے اختیار اس کے سامنے رو پڑی۔

”بخاور یا گل تو نہیں ہو گئی ہو، تم سے مجھے اس جہالت کی ہرگز توقع نہیں تھی۔“ نیلم نے اسے جھاڑا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

”یار! اللہ نے پہلے بھی تو مجھے دو بیٹیاں دی تھیں کیا تھا جو اس بار۔“ بات کرتے کرتے اس کا دل بھر آیا۔

”بخاور! اللہ جسے چاہتا ہے بیٹے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹیاں۔ تم نے یہ آیت نہیں پڑھی کیا۔“ نیلم نے اسے دلاسا دیتے ہوئے پوچھا۔

”پڑھی ہے یار، لیکن اس کے اختیار میں تو ہر چیز

ہے نا۔“ وہ ابھی بھی گلہ کرنے سے باز نہیں آئی۔

”تو پھر اللہ کی رضا میں خوش ہو جاؤ۔ وہ ان شاء اللہ تمہاری یہ خواہش بھی پورے کرے گا۔“ نیلم اسے نرم لفظوں میں سمجھا رہی تھی۔

”میں اپنے لیے نہیں ہاشم کے لیے کہہ رہی تھی۔“ اس نے فوراً ہی تصحیح کی۔

”اسے بھی پیار سے سمجھانا وہ سمجھ جائے گا۔“ نیلم نے سنجیدگی سے کہا تو وہ سر ہلا کر رہ گئی، نیلم سے بات کر کے اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ اسی لیے وہ مچن میں آکر رات کا کھانا تیار کرنے لگی۔

”خیر تو ہے، تم کچھ چپ چپ سی لگ رہی ہو مجھے۔“ ہاشم نے کھانا کھا کر نشو و ہاتھ صاف کرتے ہوئے اس کا بھجا بھجا سا چہرہ دیکھا۔

”ویسے ہی کمر میں درد تھا میری۔“ بخاور نے نہ جانے کیوں یہ بات ہاشم سے چھپالی۔ وہ اسے وقت سے پہلے دل گرفتہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”تم سے ہزار دفعہ کہہ چکا ہوں کہ جاب چھوڑ دو، پتا نہیں تم کیوں ابھی تک اس جاب سے چمٹی ہوئی ہو۔“ وہ بے زاری سے گویا ہوا۔

”ہاں اسی ہفتے ریزائن کروں گی۔“ خلاف توقع وہ فوراً ہی مان گئی۔

”ایک فل ٹائم ملازمہ کا بھی بندوبست کیا ہے میں نے تمہارے لیے۔ تم دو سراسر اکمرہ اس کے لیے سیٹ کرو۔“ ہاشم کی اگلی بات نے اسے حیران کیا۔

”وہ کیوں بھلا۔۔۔؟“

”سارے دن میں گھر میں نہیں ہوتا، خدا نخواستہ تمہاری طبیعت خراب ہو گئی تو۔۔۔؟“ وہ پہلے کی طرح اس کا خیال کرنے لگا تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ بخاور کا ذہن الجھا ہوا تھا اس لیے وہ بحث کیے بغیر مان گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



اس کی کہانی وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں پر کہانیاں ختم ہوتی ہیں۔ وہ آنکھوں میں اداسی لیے آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ آئینہ میلا تھا۔ اور اس کے سامنے کھڑے سارے عکس دھندلائے ہوئے تھے۔ وہ آئینوں سے عکس جڑانے کی کوشش میں تھک گئی تھی جبکہ خود اس کا عکس کہاں واضح تھا؟ زندگی، کہانی، دھندلی تھی۔ وقت کی لپیٹ میں سب کچھ میلا تھا۔ اور کئی تنہائیوں کا بوجھ اٹھائے وہ اکیلی تھی۔

وہ۔ وہ جو ادب کے آسمان کا درخشاں ستارہ بن کر چمکنا چاہتی تھی اور جس نے خوابوں کی روشنی میں ماحول کو چمکانا چاہا تھا۔ بہت سے ستاروں کے جھرمٹ میں ایک ستارہ ادب کے آسمان پر چمکنا تھا۔ ستارہ جو سمت بتاتا تھا۔ اسے بھی اپنی سمت کا تعین کرنا تھا۔ ماضی، ماضی، پھر ماضی، کسی حقیقت نے اسے جھٹکا دیا تھا۔

”میں تمہیں پچھلے چھ منٹ سے آوازیں دے رہا ہوں، سنتی ہو؟“
”تم کبھی مت بدلنا۔“ ہمیشہ والا رعب ہمیشہ والی

سردار المنتہی

وہ حسرتی سفر تھا

سے۔ ”شکایت پر زور تھی ملجہ ملا متی۔“
”کتابیں تم جیسوں کی ہی زندگی سناتی ہیں اور کہانیاں تم جیسوں کی سختیوں اور بے رحمیوں کے باب ہی سے جینتی ہیں۔“
”مجھے تمہاری کن ترانیوں کی پروا نہیں ہے۔“ وہ دھاڑا۔

”جب دلیل نہ دے سکویا جواب نہ ہو تو چیخا چلایا مت کرو۔“ حالانکہ وہ تو دھاڑا تھا۔

اکڑ۔ ایک مرد کا اچھا ہونا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔
”جو نوجوانی میں نہ بدلا، وہ بڑھاپے میں بدل کر کیا کرے گا؟“ اس نے جھٹا کر دریافت کیا۔
”اپنے خیالوں سے باہر نکلو اور گھر پہ توجہ دو۔“
”تم آج کل کچھ زیادہ چڑچڑے نہیں ہو رہے؟“
حالانکہ وہ تو شروع سے ہی ایسا تھا۔

”میں تو سمجھا تھا وقت کے ساتھ ساتھ تم بدل جاؤ گی، نکل آؤ گی اس کتابی دنیا سے، ان کتابی خیالوں

”مجھے تم سے کبھی اچھے کی امید ہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔“ اس نے تولیہ کرسی کی پشت پر زور سے مارا تو کپڑے کی تہہ میں چھپی منوں جیسی مٹی کی لہر بگولے کی طرح اڑ کر اس کی ناک تک پہنچی اور اسے اس معمولی سے گرد سے کھالسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔

”پتا بھی ہے کتنی سخت الرجی ہے مجھے، ہر وہ کام ضرور کرنا جو مجھے تکلیف دیتا ہو۔“ لہجے میں کیسی ٹوٹ پھوٹ تھی۔ دکھ تھا، جیسے کوئی شیشے کا گلاس کرچی کرچی ہوتے وقت سسکیاں لیتا ہے اور جیسے کرچیاں معمولی سے ارتعاش کے ساتھ فرش پر بکھرتی ہیں اور چھن سے بچھ جاتی ہیں۔ لہجہ زکام کے زیر اثر ٹھنڈا بھیگا ہوا، جنوری کی ٹھنڈ کا مارا ڈھیمہ تھا۔

قدوس نے زہر بھری نگاہ تے ہوئے جڑے میں بھنچی ہوئی ترشی تیزی مار دینے والی سخت کڑک نظر سے دیکھا تھا۔

”تم میرے لیے ہمیشہ ہی جان کا آزاری رہو گی۔“ الماری کے پٹ کو زور سے کھولا۔ تڑاخ سے بند کیا۔ دل چاہ رہا تھا یہ تڑاخ اس پر بر سادے اور کئی بار برسائی بھی۔ مگر اس کے گھر چھوڑ جانے کے بعد جو گھر پر تھوڑی بہت نظر ڈالی جاتی تھی، اس کی نظر میں وگرنہ گھر کی چھوٹی بڑی ذمہ داریاں اس کے سر تھیں وہ کون دیکھتا۔

اسے بس لکھاری کا لکھنا، پڑھنا اور دو گھڑی کا سکون غصہ دیتا تھا۔ شوہروں کی بھی عجیب نفسیات ہوتی ہے۔ بیوی چھ گھنٹے کی دی کے سامنے بیٹھی رہے تو جائز۔ سو بار دن میں سبج دھج کرے تو فطرت۔ کئی گھنٹے محلے اور خاندان بھر کی شکایتیں سنائے تو ملامت بھلا ہٹ۔ اور اگر دو گھنٹے ایک کتاب لے کر بیٹھ جائے۔ کاغذ قلم کے ساتھ چار دن گزارے، حالات حاضرہ پر نظر ڈالے، کسی عالمی مسئلے پر بحث کرے تو اپنے دائرے سے نکلتی نظر آتی ہے۔



عورت کی دلیل جتنی مضبوط ہو مرد کا شعور اندر سے

سم جاتا لگتا ہے۔ وہ بیس سال سے اسی ایک ماحول میں اسی فطرت کے مرد کے ساتھ جی رہی تھی۔ دنیا بدلی ہو تو بدلی ہو۔ دنیا میں کوئی سو میں دو مرد اچھے مزاج کے ہوں تو ہوں۔ مگر عبد القدوس تو اسے لگا پیدائشی ایسا تھا اور مرتے دم تک اسی فطرت و مزاج کا رہے گا۔ ایک مرد کے بدلنے کی خواہش اب اس کے اندر دم توڑ چکی تھی۔ اب صرف گزارہ کرنا تھا۔ دن تمام کرنے تھے۔

”کس عقل مند نے مشورہ دیا تھا تمہیں جو شادی جیسا ڈھول گلے میں ڈال لیا۔“ زہرہ نے خود چار رشتے ٹھکرائے۔ مانا کہ تنہائیوں کا شکار تھی مگر کبھی بہت آزاد۔ مرضی سے آنا جانا باہر نکلنا اس ہر وقت کے جھنجھٹ سے تو آزاد تھی۔ حالانکہ بہت سی خواہشیں اس کے اندر بھی سر اٹھاتی تھیں۔

جب لوگ اس پہ جملے کتے سٹھیا گئی ہے۔ توبہ، اف بے چاری۔ اکیلی ہے، جو کماتی ہے بھتیجیوں، بھانجیوں پر لٹا دیتی ہے۔ اس کے باوجود بھی کہنے ایک نہیں مانتے مجال ہے جو کبھی سینہ تان کر کہا ہو خالہ ہمارے لیے کیا کیا جتن کرتی ہیں۔ یا پچھپی نے اپنی کئی ضرورتیں مار کر ہماری ضرورتیں پوری کی ہیں۔ بھانجیوں کو شکایت تھی کہ بھتیجیوں پر سب لٹا دیا۔ اور بھتیجیوں کی طرف سے یہ کہ بھانجیوں پر تو جان چھڑکتی ہیں۔ بھتیجیوں کا احساس نہیں ہے، بھائی ریشاڑ منٹ کو آپہنچا ہے، دو عمرے ایک حج کر چکی ہے، یہ نہیں کہ اب بھائی کے نام کر دے زمین کے چار ایکڑ یا سونے کا سیٹ بڑی بھتیجی کو دے تو جینز بنانے میں آسانی ہو۔

ادھر بہن کی یہی شکایت۔ سونے کی انگوٹھی بھی بھیا کو دے دی، کڑے گروی رکھ لیے۔ میں تو جیسے کچھ ہوں نہیں اس کے لیے بہن ہوں۔ وہ اب بھی فون پر یہی فسانے سنار ہی تھی۔ نور کو۔ اور وہ نور فاطمہ نام کی ماں باپ کی اکلوتی لاڈلی، جس کا خود کوئی اکلوتا لاڈلا نہیں تھا۔

شوہر نے تب ہی دو سری شادی کر لی، مگر وہ بیوی نہ اسے جھیل سکی، علیحدگی ہو گئی، بچے اسی کے پاس

تھے۔ جو باپ کو پوچھتے تھے نہ تھے اور باپ نے کون سا ہاتھ رکھا سر پہ خرچے کے لیے چار پیسے کبھی نہ دیے۔ نہ پیار کی پھسکی جو ان کو خالی خولی چاہیے بھی نہ تھی۔ بیٹی ڈاکٹر تھی اور بیٹا سرکاری ملازم، مگر دونوں جھوٹے منہ نہ پوچھتے کہ ہمیں کون سا باپ نے سنبھالا تھا جو ہم اس کا خیال کریں گے۔

تیسری شادی کیوں نہ کرتا عبد القدوس اگر اسے لڑکی ملی ہوتی یا پھر کما کر کھلانے کا دم خم ہوتا۔ اور اب بھی کون سا نور فاطمہ کی کوئی ذمہ داری تھی اس پر شروع سے لگا بندھا خرچہ بھی گھر کے لیے مشکل سے دیتا اور اب بھی وہ آدھے سے زیادہ بوجھ اٹھائے ہوئے تھی۔ خرچہ بھی کم تھا۔ دو افراد تھے کل اگر چاہتے تو سب کچھ تھا زندگی کے لیے۔ بس گاڑی تو اچھی چل رہی تھی۔ مہینے کا آدھا راشن لاتا اور بجلی کا بل ادا کرتا۔ اس کے علاوہ اسے ایک دھیلا تک نہ دیتا تھا۔

وہ اپنے ساتھ اس کے لیے بھی سال کے چار چھ جوڑے بنواتی تھی چھپیل لاتی۔ موسم کے سرد گرم کپڑوں کا اضافہ نہ کرتی۔ وہ ناشکرا اور ناقدر پھر بھی یہی کہ فلاں چیز تو لنڈے سے لائی ہو۔ اس کی پلاسٹک تو خود بتا رہی ہے۔ کپڑا خود اپنی حیثیت پہ چیتا ہے۔ اور وہ یہی کہتی کہ کھڑکی کھلی ہے۔ پھینک دو بے شک یا گلی کے چوکیدار کو دے دو۔ ثواب ملے گا۔ وہ احسان کر کے کہتا۔ ”اب لائی ہو تو کیا دوں پہن لیتا ہوں۔“ لے لیتا۔

آدمی نہیں آسیب تھا اور مسلط بھی۔ وہ سخت بے زار پھر زہرہ کی بات پر عمل کیا، پچھلے سال سے اس کے لیے کچھ نہ خریدا۔ اس لیے اس کا رویہ خراب سے خراب تر ہوتا گیا۔ ہر وقت نکتہ چینی کی تو عادت ہی تھی اب تو جتنا وقت وہ گھر پر گزارتا اسے نہ بچ کیے رہتا۔ تیز آواز میں گانے لگا دیتا۔ ٹی وی چلا دیتا۔ یا پھر فون پہ نت نئے نمبر پر بھولی بھالی معصوم لڑکیوں کے مزید دماغ خراب کرتا رہتا۔ وہ کڑھتی رہتی۔ سوچتے سمجھنے کی صلاحیت سے وہ محروم تھا۔ بکتا جھٹکا کمرے سے باہر نکلتے ہوئے روم اسپرے کمرے کی

کھڑکیوں دیواروں پہ مارتا نکل گیا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے کھانستی ہوئی لاؤنج تک آئی تو وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر باہر نکل گیا تھا۔ اور حسب توقع یہی وقت تھا جب زہرہ کی کال آئی تھی اس دوران اسے پتا تھا وہ بار بار فون کر کے نمبر چیک کرے گا کہ کس سے بات ہو رہی ہے۔ پھر جب وہ جواباً ”فون کرے گی تو وہ جان بوجھ کر اپنا فون مصروف کر دے گا“ یا بند۔ اسے زچ کرنے اور تنگ کرنے کا کون سا موقع ہوتا جو وہ جانے دیتا۔ وہ بھی چار سن کر تین سنا دیتی تھی۔

”سچ پوچھو تو زہرا! اب عمر کے باقی سال سکون سے گزارنا چاہتی ہوں۔ بے زار آگئی ہوں اس جہنم جھٹ سے۔ جی چاہتا ہے کہیں دور نکل جاؤں۔ صحراؤں، وادیوں، جنگلوں میں۔ جہاں کم از کم عبد القدوس کی پہنچ نہ ہو۔“

”ٹھیک کہتی ہو۔ چلو نکل چلیں۔“ وہ بھی زندگی سے بے زار تھی۔

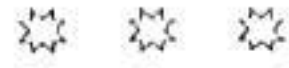
”اپنے ہیں یا جانی دشمن۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی تلوار لٹکائے رکھتے ہیں۔ میں نے تو اب کسی کو کچھ نہ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے کوئی ٹھیکہ لے رکھا ہے کیا۔ اب تو بس کوستے رہیں۔ مجھے نہیں پرواہ۔ یہی کہیں گے کہ کمپنی نے کچھ نہ دیا، ہمیں۔ ایسے ہی مر گئی۔ مرنا تو ہے کیوں نہ زندگی کے چند سال میں بھی مرضی سے جیوں۔ خود پر خرچ کروں۔ وہ جو ٹرپ جا رہا ہے نا دئی۔ میں بھی بس تیاری پکڑتی ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے، چلو ایک ساتھ نکلتے ہیں۔“

”چھوڑو زہرہ۔ میرے ساتھ تو عبد القدوس جیسا جہنم جھٹا لگا ہے۔ گھر میں اور بات ہے ہمیں باہر جا کر اپنی رہی سہی عزت بھی مٹی کرنے سے کیا فائدہ۔ چار لوگ عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں کافی ہیں۔“

”اچھا چلو چھوڑو۔ جانے دو۔ یہ بتاؤ کوئی کہانی لکھی۔“

”کیا بتاؤں یار! کتنی کہانیاں ادھوری ہیں۔ یار زہرہ اب کہانی مکمل کرنا جان جو کھوں جیسا کام بن گیا ہے۔“

”چھوڑو نور یہ سستی۔ قلم اٹھاؤ تو سہی۔“ یاد ہے اپنے دور کی کامیاب ترین لکھاری رہ چکی ہو بلکہ اب بھی ہو۔ لفظ تو ایسے جھڑتے ہیں تمہارے قلم سے جیسے۔۔۔



وہ اسے لفظوں کے اس دور میں لے گئی جب لفظ واقعی احساسات سے پر تھے، لفظوں میں احساس کی روشنیاں جگمگاتی تھیں۔ سفر کتنا عجیب اور دلچسپ تھا۔

اسے یاد آیا پہلی کہانی تب لکھی جب اسے لکھنا نہیں آتا تھا۔ سفر تھا حقیقت سے کہانی کا، اور کہانی سے کیش کیے ہوئے سچ کا سفر تھا، خواب سے روشنی کا۔ سفر جواب زندگی کی آخری سیڑھی کو چھو رہا تھا۔ اب جب اس کے بالوں میں چاندی چمکنے لگی تھی۔ اب جب حافظہ قدرے کمزور تھا۔ ہاتھ کپکپاتے تھے ذہن ٹھکن سے چور تیند کے خمار سے شل دوائیوں کے زیر اثر سویا رہتا۔ اور گھر کے کام منہ کھول کر کھڑے ہوتے اور عبد القدوس کا منہ بند کون کرتا۔

ایسے میں وہ اسے یاد دلارہی تھی۔ ”تم جو ادب کے آسمان کا درخشاں ستارہ تھیں مجھے آج بھی یاد ہے تمہاری پہلی کہانی۔ اس ریگستانی بوڑھے کی جو ٹھہر کی ریت میں شام ڈھلے بیٹھ کر لوک داستان سناتا تھا۔ جیسے بچے کو لوری دی جائے۔ ویسا سکون ملتا تھا۔“

اسے یاد تھا جب اس کی پہلی کہانی، کتنی پھیلی ہوئی بے ربط سی، بے ترتیب سی بے ڈھنگی لکھائی۔ مگر لکھائی کا کیا۔ وہ تو آہستہ آہستہ ننھے ستاروں میں تبدیل نہ بھی ہوتی تو لفظوں کا طلسم تو بڑھتا جا رہا تھا۔ کہانی نہ چھیننے کے ڈر سے باہر نکل گئی تھی۔ اور کہانی لینے کے لیے پرچوں سے ہر ماہ کئی فون یا ٹیکسٹ میسج آتے تھے۔

مگر اب۔ جب داستان اپنا روپ بچھائے سوتی بنی تھی۔ خوابوں نے اپنا ڈیرہ بدلا تھا۔ کہانی جب خواب

کے دیس سے لفظ چرالاتی تھی۔ اب تو اس کے پاس کوئی دیا نہ تھا۔ کہ احساس جب محبت کا دم بھرتے ایک ساتھ ٹولیوں کی طرح سیلیوں کی صورت اڑتے، آسمان کے نیچے ہاتھ پھیلاتے، ایک ساتھ گھر کو جاتے، پرندوں جیسے پھڑپھڑاتے تھے۔ جملے تو اودھم مچاتے تھے۔ جملے جادوئی سحر تھے۔ تتلیاں پھولوں سے رنگ چرالائیں اور کہانی خواب سے، گھر کے مسائل سے، نیند کے لیے تیار کھڑی ہوتی تھی۔ کہانی فضاؤں، خلاؤں میں اڑنے، سمندر میں تیرنے، زمین پر رقص کرنے، تھرکنے ناچنے لگی تھی۔ خوابوں کے پراونچے تھے۔ خواب کے دل مکانوں کے پنجروں میں دانہ چکنے لگے تھے۔

کہانی، جوانی کی دہلیز پر ہجر کے ذائقے سے بھی آشنا ہوئی اور گھر کی مصروفیتوں میں دب گئی مگر ایک جھٹکا لگتا تھا گاڑی کو۔ دھکا ایک ہی کافی۔ کہانی پھر سے دم بھرنے لگتی۔ ماں کے انتقال کے بعد باپ نے اسے شادی کے لیے منالیا۔ اور قسمت پھولی جب عبد القدوس سے نکلتے کے ساتھ بیاہ کر گئی۔ شروع شروع میں ضبط کیا۔ گھر بنانے کی چاہ بھی تھی۔ اور لوگوں کی باتیں سننے کی سکت نہ پا کر خود کو مضبوط کیا۔ اس کے سدھرنے کی چاہ بھی تھی۔ چھ سال ہوئے بد بختی کہیں یا خوش بختی کہ اولاد کی بھاری ذمہ داری نہ پڑی۔ عبد القدوس تو ویسے بھی دوسری شادی کے لیے پرتول رہا تھا پھر اس نے کر بھی لی۔

شروع شروع میں ایک گھر میں ساتھ رہائش تھی۔ دوسری بیوی کو اس سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ سو گھر الگ کیا۔ اس کی ناز برداریاں عروج پر تھیں۔ دو سال بعد بیٹا۔ اور پھر بیٹی کی پیدائش۔ مگر عبد القدوس کا ستارہ گردش میں تھا وہ کہاں کہاں کر خروچہ پورا کرتا۔ نوکری چھوڑنے کے بعد آوارہ پھرتا تھا۔ بیوی روٹھ کر میکے چلی گئی۔ مکان جو کرائے کا تھا، مالک مکان نے خالی کرالیا۔ خوب زور دار جھگڑا ہوا۔ بیوی نے خلع کے لیے نوٹس دیا۔ وہ بھی مجبور تھی۔ اس جیسے مرد کے ساتھ گزارا کرنا واقعی مشکل تھا۔ وہ واپس اسی گھر میں

آپڑا۔

”لو خوش ہو جاؤ۔۔۔ میرا گھر تمہاری بددعاؤں نے برباد کر دکھایا۔“ وہ منہ کھولے دیکھتی رہ گئی۔

اس سے نیکی کی توقع بے کار تھی۔ جی میں آیا کہ سامان اس سمیت گلی کے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دے۔ مگر رحم بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ جو اس کے پاس وافر مقدار میں موجود تھا۔ اس نے اسی سے کام لیا اور ساتھ ترس ملا لیا۔ ہمدردی تو از خود اضافی تھی۔ بس پھر کیا ہوا، بھگت ہی رہی تھی۔

اور زہرہ کہہ رہی تھی۔ ”کہانی لکھو۔ موڈ میں آؤ۔“

گھنٹہ پورا ہوا فون بند ہوا۔ وہ رکھ کر اٹھی۔ گھر کے چھوٹے موٹے کام نبھانے باقی تھے۔ کپڑے دھونا، استری کرنا۔ جھاڑو پونچھ تو چھینکوں سے مار دیتی تھی، کئی ادبی پرچوں کے ایڈیٹوریل میں نام نہ کام تھا۔ جو کر کے دینا تھا۔ اس نے سر جھٹکا۔ صبح اسکول جانا تھا۔ بچوں سے سر کھپا کر داغ پلپلا ہو جاتا تھا۔ اور وہ کہہ رہی تھی۔

”کہانی ہو جائے۔“

”زہرہ بھی ناں۔ بالکل پاگل ہے۔“ وہ مسکرا دی۔ کہانی اس کے ذہن میں چونچ پھر بھی مارتی رہی تھی۔

اف یہ پہلے کی شہرت کی چاہ۔ بعد کی ذمہ داری۔ اور آخر کار خالی پن۔ زہرہ نے بھی کیا سوچ کر اس سے وعدہ لیا۔ تازہ افسانے کا۔ اور اس نے وعدہ کر بھی لیا۔

رات کی ٹھنڈک نے ماحول کو خواب آور بنایا ہوا تھا۔ عبدالقدوس اپنی آوارہ گردیوں میں اب تک مشغول تھا۔ وہ کھڑکی میں آکھڑی ہوئی تو ٹھنڈی ہوا کا جھونکا چہرے سے ٹکرایا۔ کانڈ فلم بکھرے تھے۔ میز بھری بڑی تھی۔ ادھوری تو کئی کہانیاں تھیں۔ اور وعدہ اپنی حیثیت جتا رہا تھا۔ کہانی کو چھیڑنا چاہا جو کھٹنے سے آگئی۔ اس نے چوما۔ ساتھ لگایا خیال کو۔ کانڈ فرش

سے سمیٹے تھے۔ نیند پوری طرح تیار کھڑی تھی۔ آواز دے رہی تھی۔ مگر وعدے نے کہا آج نہ سونا۔ اس نے جمائی لے کر کھڑکی سے سر نکالا تو ایک یاد تازہ ہوئی۔ وہ جیسے کہانی کو آواز دے رہی تھی۔

اسے یاد آیا جب وہ آٹھ سال کی تھی۔ کندھوں پر بستہ اٹھائے سر کنارے چلتی ہوئی اور ایک سفید کالی لکھائی سے بھرا کانڈ اڑتا ہوا کنارے آگیا، بس پتے کی طرح ہوا سے اڑ کر نہ ڈوب جاتا اگر وہ اٹھاتی نہیں۔

کانڈ نے اس کے ہاتھوں میں ٹھنڈی آہ بھری جیسے۔ وہ گھر آئی۔ کانڈ پر لکھی تحریر ادھوری تھی۔ اور اس نے ادھوری کہانی کو مکمل کیا۔ تب جب اسے لکھنا بھی نہیں آتا تھا۔ بوڑھی لکھاری کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں روشنی نے جھانکا گویا زندگی ابھری تھی، کہانی جو نسل در نسل چلتی تھی جو مرتی نہ تھی۔ بستہ اٹھائے شاید کوئی نیکی۔ امید کا سرا جو ہاتھ آگیا۔ آئینے میں تھکے ہوئے عکس نے مسکان پھینکی تھی۔ کھڑکی سے تازہ ہوا نے جھانکا۔ لکھاری نے ادھوری کہانی کا صفحہ ہوا کے زور پر روانہ کیا۔ کہانی نے کہا۔ وہیں۔ جہاں سے شروع ہوئی تھی۔

✽

مصحف

عمرہ احمد



قیمت - 300/- روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، اردو بازار، کراچی

میں ستارہ..... کچے گھر میں رہ کر فلم اشار بننے کا خواب دیکھنے والی لڑکی کی ہوش ربا کہانی

فلمی دنیا کے چمکتے دسکتے خواب نگر میں ستارے کیسے شہرت کے آسمان پر جھکاتے اور پھر کیسے نوٹ کر زمین پر گرتے ہیں یہ ایک دلچسپ مگر عبرت ناک معرکہ ہے۔ وحید مراد سے روجی بانو تک کتنی ہی بار یہ داستان دہرائی گئی ہے۔ اس موضوع پر فائزہ افتخار نے پاکستانی فلم انڈسٹری کے عروج و زوال کے پس منظر میں ٹی وی دن کے لیے عشق کی ایک ناقابل فراموش داستان، ڈرامہ سیریل "میں ستارہ" تخلیق کی ہے۔ جو 17 مارچ 2016 سے نیلی کاسٹ کی جائے گی۔ ٹریا کچے گھر میں رہ کر فلمی ہیروئن بننے کے خواب دیکھتی ہے۔ بچپن ہی سے اُسے ناچنے گانے اور اداکاری کرنے کا شوق ہے۔ ماں کے ساتھ کام پر جاتی ہے۔ ماں کی ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود جہاں موقع ملے ٹی وی پر فلمیں دیکھنے بیٹھ جاتی ہے۔ اتفاقاً ٹریا کی ماں کو اپنے وقت کی مشہور ہیروئن اور گلوکارہ جبرنا بیگم کے گھر میں فل ٹائم ملازمہ کی نوکری مل جاتی ہے اور اسکا پورا گھرانہ سرونٹ کو انٹر میں شفٹ ہو جاتا ہے۔ جبرنا کا شوہر فرہاد سٹیفھی ایک مشہور ڈائریکٹر ہے جو ٹیلی ویژن سیریلز میں نام پیدا کرنے کے بعد پہلی بار فلم ڈائریکٹر کے طور پر میدان میں اترتا ہے۔ اُسے اپنی بیوی جبرنا کا بھرپور مالی تعاون حاصل ہے جو اسکی فلم کی پروڈیوسر بھی ہے۔ فرہاد نے جبرنا سے اس وقت شادی کی تھی جب جبرنا اپنے کیرئیر کے عروج پر تھی اور وہ خود صرف ایک خواب دیکھنے والا خوش شکل اور باصلاحیت نوجوان تھا۔ جبرنا عمر میں فرہاد سٹیفھی سے بڑی ہے، دونوں کی محبت کی شادی ہے۔ جبرنا کو اپنی ماس کی بیٹی ٹریا کا بھولا پن اور بھاگ بھاگ کر کام کرنا اچھا لگتا ہے اور وہ اس چھوٹی سی بیاری لڑکی پر مہربان ہو جاتی ہے جبکہ فرہاد سٹیفھی کو ٹریا ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ فرہاد سٹیفھی کی پہلی فلم کامیاب ہو جاتی ہے اور وہ اگلا تارہٹ فلمیں دینے لگتا ہے۔ اسی دوران 10 سال کا عرصہ گزر جاتا ہے۔ ملازمہ ٹریا ایک خوبصورت نوجوان لڑکی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی خدمت گزاری سے جبرنا بیگم کے بہت قریب آ جاتی ہے۔ جبرنا ایک دن ٹریا کو ریڈیو سے نشر ہونے والے فلمی گانے پر ڈانس کرتے دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ فرہاد سٹیفھی اپنی اگلی فلم کے لیے مشہور ہیروئن نسیم دلربا کو کاسٹ کرتا ہے اور اسکی فلم سپر ہٹ ثابت ہوتی ہے۔ اسی دوران فرہاد اور نسیم کے تعلقات کے چرچے ہونے لگتے

ہیں۔ جبرنا بیگم اس بات سے خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہے اور نسیم دلربا کو فلم سے نکلوانے کے لیے ایک منصوبہ بناتی ہے۔ وہ فرہاد کے سامنے ٹریا کے رقص کی تعریف کرتی ہے بلکہ ایک دن خود فرہاد بھی ٹریا کو ڈانس کرتے دیکھ لیتا ہے۔ جبرنا کے بے حد اصرار پر فرہاد سٹیفھی بادل ناخواستہ ٹریا کو ایکسٹرا کارول دیتا ہے جسے دو ڈانس کرنے ہیں اور کچھ ڈائلاگ بولنے ہیں۔ ٹریا کا فلمی نام ستارہ رکھا جاتا ہے۔ ٹریا فرہاد سٹیفھی سے بہت ڈرتی ہے اس لیے پہلی بار گھبرا جاتی ہے مگر جبرنا کے سیٹ پر آنے سے جلد سنبھل جاتی ہے اور اتنی زبردست پرفارمنس دیتی ہے کہ فرہاد سٹیفھی عشق میں کراٹھتا ہے۔ فلم کی ہیروئن نسیم دلربا ستارہ کے حسن اور اسکی کارکردگی سے خائف ہو جاتی ہے اور وہ ستارہ کو فلم سے نکلوانے کے لیے فرہاد سٹیفھی کو بلیک میل کرتی ہے کہ اگر اس نے اس معمولی سی نوکرائی کو فلم سے نہیں نکالا تو وہ کام نہیں کرے گی۔ ایک دن شوٹنگ کے دوران فرہاد اور نسیم کا زبردست جھگڑا ہوتا ہے اور فرہاد سٹیفھی غصے میں نسیم کو کھڑے کھڑے فلم سے آؤٹ کر دیتا ہے فرہاد چیلنج کے طور پر ستارہ کو فلم کی ہیروئن بنا دیتا ہے۔ ستارہ کے ہوش اُڑ جاتے ہیں مگر جبرنا اسکی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ فلم کی تیاری اور شوٹنگ کے دوران ایک جادوئی لمحے میں فرہاد سٹیفھی ستارہ کو دل دے بیٹھتا ہے، ستارہ بھی اسکی بے پناہ کشش سے نہیں بچ پاتی اور اس سے پیار کرنے لگتی ہے مگر اس کے دل دو مانغ میں ایک خوفناک جگہ چھڑ جاتی ہے کہ وہ اپنی محبت جبرنا بیگم سے بے وفائی کرے یا اپنے عشق کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کے پرچے اُڑا دے؟

فرہاد سٹیفھی کا عشق روز بروز جنون کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے اُسے ستارہ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ستارہ اُس کے دلہانہ عشق سے خوف زدہ ہو جاتی ہے۔

ستارہ کا گریز فرہاد سٹیفھی کے عشق کو پاگل پن میں بدل دیتا ہے اور ایک دن جبرنا بیگم پر اس عشق کا راز کھل جاتا ہے۔ یہاں سے کہانی ایک زبردست موڑ لیتی ہے۔

کیا ستارہ فلم گری پر راج کر پائے گی؟ کیا فرہاد اور ستارہ کے عشق کو منزل مل سکے گی؟ کیا جبرنا کی پیٹھ میں بے وفائی کا پتھر اتر جائے گا؟

سوکھے پھولوں جیسی محبت،

اک دن میں نے خواب میں دیکھا

دستِ غیب میں سوکھے پھول

پوچھا، مالک! سوکھے پھول؟

نداسی آئی

تیرے دل میں میری محبت

ان سوکھے پھولوں جیسی ہے

جانے کتنے موسم بیتے

جب بھی میں نے سوچا ہے

ان سوکھے پھولوں کو آنکھیں بھرا آتی ہیں

اپنے مالک سے میری محبت ایسی ہے؟

تب سے آج تک میں نے

اس کو ڈھونڈا بارش میں، نئے موسم کی آہٹ میں

باغوں میں کھیلانوں میں، دریاؤں طوفانوں میں

مہر و ماہ کی کرنوں میں، گرم دنوں دوپہروں میں

بادل اور ہواؤں میں، نابینا کی صداؤں میں

اب تو یہ بھی یاد نہیں ہے، کہاں کہاں ڈھونڈا

ہے اس کو

لیکن اک دن ملا وہ مجھ کو

اپنے دل کی ویرانی میں، درد بھری کہانی میں

اور اب کچھ ایسا ہے

ایسی دل کش پھوار پڑی ہے مجھ پر اپنے

مالک کی

میں تو بھیک گیا ہوں بالکل

مگر وہ سوکھے پھول ابھی تک میرے دل

میں زندہ ہیں

ان کو سوچ کے اب بھی

آنکھیں میری بھرا آتی ہیں

ڈاکٹر طاہر مسعود



عجیب شخص ہے خوش بھی نہیں خفا بھی نہیں
ہوا تھا دور مگر دور وہ رہا بھی نہیں

صوفی شہر میرے حق میں دعا کیا کرتا
خود تھا محتاج عطا، مجھ کو عطا کیا کرتا

مجھے پکارا ہے اس نے کہ میرا وہم ہے یہ
صدا سنی ہے درِ سچہ مگر کھلا بھی نہیں

اپنی آواز کے سنائے سے ہول آتا ہے
میں بیابانِ تمنا میں صدا کیا کرتا

میں ساتھ چھوڑ دوں اس کا کہ اس کو اپناؤں
وہ میرا دوست ہے، ناداں بھی ہے، بُرا بھی نہیں

محتسبِ جرم مرا دیکھ کے خاموش رہا
خود خطا کا رہتا، احکام سزا کیا کرتا

ہوا بکھیرے گی مجھ کو تو اور اچھا ہے
نہیں ہوں شعلہ مگر میں ابھی بجھا بھی نہیں

رفعتِ دار بھی چھولی تیری خاطر میں نے
منکر عہدِ وفا اور بتا کیا کرتا

یہ مرحلہ بھی بڑا خوش گوار ہے ساحل
کہ پھول شاخ پہ آیا بھی ہے، کھلا بھی نہیں
لطیف ساحل

خود فراموشی کے صحراؤں میں گم تھا محسن
کوئی اس بے خبر جاں سے گلہ کیا کرتا

محسن احسان

حکمت عملی

ڈراپ سین

”ہیلو۔ کیسی ہو تم؟“ بڑی چمکتی ہوئی آواز آئی۔
”کتنی دیر لگادی تم نے“ میں کب سے بیٹھی
تمہارے فون کا انتظار کر رہی تھی۔“
”ہاں بس! امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس
لیے کھانا بناتے ہوئے ذرا دیر ہو گئی۔“
”اچھا اور کیا حال ہے تمہارا۔؟“ جمائی لیتے
ہوئے پوچھا گیا۔

”میں بہت تھک گئی ہوں آج تو!“

”کیوں کیا کیا تھا؟“

”بس امی کے ساتھ بازار گئی تھی پوری گرمیوں
کی شاپنگ کر لی ہے۔“
”اچھا سنو! جس کام کے لیے فون کیا تھا وہ تو میں
بھول ہی گئی۔ اگر یا سمین سے بات ہو تو اسے کہنا کہ وہ
اپنی اور بج جارحٹ کی قمیص بھیج دے مجھے بھی ویسی
ہی بنوائی ہے۔“

”کون یا سمین؟ کون سی قمیص۔؟“

”کیا۔ مطلب کون یا سمین؟ وہ جو ایف اے میں
ہمارے ساتھ پڑھتی تھی۔“

”کیا عظمیٰ انہم تو میٹرک کے بعد اسکول گئے ہی نہیں
اور کون سی سیلی یا سمین؟“

”ارے بھئی کون عظمیٰ میں تو حیا ہوں۔ اور کیا تم
رباب نہیں؟“

”رباب۔؟ نہیں تو۔۔۔ میں تو سمعیہ ہوں۔“

”کیا یہ 021760201 نہیں ہے؟“

”سوری رائگ نمبر۔!!“

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

ایک آدمی اونچے درخت پر چڑھ گیا، پھر اس سے
نیچے نہیں اترا جا رہا تھا۔ لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔
مختلف طریقے آزمائے گئے۔ اسے مختلف مشورے
دیے گئے مگر وہ شخص ڈر کے مارے اترنے پر کسی طور
پر راضی نہیں ہوا۔ کسی نے مشورہ دیا۔ علاقے کے
بزرگ حکیم کو بلایا جائے۔ ہو سکتا ہے یہ شخص احترام
ان کی بات مان لے یا وہ کوئی کارگر طریقہ بتا دیں۔ حکیم
صاحب آئے۔ ان کے مشورے پر ایک موٹا رسا اوپر
چڑھے شخص کو اچھال کر فراہم کیا گیا۔

”اسے اپنی کمر کے گرد کس کر باندھ لو۔“ حکیم
صاحب نے مشورہ دیا۔ اس شخص نے باندھ لیا تو حکیم
صاحب نے نیچے کھڑے تین قدرے سمجھ دار آدمیوں
سے کہا۔

”رسا پکڑ کر زور سے کھینچو۔“ آدمیوں نے رسا پکڑ

کر کھینچا۔ وہ آدمی دھڑام سے نیچے آگرا اور گرتے ہی مر
گیا۔ لوگ گھبرا گئے۔ کسی نے شکوہ کیا۔ ”حکیم

صاحب۔۔۔! آپ نے ایک بے گناہ آدمی کو مار دیا۔“

حکیم صاحب سٹپٹا گئے۔ سوچتے ہوئے بولے۔

”یہ تو اللہ کی مرضی ہے۔ ورنہ میں نے بہت سے

لوگوں کو ایسے ہی کنوؤں سے نکالا ہے۔“

مرحاکل۔۔۔ درابن مکدن

ایک سے بڑھ کر ایک

ایک ڈاکٹر صاحب کالی وی خراب ہو گیا۔ انہوں
نے مکینک کو گھر بلا کر اسے چیک کروایا تو مکینک
نے صرف معائنہ کرنے کی اجرت پانچ سو روپے بتائی

اور کہا کہ اگر کوئی پرزہ خراب ہوا تو وہ آپ منگوائیں گے۔

گرگیا شاہ۔ کھڑپکا

عاجز فقیر

ایک خستہ حال دروازے کے سامنے فقیر نے صدا لگائی۔ ”اے نیک بی بی! کچھ کھانے کو ملے گا، بابا بھوکا ہے۔“
گھر سے کوئی آواز نہ آئی۔ فقیر دوبارہ عاجزانہ گویا ہوا۔

”اے بی بی! بابا روٹی بھی کھا لیتا ہے، چاول بھی کھا لیتا ہے۔ برگر بھی کھا لیتا ہے۔“
ایک دم گھر سے ایک کڑک دار نسوانی آواز سنائی دی۔ ”بابا جوتے بھی کھا لیتا ہے؟“
”نہیں بی بی! بابا کو سخت غذا منع ہے۔“ بابا نے اطمینان سے جواب دیا۔

ملائکہ کوثر۔ بسم اللہ پور

اہم شخصیت

ایک دفعہ میخائل گورباچوف ایک میٹنگ سے لیٹ ہو گئے تو اپنے شو فر سے بولے۔ ”جلدی کرو“
شو فر نے کہا۔ ”اگر میں گاڑی تیز چلاؤں گا تو قانون کی خلاف ورزی ہوگی۔“
چنانچہ گورباچوف نے اسے حکم دیا کہ تم پچھلی سیٹ پر بیٹھو اور خود اسینئرنگ سنبھال لیا ابھی وہ چند کلو میٹر ہی گئے تھے کہ گشتی پولیس نے دھریا سینئر آفیسر نے اپنے ماتحت کو بھیجا کہ وہ قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کو پکڑ کر لائے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پولیس والا آگیا اور کہا۔

”گاڑی والا اتنا اہم شخص ہے کہ اس کا چالان نہیں ہو سکتا۔“ پولیس چیف نے پوچھا۔

”وہ کون ہے؟“

”اس کا تو مجھے پتا نہیں لیکن کامریڈ گورباچوف اس کے شو فر ہیں۔“ پولیس مین نے جواب دیا۔

نمرائیم۔ کراچی

ملنسار ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بھئی تم تو ہم سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئے ہو۔ میں تین مریضوں کے معائنے کے صرف دو سو روپے لیتا ہوں۔“
”وہ تو تھیک ہے ڈاکٹر صاحب!“ مکینک نے مسکراہٹ کا تبادلہ کرتے ہوئے اطمینان سے کہا۔
”مگر ہم میں اور آپ میں یہ فرق ہے کہ ہم گارنٹی بھی دیتے ہیں۔“

حرمہ واجد۔ کراچی

صورت حال

مندى کے دنوں میں کپڑے کے کارخانے کے مالک نے دوسرے کارخانے کے مالک سے پوچھا۔

”کاروبار کیسا جا رہا ہے؟“

”بس تھیک ہی ہے کل ہی ہمیں پچاس ہزار تھان کی سپلائی کا آرڈر ملا ہے۔“ دوسرے مل اونر نے بتایا۔
”جھوٹ۔“ پہلے مل اونر نے فوراً کہا۔ ”میں یقین نہیں کر سکتا۔“

آج کل پچاس ہزار تھان کا آرڈر کہاں سے آسکتا ہے؟“

”اس میں یقین نہ کرنے والی کون سی بات ہے؟“
دوسرے مل اونر نے گویا برا مانتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی اس آرڈر کے کینسل ہونے کا لیٹر دکھا دیتا ہوں۔“
سیدہ نسبت زہرا۔ کھڑپکا

اطمینان

ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب بولے۔
”میں جب بھی کسی ٹیکسی میں بیٹھتا ہوں مجھے سب سے زیادہ فکر بریکوں کی ہوتی ہے۔“

”اس ٹیکسی میں بیٹھ کر آپ کو بریکوں کے بارے میں فکر مند ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس میں بریکیں ہیں ہی نہیں۔“ ڈرائیور نے اطمینان

گلشنِ حیات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
”سوئے ہوئے تم اپنے گھروں میں آگ (جلیتی
ہوئی) نہ چھوڑا کرو۔“

جیسا ہوگا؟
آپ نے فرمایا۔ ”ہاں! وہ شخص جس کی تمام گفتگو
اللہ کا ذکر اور خاموشی تفکر اور اس کی نظر عبرت آموز
ہو، وہ مجھ جیسا ہے۔“

خوفِ خدا،

اقوال حضرت علیؑ،

ابن الصمہ ایک بزرگ گزرے ہیں۔ انہوں نے
اپنے نفس کا حساب کیا تو ساٹھ برس ہوئے تھے۔
(ان کی عمر ساٹھ سال تھی) دونوں کا حساب کیا تو اکیس
ہزار چھ سو دن ہوئے۔ کہنے لگے۔
”اگر روز ایک گناہ سرزد ہوا تو اس طرح اکیس ہزار
چھ سو گناہ ہوئے اور اتنے گناہوں سے تیری رہائی کس
طرح ہو سکتی ہے جبکہ اس مدت میں ایسا دن بھی
شامل ہے جس میں ایک ہزار گناہ سرزد ہوئے ہیں۔“
پس خوف سے ایک نعرہ مارا اور گر پڑے۔ جب
ان کو دیکھا گیا تو وہ انتقال کر چکے تھے۔
شکفتہ یونس۔ لکی مروت

سیدنا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔
”جو آدمی اپنے دینی بھائی کی نیک نیتی پر شکر
نہ کرے گا وہ نیک کام پر بھی شکر ادا نہ کرے گا اور
چاہیے کہ پس پشت اس کی مدد و اعانت کرے اور طعن و
تشنیع کرنے والے کو اس کا جواب دے اور اسے اپنی طرح
تصویر کرے اور یہ بڑا ظلم ہے کہ کوئی اس کے دوست
کو برا کہے اور یہ چپ بیٹھا رہے۔ اس کی مثال اس
طرح ہے کہ اس کے دوست کی پٹائی ہمدی ہو اور
وہ بیٹھا دیکھتا رہے اور اس کی کچھ مدد نہ کرے۔“

کمینہ،

غلام سے سلوک،

یعنی بن خالد کا قول ہے کہ کریم جب پارسا ہوتا ہے
تو تواضع اختیار کرتا ہے اور کمینہ نادان جب پارسانی
اختیار کرتا ہے تو اس میں تکبر پیدا ہوتا ہے۔
فرعین ظفر۔ سیسی ظفر۔ کراچی

متکبر،

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ بیس برس تک میں
نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی۔ جو کام میں
نے نہیں کیا آپ نے اس کے بارے میں کبھی ارشاد نہیں
فرمایا کہ یہ کام کیوں نہیں کیا۔ البتہ جب حضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے اہل بیت میں سے کوئی مجھ پر میرے کام
پر غصا ہوتا تو آپ فرماتے اس کو معاف کر دو۔ اگر
تقدیر میں ہوتا تو یہ کام ٹھیک سرانجام ہوتا۔
شاہین رضوان۔ کراچی

شیخ یازید بسطامیؒ فرماتے ہیں۔ ”جب تک ایک
آدی کسی شخص کو بھی خود سے بدتر سمجھتا ہے وہ متکبر ہے۔“
دشال فرحان۔ کراچی

دکھ،

اللہ کا ذکر،

اللہ تعالیٰ جس کو اپنا آپ یاد دلانا چاہتا ہے اسے
دکھ کا الیکٹرک شاک دے کر اسے اپنی جانب متوجہ کر

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کسی نے دریافت
کیا۔ ”اے روح اللہ! کیا روئے زمین پر کوئی بشر آپ

لیتا ہے۔ دکھی بھی سے نکل کر انسان دوسروں کے لیے
نرم پڑ جاتا ہے۔
پھر اس سے نیک اعمال خود بخود اور بہ خوشی سرزد
ہونے لگتے ہیں۔ دکھ تو روحانیت کی میٹھی ہے۔ اس
پر صابر و شاکر ہی چڑھ سکتا ہے۔

(بانوند سیہ)

نوزیہ ٹریٹ، ہائینہ عمران۔ کراچی

شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے،

① دو چیزیں آپ کی فطرت کی وضاحت کرتی ہیں

آپ کا رویہ جب آپ کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔

آپ کا رویہ جب آپ کے پاس سب کچھ ہو۔

② اپنا پن تو ہر کوئی دکھاتا ہے... پراپنا ہے کون؟
یہ صرف وقت بتاتا ہے۔

③ اللہ کے خوف سے گرنے والے آنسو وہ واحد ذلیل
ہیں جو گرتے تو باہر ہیں... مگر صفائی اندر کی کر
ڈالتے ہیں۔

④ ریس میں جیتنے والا گھوڑا نہیں جانتا کہ کامیابی
کیلئے وہ دوڑتا ہے تو اپنے مالک کی طرف
سے ملنے والی تکلیف کی وجہ سے۔ تو جب کبھی
تم خود کو تکلیف میں پاؤ تو سمجھ لینا کہ تمہارا مالک
اللہ جانتا ہے کہ جیت تمہاری ہو۔

⑤ جب تمہاری زندگی میں دوائے مائتے ملنے
آجائیں کہ ظالم تمہیں گردن اٹھانے نہ دیں۔ اور
دین تمہیں گردن جھکانے نہ دے تو تیسرا راستہ
گردن کٹانے کا ہے۔

⑥ زندگی کا المیہ یہ نہیں کہ یہ بہت جلد ختم ہو جاتی
ہے بلکہ زندگی کا افسوس المیہ یہ ہے کہ ہم جتنا ہی
بہت دیر سے سیکھتے ہیں۔

دھوانہ شکیل: از۔ لودھراں

یقین کامل،

حضرت نون رومیہؒ ان خواتین اسلام میں سے
تھیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ابتدائی

ایام میں اسلام کے شرف سے مشرف ہوئی تھیں۔ یہ
بنو مخزوم کی لونڈیوں میں سے تھیں۔ ایک قول کے مطابق
بنو عبد الدار کی لونڈی تھیں۔ جب انہوں نے اپنے اسلام
کا اعلان کیا تو ان کے اوپر ظلم و ستم کا وہی پہاڑ ڈھایا جانے
لگا جیسا کہ ان سے پہلے کمزوروں کو لاچار مسلمانوں پر ڈھایا جا
رہا تھا۔ مشرکین مکہ انہیں طرح طرح کے عذاب میں مبتلا
کرتے مگر یہ اللہ کی بندی پورے صبر و تحمل کے ساتھ اپنے

ایمان پر قائم رہیں۔ اسلام کی راہ میں ہر تکلیف برداشت
کی۔ مشکلات و مصائب سے تنگ آکر بھی اپنی زبان پر
حرف شکایت اٹ تنگ نہیں لائیں۔

ابو جہل ملعون سیدہ زینرہ رومیہؒ کو سزا میں
دینے میں پیش پیش تھا۔ علامہ بلاذریؒ کا بیان ہے کہ
ابو جہل اپنے لوگوں سے کہا کرتا تھا۔

”تم لوگوں کو اس بات سے تعجب نہیں ہوتا کہ یہ
کیسے کیسے (کمزور لاچار) لوگ اس طرح محمدؐ کی پیروی
کرتے ہیں؟ اگر محمدؐ کا لایا ہوا دین بہتر اور حق ہوتا تو یہ
(خستہ حال لوگ) ہم سے پہلے اسے قبول نہیں کر سکتے تھے۔
(بلکہ ہم مال دار، سمجھ دار اور ذور و سرخ والے پہلے اسے قبول
کرتے) کیا یہ زینرہ رومیہؒ کی طرف ہم پر سبقت
لے گئی۔ جبکہ تم دیکھ رہے ہو کہ یہ کون ہے (اوداس کی
حیثیت کیلئے)“

حضرت زینرہ رومیہؒ کو کفار مکہ مارتے جلتے اور کہتے
جالتے: ”تم محمدؐ کا دین چھوڑ دو“ مگر قربان جائیے اس اولوالعزم
اور بہادری خاتون کے مضبوط ایمان پر کہ اس نے کفار کے ہر
ستم کو برداشت کر لینا گوارا کر لیا لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کے لائے ہوئے دین کو ایک لمحے کے لیے چھوڑنا گوارا نہیں
کیا۔ بالآخر اللہ کی راہ میں مسلسل سزائیں برداشت کرتے
کرتے ان کی آنکھوں کی بنائی چلی گئی۔ اس وقت کفار مکہ
حضرت زینرہ رومیہؒ سے کہنے لگے۔

”یقیناً لات وعزٰی نے تمہارا یہ حال کیا ہے جو تم دیکھ
رہی ہو؟“

حضرت زینرہ رومیہؒ بلاشبہ اندھی ہو چکی تھیں مگر ان
کی دل کی آنکھیں روشن تھیں۔ چنانچہ انہوں نے کفار کی
باتوں کا خود دو لوگ جواب دیا۔

”لات وعزٰی کو کیا معلوم کہ کون ان کی پوجا کرتا ہے؟“

بلکہ یہ بینائی آسمانِ طے کے حکم سے زائل ہوئی ہے۔
(میری قسمت میں تمہارے ظلم و ستم کی بدولت مجھے
اندھا ہونا لکھا تھا) اور ہاں، میرا پروڈیو گار اب بھی میری
بینائی واپس کرنے پر قادر ہے۔
سیر و تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔
اسی بات کی صبح کو رب تعالیٰ نے حضرت زینرہؓ
کی بینائی واپس کر دی۔

چہ جائیکہ کفار قریش اس واقعے سے درسِ عبرت لیتے۔
الٹا کہنے لگے۔
”ارے یارہ تو محمدؐ کے جادو کا کرشمہ ہے۔“
حضرت زینرہ رومیہؓ پر آئے دن کفار قریش ستم
توڑ رہے تھے۔ چنانچہ ایک دن سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے
انہیں خرید کر آزاد کر دیا۔ حضرت زینرہؓ بھی ان سات لوگوں
میں سے ایک تھیں، جنہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان
کے آقاؤں سے خرید کر آزاد کیا تھا اور جو خدا کے دے میں
ستلئے جا رہے تھے۔

نخبہ اکرم۔ گاؤں گولیکی

واصف علی و اصف کے افکار

وہ ہر شخص جو اللہ سے معافی کا خواستگار ہے اسے
سب کو معاف کر دینا ہے۔ جس نے معاف کیا وہ
معاف کر دیا جائے گا۔ حق والے کو حق ادا کرو بلکہ اسے
حق سے بھی ماسوا دو۔ بس اتنے سے عمل سے ظلم
ختم ہو جائے گا۔ جس معاشرے میں مظلوم محروم نہ ہوں
وہ معاشرہ نلاجی ہے۔

وہ پست خیال انسان آکاس بیل کی طرح خود پھیلتا
ہے اور دوسروں کو پھیلنے سے روکتا ہے۔ وہ
دوسروں کو ان کے حقوق سے محروم کر کے اپنے
نفس کی تسکین کرنا چاہتا ہے۔

وہ بلند خیال انسان شمع کی طرح جلتا ہے اور روشنی
دیتا ہے جلتا ہے روشن رہتا ہے۔ وہ اپنے
اصل کی طرف یعنی نور کی طرف رجوع کرتا ہے۔
اس کی زندگی دوسروں کے لیے اور دوسروں
کا دکھ اپنے لیے۔

وہ خوشامد اس میان کو کہتے ہیں جس کو دینے والا
جانتا ہے کہ جھوٹ ہے اور سننے والا سمجھتا ہے
سچ ہے۔

وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر تقرب الہی کا تصور
خارج از اسلام ہے۔

وہ غم ہو یا خوشی... اللہ والوں کو یہ دونوں اللہ کے
قریب لے جاتے ہیں۔

وہ صرف بزرگوں کی یاد منانے سے بزرگوں کا فیض نہیں

ملتا۔ بزرگوں کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے سے
بات بنتی ہے۔

وہ بادشاہوں کی بادشاہی چھوڑ کر دیوبندی تو قبول
کی لیکن کسی دیوبندی نے دیوبندی چھوڑ کر بادشاہی
قبول نہیں کی۔

منزہ، افراد۔ کراچی

سادگی

جب حضرت عمرؓ ملک شام تشریف لے گئے تو
لوگوں نے اور وہاں کے سرداروں نے حضرت عمرؓ کا
استقبال کیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

”میرا بھائی کہاں ہے؟“

لوگوں نے پوچھا۔ ”وہ کون ہے؟“

انہوں نے فرمایا۔ ”حضرت ابوعبیدہؓ۔“

لوگوں نے کہا۔ ”وہ ابھی آپ کے پاس آجائیں گے۔“

چنانچہ جب حضرت ابوعبیدہؓ آئے تو سواری سے پیچھے
اتر کر حضرت عمرؓ نے انہیں گلے لگایا۔ پھر ان کے گھر
تشریف لے گئے اور انہیں گھر میں صرف یہ چیزیں نظر
آئیں۔ ایک تلوار، ایک ڈھال اور ایک کجاوہ۔

حضرت ابوعبیدہؓ ابن جراح اسلامی فوج کے
سربراہ تھے۔

صف عمران۔ کراچی



فہرست کتب

- راضیہ بول گھومکی
آٹے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں
بھولے تو یوں کہ گویا کبھی آشنا نہ تھے
- رقیہ سیف ملتان
اے عشق! دل کی بات کہوں، بُرا تو نہیں مانو گے
بڑی راحت کے دن تھے تیری پہچان سے پہلے
- ارم کمال فیصل آباد
یہ حقیقت سراب ہے پیارے
ظلمتوں کا یہاں بسیرا ہے
وقت کے سب غلام ہیں ورنہ
کون تیرا ہے، کون میرا ہے
- شازیہ حنفی لی مارکیٹ کراچی
چاند نکلا تھا مگر رات نہ تھی پہلی سی
یہ ملاقات، ملاقات نہ تھی پہلی سی
ریخ کچھ کم تو ہوا آج ترے ملنے سے
یہ الگ بات کہ وہ بات نہ تھی پہلی سی
- مسرت الطاف احمد کراچی
ہنسی کے رنگ بہت مہرباں تھے لیکن
ادا سیوں سے ہی بھی خمیر ایسا تھا
- فوزیہ ثمریٹ بکرات
دد کی خوشبو گئی، زخموں کی رعنائی گئی
موسم بھجلا تری اب کے پذیرائی گئی
کون سی محفل، کہاں کے بندوبست کیسا قیام
زندگی تو اصل میں اک سانس ہے آئی گئی
- تسینم کوثر کراچی
کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صودت نظر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی
- کوثر خالد جڑانوالہ
ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں
- مدیحہ نورین مہک برنالی
جس شہر میں ہوئے ہیں آباد سنگ زارے
وہاں سب لوگ آئینوں سے محروم ہو گئے ہیں
- ریما نور رضوان کراچی
جیون گھرا ہوا تھا اندھیروں کے شہر میں
سوچوں کا ایک دیپ جلانا پڑا مجھے
- نایاب نگینہ بنوں
سائے کا بھی ہم نے اگر احسان لیا ہے
گھر کس کا ہے دیوار سے پہچان لیا ہے
- شائستہ اکبر گدڑوکانوٹی
نام ہی نام چار سو، ایک، ہجوم دو یہ دو
کوئی تو ہومرے سوا، کوئی مرے سوا نہیں
- ثوبہ قطب کراچی
دل گیا، رونق حیات گئی
غم گیا، سادی کائنات گئی
- بینا ظفر، فرحین ظفر کراچی
تمہارا ہجر صدی دو صدی پالیں گے
ابھی کچھ اتنی سکت تو ہماری چاہ میں ہے
- بریرہ اکرام، قرأت اکرام کراچی
مجھے تعمیر کرتا جا رہا ہے جذب و مستی میں
میں جب تعمیر ہو جاؤں گا پھر مسما کر دے گا
- شاہدہ، سیمی، ثروت راشد کراچی
فیطرت کسی کے ظرف کو اتنا نہ آزما
ہر شخص اپنی ذات میں بڑا لا جواب ہے





خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

ہیپیاٹائٹس کے انجکشن کا دوسرا کورس ہو رہا ہے۔ آج اکرم نے بہت اصرار کر کے یہ خط لکھنے پر مجبور کیا ہے۔ پلیز میرے لیے آپ ضرور دعا کیجئے گا۔ مارچ کا شمارہ ہاتھ میں آیا تو سب سے پہلے سائرہ رضا کے نام نے ہی جی خوش کر دیا۔ ناول کا عنوان ”محبت مارچ کا موسم“ بہت منفرد لگا۔ جبکہ ہم بحیثیت استاد مارچ کو ”امتحان کا موسم“ کہتے ہیں۔ ٹائٹل بھی جاذب نظر لگا۔ بہت سادہ نکھری نکھری ماڈل.... ناظمہ زیدی نے چوک اعظم کا احوال بہت خوب تحریر کیا۔ آپ خوش نصیب ہو جو تازہ ہوا اور خالص غذا میسر ہے۔ ہم کراچی والے تو ان چیزوں کے لیے ترستے ہی رہتے ہیں۔ کوثر خالد اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ تصنع اور بناوٹ سے پاک.... خالص اور بے ریا لوگ عطیہ خداوندی ہوتے ہیں۔ آپ کو دادی بننے پر مبارک باد۔ آپ کی طرح کوثر خالد کی کمی ہر ماہ مجھے بھی بہت محسوس ہوتی ہے۔ اس ماہ تینوں مکمل ناول لا جواب لگے۔ فرزانہ کھل نے ”محبت مانگتی ہے جو“ میں عورت کی عزت نفس پر ہر شے کو ترجیح دی۔ ”ایک تھی مثال“ کی آخری قسط حسب توقع ہی رہی۔ ناول کے ہر کردار نے اپنا بویا ہی کاٹا۔ ”سیاہ جاشیہ“ ہر مرتبہ بخاور کی قسمت پر بڑا افسوس ہوتا ہے۔ ہاشم جیسے بے دین شخص کا ساتھ ایک بڑی سزا ہی تو ہے۔ والدین کا دل دکھانے کی سزا.... اپنی خود سری اور نافرمانی کی ایک نہ حتم ہونے والی سزا.... ”دعائے خیر“ ام ایمان قاضی نے بھی بہت خوب کہانی تحریر کی۔ ”میں ایک قاری ہوں“ عائشہ تنویر کا یہ ننھا مٹا افسانہ بڑا حقیقت پر مبنی محسوس ہوا۔

ج۔ پیاری شینہ! آپ کی کمی ہمیں ہی نہیں ہماری قارئین کو بھی محسوس ہوتی ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے۔ آپ کا خط پڑھ کے تو دل دکھ سے بھر گیا۔ بیماری کے باوجود آپ نے ہمیں خط لکھا، آپ کی محبت کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہو گا۔ اتنی محبت کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ اکرم صاحب نو ہماری طرف سے سلام۔ قاری بہنوں سے گزارش ہے کہ اپنی دعاؤں میں شینہ اکرم کو ضرور یاد رکھیں۔ اللہ ہم سب پر رحم فرمائے اور ہمارا ہاتھ تھامے رہے۔ (آمین)

کراچی سے مناز یوسف نے لکھا ہے
سب سے پہلے فروری میں شائع سمیرا حمید کی تحریر ”ہماری کہانی“ کی مختصراً بات کرنا چاہوں گی۔ اتنی اچھی

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔ شروع اللہ تعالیٰ کے بابرکت نام سے جو دلوں میں محبت ڈالتا ہے۔ آپ کی عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو، آپ کو، ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین)
پہلا خط لیاری، کراچی سے شینہ اکرم کا ہے، لکھتی ہیں۔

آج میں نے سوچا کہ شعاع ڈائجسٹ میں اپنی انٹری دے کر آپ کو ممکنہ تشویش سے بچالوں۔ (جو ایک قاری کی طویل غیر حاضری کی صورت میں آپ کو ہوتی ہے) ہر ماہ کوشش تو بہت کرتی ہوں کہ شعاع کے مستقل سلسلوں کا حصہ بنوں۔ آپ سے نصف ملاقات کروں۔ مگر کاغذ قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھتی ہوں تو سر میں درد کی ٹیسسیں اٹھنے لگتی ہیں، پھر چند لائنیں لکھ کر میں اپنا ارادہ ترک کر دیتی ہوں۔ طبیعت بہت خراب رہنے لگی ہے۔ میرا

ہمارے معاشرے کی تصویر ہے جہاں بہو اور ساس دونوں ہی مظلوم ہیں شادی ہو کر بھری سسرال میں آنے والی لڑکی کو بہت سارے لوگوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ شوہر اس کے ساتھ ہوتا بھی ہے تو لیکن ایک عمر کی ریاضت کے بعد... جب سارے ارمان ٹھنڈے اور دل بچھ چکا ہوتا ہے۔

ثوبیہ نور، کشن گڑھ، بھاول پور سے لکھی ہیں

ٹائٹل اچھا تھا اور ٹائٹل پر دیا گیا پیغام بھی لالچ بھی کہہ سکتے ہیں۔ بچوں کے پیپرز ہو چکے ہیں اور میں نے ”محبت مارچ کا موسم“ شروع کرنے سے پہلے ہی رزلٹ بھی آفس میں جمع کروادیا اور اعلان بھی کر دیا۔ خبردار! کوئی مجھے ڈسٹرب کرنے کی کوشش نہ کرے۔ شافعہ نے کہیں سے سن لیا، پھر تو سر پر سوار ہو کر جو دماغ تپایا کہ نہ پوچھیں۔ اگر آپ کے پاس بھی کوئی ایسا ”ڈھیٹ“ دوست ہے تو آپ کو پہلے ہی پتا ہو گا۔

سارہ رضا کا انداز تحریر، میں صدقے جاواں، کیا کہنے بھئی۔ حضرات کے لیے سروے رکھنے والا آئیڈیا اچھا ہے۔ بیوی اور ماں کے درمیان اچھی خاصی درگت بنتی ہے بے چاروں کی۔ ”رقص بکسل“ میں لگتا ہے جلد ہی رضا حیدر بکسل کی طرح تڑپنے والے ہیں۔ ”باتوں سے خوشبو آئے“ اس دفعہ کچھ زیادہ ہی پسند آیا۔ خطوط میں

انیقہ انا کو ویلکم کہا جاتا ہے بھئی۔ اور کوثر خالد مبارک باد... ”ایک تھی مثال“ میں آخر میں افسانوی طور پر ہر چیز صاف، شفاف، نکھری ستھری ہو گئی بات ختم۔ خیر اچھا اینڈ ہے حوصلہ افزا کہ بالا خر مثال کو کچھ سکون ملا۔

ج۔ پیاری ثوبیہ! ہمارے پاس شافیہ جیسی دوست تو نہیں، البتہ قاری ضرور ہے اور اس قاری سے فرمائش ہے کہ اگلی دفعہ بھرپور تبصرے کے ساتھ شریک ہو۔ معید کام بھی کرے گا اور حمیرا کے لیے بہت کچھ خرید کر لائے گا۔ کہانی ابھی باقی ہے دوست! اور نبیلہ کی کہانی میں ماورا کے عزائم بھی ضرور سامنے آئیں گے، کہانی کی چند ہی اقساط باقی ہیں۔

بلقیس تبسم اور نفیسہ حسین، بھٹیاں والا اوکاڑہ سے شرکت کر رہی ہیں، لکھا ہے

اس ماہ کا ٹائٹل بھی بہت اچھا تھا۔ خاص طور پر ماڈل کی

لگی مجھے وہ تحریر، ہنس ہنس کر پیٹ میں بل پڑ گئے۔ ایک بار پڑھی دوبارہ پڑھی۔ ویسے تو سیرا کی اکثر تحریریں دوبارہ پڑھنی پڑھتی ہیں۔ خاص طور سے ”جوگ آس“ تو میں نے تین چار بار پڑھی تب صبح سے سمجھ میں آئی۔ بہت ذہین ہیں سمیرا حمید۔

”سیاہ حاشیہ“ صائمہ اکرم کو چاہیے کہ ماضی کو زیادہ سے زیادہ دھرائیں، کیونکہ اب ماضی جاننے میں زیادہ دلچسپی محسوس ہو رہی ہے۔ ”محبت مارچ کا موسم“ سارہ رضا کی تحریر ہو اور اچھی نہ ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ شازیہ جمال طارق کے افسانے مختصر مگر پر اثر ہوتے ہیں۔ مجھے شازیہ جمال کی تحریریں اچھی لگتی ہیں۔ نادیہ صدیقہ کی کہانی بھی اچھی تھی۔ اس کی نندوں پر غصہ آیا۔ عائشہ تنویر کی کہانی اچھی لگی۔ ”مجھ سے نانا“ اس دفعہ کا بہت اچھا تھا۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ جن خواتین کے شوہر دوسری شادی کر لیتے ہیں، وہ ساس، نندوں کی برائیاں نہیں تحریر کرتیں، کیونکہ سو کن کا دکھ ہر دکھ سے بڑا ہوتا ہے شاید... جو بہنیں چاہتی ہیں کہ اس سلسلے میں ان کا نام شائع کیا جائے تو ان بہنوں کے اصل نام ضرور شائع کیا کیجئے اور جو بہنیں اصل نام شائع نہیں کروانا چاہتیں ان کے فرضی نام لکھ دیا کیجئے۔ زن وغیرہ مناسب نہیں لگتا۔ ”مثلاً“ فریجہ یا سمین (فرضی نام) یا پھر سمیرا حسن (فرضی نام) اس طرح زیادہ

صحیح لگے گا۔ ”خط آپ کے“ کے زبردست سلسلہ ہے۔ (کیونکہ میں بھی اس میں شرکت کرتی ہوں۔) فوزیہ سلطانی کو ان ہی کے انداز میں دیا گیا آپ کا جواب، زبردست بھئی۔ اور ہاں فرزانه مغل کا آئیڈیا بھی اچھا ہے۔ مردوں کا ”مجھ سے نانا“ شروع کروانے کا۔ اگر بہوؤں کے علاوہ ساس، نندوں کے لیے بھی ایسا ہی سلسلہ شروع کیا جائے تو؟ کیونکہ ہمیشہ بہوئیں مظلوم نہیں ہوتیں، کبھی کبھار بہوئیں بھی ساس، نندوں کے ساتھ غلط کر جاتی ہیں۔

ج۔ کیا کرتی ہیں مناز! آپ کا یہ جملہ پڑھ کر کہ ”خط آپ کے“ زبردست سلسلہ ہے، ابھی ہمارا دماغ آسمان کی سیر کو جانے ہی والا تھا کہ بریکٹ میں آپ کا تبصرہ دیکھ کر ہم ہوش کی دنیا میں لوٹ آئے، حد ہو گئی۔ نبھی لوگ تو خوش، میاں بھی نہیں پالنے دیتے۔

یہ سلسلہ ساس، نندوں کے مظالم بیان کرنے یا بہوؤں کی مظلومیت دکھانے کے لیے شروع نہیں کیا گیا، بلکہ

گھڑی پھر پارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں پڑھ کر ایمان کو تازہ کرتے ہیں، مجھے یہ سلسلہ خاص طور پر بہت پسند ہے، بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے، پھر چھلانگ لگائی "رقص بگل" کی طرف۔ واہ کیا بات ہے نبیلہ عزیز کی صائمہ اکرم جی "دیمک زدہ محبت" کے بعد اب "سیاہ حاشیہ" زبردست ہے۔ "ایک تھی مثال" بھی بہت اچھا تھا۔ ویسے بشری اور عدیل دونوں کے ساتھ اچھا نہیں ہوا، پری کے انجام کے بارے میں بھی پڑھ کے بہت افسوس ہوا۔ افسانے بھی سارے اے ون تھے۔ بہت زیادہ سبق آموز، نظم میں سے محمد مشتاق آنم کی نظم بہت اچھی تھی۔ اس دفعہ سائرہ رضا کا ناول دیکھ کے بہت خوشی ہوئی۔ سارے مکمل ناول اے ون تھے۔ میں اپنے گاؤں سے پہلی لڑکی ہوں جو آپ کو خط لکھنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ ہمارا گاؤں بہت خوب صورت ہے، یہاں پکی سڑکیں اور اسکول اور ہر سہولت ہے اور اب تو ماشاء اللہ سے سوئی گیس کی سہولت بھی ہے اور کبھی لوڈ شیڈنگ بھی نہیں ہوتی۔ ہمارے گاؤں کے لوگ پڑھے لکھے اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کے رہتے ہیں۔ مجھے شعاع کو پڑھتے ہوئے تقریباً 20 سال سے بھی زیادہ ہو گئے ہیں۔ سو اتنا حق تو میرا ابھی بنتا ہے نہ اور ہاں مجھے ہر ماہ ڈائجسٹ منگوانے میں بہت مشکل ہوتی ہے، تو اس لیے میں شعاع، کرن اور خواتین ڈائجسٹ کی سالانہ خریدار بننا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا کہ تینوں ڈائجسٹ محفوظ طریقے سے مجھ تک پہنچ آئیں۔

۔ بلقیس اور نفیسہ پہلے تو دلی مبارک باد، آپ واقعی بہت خوش قسمت ہیں، یقین نہیں آرہا کہ آپ کے گاؤں میں لوڈ شیڈنگ نہیں ہوتی۔ دیہات میں شہروں سے زیادہ بجلی کا مسئلہ ہے۔ آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ گھر بیٹھے تینوں پرچے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ تینوں پرچوں کی سالانہ خریدار بن جائیں۔ سال بھر تک ایک پرچہ گھر بیٹھے حاصل کرنے کے لیے آپ کو 700 روپے منی آرڈر کرنا ہوں گے۔ تین پرچوں کے لیے 2100 منی آرڈر کریں۔ منی آرڈر اس ایڈریس پر کریں۔ شعاع 37۔ اردو بازار کراچی

نادیہ صدیقہ، بونگہ، بلوچاں پھول نگر تحصیل پتوکی سے شرکت کر رہی ہیں، لکھتی ہیں

ناٹل بہت ڈیفنٹ اور سوبر۔۔۔ امی کہنے لگیں، دیکھو تو شاید تمہارا نام بھی آیا ہو۔ میں نے کہا امی ابھی کہاں؟ ساتھ ساتھ ورق گردانی بھی کر رہی تھی کہ۔۔۔ افسانوں پر نظر پڑی اور خوشی سے چیخ نکلی۔ "امی۔۔۔ میرا افسانہ شائع ہو گیا ہے۔" (کانپتی ہوئی آواز لرزاتے ہاتھ) حیرت، شدید حیرت، خوشی اور بہت خوشی۔۔۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ خوشی کی شدت سے میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ امی بھی بے انتہا خوش تھیں۔ مجھے کہنے لگیں۔ "بیٹا آرام سے، آرام سے۔۔۔" حالانکہ انہوں نے اپنے دل کو بھی بمشکل ہی کنٹرول کیا ہوا تھا۔ الحمد للہ۔۔۔ میری امی (قاریہ عائشہ صدیقہ) بہت نیک، سادہ و صاف دل، دن رات قرآن پڑھنے والی ہیں۔ انہوں نے آپ سب کے لیے دعائیں کیں۔ اب آتے ہیں اس ماہ کے شمارے کی طرف۔۔۔ کوثر خالد (جزائوالہ) کا خط پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ خط نہیں، کوئی کہانی پڑھ رہے ہیں، بے ساختہ انداز۔۔۔ بہت خوب۔۔۔ "تاریخ گئے جھروکے" کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ہم نہ پڑھیں؟ "ایک تھی مثال" کا اینڈ بہت اچھے انداز سے کیا، رخسانہ نگار آپا نے کسی قسم کی تشنگی نہ رہی۔ افسانوں میں "پہلی" میں "ایک قاری ہوں" زبردست۔ "حیث ہمارے" کا افسانہ کے شروع کرنے کا انداز بہت اچھا۔ پیاری بنت سحر "اب کے برس" پچھلے ماہ والا اور "اہل جنوں باقی ہیں" دونوں ہی بہت اچھے تھے۔ "سیاہ

حاشیہ" کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں مل رہے امیزنگ! ناول ہے یہ تو۔۔۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا" بند نہیں کرنا آپ نے یہ سلسلہ! تنقید تو ہوتی ہی رہتی ہے، مگر اس سلسلے کے حامی زیادہ ہیں۔

ج۔ پیاری نادیہ صدیقہ! آپ کی والدہ کے بے حد شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھا۔ آپ سب کی محبت، خلوص اور دعاؤں سے تو ہماری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

تسنیم کوثر ایف بی ایریا کراچی سے شرکت کر رہی ہیں، لکھا ہے

مارچ کا شمارہ پڑھا مزہ آیا۔ خاص طور پر دعائے خیر پسند آیا۔ بہت یونیک سانا نام اور اسٹوری جان دار تھی۔ نہایت عمدگی سے ناول لکھا گیا ہے۔ "میں ایک قاری ہوں" بھی

بہت خوب کیا زندہ دل تحریر رقم کی ہے۔ بالکل حقیقت سے قریب تر واقعی مدیر صاحبہ کا اناب شاپ ٹائپ کے بے تگے خطوط پڑھ کر کیا حال ہوتا ہوگا۔ آپ کو تو پتا ہی ہوگا۔ کہیں ہم تو ان میں شامل نہیں؟ ”کامیاب عورت“ اچھا لکھا ہے، مگر ساری بہوئیں اتنی اچھی نہیں ہوتی ہیں۔ ”ایک بھی مثال“ کا اینڈ ہوا اور بہت اچھا ہوا۔ آخری قسط شان دار لکھی گئی۔ افسانہ آزمائش مختصر اور جیسے کو تیسرا تھا۔ فرزانہ کھل کا ”محبت مانگتی ہے جو“ ہمیں زیادہ متاثر نہیں کیا۔ اس کا اینڈ کچھ تشنگی لیے ہوئے تھا۔ سارہ رضا کا ناول ”محبت مارچ کا موسم“ ناول کا نام تو بڑا دلکش ہے۔ اسٹوری بھی بس تھوڑی بہتر ہے۔ صائمہ اکرم کا ”سیاہ حاشیہ“ کا جواب نہیں۔

ج۔ پیاری تسنیم ہم اپنے قارئین سے بالکل بھی تنگ نہیں۔ یہ تو بس افسانہ ہی تھا۔ ہم تو اپنے تمام قارئین کو یاد ہی رکھتے ہیں اور جب سے آپ کا لہجہ اور تبصرہ تبدیل ہوا ہے تو آپ کو تو بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کوثر خالد نے جڑانوالہ سے لکھا ہے

کتنی چاہت سے آپ نے طویل ”ناتا“ کا اصرار کیا تھا۔ جو ہم نے فوراً ”بھیج دیا تھا“ مگر اب طویل انتظار۔۔۔ آج کل ہماری اماں جانی تشریف لائی ہوئی ہیں اور کافی مدد کر رہی ہیں۔ اس کے باوجود رسائل سے رابطوں کے لیے آج ساری رات تہجد تک جاگ کر لکھا اور ناشتے کے بعد سے پھر قلم چل رہا ہے۔ شعاع سے رشتہ جوڑا تو اس نے حوصلہ افزائی کی نوید بخشی۔ اسی نے بچوں کے رسائل میں لکھنے کا مشورہ دیا۔

اس بار پورا رسالہ ابھی نہیں پڑھ پائے۔ تاخیر کے خدشے کی بدولت۔ ناولز تو پڑھ ہی لیے ہیں۔۔۔ کہ آئندہ کا دھڑکا ہوتا ہے۔ ورنہ بقول میری خالہ انور۔۔۔ سب کہانیاں ایک ہی سبق دیتی ہیں۔ محبت یا نفرت کا۔۔۔ گویا سب کہانیاں ایک ہی ہیں۔ ”ایک بھی مثال“ آخر اختتام پذیر ہو ہی گیا۔ ”رفصہ بکل“ حسب توقع جارہا ہے۔ البتہ ”سیاہ حاشیہ“ کافی غور و خوض یا صبر کا تقاضا کرتا ہے۔ غزلیات واہ صاحب کی شاعری ہے تو اچھی، مگر ہمارے حسب حال نہیں ہے۔ بھلا ہے کوئی جو ہم پر ظلم کرے۔۔۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے نا۔ لطیفے میرے مزاج آشنا نہیں۔ دو

دو بار پڑھ کر تو سمجھ میں آتے ہیں۔ ہنسی تو کسی پر ہی آتی ہے۔ خطوط میں ہمارا پرانا خط سربراہ زو خوشی کی دولت سے مالا مال کر گیا۔ انیقہ جی! خوش آمدید۔۔۔ اب جانا مت۔ پہلے جواب شریف ہوتے تھے اب شریر بھی۔۔۔ لطیف بھی جیسا کہ فوزیہ سلطانہ والا۔۔۔

ج۔ پیاری کوثر خالد! اللہ تعالیٰ نے ہنسنے پر پابندی تو نہیں لگائی۔ جن باتوں پر ہنسی آئے دل کھول کر ہنسا کریں۔ حوا زہ کی پابندیاں آپ اپنے اوپر نہ لگائیں۔ کچھ خطوط ایسے ہوتے ہیں کہ ہماری حس ظرافت کو بھنھوڑ کر جگا دیتے ہیں۔ ہمارے جواب شریف ہوں کہ شریر۔۔۔ بخدا ہم بہت شریف ہیں، بس کبھی غرور نہیں کیا۔ اور آپ اپنی ’حالہ کی تصحیح کر دیتیں‘ ہمارے ہاں جو کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔ وہ صرف محبت کا درس دیتی ہیں۔ انسان اور انسانیت سے محبت کا درس۔۔۔

افسر عباسی نے ہری پور عباسی سے لکھتی ہیں

افسوس۔۔۔ اداسی۔۔۔ ناامیدی۔۔۔ میں مسلسل 2 ماہ سے خط لکھ رہی ہوں، مگر نہ جانے کیوں میرے خط قبولیت کا شرف حاصل کرنے سے محروم ہیں۔ تمام سلسلے بہت اچھے ہیں۔ ”سیاہ حاشیہ“ بہترین اور اول درجے پر جا رہی ہے۔ ”میں ایک قاری ہوں“ کی سمجھ نہیں آئی نہ جانے کس طرح لکھا گیا ہے یہ افسانہ! ”ایک بھی مثال“ کی آخری قسط بہت اچھی قسط رہی۔

ج۔ پیاری افسر! افسوس، ناامیدی صرف ایک خط شائع نہ ہونے پر۔۔۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل پر نہیں لیتے اور پھر یہ دیکھیں کہ صرف دو کہانیوں پر تبصرہ اور باقی خط اس ضد کی نذر کہ خط ضرور شائع کریں۔ چلیں۔۔۔ شائع کر دیا، خوش۔۔۔ افسانہ ”میں ایک قاری ہوں“ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ حیرت ہوئی یہ جان کر۔۔۔ بہت سادہ سا افسانہ تھا۔

رومینہ شاہد نے کراچی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ہم نے قلم اٹھانے میں دیر ضرور کی، مگر قاری بہت پرانے ہیں۔ سارے افسانے بہت خوب رہے۔ امتہ العزیز شہزاد نے ”پہلی“ واقعی خوب تحریر کیا ہے کہ اور ہر آزمائش پر پورا کر کے کامیاب عورت کہنے والی نادیہ صدیقہ اور شازیہ جمال کے بعد، سدرہ حیات کہتی ہیں کہ

(جیت ہماری ہے) بنت سحر کا "اہل جنوں باقی ہیں" اور عائشہ تنویر کا "میں ایک قاری ہوں" دونوں نے اپنی تحریروں سے انصاف کیا۔ "سیاہ حاشیہ" زبردست جا رہا ہے۔ فرزانہ کھل کا "محبت مانگتی ہے" زبردست رہا اور "دعائے خیر ہوں" ام ایمان قاضی کا بہت پیاری تحریر 'رخسانہ نگار عدنان' ایک تھی مثال "بالآخر اختتام کو پہنچا۔ اچھا رہا۔ نبیلہ عزیز کا "رقص بسمل" بھی اپنی مثال آپ ہے۔

ج۔ پیاری روبینہ! خط شامل اشاعت ہونے کے لیے ضروری تھیں کہ وہ مختصر ہو، مگر ایسا بھی نہیں کہ وہ داستان امیر حمزہ بن جائے۔ ہاں بس تبصرہ ذرا جان دار ہو.... اور بروقت مل جائے۔ اتنی سی شرط ہے۔

شازیہ کنول، چوک اعظم سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

ہر ماہ آپ کے شمارے لازمی پڑھتی ہوں۔ پہلے میاں صاحب ناراض ہوتے تھے، لیکن اب تو ہر ماہ خود ہی لا دیتے ہیں۔ پتا ہے کیوں؟ مزے دار کھانا کھانے کے لیے، کیونکہ میں 8th کلاس میں تھی جب ای وفات پا گئیں۔ (اللہ جنت نصیب کرے) تو میں نے۔۔۔ جو کچھ بھی سیکھا ان شماروں سے ہی سیکھا۔ ویسے کچھ کھانا پکانا مجھے میرے بڑے جیٹھ شہباز بھالی نے بھی سکھایا ہے، اب تو سب ہی رشتے دار کہتے ہیں کہ شازیہ کھانا بہت مزے دار بناتی ہے۔ (اپنے منہ میاں مٹھو) زندگی گزارنے کے سارے گراہی سے سیکھے۔ یہ شمارہ تو میری دوسری ای ہے۔ اب آتی ہوں کہ خط کس وجہ سے لکھا، تو جناب وہ میں نے اپنی قاری بہن

ناظمہ زیدی کا خط پڑھا تو بہت خوشی ہوئی۔ 20 سال بعد قلم اٹھا ہی لیا۔ "ایک تھی مثال" پڑھ کر از دو اجی الجھنیں دور کیں۔ ویل ڈن رخسانہ صاحبہ.... "رقص بسمل" اور "سیاہ حاشیہ" ماں باپ اور بچوں کو بہت کچھ سمجھا رہا ہے، اگر کوئی سمجھنا چاہے تو بہت ہی اچھی کاوش ہے اور فرزانہ کھل نے تو میرے دل کی بات کو لفظوں کے پیراہن پہنا دیے کہ محبت صرف عزت مانگتی ہے، عزت کے بغیر محبت کچھ نہیں۔ سائرہ اور دعائے خیر کے کردار بہت پسند آئے۔ افسانے سب ہی اچھے ہوتے ہیں۔ عائشہ تنویر نے تو سچ میں بڑی میٹھی میٹھی سی کردی۔ اور یہ صفیہ جیسے کردار ہر فیملی میں ہوتے ہیں۔ کسی کی برسوں کی ریاضت کو

پل میں خاک کرنے والے۔ احادیث پڑھ کر عمل کرنے کی کوشش کرتی ہوں اور دوسروں کو بھی سناتی ہوں، تاکہ کسی کا بھلا ہو جائے اور مجھے ثواب ملے۔ "تجھ سے ناتا جوڑا" بہت اچھا سلسلہ ہے۔ اس سے بالکل بھی بچوں کو غلط اثر نہیں لینا چاہیے، بلکہ سسرالی جنگ کے لیے اپنے پاس برداشت، اخلاق اور صبر جیسے ہتھیار جمع کر لینے چاہئیں۔ ج۔ پیاری شازیہ! اتنا اچھا خط لکھنے کا شکریہ۔ بہت خوشی ہوئی آپ نے خط لکھا۔ آپ ضرور "جب تجھ سے ناتا جوڑا" میں شامل ہوں۔ ہم آپ کی تحریر کے منتظر ہیں۔

آئینہ ملک نے لکھا ہے

واؤ.... سائرہ رضا کا ناول.... سائرہ رضا انہوں.... آپ خوب صورت لکھتی ہیں نا، مسحور کن، آپ تو بس سچ لکھتی ہیں۔ آپ کا ہر کردار ہمارے ارد گرد سے لیا گیا ہوتا ہے۔ کرداروں کی سوچ اور جذبات سے زیادہ ان کے ماحول اور حالات کو سادہ سے انداز میں بیان کرنے کا ہنر آج کے دور میں صرف آپ کے پاس ہے یا پھر سب سے زیادہ آپ کے پاس.... بس سائرہ کے لیے یہ ہی کہا جاسکتا ہے کہ تسمی کریٹ ہو۔ "پہلی" کامیاب عورت اور آزمائش نے اسی خیال کو تقویت دی کہ عورتوں کے اصل مسائل، کسی بل کے پاس ہونے سے ختم نہیں ہونے والے۔ جیت ہماری ہے، شاید آفریدی اچھا سبق ہے، یہ کھانا پینا نہیں چھوٹا۔ "میں ایک قاری ہوں" مختصر مگر پراثر (بابا بابا) "سیاہ حاشیہ" نہیں پڑھ رہی۔ فرزانہ کھل واؤ.... آپ کی ہیروئن کی باتیں بہت اچھی تھیں۔ کہانی کا کیا کہوں، مگر ڈائلاگز خصوصاً "ہزبینڈ کے معاملے میں.... میں نے یہ جانا گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔" مسکراہٹیں "اس دفعہ دلچسپ تھیں۔" تاریخ کے جھروکے "اور" احادیث "جمع تفصیل ہمیشہ کی طرح دماغ پہ دستک دیتی اور دل کو اطمینان دیتی ہوئی تھیں۔ اوہ ہاں....! خطوط تو رہ ہی گئے، جو میں نے سب سے پہلے پڑھے اور پڑھ کے بہت افسوس ہوا کہ کہانیوں میں بھرے تو ردی کی ٹوکری کی نذر ہو گئے تھے۔ خیر انبیقا انا کی واپسی ادھوری سی ہے ابھی.... آپ اپنے اپنے علاقوں کا تعارف کروانے کے لیے کوئی الگ سلسلہ شروع کریں۔ کوثر آنٹی کے دادی بننے پر خوشی.... اردی! نور اور فرح فاطمہ کیا واقعی ہی یہ سلسلہ منفی تاثر پیش کر رہا ہے؟ اب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سب کے ساتھ ہی کچھ نہ کچھ برا ہوتا

ہے 'تو پڑھنے والے اور لکھنے والے دونوں کو غیر جانبدار ہو کر سوچنے سے پتا چل سکتا ہے کہ برائی کا پلڑا بھاری ہے یا اچھائی کا۔ فائزہ کی بیماری 'عائش کی نو نہالی'، نمرہ اور رضوانہ کا تبصرہ سب ہی دلچسپی کا عنصر لیے ہوئے تھے، مگر سب سے زیادہ مزہ آیا فوزیہ سلطانہ کا خط پڑھ کے اور آپ کا سوا سیر جیسا جواب پیٹ میں درد شروع ہو گیا۔ (ہنس ہنس کر) ناظمہ جی آپ کو یہ سب شعاع کے ساتھ ساتھ میں لکھنا چاہیے تھا۔ عائشہ انصاری کے دو لفظ تادیر میری آنکھوں کے سامنے رہے، ہٹ کر "عمدہ الفاظ کا چناؤ" بابا بابا... رضوانہ پروین اور عائشہ کا تبصرہ میرے لیے ڈوبتے کو تنکے کے مترادف تھا۔

ج۔ پیاری آئینہ ملک! دنیا میں واقعی کوئی بات نئی بات نہیں۔ صرف انداز بیاں نیا ہوتا ہے۔ آپ اپنی تحریریں بھیج دیں۔ ہو سکتا ہے آپ کا اندازہ غلط ہو۔ بانی داوے یہ خیال کیونکر آیا کہ کہانیوں کے تبصرے ردی کی ٹوکری کے نذر ہو گئے ہیں۔

ثمرہ ہاشمی 'کندیاں سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

اس ماہ کا شمار بالکل بھی نہیں پڑھا، صرف ٹائٹل ہی دیکھا ہے، کیونکہ مجھے بہت تیز بخار ہے اور میرا بخار دو ہفتوں سے پہلے جاتا ہی نہیں۔ ٹائٹل گرل کا آئی میک اپ بہت خوب صورت ہے، لیکن ماڈل کی ناک نعلی لگ رہی ہے۔ پلیز مائنڈ مت کرنا حمیراجی، یہ میرا اپنا ذاتی خیال ہے، ہو سکتا ہے بخار ہی دماغ پہ چڑھ گیا ہو۔ مصباح وقاص ہاشمی میری پھوپھو کی بیٹی ہے اور میری منہ بولی بہن ہے۔ مجھے رسالے پڑھنے کا شوق اسی سے لگا ہے۔

ج۔ ثمرہ ہاشمی! بخار میں بھی آپ کا دماغ خوب چلتا ہے۔ نعلی ناک؟ بابا بابا... آپ کی بات سن کر ماڈل کی ناک کا موازنہ مائیکل جیککسن کی ناک سے بھی کر دیکھا۔ بخدا ہمیں تو کوئی مماثلت نظر نہیں آتی۔ مصباح وقاص ہاشمی کو ہمارا شکریہ پہنچادیں، جنہوں نے آپ میں شعاع پڑھنے کا شوق پیدا کیا۔

عائشہ رباب نے کراچی سے لکھا ہے

میرے ساتھ ساتھ میری پیاری آنٹی ساجدہ افتخار کا سلام بھی قبول کریں۔ ہر ماہ باقاعدگی سے آنٹی ہی شمارہ منگواتی ہیں۔ میرا حاصل تبصرہ کرتی ہیں۔ سرورق کچھ خاص

نہیں لگا۔ ماڈل کی آنکھیں کچھ طنزیہ ہی لگیں۔ حسب معمول پہلی شعاع سے آغاز کیا، کیا خوب لکھا ہے۔ "امیدا در یسین کا دیا بجھنے نہ دیں۔" "نیا ناول" "خواب شیشے کا" "عفت سحر کا ناول" "بن مانگی دعا" پڑھا تھا، کچھ خاص متاثر نہیں کر سکا۔ "پیارے نبی کی پیاری باتیں" بیش بہا خزانے اندر لیے ہوئے ہوتا ہے۔ "جب تجھ سے نا آجا جوڑا ہے" "ن۔ زکی والدہ نے جتنی قربانیاں دی ہیں "خدا انہیں بے حساب خوشیاں عطا کرے" (آمین) "دستک" میں محمد اکبر، شبنم ثانی، ضم سعاد کا انٹرویو بہت اچھا لگا۔ نظمیں، غزلیں میں انتظار بہت اچھا لگا۔ اس ماہ کی مسکراہٹیں ساری ہی نئی تھیں، اچھی لگی ہیں۔ "باتوں سے خوشبو آئے" خوب صورت عورت کمال کی لگی۔ عائشہ گو جرح کا شعر سب سے اچھا لگا۔ "خط آپ کے" میں فوزیہ سلطانہ صاحبہ کا خط پڑھ کر چکر آنے لگا۔ صد شکر کہ ابھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ "آئینہ خانے" اس بار بالکل پسند نہیں آیا۔ "تاریخ کے جھروکے سے" اتنا دلچسپ... لیکن افسوس ہے، آج کی قوم بھی جاہلیت کا لباس پہنے جا رہی ہے۔ ناول میں "ایک تھی مثال" کی آخری قسط دیکھ کر خوشی ہوئی۔ کسی نے ٹھیک تجزیہ کیا تھا۔ جب مصنفین کرائسٹس دکھاتی ہیں تو بتیں فسطیں اور جب ہیروئن پر اچھا وقت آتا ہے تو اس کے خوش ہونے سے پہلے حتم کر دیتی ہیں۔ "در قفس بسمل" بالکل پاکستان ریلوے کی طرح رواں دواں ہے۔ مکمل ناول "محبت مارچ کا موسم" سارہ رضوانہ بہترین لکھا ہے، لیکن آئندہ ماہ دیکھ کر افسوس ہوا۔ "محبت مانگتی ہے" بلاشبہ ایک اچھی کہانی ہے۔ اینڈ تو بہت ہی اچھا تھا۔ لڑکی کو اتنا ہی حوصلہ مند ہونا چاہیے۔ اپنی عزت، اپنی

وقار بھی کوئی چیز ہے۔ جہاں عزت نہ ملے وہاں محبت کچھ کام نہیں آتی۔ "دعائے خیر ہوں" بہترین کاوش تھی۔ سپاہ حاشیہ اچھا۔ لگا میرا اندازہ ہے، شانزے صالحہ آیا کی بیٹی ہے۔ افسانہ "پہلی" اچھی کہانی تھی۔ مریم کا فیصلہ اچھا لگا۔ "کامیاب عورت" میں کمی سی محسوس ہوئی۔ "آزمائش" بھی ٹھیک تھی۔ "جیت ہماری ہے" سدرہ حیات نے اچھی منظر نگاری کی، پاکستانیوں کے جذبات کی "میں ایک قاری ہوں" کیا کہوں اس بارے میں۔ پڑھ کر اطف آیا اور سب سے آخر میں پورے شمارے کا سب سے بہترین افسانہ "اہل جنون باقی ہیں" اتنے کم الفاظ میں اتنا

جامع افسانہ، تحریر میں روانی، بے ساختگی خوب تھی۔
ج۔ اپنی پیاری آنٹی ساجدہ افتخار کو ہمارا ولیکم السلام پہنچا دیں اور ان سے کہیں رائٹنگ کی پروانہ کریں، ہمیں ہر طرح کی رائٹنگ پڑھنے کی عادت ہے۔ آپ کو سرورق خاص نہیں لگا، تب ہی تو ماڈل نے طنزیہ نگاہوں سے دیکھا آپ کو۔ بے چاری کا دل توڑ دیا آپ نے۔ شمارے پر آپ کا سیر حاصل بصرہ اچھا لگا۔

فوزیہ ثمریٹ ہانیہ عمران آمنہ میر نے گجرات سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

صبر تہذیب ہے محبت کی
وہ سمجھتے ہیں بے زباں ہیں ہم
شعاع والے اتنے ستم گر تو کبھی نہیں رہے۔ مسلسل میری تحریر کی توہین کیے جائے رہے ہیں۔ باقاعدگی سے کوئی بے عزت (شعاع سے) ہونا ہم سے سیکھے۔ ہر ماہ میرا خط ردی کی ٹوکری کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ جیسا ہمارے حکمران دے قرضہ پہ قرضہ عوام کی ناتواں گردنوں میں ڈال رہے ہیں۔ سرورق خوب صورت لگا۔ اس بار ہم نے سوچا، ذرا سی بھی تنقید نہیں کرنی، بلکہ ڈبل مکھن لگا ماسے تاکہ مابدولت کا خط شریف اپریل میں شامل ہو سکے۔ ماڈل سو برسی کیوٹ لگ رہی تھی۔ مجھے تو عرصہ ہوا ہونٹوں پہ لپ اسٹک لگائے ہوئے۔ شرٹ کے ساتھ میچنگ گھڑی پیاری لگی۔ اف ف ف یہ لمبے ناخن ذرا بھی اچھے نہیں لگے۔ ہاں صرف انگوٹھوں کے لمبے ناخن پسند ہیں۔ میرے خیال میں میری مدبرہ صاحبہ اس پہ تو مجھے کوئی کرار اس کمینٹس لازمی دیں گی۔ محبت مانگتی ہے۔ غشنا کا کردار اچھا تھا۔ بولڈ اور حوصلے والا۔ افسانے سب ہی اچھے لگے۔

خاص کر عائشہ تنویر کا انداز تحریر پسند آیا۔ سلسلہ ”پیاری باتیں“ سب سے فیورٹ ہے۔ سرورق پہ سائرہ رضا کا ”محبت مارچ کا موسم“ خوشی سے دل جھوم اٹھا، کیونکہ ابھی تک ہماری خوشیاں یہاں ہی وابستہ ہیں۔ خیر چھوڑیں۔ پہلے بات کروں گی صائمہ اکرم کا ”سیاہ حاشیہ“ اس ماہ کی لاجواب تحریر رہی۔ ”رقص بکمل“ پڑھا۔ بہت کم تحریر تھی۔ اللہ پاک نبیلہ جی کی مشکلیں آسان فرمائے۔ ہماری پہلی سی خوش مزاج والی نبیلہ جی ہمارے سامنے ہوں۔ ”ایک مٹی مثال“ چلو جی اپنے اختتام کو پہنچا۔ میں دعائے

خیر ہوں۔ اچھا لگا۔
اس ماہ کی مسکراہٹیں تمام کی تمام مزے دار تھیں۔ خاص کر کبریٰ عباس کا لطیفہ یونیک اور منفرد لگا۔ باتوں سے خوشبو آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ سبق آموز ہے۔ شاعری بھی بہت اچھی لگی۔ خط آپ کے میں سب کے خط اچھے ہوتے ہیں، مگر کوثر خالد کا انداز بیاں بہت دلچسپ لگتا ہے۔ ہر خط ایک الگ ہی داستان سنارہا ہوتا ہے۔ ارے یاد آیا، سائرہ رضا کے قلم کا ہم پہ ادھار رہا۔ اگلے ماہ دو اکٹھی اقساط پڑھیں گے۔ کیونکہ ناول کے ابتدائے میں ہی ہم نے اینڈ کے صفحے میں باقی آئندہ پڑھ لیا تھا۔

ج۔ پیاری بچیوں فوزیہ ثمریٹ، ہانیہ عمران، آمنہ میرا یہ لڑکیوں کے دل نازک ہوتے ہیں تو کیا مطلب؟ ہمارا دل کیا فولاد کا بنا ہوا ہے۔ خود ہی کہتی ہیں کہ ہتھ ہولار کھیں۔ پھر کرارے جواب کی تمنا بھی رکھتی ہیں اور یہ بے زبانی کی بھی خوب کمی، ہم نے تو بجداگوئی لڑکیوں کو بھی اشاروں کی زبان میں اتنا بولتے دیکھا ہے کہ اللہ کی پناہ!
فوزیہ آپ تو ہمارے تینوں پرچوں کی باقاعدہ قاری ہیں اور مختلف سلسلوں میں شامل بھی رہتی ہیں۔ پھر بھی شکایت۔ اللہ رے یہ نازک دل لڑکیاں۔ مکھن کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہم آج کل ڈائننگ کر رہے ہیں۔

حراق قریشی، بلال کالونی ملتان سے لکھتی ہیں

یک حرفی خط پہلی شعاع (منعکس روشنی) حمد و نعت (باعث ہدایت) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں۔ (رحمت خداوندی بصورت شعاع) عشنا نور سے ملاقات (چھٹو جی!) دستک (ناٹ انٹرسٹڈ) شعاع کے ساتھ (اپنائیت) انسیت (آزمائش فیصلہ کن، تفکر سے پر) پسلی (بہترین شعور کے پرت واکرتی مارچ کی الوہی تحریر) جیت ہماری ہے (واقعی؟ یہی سچ ہے) محبت مانگتی ہے جو (لطیف قرار و

ثبات۔ رافع اور عشنا کے مکالمے حد درجہ پر لطف) کامیاب عورت، کڑوی حقیقت ”سیاہ حاشیہ“ محو دلچسپی۔ اہل جنوں باقی ہیں۔ اجالا بکھیرتی تحریر۔ دعائے خیر ہوں یادش بخیر! ایمان کی تحریر پہلے سے اچھی، معتبر ”رقص بکمل“ اجنبی ہمیشہ کی طرح کبھی بڑھی جو نہیں۔ ”نظمیں غزلیں“ اثر آفرین۔ ”مسکراہٹیں میٹھی میٹھی“ باتوں سے خوشبو آئے ”ذوق بصیرت“ ”کھلتا کسی پہ کیوں!“ یہ

مانگتی ہے جو "اچھا ناول تھا کیا بات ہے اب تمام اسٹوریز ماضی سے جڑ جاتی ہیں۔ ماضی حال پر بازی لے جاتا ہے۔ پلیز ہر کہانی کو ماضی سے جوڑنا ضروری ہے کیا۔
ج۔ محترمہ آسیہ ارم! ہم تو خود آپ کی طرف سے تشویش میں مبتلا تھے کہ اتنے دنوں سے کہاں ہیں۔ اب پتا چلا کہ یہ سب نامہ بر کی غیر حاضری کی وجہ سے ہوا۔ تبصرہ بہت اچھا لگا۔ آپ کو پرچے میں جگہ ملے نہ ملے۔ ہم نے اپنے دل میں آپ کو بہت جگہ دے رکھی ہے۔ بس اس بات کو یاد رکھیں۔



قارئین متوجہ ہوں!

- 1- ماہنامہ شعاع کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔
- 2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔
- 3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔
- 4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔
- 5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔
- 6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔
- 7- ماہنامہ شعاع کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع

37- اردو بازار کراچی

کون ہے بھئی حراقہ شیشی بائیں قطار کے اشعار میں موجود آخری شعر کی صورت۔ خط آپ کے سہولت زندگی "تاریخ کے جھروکے" تحیر و حیرت، باکمال "موسم کے پکوان" شایم کی بھجیا آج ہی بناؤں گی۔ خوب صورت بنیے جو پہلے ہی سے منظور نظر، خوب صورت ہو۔ وہ عزیز شاعر کے لیے.... بقول حراقہ شیشی....

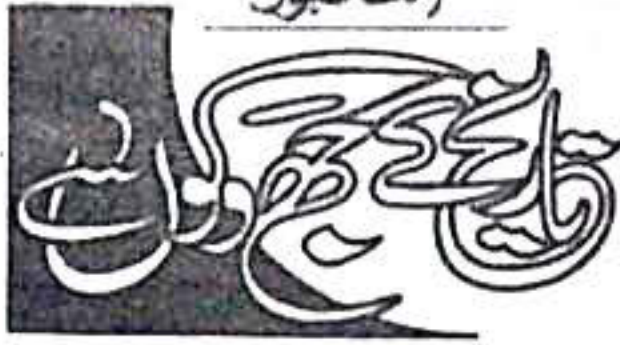
ج۔ پیاری حرا! آپ نگارشات بھیج کے بھول جاتی ہیں مگر ہم یاد بھی رکھتے ہیں اور باری آنے پر لگا بھی دیتے ہیں۔ (کیا؟ ہماری طرف سے یک حرفی اظہار) "کھلتا کسی پہ" آپ ہی کا ارسال کردہ شعر ہے۔ بھرے کا شکریہ۔ معذرت چاہتے ہیں ہم بذریعہ ای میل کوئی بھی نگارش قبول نہیں کرتے۔

آسیہ ارم کراچی سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

شکر ہے جی کہ "ایک تھی مثال" کا اپنڈ ہو گیا۔ اب اس کی جگہ زبردست سی کوئی اسٹوری ہونی چاہیے۔ (طاہر لاہوتی) جیسی نبیلہ جی کا "رقص بسل" عجیب و غریب رقص کرتا گزر رہا ہے۔ "سیاہ حاشیہ" بہت خوب صورتی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ مکمل ناول میں ام ایمان قاضی کا "دعائے خیر ہوں" پڑھا۔ ویل ڈن ام ایمان آپ کی تحریر کی ہیروئن کی تو میں نام اور اس کے کردار کی فین ہو گئی۔ عائشہ سنویر آپ نے آئینہ دکھایا تو اتنا کم کہ ایک صفحہ پر ہی ختم! بہر حال ایک صفحے کا ہی سہی۔ ایک قاری کے دل کا اور قلم کا حال سنا کر بے حال کر دیا۔ (ہنسا کر بھئی) اب تو سائرہ رضا کا نام ہی کافی ہے اس پر اتنا اچھوتا سا نام "محبت مارچ کا موسم" اپنے نام کی طرح ہی تھا جیسے مارچ میں جاتی سردی اور آتی بہار (21 مارچ) بہار کا پہلا دن۔۔۔ حمیرا کی اپنے تایا سے محبت بہت اچھی لگی، ہریا پ کو اپنی بیٹی سے ایسی ہی محبت، انیسیت اور اعتدا، ہونا چاہیے۔ بنت سحر کا "اہل جنوں باقی ہیں" بہت

زبردست تھا، مگر اتنے اہم موضوع پر اتنا مختصر افسانہ، تشنگی بانی ہے سحر۔ "کامیاب عورت" یاریہ عورتوں کے ساتھ خاموش ظلم کب ختم ہوگا۔ فرزانه کھل کا "محبت

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نیوی چینل پر ڈراما، ڈرامائی تحلیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



گنوماتا کی وجہ سے شکست

محمد غوری نے جب دوسری مرتبہ دلی پر حملہ کیا تو اپنی فوج کے آگے گائیوں کا بہت بڑا گلہ کر دیا۔ اور اس کی آڑ میں پیش قدمی جاری رکھی۔ گائیوں کے احترام کے سبب چوہان اپنی تلواریں بند کیے پیچھے ہٹے رہے اور محمد غوری کی فوج آگے بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ انہوں نے گائیوں کی ڈھال کی آڑ میں دلی فتح کر لیا اور چوہان گائیوں کو کاٹ کر ترکوں تک نہ پہنچ سکے، یوں لڑے بغیر دلی فتح ہو گیا۔

تاجر کی عیاری

انگریزوں کا برصغیر میں نزول تاریخی دلچسپی کا حامل ہے۔ عظیم مغل بادشاہ شاہ جہاں کی بیٹی ایک حادثے میں آگ سے بھلس گئی۔ انگریز ڈاکٹر کی مسیحائی نے اسے صحت دی تو احسان مند بادشاہ نے بطور اظہار ممنونیت کمپنی کو تجارتی حقوق مرحمت کر ڈالے۔ یہی حکم برصغیر کی تاریخ میں اہم سنگ میل ثابت ہوا۔ انگریزوں نے ساحل سمندر پر بے شمار چھوٹے بڑے قلعے تعمیر کیے اور ان میں ڈاکوؤں سے بچاؤ کے بہانے اسلحہ ذخیرہ کر لیا۔ وہ اسلحہ بعد ازاں مغلیہ حکومت کے خلاف استعمال ہوا اور یوں عیار تاجر مالک بن بیٹھا۔ گویا گرم مسالوں سے شروع ہونے والی تجارت نے انسانوں اور پھر ملکوں کو بھی اپنا غلام بنالیا۔

مقدس رباب، چکوال

شب دیز

ایران کے بادشاہ خسرو کے پاس بہت سی نادر اشیا تھیں اور اس کے دربار کا عجوبہ ایک گھوڑا بھی تھا۔ یوں

تو خسرو کے پاس پچاس ہزار گھوڑے، بارہ ہزار اونٹ اور ایک ہزار ہاتھی تھے۔ لیکن وہ گھوڑا جس کا نام ”شب دیز“ تھا۔ اس کی سواری کے لیے مخصوص تھا۔ یہ نہایت اسیل اور خوب صورت تھا اور موڑ خین کے مطابق آب و آتش کی صفات کا مجسمہ تھا۔ جس طرح رستم کی وجہ سے اس کا گھوڑا رقتیں بے حد مشہور ہوا، اسی طرح خسرو کا شب دیز نام کا یہ گھوڑا بے حد مشہور ہوا۔

مشہور روایت ہے کہ یہ گھوڑا خسرو کو اس قدر عزیز

تھا کہ وہ کہتا تھا کہ جو شخص بھی اس گھوڑے کی موت کی خبر اس تک پہنچائے گا اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ پھر اچانک ایسا ہوا کہ شب دیز نام کا یہ گھوڑا بیمار ہو گیا اور آخر کچھ دنوں بعد مر گیا۔ خسرو کے لیے اس کا مرنا ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔ جان کے خوف سے کوئی شخص یہ اطلاع بادشاہ کو نہ دینا چاہتا تھا۔ لیکن خبر بھی بہر صورت پہنچانی تھی۔ آخر داروغہ اصطبل نے خسرو پرویز کے مشہور گویے باربد کو وسیلہ بنایا۔ باربد نے خسرو پرویز کے حضور گا کر شعر پڑھے جن کا مضمون کچھ یوں تھا۔

”شب دیز نہ اب دوڑ سکے گا، نہ چل سکے گا، نہ سو سکے گا“ یہ سن کر خسرو پرویز چونک کر بولا۔ ”شب دیز مر گیا۔“ باربد نے کہا۔

”حضور ہی یہ فرما رہے ہیں اور کسی کی یہ جرات نہیں ہو سکتی۔“ باربد نے کہا۔

اس پر بادشاہ بولا۔

”بہت خوب، تو نے اپنے آپ کو بچالیا اور دوسروں کو بھی۔“

شازیہ خان۔ ملتان

ہجیرہ روم

حضرت لوط علیہ السلام جس قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے وہاں کے افراد ایک شرمناک فعل میں مبتلا تھے۔ وہ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کی طرف رغبت کرتے تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے تبلیغ بے اثر دیکھی تو رب العزت سے دعا کی۔ رب تعالیٰ نے ان کی سخت ناشائستہ حرکت کی پاداش میں جو سنگ انسانیت تھی ان پر معجیل کے پتھر برسائے۔ بارہ فرشتے جو خوش شکل اور جوان تھے ان کے ذمہ یہ کام سونپا گیا۔ اس سنگ باری سے بستی کے افراد ہلاک ہو گئے۔ قوم لوط کی بستی بالکل تہ و بالا کر دی گئی اور اس سرزمین میں دفعتا ایک ہجیرہ نمودار ہو گیا جو ہجیرہ لوط کے نام سے اب تک مشہور ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام کی تباہ شدہ بستی کا جائے وقوع تمام لوگوں کے لیے باعث عبرت ہے۔ لیکن اس

سے کافروں نے — عبرت حاصل نہیں کی وہ کہتے ہیں کہ اس مقام پر کوئلے اور گندھک کی کان تھی۔ جس کے اڑنے سے یہ ہجیرہ نمودار ہو گیا تھا۔ الغرض یہ مقام صرف اہل ایمان کے لیے عبرت نگاہ ہے۔ اہل کفر اس سے سبق نہیں سیکھتے۔

ہجیرہ لوط کا پانی ایسا تلخ اور بدبودار ہے کہ کوئی ذی روح اس کو استعمال نہیں کر سکتا اور اس کے کنارے کوئی درخت بھی نہیں اگتا۔

سدرہ، سونیا چوہدری گلاہور

تعرض

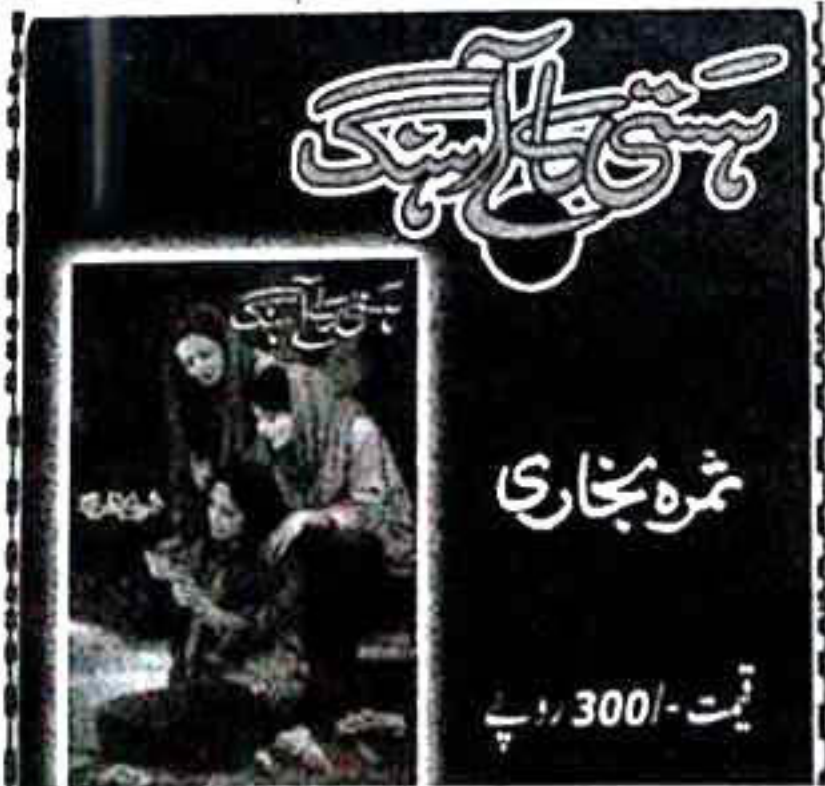
ایک مرتبہ چند متشدد قسم کے لوگوں نے رضیہ سلطانہ کی دین داری دیکھتے ہوئے مشورہ دیا کہ جہنم میں ہندوؤں کے تہواروں پر جو اشنان ہوتے ہیں اور جہنم کے کنارے جو مندروں میں بڑے زور و شور سے گھنٹے بجاتے ہیں ان سے مسلمانوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اس لیے انہیں حکماً بند کر دیا جائے۔ اپنے موقف کو تقویت پہنچانے کے لیے مشورہ

دینے والوں نے سلطانہ کے باپ التمش کی مثال بھی پیش کی کہ ”انہوں نے اپنے عہد میں مہاکال مندر مسمار کرا دیا تھا۔ آپ بھی جہنم کے کنارے جتنے مندر ہیں، مسمار کرادیں۔“

اتفاق سے سعد الدین کروی، جو اس زمانے کے ایک معتبر عالم تھے، کو اس بات کا پتا چل گیا، وہ فوراً ”سلطانہ کے پاس گئے اور کہا۔“

”اے سلطانہ! لوگوں کی باتوں میں نہ آنا۔ آپ کے والد نے جو مہاکال مندر ڈھایا تھا۔ وہ خود اس مندر کے برہمنوں کی التجار پر منہدم کیا گیا تھا۔ سبب اس کا یہ تھا کہ وہاں آوارگی کا اڈہ بن گیا تھا اور لوگ پوجا پاٹ کے بہانے وہاں آکر فحش حرکات کرتے تھے۔ اے سلطانہ! اسلام نے غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کو ڈھا دینے کی سختی سے مخالفت کی ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے ایران فتح کیا تو وہاں زرتشتی

مذہب قائم تھا۔ بے شمار آتش کدے روشن تھے لیکن انہوں نے فاحش ایران ہونے کے باوجود وہاں کے آتش کدوں کو مسمار نہیں کیا اور زرتشتیوں کو ان کی رسمیں ادا کرنے کے حق سے محروم نہیں کیا۔ دور نہ جائیں۔ ہندوستان میں محمد بن قاسم کی مثال لے لیں۔ اس نے سندھ اور ملتان کو فتح کر کے وہاں کے ہندوؤں کی پوجا پاٹ پر کوئی تعرض نہیں کیا اور ایک بھی مندر مسمار نہیں ہونے دیا۔ اے سلطانہ! تیرا بزرگوں



سے بڑھ کر نہیں ہو، اس لیے ایسا قدم ہرگز نہ اٹھانا جس کی اسلام نے اجازت نہیں دی۔“

رضیہ سلطانہ نے سعد الدین کردی کی باتیں سن کر ندامت سے سر جھکا لیا۔ اور اعتراف کیا کہ وہ واقعی ان لوگوں کی باتوں میں آگئی تھی۔ مگر اب وہی ہو گا جس کی اسلام نے تعلیم دی ہے اور ہندوؤں سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔

کنول شاہین، جلال پور جٹاں حجاج بن یوسف کا عجیب واقعہ

ام ابان بنت نعمان بن بشیر الانصاریہ نامی ایک بہت ہی حسینہ، جمیلہ، فصیح زبان اور ذہین خاتون تھی۔ اس کا پہلا نکاح روح زنباع سے ہوا تھا۔ اس کے بعد جبراً حجاج نے اس سے دولاکھ درہم پر نکاح کیا، مگر اس کے دل میں حجاج کی نفرت برقرار رہی۔ ایک مرتبہ آئینہ میں اپنے حسن و جمال اور حجاج کا موازنہ کرتے ہوئے بے ساختہ فی البدیہ اس کی زبان پر یہ اشعار جاری ہوئے۔

ترجمہ: ”ہندہ نہیں ہے، مگر علی گھوڑی جواچھے گھوڑے کی نسل سے ہے جس سے ایک خچر نے نکاح کیا۔ اب اگر باکمال کو نہ چنے تو کیا خوب ہے اور اگر خچر کو چنے تو سمجھ لو کہ خچر سے خچری پیدا ہوتا ہے۔“

جس وقت یہ شعر پڑھ رہی تھی حجاج کمرے میں داخل ہوا تو اس نے یہ اشعار سن لیے اور مارے غصے کے اسے طلاق دے دی اور عبداللہ بن طاہر کے ذریعے مہر بھجوا دیا۔

اس غیرت مند خاتون نے ابو طاہر کو وہ رقم بطور تحفہ دے دی اور کہا۔

”تقیف کے کتے سے نجات کی بشارت سنانے پر میں یہ خطیر رقم تجھے دیتی ہوں۔“

عدت کے بعد عبدالملک بن مروان کو اس کے حسن و جمال کی اطلاع ہوئی تو نکاح کا پیغام دیا۔ خاتون نے ایک تحریر لکھی۔ جس کا مضمون یہ تھا۔

”امیر المومنین کو معلوم ہونا چاہیے کہ برتن میں کتے نے منہ ڈال دیا ہے۔“

خط پڑھ کر عبدالملک خوب ہنسا اور جواب تحریر کیا۔ ”جب برتن میں کتا منہ ڈال دے تو اس کو سات مرتبہ دھویا جاتا ہے۔ تم بھی برتن کو دھولو، قابل استعمال ہو جائے گا۔“

ہندہ ایک شرط پر نکاح کے لیے راضی ہوئی کہ ”میری رخصتی کے وقت حجاج میری سواری کی ٹکیل تھام کر آپ کے شہر تک پہنچائے گا“ اس حال میں کہ وہ ننگے پاؤں چل رہا ہو اور اپنے اباؤ اجداد کے اصلی لباس اونٹ کے چرواہوں کے لباس میں ہو۔“

یہ شرط پڑھ کر عبدالملک خوب ہنسا اور حجاج کو حکم دیا کہ وہ ہندہ کو پہنچائے۔

بادشاہ کے حکم کے سامنے حجاج بے بس ہو گیا۔ جب حجاج ہندہ کی اونٹنی کی ٹکیل پکڑ کر حجاج جا رہا تھا تو ہندہ نے وایہ سے کہا۔

”ذرا مخمل کا پردہ ہٹاؤ۔“ پھر حجاج سے کہا۔ ”اے شہزاد! ہمارا ایک درہم گر گیا ہے۔ اٹھا کر دے۔“ ہندہ نے نیچے دینار پھینک دیا تھا۔ حجاج زمین پر درہم ڈھونڈنے لگا تو اس نے کہا۔ ”یہاں پر دینار ہے، درہم نہیں۔“

ہندہ نے کہا۔ ”نہیں، وہ تو درہم ہی تھا۔“ اس نے کہا۔

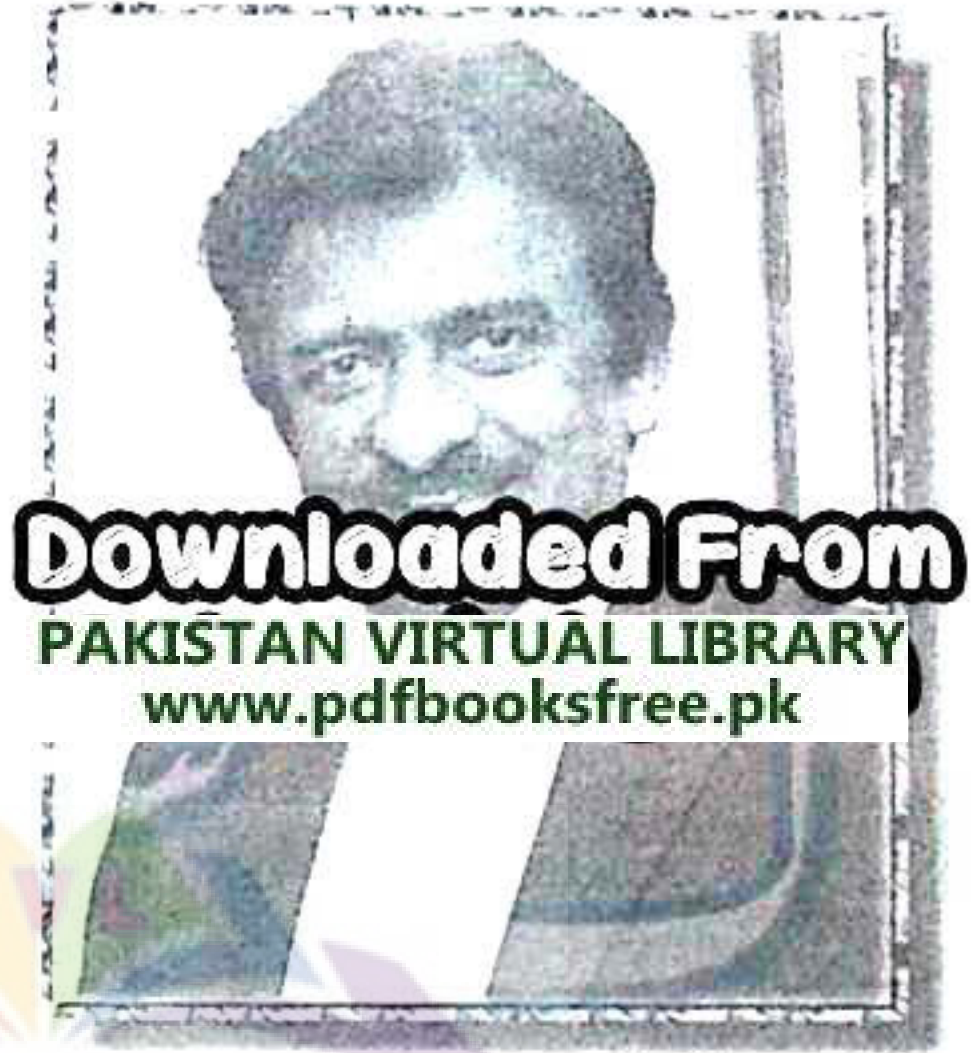
”نہیں دینار ہی ہے۔“ حجاج نے یقین دلایا۔ ہندہ ہنس کر بولی۔

”میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔ گرا تو میرا درہم تھا، مگر اس نے مجھے دینار عطا کیا۔ تجھے حقیر کے بدلے عبدالملک بن مروان جیسے بادشاہ کی زوجیت کا شرف بخشا۔“

حجاج پوری بات سمجھ گیا اور بے حد شرمندہ ہوا اور اس سے کوئی جواب نہ بنا۔ اس طرح ہندہ عبدالملک بن مروان کے پاس پہنچ گئی۔

فرزانہ مغل۔ واہ کینٹ

عقیدہ آصفی نے پاکستان میں افغان پناہ گزینوں کے کیمپ میں لڑکیوں کو تعلیم دینے کے لیے کرائے پر شامیانے لے کر پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا۔ ابتدا میں چند لوگوں نے اپنی لڑکیوں کو بھیجنا شروع کیا۔ عقیدہ نے سب سے پہلے انہیں غیر متنازعہ موضوعات کے متعلق تعلیم دینی شروع کی، انہوں نے سب سے پہلے بچوں کو حفظان اصول کے اصولوں کے تحت گھر سنبھالنے کے طریقے، صحت صفائی، مذہبی تعلیم کے متعلق بنانا شروع کیا اور جب لوگوں کا ان پر اعتماد بحال ہونا شروع ہوا تو پھر انہوں نے جغرافیہ، حساب اور تاریخ پڑھانا شروع کیا۔ ابتدا میں ان کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ بلیک بورڈ خرید سکیں تو وہ کپڑے کے ٹکڑوں پر سلائی کر کے مضامین لکھا کرتی تھیں اور پھر اسے خیمے کی دیوار پر لٹکا کر بچوں کو پڑھاتی تھیں۔ لیکن ان کی ہمت اور لوگوں کے ساتھ نے انہیں آج



معیار

معروف اداکار تو قیرنا صر کا کہنا ہے کہ ٹی وی چینلز کی بہتات کے باعث ان دنوں ٹی وی ڈراما افراتفری کا شکار ہے۔ پاکستانی اداکاروں اور ڈائریکٹرز کے پاس کام زیادہ وقت کم ہے۔ اسی لیے ڈرامے کا معیار بھی کم ہو رہا ہے، (ریٹنگ کا شکار ہو ہیں سب) انہوں نے مزید کہا کہ ماضی میں فلموں میں کام کرنے کا ان کا تجربہ اچھا نہیں رہا۔ مگر آج کل اچھی فلمیں بن رہی ہیں اور ان کا مستقبل بھی اچھا نظر آ رہا ہے۔ (نئے اداکاروں اور ڈائریکٹرز کو اتنے منہجے ہوئے فنکار کی بات پر سنجیدگی سے غور ضرور کرنا چاہیے اگر وہ ٹھہرنا چاہتے ہیں تو۔۔۔ ورنہ۔۔۔؟)

ایک رخ یہ بھی

افغانستان سے ہجرت کر کے پاکستان آنے والی





اس مقام پر پہنچ دیا ہے کہ آج ان کے پاس ایک عمارت ہے اور 9 خیمہ اسکول ہیں۔ جن میں کئی خواتین بچوں کو پڑھانے کا فریضہ انجام دے رہی ہیں اور اس وقت ان کے اسکولوں میں پندرہ سو بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں جن میں نو سولڑکیاں ہیں۔

عقیلہ آصفی کی خدمات کو پوری دنیا میں سراہا گیا ہے اور ایک معروف برطانوی چینل نے ان پر ایک ڈاکیومنٹری بنائی ہے۔ (حیرت کی بات ہے ورنہ تو مغرب والوں کو مسلمان عورت مظلوم ہی نظر آتی ہے) 2015ء میں بھی عقیلہ آصفی کو اقوام متحدہ کی جانب سے ایوارڈ سے نوازا گیا تھا اور اب ان کی خدمات سراہتے ہوئے دنیا کے بہترین استاد کے ایوارڈ (گلوبل ٹیچر پرائز ایوارڈ) کے لیے نامزد کیا گیا ہے۔ دس بہترین اساتذہ میں ان کا نام شامل ہے (اللہ کرے کہ یہ ایوارڈ جس کی رقم ایک ملین ڈالر کی خطیر رقم ہے عقیلہ آصفی کو مل جائے۔ شرمین عبید چنائے جیسی خواتین۔۔۔؟)

تبدیلی

ماروی میمن سابق صدر پرویز مشرف کے دور میں پاک فوج کے شعبہ تعلقات (آئی ایس پی آر) سے وابستہ تھیں اور خود بتاتی ہیں کہ ان کی ذمہ داری پرویز مشرف کی فوجی اور سیاسی حکومت کو مشورے دینا تھا۔ (یعنی۔۔۔ وہ بھی۔۔۔؟) پھر وہ ق لیگ میں شامل ہو گئیں اور قومی اسمبلی کے ایوان کے علاوہ مختلف پارٹ فارمز پر چوہدری شجاعت حسین کو ملک کا ایک عظیم راہنما ثابت کرنے کے لیے جوش خطابت کا مظاہرہ کرتی رہیں۔ پھر انہوں نے جنرل ریٹائرڈ پرویز مشرف سے وابستگی اختیار کر لی اور یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ سابق صدر کے دستخطی ہونے پر وہ صدمے سے بے حال ہو گئی تھیں اور پھوٹ پھوٹ کر روئی تھیں۔

مسلم لیگ ن کی قیادت پر جارحانہ تنقید کرنے والی ماروی میمن آج اسی ن لیگ حکومت میں بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کی چیئر پرسن ہیں یہ لحاظ عمدہ وزیر مملکت ہیں (تو بھئی اس میں زور کس پر ہے۔۔۔؟) اس

سب کے باوجود ان کی ذہانت، علمیت اور اپنی ذمہ داری نبھانے پر انگلی نہیں اٹھائی جاسکتی (لیکن انگلی تو امپائر اٹھاتا ہے ناں اور۔۔۔؟) وہ ایک کامیاب بزنس وومن بھی ہیں۔

کچھ ادھر ادھر سے

☆ فیصل چوہدری مسکرایا اور پھر بجائے مریض کے بارے میں دلائل دینے کے اپنے بارے میں کہنے لگا کہ ”آپ کو پتا ہے ناکہ ہماری فیملی برسوں سے وکالت کے شعبے سے منسلک ہے۔ میں اگر چاہوں تو اگلے چودہ سال پرویز مشرف کو عدالت میں بیمار رکھ سکتا ہوں“ اس اعلانے کے بعد مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

(چہرہ۔ مظہر لاس)

پرویز مشرف اگرچہ بیمار و بیمار کوئی نہیں۔ مگر انہیں باہر جانے کا راستہ دے دینا چاہیے۔ ہمارے وزیر اعظم نیک نیت انسان ہیں سب سے زیادہ بھروسا بھی اللہ ہی پر کرتے ہیں۔ چنانچہ میرا مشورہ ہے کہ وہ اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے پرویز مشرف کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں۔ بے شک وہ انصاف کرنے والا ہے۔

(روزن دیوار سے عطاء الحق قاسمی)

موسم کے پکوان

خالہ جیلانی

فاسٹ فوڈ اب گھر میں بنائیں

ہاٹ ڈاگ برگرز

ضروری اشیاء :

برگر بن (لجے والے) چھ عدد

کباب چھ عدد

سلاد پتے حسب ضرورت

مایونیز حسب ضرورت

ٹماٹر حسب ضرورت

کھیرا حسب ضرورت

تیل حسب ضرورت

ترکیب :

مرغی یا گلٹے کے قیمے میں چنے کی دال، پیاز، لال ثابت مرچ، ہری مرچیں، لہسن، اورک، نمک اور ثابت گرم مسالا حسب منشا ڈال کر ابل لیں اور پیس کر مکینے بنالیں۔

کباب کو گرم تیل میں دونوں طرف سے مل لیں برگر بن کو لمبائی کے رخ پر درمیان سے کاٹ لیں اور نچلے والے حصے میں مایونیز لگائیں۔ اس پر سلاد پتہ رکھیں۔

پھر ٹماٹر، کھیرا اور کباب رکھ کر تھوڑی مایونیز ڈال کر بن کا دوسرا حصہ رکھیں۔ کھچپ کے ساتھ نوش فرمائیں۔ (اس ترکیب میں آپ گھر میں موجود کوئی بھی کباب استعمال کر سکتی ہیں)۔

چکن شاورمہ

ضروری اشیاء :

مرغی کا گوشت ایک کلو

پیسا ہوا اورک، لہسن دو کھانے کے چمچے

سرکہ ایک چوتھائی کپ

ایک کھانے کا چمچ
آدھا کھانے کا چمچ
ڈیڑھ کھانے کا چمچ
حسب ذائقہ

چلی ساس
پسی رائی
پسی لال مرچ
نمک

آدھا کپ
حسب ضرورت
آدھا کپ
ایک کپ
ایک عدد

تیل
پیٹا بریڈ
مایونیز
دہی
کھیرا
ٹماٹر

ترکیب :

گوشت دھو کر دو انچ لمبے اور ایک انچ چوڑے پارچے بنالیں۔ ایک بڑے پیالے میں سرکہ، پیسا ہوا اورک، لہسن، چلی ساس، پسی لال مرچ اور نمک ملائیں۔ پھر اس میں گوشت کے پارچے شامل کر کے اچھی طرح ملائیں اور اس کو آدھے گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔

پٹیلے میں تیل گرم کریں اور اس میں گوشت ڈال کر درمیانی آنچ پر گوشت گھٹنے تک پکائیں۔ جب گوشت گل جائے تو بھون لیں۔

ٹماٹر اور کھیرے کے باریک ٹکڑے کاٹ لیں۔ ایک پیٹا بریڈ لیں اس میں ایک کھانے کا چمچ مایونیز لگائیں، دو کھانے کے چمچے گوشت رکھیں۔ ٹماٹر اور کھیرے کے ٹکڑے رکھیں اور ہر شاورمہ میں ایک چائے کا چمچ دہی ڈال کر رول بنالیں اور چاہیں تو کھچپ اس کے اوپر ڈال کر پیش کریں۔ پیٹا بریڈ نہ ملے تو روٹی یا پرائٹھے سے بھی بنایا جاسکتا ہے۔

ہوم میڈ کرپسی زنگر

ضروری اشیاء :

مرغی (بغیر ہڈی)
پسپا لسن اور ک
انڈے

حسب ضرورت
آدھا چائے کا چمچہ

پسپا سفید مرچ
پسپا کالی مرچ
تیل

ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
ایک کھانے کا چمچہ

میدہ
پسپا کالی مرچ

تین سے چار کھانے کے چمچہ
آدھا چائے کا چمچہ

سویا ساس
چلی ساس

ایک چائے کا چمچہ
ایک چائے کا چمچہ

چھس
سوکھی ڈبل روٹی کا چورا
نمک

آدھا کپ
آدھا کپ
حسب ذائقہ

کچری پاؤڈر
تیل
لیموں کا رس

ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
حسب ضرورت
ایک چائے کا چمچہ

بن
سلاو پتا
پانی
تیل

حسب ضرورت
حسب ضرورت
حسب ضرورت
حسب ضرورت

پانی

ترکیب :

کڑا ہی میں تیل گرم کر کے پیاز کو سنہرا کر لیں اس
میں گوشت ڈال کر اسے ہلکا سا بھون لیں۔ پھر اس میں
اوپر دیے گئے تمام مسالا جات علاوہ تل کے ڈال کر
بھون لیں۔ اگر ضرورت پڑے تو پانی ڈال لیں گوشت کو

درمیانی آنچ پر گلا لیں۔ بھوننے وقت تل چھڑک دیں۔
لیموں کے سلائس سے سجا کر چاولوں کے ساتھ پیش
کریں۔ گاجر کا موس

ساس پین میں مرغی اور پسپا لسن اور ک ڈال کر
کچھ دیر تک پکا میں۔ جب مرغی کا پانی خشک ہو جائے تو
چولہے سے اتار لیں اور ٹھنڈا کر لیں۔ ایک پیالے میں
انڈے پھینٹ کر اس میں میدہ، نمک، پسپا کالی مرچ
اور تھوڑا پانی شامل کر کے آمیزہ تیار کر لیں۔

چکن کو انڈے کے آمیزے میں ڈبو کر بریڈ کر مرز
سے کوٹ کر لیں۔ ایک پلیٹ میں چھس پھیلا کر چورا
کر لیں۔ چکن کو ایک ایک کر کے اس میں کوٹ کریں
اور آدھے گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔

کڑا ہی میں تیل گرم کر کے اس میں چکن ڈال کر تل
لیں۔ سنہری ہو جائے تو اس کو بن میں سلاو کے پتے
کے ساتھ رکھ دیں۔ پھر سرونگ پلیٹ میں نکال کر فریج
فرائیز اور کیچپ کے ساتھ سرور کریں۔

تل گوشت

ضروری اشیاء :
گائے کا گوشت

آدھا کلو
ایک کپ
ایک عدد

ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
حسب ضرورت

دہی
پیاز
پسپا لسن
پسپا اور ک
نمک

آدھا کلو
ایک کلو
ایک کپ
ایک کپ
دو کھانے کے چمچہ
جیلٹن پاؤڈر
بادام، پتے، چاندی کا ورق سجانے کے لیے

1۔ گاجر کو کش کر لیں۔ دودھ میں گاجر ڈال کر پکنے
رکھ دیں دودھ پک کر آدھا رہ جائے تو چینی ڈال دیں
ایک منٹ پکا کر ہلنڈہ میں پیس لیں۔

2۔ جیلٹن پاؤڈر کو آدھا کپ گرم دودھ میں ملا کر
گاجر کے آمیزے میں ڈال کر پیس لیں۔

3۔ آدھی کریم ملا کر شیشے کے گلاس یا کسی پیالے
میں ڈال کر فریج میں جمانے رکھ دیں۔

4۔ جب موس جم جائے تو کریم، بادام، پتے اور
چاندی کے ورق سے سجادیں۔





خوبصورتی، شگفتہ، تروتازہ چہرہ

اگر آپ خوب صورت شگفتہ و تروتازہ چہرہ حاصل کرنے کی خواہش مند ہیں اور کسی بہترین بیوٹی پروڈکٹ کی تلاش میں ہیں تو پھر جان لیجیے کہ فیشل اور فیس ماسک ہی سب سے نمایاں اور اول درجے پر فائز ہیں۔

تاہم کسی بھی صورت حال میں فیشل کروانے سے پہلے ماہرین سنگھار یہ تجویز کرتے ہیں کہ اگر آپ حساس جلد کی مالک ہیں تو چہرے پر براہ راست فیشل کروانے سے پہلے کسی ڈرما ٹولوجسٹ سے مشورہ کریں۔ کیونکہ فیشل کے دوران استعمال ہونے والے کیمیکلز اور کرمیوں سے آپ کی جلد کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس کے برعکس چہرے کی جلد کو نکھارنے و سنوارنے کے لیے تازہ و خشک پھلوں، سبزیوں اور مختلف اقسام کی نباتاتی جڑی بوٹیوں کا استعمال قطعی بے ضرر ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ اس وقت بھی پر خطر نہیں ہوتا جب آپ کسی قسم کی الرجی کا شکار ہوں۔

ماسک

نرم و ملائم جلد کے حصول کے لیے بادام، جئی کے دلیے، شہد اور دہی کے مکسچر کو چہرے پر اپلائی کریں۔ 15 منٹ کے بعد نیم گرم پانی سے چہرے کو دھو کر صاف کر لیں اور چہرے کی فطری شگفتگی سے لطف اندوز ہوں۔

اسکرب

ہوم میڈ اسکرب بنانے کے لیے ایک کھانے کا چمچ اخروٹ کا پاؤڈر لے کر اس میں شہد اور لیموں کا رس ملا کر پیسٹ تیار کر لیں۔ اس مکسچر سے چہرے کی

اسکربنگ کریں اور کچھ دیر کے لیے لگا کر چھوڑ دیں۔ اس کے بعد ٹھنڈے پانی سے چہرے کو دھو کر صاف کر لیں۔

فیس ماسک

چہرے کی کھوئی ہوئی رعنائی کو بحال کرنے کے لیے لوکی کا ایک ٹکڑا لے کر اسے ایک انڈے کی زردی اور دودھ کے ساتھ ملا کر میسج کریں، چہرے پر یہ فیس ماسک اپلائی کریں اور 30 منٹ کے بعد چہرہ دھو کر صاف کر لیں، دیکھیں کہ کس طرح آپ کی جلد روشن و چمکدار دکھائی دیتی ہے۔

قدرتی اشیاء کی مدد سے چہرے پر نکھار لائیں

1۔ پودینے کے پتوں کو پیس کر اس میں شہد شامل کریں اور فیس ماسک بنائیں جو آپ کی جلد کے مسامات کی صفائی کرے گا اور ان کے کھلے ہوئے منہ بند کر دے گا۔

دو کھانے کے چمچے خشکاش لے کر رات بھر کے لیے بھگو دیں، صبح اس میں تھوڑا سا دودھ شامل کر کے گرائنڈ کر کے پیسٹ تیار کر لیں۔ اس پیسٹ کو چہرے پر لگائیں، خشک ہو جائے تو ٹھنڈے پانی سے دھو کر صاف کر لیں۔

چہرے پر مساج کرنا، چہرے کے لیے بہترین ایکسرسائز ہے۔ اس سے آپ خود کو پرسکون اور اپنی روح کو توانا ہوتا ہوا محسوس کریں گی، یہ آپ کے چہرے کے دوران خون کو بہتر بنانے میں معاونت کرے گا اور اسے جھریوں کا شکار بننے سے محفوظ رکھے گا۔

